اور جوش عمل پیدا کیا انھوں نے ایک ماہر فن استاد کی طرح قوم مسلم کو سکھایا کہ
وہ غوغائے عالم میں حصہ لے اور ہندوستان کے ایک بسنے والے کی حیثیت
سے شہریت کے تمام حقوق کا مطالبہ کرے اس کے حصول کے لئے جدوجہد
کرے اور پورے انشراح قلب سے دوسری قوموں اور دوسرے مذہب والوں
کے ساتھ دوش بدوش ملکی ترقی میں سعی وکوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔
جمعیۃ العلماء اور بہت سی اور نیشنلسٹ جماعتوں کا بلاشبہ یہی نظریہ تھا۔ مولانا
حفظ الرحمن اس میں منفرد نہ تھے وہ تو وہی بات کہتے تھے جو ہر مکتبہ خیال کے
پانچ سو سے زاید علما متفقہ طور پر کہہ چکے تھے جن کے تقدس اور جن کے علم و
تحقیق کی مثالیں کم ہیں مگر مولانا حفظ الرحمن کی حیثیت ایک میر کارواں کی تھی،
انھوں نے اس نظریہ کو جاندار بنایا اسے خلعت فاخرہ بخشا اور اپنے پختہ عقیدہ
بے پناہ عزم مسلسل عمل جرأت وبیباکی ایثار وقربانی اور بے مثال ذہن، اور
باریک بینی سے اسے اجاگر کر دیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہی اس کے موجد تھے
لاکھوں انسان ان کے پیرو تھے اور ان کے ہر قول کو واجب التعمیل سمجھتے
تھے انہی میں یہ عاجز بھی تھا۔ میں اس پر فخر نہیں کرتا مگر میری عادت نکتہ چینی
کی ہے اور میں نے آج تک کسی کی کورانہ تقلید نہیں کی۔ اگر مولانا حفظ الرحمن
دن کو رات کہہ دیتے تو میں تسلیم کر لیتا کیونکہ مجھے ان کے سوچنے کے انداز
اور ان کی دیدہ وری پر پورا بھروسہ تھا۔

ملت اسلامیہ ہند کی خدمت

اس عوامی نظریہ کے ساتھ انھوں نے ملت اسلامیہ ہند کی جو گراں بہا
اور ان مٹ خدمات انجام دیں وہ تاریخ میں زریں حروف سے لکھی جائینگی
آیندہ کا مورخ جب اس زمانہ کے حالات قلمبند کرے گا تو انھیں یقیناً
نجات دہندہ کا لقب دے گا ۱۹۴۷ء کی آزادی کی برکتوں کے ساتھ پاکستان
کے قیام کے ردعمل کے طور پر نفرت اور تنگ نظری کی جو فضا پیدا ہوئی وہ
محتاج بیان نہیں ہے۔ ہر نیشنلسٹ مسلمان کا یہ خیال تھا کہ اس فضا کی بالواسطہ
ذمہ داری مسلم لیگ پر ہے۔ یہ خیال صحیح ہو یا غلط اس سے یہاں بحث نہیں
ہے واقعہ یہ ہے کہ مولانا کا نظریہ بھی یہی تھا۔ وہ مسلم لیگ سے بے پناہ جرأت
ودلیری کے ساتھ لڑے تھے اور ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ان لوگوں کے
ساتھ محبت اور بھائی چارے کا رشتہ قائم کرنا بہت ہی دشوار تھا لیکن
اس عظیم انسان کے لئے یہ بات جو ہم سب لوگوں کے لئے بڑی مشکل
تھی ایسی آسان نکلی کہ گویا اس میں کوئی بات ہی نہ تھی وہ ہر مسلم لیگی کے
لئے پشت پناہ تھے اور پنجاب سے مدراس اور کلکتہ سے پونا تک دورہ
کرکے چیختے تھے کہ مسلمان سے وفاداری کا مطالبہ غلط ہے وہ ملک و
وطن کا وفادار ہے۔ کریم النفسی اور عالی ظرفی کی ایسی نادر مثال شاید ہی مل
سکے۔ پھر ان لوگوں سے جو وفاداری کا مطالبہ کرتے تھے مولانا بجلی کی کڑک دار
آواز سے خطاب کرتے تھے، مجھے وہ منظر کبھی بھول نہیں سکتا جب کانفرنس
مسلمانان ہند لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ اس وقت وفاداری کا مطالبہ اپنے
عروج پر تھا۔ تمام ہندوستان کا مسلمان یہاں جمع تھا۔ امام الہند صدر
تھے۔ اس میں مولانا حفظ الرحمن نے ایک یادگار تقریر کی تھی، اب تک
جب میں اس تقریر کو سوچتا ہوں تو میرے کانوں میں بجلیاں کڑکتی اور
توپیں گرجتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے جو الفاظ کہے تھے ان کا مفہوم
میں ذیل میں درج کرتا ہوں:-

> "ہم کسی جماعت پارٹی یا حکومت کے وفادار نہیں ہیں ہم
> صرف ملک اور وطن کے وفادار ہیں، اگر کوئی جماعت پارٹی
> یا حکومت ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے تو ہم اسے
> بتادینا چاہتے ہیں کہ اگر وہ جماعت یا پارٹی یا حکومت غلط
> راستوں پر جائے تو ہمارا کام اس کو سیدھا کرنا یا الٹ دینا
> ہے، جو افراد یا جماعتیں ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتی ہیں
> ہم ان سے ملک کی وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں جو لوگ
> فرقہ پرستی تنگ نظری یا تعصب پیدا کرتے ہیں وہ ملک
> کے غدار اور وطن کے دشمن ہیں ان کو کسی دوسرے سے
> وفاداری کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے وہ خود اپنی وفاداری
> کا امتحان دیں"

میں نے دیکھا کہ ہر صوبہ کا مسلمان جو پژمردہ۔ مایوس۔ خوف زدہ
اور مضمحل تھا ایک دم بشاش ہو گیا اور گردن اٹھا کر اور سینہ تان کر چلنے
لگا۔ یہ ایک مثال نہ صرف ان کی جرأت ودلیری اور وطن دوستی کی ہے
کیوں کہ انتہائی درجہ تک محب وطن ہوئے بغیر کوئی شخص اس طرح کی
باتیں کہنے کی ہمت ہی نہیں کرسکتا۔ بلکہ یہ ان کی بے مثال ذہانت کو
بھی ظاہر کرتی ہے یہی ان کی نکتہ بینی اور صحیح الفکری تھی جو انھیں اپنے
عصر کے لوگوں پر ممتاز کرتی تھی۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ نہ صرف علما
بلکہ بڑے بڑے انگریزی داں وکیل ماہر سیاست ملکی امور میں ان کے
سامنے طفل مکتب نظر آتے تھے۔ چنانچہ آج مولانا کی یہ تقریر ایک

اصول مسلمہ بنی ہوئی ہے اور اس نے بے شمار پریشاں و ماغیوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ہندوستان کا کوئی گوشہ کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا، جہاں سے ان کے پاس فریاد نہ جاتی ہو اور جہاں وہ خود اس فریاد پر دوڑ کر نہ پہونچتے ہوں یا کسی کو بھیج کر یا مقامی اشخاص کو لکھ کر اس پر پوری توجہ نہ صرف کرتے ہوں۔ اس میں وہ اپنے عقیدے پر بھی اصرار نہ کرتے تھے۔ اگر اجمیر شریف اور خواجہ بختیار کاکیؒ کے عرس بند کئے جاتے تھے تو یہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات تھی کہ اس کھلوانے کے لئے مجاہدہ کرتی تھی۔ چھوٹی سے چھوٹی باتیں بھی ان کی توجہ کا مرکز بنتی تھیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ سارے ہندوستان کا مسلمان انھیں ملجا و ماوی سمجھنے لگا تھا۔ ان کے بارے میں امیر مینائی کا یہ شعر پورے طور پر موزوں ہے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

۱۹۵۰ء و ۱۹۵۱ء کے ہنگامہ خیز زمانہ میں وہ یوم النبی کمیٹی بستی کی درخواست پر ۱۲ ربیع الاول کو تقریر سیرت کرنے آئے اور میرے مہمان ہوئے میں نے کسی کی دعوت نہیں کی تھی مگر ۵۰ - ۶۰ آدمیوں کا کھانا پکوایا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ان کا نام سن کر قرب و جوار کے مواضعات کے مقامی مسلم کارکن دوڑ پڑیں گے چنانچہ یہی ہوا گونڈہ فیض آباد، بہرائچ، گورکھپور، دلوریا، غازی پور، بلیا، سلطان پور وغیرہ سے لوگ اپنی شکایتیں لے کر آئے۔ اور اپنی اپنی کہانیاں بیان کرتے تھے۔ مولانا بڑے ہی صبر و سکون سے سب کی باتیں سنتے تھے اور جواب دیتے تھے۔ جس چیز نے سب سے زیادہ مجھ کو متاثر کیا وہ مولانا کا اطمینان اور سکون قلب تھا۔ وہ مطمئن تھے کہ فرقہ واریت دم توڑ کر رہے گی ان کا خیال تھا کہ آدھی لڑائی جیتی جا چکی ہے اور آدھی صرف باقی ہے جو جلد جیت لی جائے گی۔ اس کے علاوہ وہ ہندو فرقہ واریت سے اسی طرح لڑ رہے تھے جس طرح وہ مسلم فرقہ واریت سے لڑ چکے تھے کبھی میں نے ان کے اندر نفرت یا تلخی نہیں پائی اور نہ مایوسی ان کے قریب آئی۔ ان کے نزدیک یہ کام بھی حق و صداقت ملکی و وطنی سالمیت کی گراں بہا خدمات تھے۔

دستورِ ہند

جو مسلمان پاکستان چلے گئے ان کی متروکہ جائداد، گاؤں گاؤں میں قبرستانوں کے کھودے جانے کے قضیے مسجدوں کی تعمیر میں رکاوٹیں بلوے اور فسادات اور اس سلسلہ میں حکام کی بعض جگہ بے راہ رویاں یہ سب اور ان کے علاوہ بہت سے بڑے اور چھوٹے معاملات ہمہ وقت ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ اس سلسلہ کی داستان طویل ہے مگر سب سے بڑا احسان جو انھوں نے ملت اسلامیہ پر کیا وہ دستور ہند کا موجودہ ڈھانچہ ہے اس وقت مولانا دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے اور کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ اقلیتوں کو جو حقوق دیئے گئے ہیں ان کی ترتیب و تدوین میں مولانا حفظ الرحمٰن کا بہت بڑا ہاتھ ہے آج یہی دستور کی دفعات ہیں، جو مسلمانوں کو ہندوستان میں سربلند رکھ سکتی ہیں اور اگر ان میں ان حقوق کے حاصل کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے یعنی وہ احساس کمتری سے نکل آویں تو ان کا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے۔ مولانا بار بار کہتے تھے مسلمانوں سے احساس کمتری مٹانا اس عصر کی سب سے بڑی خدمت ہے ایک مرتبہ مولانا نے مجھے ایک خط لکھا اور ایک خاص قومی معاملہ میں مجھ سے رائے طلب کی میں نے جواب میں عرض کیا کہ میں تو آپ کا پورا نہ مقلد ہوں لیکن آپ رائے پوچھتے ہیں تو بہ تعمیل حکم عرض ہے کہ بات یوں ہے اس پر مولانا نے مجھے لکھا کہ آپ کے جواب سے طبیعت بہت خوش ہوئی، اگر اسی طرح مسلمان احساس کمتری کو اپنے دلوں سے نکال پھینکیں تو ہمارے کل معاملات آناً فاناً حل ہو سکتے ہیں۔ احساس کمتری کو مٹانا دستور کے دیئے ہوئے حقوق کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ اور عمل ہے دستور نے جو حقوق دیئے ہیں وہ ایسے جامع ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی بھی آج تک اضافہ کی ہمت نہ کر سکا۔ جو لوگ حکومت الٰہیہ کا خواب دیکھتے ہیں اور ملک کی اس طرز حکومت کو نظام باطل کے نام سے پکارتے رہیں وہ بھی دستور ہند کے ان دفعات کی داد و تحسین کرتے ہیں، جن میں مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے حقوق درج ہیں۔ مگر یہ حقوق بلا احساس کمتری کو دور کئے حاصل نہیں ہو سکتے ہیں۔ مولانا کا یہ زبردست مشن تھا کہ مسلمان احساس کمتری کو ترک کریں وہ فرمایا کرتے تھے کہ زمانہ حاضرہ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ مسلمانوں سے احساس کمتری کو دور کیا جائے۔ یہ ان کے فکری گہرائی کی واضح مثال ہے۔

دینی تعلیمی تحریک

مولانا حفظ الرحمٰن کو بجا طور پر دینی تعلیمی تحریک کا موجد و محرک قرار

دیا جاسکتا ہے انکی دوررس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمان بچوں کو موجودہ ماحول میں دینی تعلیم دیئے بغیر آیندہ کی نسلوں کا مسلمان رہنا دشوار ہوگا وہ مسلمانوں کو اس سانچے میں جو دستور ہند کے ذریعے انھوں نے تیار کرایا تھا پوری طرح فٹ کرنا چاہتے تھے۔ ان کی وطن دوستی اور ملک نوازی اسلام کے اصولوں سے کسی مصالحت پر مبنی نہ تھی بلکہ ملک وطن تمام ہندوستان کی اقلیت واکثریت کی خدمات وہ صرف اسلام کے احکام کے ماتحت کرتے تھے۔ انھوں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ رائے قائم کی تھی کہ ملک کی ترقی کے ساتھ مسلمانوں کی ترقی اور ملک کی تنزلی کے ساتھ مسلمان کا تنزل بھی وابستہ ہے۔ اور یہی امر حق ہے کہ ملک سے محبت اور دوستی میں کسی منافقت کو دخل نہ دیا جائے کیونکہ وہ کشتی جس پر ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب سوار ہیں اگر ڈوبے گی تو سب ڈوب جائیں گے کوئی نہ بچے گا۔ مگر اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کی مذہبی وثقافتی انفرادیت کو نہ صرف قائم رکھنا چاہتے تھے بلکہ اُسے اجاگر کرنے کے لیئے بے چین رہتے تھے اس لئے بنیادی دینی تعلیم پر انھوں نے نہ صرف حد سے زیادہ زور دیا بلکہ بمبئی میں اس کے لیئے ایک آل انڈیا کنونشن بھی کیا اور ایک آل انڈیا دینی تعلیمی بورڈ بھی بنایا جس کی شاخیں تمام صوبوں میں قائم کیں۔ مولانا ایک بہت معروف آدمی تھے مگر قوم کو انھوں نے ایک فکر دیدی۔ اور جہاں تک ہو سکا اس کے لئے کوشش اور جدوجہد بھی کی۔

جمعیۃ علماء ہند

مولانا کو جمعیۃ علماء ہند سے بے پناہ محبت تھی بلکہ ہم لوگ کبھی کبھی یہ محسوس کرتے تھے کہ اس میں ان کو غلو کا درجہ حاصل ہے۔ مجھے ایک مرتبہ انھوں نے لکھا کہ میں ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتا ہوں جو میری تو تعریف کرتے ہیں اور جمعیۃ علماء ہند کی مذمت کرتے ہیں۔ میں جمعیۃ کا ایک خادم ہوں اور میں جو کچھ کر سکتا ہوں یا کرتا ہوں وہ تنہا میرا کارنامہ نہیں میرے جملہ رفقاء کی مشترکہ جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ایک کل ہند جماعت بنانا یا بنی ہوئی جماعت کو قائم و برقرار رکھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ تقسیم کے بعد ملک کے اندر ایک ایسا طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو مسلمانوں کی ہر تنظیم کا مخالف تھا۔ جمعیۃ علمائے ہند کے شاندار ماضی کو نظرانداز کر کے وہ طبقہ اس کا بھی دشمن تھا کیونکہ جمعیۃ اب مسلمانوں کی آواز تھی۔ جمعیۃ علماء ہند کو بڑے طوفانوں سے گزرنا پڑا مگر مولانا حفظ الرحمٰن نے اس امانت کو جو انھیں اپنے بزرگوں سے ملی تھی بہت سنبھال کر رکھا۔ اور نہ صرف سنبھال کر رکھا بلکہ بہت ترقی دی۔ جمعیۃ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان کو ایک ایسا قائد ملا تھا جس کا کوئی رقیب نہ تھا اور اگر کبھی اندرونی اختلافات رونما ہوئے جو ہر زندہ جماعت کے لئے لازمی ہیں تو ان کی بات کوئی ٹالنے والا نہ تھا وہ سب کو ایک دھاگے میں پروئے رہتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا ایک بڑا کارنامہ جمعیۃ علماء ہند کو اس مضبوطی استحکام اور نظم کے ساتھ قائم رکھنا تھا۔ شاہ ایران، شاہ افغانستان، جمال عبدالناصر، صدر انڈونیشیا العرض جو بھی مسلم حکمراں یا قائد دنیا کے کسی گوشہ سے آتا تھا اُسے مسلمانوں کا ایک نظام ملتا تھا اور ہندوستان کا مسلمان خواہ وہ جمعیۃ میں ہو یا نہ ہو یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوتا تھا کہ ہم بھی اس ملک میں بستے ہیں اور ہماری بھی آواز ہے۔ اور جب جب اندرون ملک میں ضرورت پڑتی تھی مسلمانوں کی ایک باضابطہ انجمن نمائندگی کے فرائض انجام دینے کے لیئے تھی۔ میں اس موقع کو غنیمت تصور کر کے قومی آواز کے اس اپیل کی تائید کرتا ہوں کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی اس یادگار کو مسلمان مضبوط بنائیں کیونکہ مسلمانوں کا یہ واحد ادارہ ہے جس کا ماضی تابناک اور جس کی حالیہ خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

انجمن ترقی اُردو اور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

مولانا انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کورٹ کے بھی ممبر تھے اور شاذ و نادر ہی کسی خاص مجبوری کی بنا پر ان کے جلسوں میں شرکت ناغہ کرتے تھے۔ مولانا اردو کو ہندو اور مسلمانوں کا مشترکہ سرمایہ تسلیم کرتے تھے اور اس کا کل کام انجمن ترقی اردو کے ذریعے کرنے کے قائل تھے۔ مگر اردو پر ان کے عظیم احسانات ہیں۔ اور شاید ہی ہندوستان میں کوئی دوسرا ایسا شخص ہو جو خدمت اردو میں ان کا ہم پلہ قرار دیا جاسکے۔ مولانا کو اردو سے اس درجہ شغف تھا کہ جب سہ لسانی فارمولے کی آڑ لے کر ریاست اتر پردیش میں اردو کو ختم کرنے کے منصوبے بننے لگے تو انھوں نے امریکہ کے بستر علالت سے جسے اب بستر مرگ ہی کہا جاسکتا ہے وزیر اعلیٰ شری سی۔ بی۔ گپتا کو ایک درد انگیز خط لکھا جس نے بھی اس خط کو پڑھا ہوگا اس کی آنکھ ضرور نم ہو گئی ہوگی۔ مولانا کے اس خط کا عالم گیر اثر ہوا اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کا جواب

دیا اور مولانا کو اطمینان دلایا۔ مولانا کے متوازن اور مدبرانہ مشوروں کے لیے ہر نازک موقع پر تلاش کیے جاتے تھے اور رہبران تحریک اردو کو اپنی رائے پر اسوقت تک بھروسہ نہیں ہوتا تھا جب تک کہ مولانا اس پر صاد نہ کر دیں۔ یہی حال مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا تھا۔

ان تمام مختلف مقامات پر کام کرتے ہوئے مولانا کی شخصیت خاص طور پر اجاگر رہتی تھی۔ میں نے ہر کہ فرد کو ان کا احترام کرتے دیکھا یہ احترام اُن کی فطری ذہانت و فراست اور ان تمام معاملات میں جن کے لئے علوم جدیدہ کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے ان کی وسیع معلومات، ان کی بے پناہ جرات و ہمت، ان کا خلوص۔ ان کا جذبہ قربانی اور عدیم المثال حب الوطنی کی بنا پر تھا۔ وہ ایک جامع و ہمہ گیر ہستی تھے اور بلا وزن کئے اور تولے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالتے تھے ان کے نزدیک اردو اور مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور اس طرح کی دوسری ضروری خدمات ملک و وطن کی خدمات تھیں جن کے متعلق تنگ نظرانہ رویہ ملک کو تباہی و بربادی کی طرف لے جانے والا تھا۔ وہ جس محفل میں بیٹھ جاتے تھے منفرد اور یگانۂ روزگار نظر آتے تھے۔ اور اسی لئے علما اور مغربی تعلیم یافتہ سب کی گردنیں ان کے آگے جھکتی تھیں۔

خصائص ذاتی

مولانا کے خصائص ذاتی کا تذکرہ اسی طرح دشوار ہے جس طرح ان کی عظیم شخصیت اور ان کی خدمات ملکی و ملی کو بیان کرنا مشکل ہے وہ بہت ہی سادہ مزاج اور عوامی آدمی تھے۔ وہ دیکھئے جمعیۃ علماء ہند کے دفتر کے سائبان میں زمین پر ایک فرش بچھا ہے اس پر مولانا بیٹھے ہیں اور شہر اور بیرون شہر کے لوگ یکے بعد دیگرے اپنی حاجتیں لئے چلے آ رہے ہیں۔ نہ کوئی دربان ہے اور نہ کسی سے یہ مطالبہ ہے کہ آپ کون ہیں کس غرض سے آئے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دوست اور دشمن جمعیۃ علمائی و غیر جمعیۃ علمائی کانگریسی و غیر کانگریسی کی کوئی شرط نہیں ہے۔ نہ کبھی تھکتے ہیں اور نہ کبھی منہ بناتے ہیں خندہ پیشانی سے سب کی باتیں سنتے اور سب کو مشورہ و امداد کے لئے آمادہ ہیں کسی کو کسی یونی ورسٹی میں داخلہ چاہیئے کوئی پاسپورٹ مانگ رہا ہے کسی کی متروکہ جائداد کا جھگڑا ہے کسی کو نوکری چاہیئے الغرض تمام متنوع کام جو انسان کو پیش آ سکتے ہیں اس دربار قلندرانہ میں پیش ہو کر انجام کو پہونچتے ہیں کہیں خط لکھ رہے ہیں کہیں ٹیلیفون ہو رہا ہے اور کہیں بنفس نفیس جا رہے ہیں۔ جلسوں میں جاتے تھے تو کوئی امتیازی شکل نہیں اختیار کرتے تھے۔ مسجد میں جاتے تھے تو یہ صورت تھی ؎

در مسجد اگر آدمی چناں رود کہ ترا
در پیش نخواہند و امامت نہ کنند

تواضع اور مہمان نوازی حد درجہ تھی، جب صدر جمہوریہ سے اردو کا وفد مل رہا تھا تو میں بھی اس کا ایک رکن تھا مولانا نے مجھ سے کہا کہ تم میرے ہی پاس ٹھہرنا اگرچہ نئی دہلی دور ہے مگر میں اس کو قریب کر دوں گا۔ ایک مرتبہ اور میں ان کا مہمان ہوا۔ شام کو میں حافظ محمد ابراہیم صاحب کے ہاں گیا اور رات میں رہ گیا۔ صبح میں ناشتہ کر رہا تھا کہ وہ آ گئے مجھے دیکھ کر فرمایا غریب کے گھر رہا نہیں جاتا منسٹر کے ہاں چلے آئے میں نے حافظ صاحب کی کوٹھی کے لان کی طرف اشارہ کیا اور عرض کیا کہ جمعیۃ کے دفتر میں گرمی بہت تھی فرمانے لگے کہ ہاں میں جمعیۃ کے دفتر کی توسیع کر رہا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی یہ تکلیف جلد دور ہو جائے گی۔ کاش کہ قوم مولانا کی اس تمنا کو پوری کرنے کی جانب جلد توجہ کرے۔ مولانا میں سب سے زیادہ نمایاں اور تعجب خیز چیز ان کا کلچر تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک بڑے کلچرڈ آدمی تھے۔ کلچرڈ آدمی کی تعریف پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ کی ہے کہ جو دوسروں کے جذبات و خیالات کو سمجھ سکے۔ ان کے برتاؤ میں ہر شخص کے ساتھ شائستگی ستھرا پن اور ملائمت کے وہ عنصر غالب رہتے تھے جو کمیاب ہیں وہ کسی سے نفرت کرنا اور کسی سے خواہ وہ کوئی ہو بہرے پن کا برتاؤ کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ یہ وہ بات ہے جو مغربی تعلیم والے اپنے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں مگر وہ سب میں ممتاز تھے۔ اسی طرح معاملہ فہمی اور عملی کارروائی میں بھی وہ سب سے آگے تھے جب اردو کا وفد صدر جمہوریہ سے ملنے والا تھا تو وہاں کے آداب و قوانین مقررہ کے ماتحت باریابی حاصل کرنے کا ایک سوال تھا مولانا نے فوراً کہا کہ میں یہ سب کام کر لوں گا۔ چنانچہ ہم لوگوں کو کچھ خبر نہ ہوئی مولینا نے موٹریں اکٹھا کر دیں اور نہایت تیزی سے یہ بتلاتے گئے کہ کون کہاں بیٹھے اور سب سے آگے اپنی موٹر کر دی اور سب سیدھے صدر جمہوریہ تک پہونچ گئے اسی طرح

وہاں سے واپسی کے بعد حیات اللہ انصاری کو یہ پریشانی ہوئی کہ کسی طرح فوراً ایک پریس کانفرنس ہو جائے جس کو وفد کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خطاب کر دیں، مولانا نے نہایت اطمینان سے کہا کہ میں اس کا انتظام کر دوں گا۔ پھر ہر چھوٹے سے چھوٹا انتظام ہو گیا اور مولانا کی شخصیت کے اثر سے بہت سے اخبارات کے نمائندے آگئے۔ مسلم لیگ سے آویزش کے دوران میں کچھ لوگوں نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک علیحدہ پارٹی بنانے کا ارادہ کیا لکھنؤ میں جمعیۃ علما کا اجلاس ہو رہا تھا اس وقت جمعیۃ علما الکشن لڑتی تھی اور امیدوار کھڑا کرتی تھی نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت بنتی تو جمعیۃ کی رقیب ہوتی مگر جب مولانا سے یہ بات کہی گئی تو انھوں نے فوراً منظور کر لیا اور گنگا پرشاد میموریل ہال میں جلسہ کرا دیا خرچ کل جمعیۃ سے مولانا نے دلایا اور خود شرکت بھی کی مگر انتظام سب نیشنلسٹ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔ ایسی فراخ دلی اور کشادہ قلبی کی مثالیں کہاں ملتی ہیں؟ اور جب یہ معلوم ہوگا کہ کن حالات میں انھوں نے جمعیۃ کے صرفہ سے یہ جلسہ کرایا تھا اور زیادہ حیرت ہوگی ایک نیشنلسٹ مسلمان صاحب نے کہا کہ ہم کانگرس میں جاتے ہیں تو وہاں لوہے کی دیوار کے اندر گھس نہیں پاتے ہیں آپ کے ہاں آتے ہیں تو آپ ہمہ وقت مذہب کی بات کرتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنی الگ جماعت چاہتے ہیں مولانا نے جلسہ کو منظور کرتے ہوئے جو جواب دیا تھا وہ اب تک میرے دل پر نقش ہے، فرمایا کہ آپ جلسہ ضرور کریں۔ ہال کا کرایہ ہم دیں گے۔ فرش فروش وغیرہ ٹھیک کرا دیں گے، اور آپ کی ہر مدد کر دیں گے مگر جلسہ کی باگ ڈور آپ اپنے ہاتھ میں رکھیں رہی مذہب والی بات تو وہ تو ہم آپ کو ضرور سنائیں گے آپ یہاں نہیں سنیں گے تو گھر پر آپ کو سنائیں گے آپ ہمیں دھتکار دیں گے تو ہم چلے آئیں گے، مگر پھر جائیں گے غرضیکہ ہم آپ سے کہتے رہیں گے اور تھکیں گے نہیں۔ یہ تھا مولانا حفظ الرحمٰن کا ضمیر

سارا ہندوستان بلاقید مذہب و ملت ان کا شیدائی تھا۔ اور تمام ہندوستان کی وہ مدد کرتے تھے فیس کی معافی سے لے کر بڑی بڑی نوکریاں دلوانا اور ویزا حاصل کرنا وغیرہ ہزاروں کام روزمرہ لوگ ان کے پاس لے کر آتے تھے اور ان کا ایک پورا محکمہ ان خدمات کے لئے وقف تھا۔ مولانا کے چہرے پر کسی کی امداد کرنے میں کبھی تھکن محسوس نہیں کی۔ بلکہ انتہائی ذوق و شوق سے وہ ہر حاجت مند کی حاجت روائی کرتے تھے۔ اس میں مخالف و موافق کی بھی کوئی قید نہ تھی۔

مولانا جمعیۃ علمائے ہند کے سنوارنے والوں میں ہیں۔ ان کو جمعیۃ سے بے انتہا شغف تھا اور وہ جمعیۃ کو مسلمانان ہند کی خدمت کرنے کے قابل بنانے میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے اور جمعیۃ نے اس دور بلا میں جو شاندار کام انجام دئے ہیں ان میں مولانا کی شخصیت ان کی خدمت اور لگن کا بڑا ہاتھ تھا۔

ہر نازک موقع پر وہ شیر کی طرح گرجتے تھے مگر اس گرج میں نفرت اور علاحدگی پسندی نے کبھی کارفرمائی نہیں کی۔ افسوس اب یہ گرج سنائی نہیں دے گی۔ اب پارلیمنٹ کا ایوان ہو یا کانگرس کا اجلاس، مسلمانوں کا پلیٹ فارم ہو یا مشترکہ جلسہ، حق گوئی کی وہ بے باک آواز کون اٹھائے گا۔ اب کون امریکہ کے بستر مرگ سے "اردو" کے لئے شری سی۔ بی۔ گپتا کو چھٹی لکھے گا جس کا جواب پنڈت جواہر لال نہرو دیں گے۔

اب ہندوستان کے ان چار کروڑ مسلمانوں کی رہنمائی اور نگہبانی کے فرائض کون انجام دے گا۔ افسوس! کون جانشین بھی نہیں چھوڑا۔ آفتاب غروب ہو گیا اور تاریکی پھیل گئی ہے۔ اس اندھیرے میں اجالا کون کرے گا۔

آج مولانا حفظ الرحمٰن کا ماتم ایک عصر کا ماتم ہے، ایک ایسے لیڈر کا ماتم ہے جو صحیح الخیالی، بے تعصبی، خوش فکری اور اسلام نوازی و ملک دوستی کے امتزاج کے لئے یقین محکم و عمل پیہم کا نمونہ تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن نہ اپنی تعریف سے خوش ہوتے تھے اور نہ اپنی مذمت سے ناراض۔ وہ کل خدمات فرض سمجھ کر تمام عمر انجام دیتے رہے نہ ستائش کی پرواہ کی اور نہ کبھی صلے کی تمنا کی۔ وہ انبیاء کرام کے اس مسلک پر تھے کہ ان اجری الا علی رب العالمین (میں اللہ کے سوا اور کسی سے کوئی اجر نہیں مانگتا) وہ ایک عظیم انسان ایک عظیم محب وطن اور ایک عظیم کارکن تھے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ اللہ کے فرمانبردار بندے تھے جو کچھ کرتے تھے اللہ کی رضا جوئی کے لئے کرتے تھے انھوں نے دنیا کو دکھلا دیا کہ ایک سچے مسلمان کا کردار کیسا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ان کی روح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے مدارج بلند کرے۔ آمین

جناب ضیاء الحسن فاروقی

اک شمع رہ گئی تھی ---- ایک تقریر

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دِن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

۲ر اگست کو نمبر ا کیننگ لین (نئی دہلی) میں نہ معلوم کیوں اُس وقت یہ شعر میری زبان پر بے اختیار آگیا جب ہندوستان کی ایک مقتدر ہستی جس کے ہاتھوں میں اس وقت زمام اختیار ہے اپنے ایک ساتھی اور جنگ آزادی کے بہادر سپاہی کے جنازہ کے سامنے خاموش کھڑے ہوکر عقیدت کے پھول پیش کر رہی تھی، آپ جانتے ہیں کہ اس سے میری مراد کیا ہے اور میں نے کس کی "بے زبانی" کی طرف اشارہ کیا ہے —— اس کی بے زبانی جو گفتار ہی کا غازی نہیں بلکہ کردار کا بھی غازی تھا، اور جس کی شخصیت پر مجاہد ملت کا خطاب اسی طرح زیب دیتا تھا جس طرح مولانا حسین احمد مدنی، اور جناب مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیتوں پر شیخ الاسلام اور امام الہند کا۔

حضرات! مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا انتقال ہوگیا یعنی وہ شمع خاموش ہوگئی جس کی روشنی میں ہمارا درماندہ کارواں اب دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا، وہ انسانی سہارا جاتا رہا جو حالات کی اندھیاریوں میں امید کی کرن بن کر چمکتا تھا، لوگوں کی مصیبتوں کو سن کر تڑپ جانے والا ایک دل تھا جو ٹھہر گیا، آزادی اور بے باکی کی ایک آواز تھی جو ڈوب گئی، فکر و عمل کا ایک آفتاب تھا جو غروب ہوگیا۔

مولانا مرحوم کا جنازہ کیننگ لین سے قوم اپنے کاندھوں پر اٹھا کر فیروز شاہ کوٹلہ کے بڑے میدان میں لائی اور پھر اُسے مہندیوں کے احاطے میں محصور اُس شہر خموشاں میں سپرد خاک کر دیا جہاں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خانوادہ اور سلسلہ کے لوگ ابدی نیند سو رہے ہیں۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

ہزاروں انسانوں کا ایک ہجوم تھا جو ملت کے اِس مجاہد رہنما کو دل کی تمام سوگواریوں کے ساتھ رخصت کرنے آیا تھا، اور اِس ہجوم میں میری نظر تصویر دیکھ رہی تھی کہ مولانا مرحوم کے جنازہ کے ساتھ دو سو سال کی تاریخ بھی تھی جو اُسے نئی دہلی سے مہندیوں کے احاطہ تک رخصت کرنے آئی تھی، یہ اس لئے کہ مولانا اس عہد میں اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھے جو شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات سے شروع ہوتا ہے اور جس کا دامن ان گنت انقلابی سیاسی، تعلیمی اور مذہبی تحریکوں پر پھیلا اور پھیلا ہوا ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن سیوہارہ (ضلع بجنور) میں پائی اور اس کے بعد وہ دنیائے اسلام کی مشہور درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوگئے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا اور اگرچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی انقلابی تحریک ناکام ہو چکی تھی، لیکن دارالعلوم دیوبند کی فضا اس کی گرمی سے معمور تھی، اس فضا کا مولانا کے حساس دل و دماغ پر گہرا اثر پڑا تھا، اور ان میں آزادی اور اس کی برکتوں کا شعور پوری طرح جاگ اٹھا۔ یہاں تک کہ جب سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریکیں شروع ہوئیں تو مولانا عہد شباب کے پورے جوش و خروش کے ساتھ ان میں شامل ہو گئے۔ اور قید و بند کی منزل سے گذرے، قید فرنگ سے آزاد ہوتے تو پہلے انھوں نے دارالعلوم کے نصاب کی تکمیل کی اور پھر وہیں ایک بوریئے پر بیٹھ کر درس دینے لگے، لیکن اس زمانے میں بھی وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر، کانگریس، خلافت اور جمعیۃ العلماء ہند کے تحت مختلف تحریکوں میں حصّہ لیتے رہے، کہا جاتا ہے کہ ان کی عمر کے پندرہ سال درس و تدریس میں، پانچ سال قید فرنگ میں اور باقی حصّہ ملک و ملّت کی خدمت میں گذرا۔

مولانا کی شخصیت کا کمال یہ رہا کہ اِس میں دین و دنیا، مذہب اور عقل، یعنی دوسرے لفظوں میں "جام شریعت" اور "سندان عشق" کا ایک ایسا خوشگوار امتزاج پیدا ہوگیا تھا جو اس زمانہ میں خال خال اشخاص کے یہاں ملتا ہے، انہوں نے ایک طرف علمائے دیوبند کی پُر وقار مجاہدانہ روایات کے ساتھ، گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے دوش بدوش چل کر، آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔ آزادی کے بعد پنڈت نہرو کا ایک بازو بن کر، سوشلزم کی بنیادوں پر نئے ہندوستان کی تشکیل و تعمیر میں لگے ہوئے تھے، سیکولرزم کے حامی تھے اور اس کا جرأت کے ساتھ پرچار کرتے تھے، دوسری طرف وہ جمعیۃ العلماء جیسی مذہبی جماعت

سے ناظم اعلیٰ ہی نہیں بلکہ روح رواں تھے، مکاتب، مدارس اور دینی تعلیم کے
پروگرام کو چلاتے تھے، مسجدوں، خانقاہوں اور قبرستانوں کو واگذار کراتے
تھے اور اُن سے متعلق اوقات کو بچانے میں رات دن مصروف رہتے تھے، ایک
طرف وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے تعلیمی اداروں میں جہاں
دنیوی تعلیم دی جاتی ہے، اپنی شخصیت کا سایہ ڈالتے رہتے تھے۔ تو دوسری طرف
دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ایک بہت ہی اہم رکن تھے، اس طرح وہ بیک
وقت مختلف النوع مذہبی وسیاسی، تعلیمی وثقافتی، لسانی، تصنیفی انجمنوں اور اداروں
کے فعّال رکن تھے اور ہر جگہ قائد کی حیثیت رکھتے تھے، آزادی سے پہلے بھی اور
آزادی کے بعد خاص طور سے ملک وملّت کی تاریخ پر ان کی شخصیت ان کی انتھک
جدوجہد، اُن کی ذہانت، ان کی معاملہ فہمی اور ان کی گہری اور اثر آفریں انسانیت
کی چھاپ ہے، اس تاریخ کا مطالعہ ان کی شخصیت کے مطالعہ کے بغیر نامکمل
رہے گا۔

مولانا کی شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت اُن کی جرأت اور اُنکی
بے خوفی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے تھے، ہم سب
مذہبی انسان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم خدا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتے، لیکن حق یہ ہے
کہ ہم خدا کے سوا سب سے ڈرتے ہیں، اُس زمانہ میں جب کہ بڑے بڑے قومی رہنما
گوشہ نشین ہو گئے تھے اور اپنی کمزوریوں پر حالات کی نامساعدت یا مصلحت کا پردہ
ڈال کر مطمئن ہو بیٹھے تھے، ایک آواز تھی جو ملک کے گوشہ گوشہ میں گونجتی تھی،
ایک عشق تھا جو بے خطر تغیرات وانقلابات کی آگ میں کود پڑا تھا، ۱۹۴۷ء اور
اس کے بعد کے پیچیدہ اور نازک زمانے میں ایک شخص تھا جو بہادری سے کہتا
تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندوستانی ہے، ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب حالات
قابو سے باہر ہو گئے تھے اور اس کے غیر مسلم ساتھیوں نے اس خیال سے کہ یہ شخص
بھی فسادات کی نذر نہ ہو جائے، یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ کہیں پناہ گزیں ہو کر بیٹھ جائے
تو معلوم ہے کہ اس شخص نے کیا جواب دیا تھا، اس نے کہا تھا کہ جس وطن کی
آزادی کے لئے میں نے جدوجہد کی تھی، اسی وطن میں آج میں شرنارتھی بن کر رہوں،
یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا، جس زندگی کو میں اس طرح بھاگ کر بچالے جاؤں گا وہ
کس قیمت کی ہوگی۔ آپ لوگ کیا باتیں کرتے ہیں، یہ موقع جان دینے کا ہے یا
جان بچانے کا۔

لیکن مولانا میں محض جرأت وبے خوفی ہی نہیں تھی، آپ کو آج بھی خود
جمعیۃ العلماء میں بہت سے نڈر سپاہی اور رضاکار مل جائیں گے۔ مولانا کی یہ
خصوصیت تھی کہ وہ جرأت کے ساتھ ساتھ ہوش وسلیقہ بھی رکھتے تھے،
بات کتنی ہی سچی ہو اور کتنی ہی بے باکی سے کیوں نہ کہی جائے، اگر کہنے کا سلیقہ
نہیں تو بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے، مولانا کو بات کہنے کا سلیقہ تھا اور یہی وجہ
ہے کہ جب وہ کوئی بات کہتے تھے تو وہ سُنی جاتی تھی اور اس کا اثر ہوتا تھا۔
مولانا ایک بڑے خطیب تھے اور ان کی خطابت میں بلا کی صلابت تھی۔
اس صلابت اور اس کی سحر آفرینی کا سرچشمہ ان کی حق پرستی اور قوت ایمانی
تھی۔ وہ وہی بات کہتے تھے جسے وہ حق سمجھتے تھے اور جس کی سچائی پر اُن کا
کا ضمیر مطمئن ہوتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ کوئی بات اپنے خاص
اسلوب میں، اپنی پوری شان خطابت سے کہتے تھے تو سننے والوں کے
ذہن کی گرہیں کھل جاتی تھیں، کتنے دل ہوتے تھے جو تڑپ اٹھتے تھے۔
اور کتنے ضمیر ہوتے تھے جو بیدار ہو جاتے تھے۔

ابھی بہت دن نہیں ہوتے اور وہ معرکہ ہم سب کو یاد ہے جو اس برصغیر میں
مسلم لیگ کے دوقومی نظریے اور مطالبۂ پاکستان کے سلسلہ میں گرم ہوا تھا، آپ
جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو لفظ اسلام سے کتنا گہرا جذباتی تعلق ہے، یہ نظریہ اور یہ
مطالبہ اس طرح پیش کیا گیا تھا کہ گویا اس وقت سارا اسلام یہی تھا۔ مولانا نے
اپنے بزرگوں کی رہنمائی میں یہ چیلنج قبول کیا اور گاؤں گاؤں پھر کر اس کی نفی
کی۔ مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ ایسے لوگوں کو وہ اپنا دشمن سمجھتے تھے اور ان کی
تذلیل واہانت اسلام کی خدمت تصور کرتے تھے، اپنے ہی ہم مذہبوں کے
خلاف اس طرح ڈٹ جانا کوئی آسان کام نہیں، بڑا مجاہدہ ہے یہ، ایمان کی
بڑی آزمائش ہے اس میں، مولانا ہندوستان کی تقسیم کو تو نہیں روک سکے۔
لیکن انہوں نے حق شناسی اور بے باکی کی ایک مثال قائم کر دی، تقسیم کے
بعد جو صورت حال سامنے آئی اس نے دوقومی نظریے کا کھوکھلا پن ثابت کر دیا
جس چیز کو مسلمان عین ایمان سمجھ بیٹھے تھے محسوس ہوا کہ وہ باطل تھی، جنہیں وہ
اپنی کشتی کا ناخدا سمجھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ انہیں منجدھار میں چھوڑ کر دوسرے
کنارے پر پہنچ گئے، جس زمین پر انہوں نے اپنے خوابوں کے محل تعمیر کئے تھے
وہ زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہوئی، یہ صورت حال ایسی تھی جس نے مسلمانوں کو
کہیں کا نہیں رکھا۔ کروڑوں انسانوں کے اس ملک میں اُن کی حالت اُن جلی
ہوئی لکڑیوں کی مانند ہو گئی جنہیں قافلے صحرا میں جلا کر چھوڑ جاتے ہیں، نتیجہ
ہوا وہی جو ہونا تھا، ان کا روحانی اضطراب اور ذہنی انتشار انتہا کو پہنچ
گیا اور بے اعتمادی اور خوف کی وہ فضا پیدا ہو گئی جس کی مثال مسلمانان ہند
کی تاریخ میں، ۱۸۵۷ء کے بعد نہیں ملتی، ایسے نازک وقت میں حفظ الرحمٰن
صاحب مسلمانوں کی کشتی کے نگہبان بن گئے۔ مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں بیٹھ

کر، ملک کے کونے کونے میں جاکر، پارلیمنٹ میں، غرض ہر جگہ پہنچ کر ایسے ایسے حوصلہ بخش بیانات دیئے اور ایسی ایسی ولولہ انگیز تقریریں کیں کہ مسلمانوں میں زندہ رہنے کا حوصلہ ایک بار پھر پیدا ہوگیا۔

مولانا کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور قنوطیت اور احساس کمتری کے سخت دشمن تھے، عثمان فارقلیط صاحب نے صحیح کہا ہے کہ مولانا کا ایمان تھا کہ اسلام اور عزت نفس لازم ملزوم ہیں کسی امت کا تباہ ہونا اتنا افسوسناک نہیں جتنا کہ اس کا احساس کمتری میں مبتلا ہونا، عزت نفس کی موت احساس کمتری کی زندگی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

حضرت مولانا کو احساس کمتری کے نام سے چڑ تھی، آپ جہاں جاتے اس خطرناک جذبہ کی سختی کے ساتھ مذمت کرتے، مرکزی دفتر جمعیۃ العلماء میں لوگوں کا ہجوم رہتا اور آپ برابر گفتگو کرتے رہتے اور انداز بیان ایسا اختیار کرتے گویا احساس کمتری کو چیلنج کر رہے ہوں، اگر ایڈیٹر الجمعیۃ کے قلم سے کسی اداریہ میں احساس کمتری کی جھلک نظر آجاتی تو آپ اس پر سخت تنبیہ کرتے اور فرماتے کہ ہماری زندگی تو اس جذبہ کے خلاف جہاد کرنے میں گذری ہے، اگر جمعیۃ العلماء کا ترجمان بھی یہ جذبہ پیدا کرنے لگے تو مسلمانوں کو اس دلدل سے نکالنے کے لئے کون آئے گا اور پوری امت کا انجام کیا ہوگا

مولانا نے یہ وطیرہ کبھی نہیں اختیار کیا کہ حکومت وقت کی خوشنودی کے لئے اور اپنی سیکولرزم کے دکھانے کے لئے یہ کہیں کہ یہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو مشکلات کا سامنا نہیں ہے اور ان کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ انھوں نے کھلے بندوں بار بار اس بات کو کہا کہ مسلمانوں کے سامنے بڑی مشکلات ہیں، پچھلے سال کے مسلم کنونشن میں انھوں نے مسلمان نمائندوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی شکایات کا ایک دفتر تیار کیا۔ مسلم کنونشن جن حالات میں ہوا وہ ہم کو معلوم ہے، کس طرح مختلف حلقوں سے اس کے انعقاد کی مخالفت ہوئی، طنز و تشنیع کا ایک محاذ تھا جو مختلف جماعتوں نے اس کے خلاف قائم کر لیا تھا اور غالباً حکومت بھی اس کو مناسب نہیں سمجھتی تھی، لیکن مولانا نے کسی کی پرواہ نہیں کی، کنونشن ہوا اور جس مقصد کے لئے منعقد ہوا تھا وہ مقصد مولانا نے پورا کر کے دکھایا۔ مولانا مسلمانوں کی مشکلات بیان کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس بات کو بڑے زور طریقے سے کہتے تھے کہ ان مشکلات کو ہم ہی حل کر سکتے ہیں، کوئی دوسرا ملک یا دوسری جماعت انہیں نہیں حل کر سکتی، ہاں دوسرے ہماری پریشانیوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ جب وہ یہ کہتے تھے تو بلاشبہ ان کے سامنے پاکستان کا رویہ ہوتا تھا۔ اس طرح مولانا نے بے جا تملق کی فضا کو صاف کیا اور ان کی حق پرستی نے زمانہ ساز اور وقت کے بھوکے رہنماؤں کو رسوا کیا۔ انہوں نے حکومت پر سخت سے سخت تنقید کی اور اس طرح مسلمانوں اور باہر والوں پر واضح کیا کہ ہندوستان میں جمہوریت اور اظہار خیال کی آزادی ہے۔ مولانا ہندوستان کی جمہوریت اور سیکولرزم کی آبرو بن گئے تھے۔

مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی یہ خصوصیت نئی تعلیم والوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ اب تک اس قوم کی کوئی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے تو انہیں لوگوں نے دی ہے جنہوں نے مکتبوں اور مدرسوں میں چٹائیوں پر بیٹھ کر تحصیل علم کیا تھا۔ مولانا ایک غریب اور گمنام خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ تعلیم بھی انہوں نے پرانے طرز کی پائی۔ لیکن کام وہ کر گئے جو کالج اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والوں سے نہ ہو سکا۔ کیا اسے ہم مکتب کی کرامت کہہ سکتے ہیں؟ بلاشبہ یہ فیضان نظر تھا۔

حضرت مجاہد ملت صرف مسلمانوں ہی کے لیڈر نہیں تھے، درحقیقت وہ ملک کے ایک بہت ہی بڑے رہنما تھے۔ وہ قومی مسائل میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے پاس غیر مسلم حضرات بھی اپنے مسائل لے کر آتے تھے اور خواہ وہ مسائل حل ہوں یا نہ ہوں، مطمئن ہو کر جاتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے مسائل کو خاص طور سے پیش کرتے تھے مگر محض اس خیال سے نہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ بلکہ اس یقین کے ساتھ کہ مسلمانوں کے حل میں ملک اور قوم کی نیک نامی ہے، جمہوریت کی کامیابی ہے۔ سیکولرزم کی جیت ہے۔ یقیناً وہ ایک سچے محب وطن تھے۔

مولانا کی طبیعت میں فقیروں کی سی سادگی اور بوریہ نشین بزرگوں جیسا انکسار اور وقار تھا۔ وہ ایک ایسے درویش تھے جس کی خانقاہ میں کوئی دربان نہیں ہوتا۔ دہلی میں جمعیۃ کا دفتر اس درویش کی خانقاہ تھی۔ جس کے دروازے موافق اور مخالف، امیر و غریب، مسلم و غیر مسلم، مقیم اور مسافر سب پر ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ لوگ دور دور سے آتے ایک گوشہ میں اپنا سامان رکھتے اور پوچھتے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کہاں ہیں؟ مولانا موجود ہوتے تو سلام کر کے ان کے پاس بیٹھ جاتے، بس اپنی بات کہنے اور اگر جی چاہے تو اس خانقاہ میں قیام کرنے کے لئے اتنا کافی تھا، مولانا موجود نہ ہوتے تو لوگ کئی کئی دن ان کا انتظار کرتے، مولانا ہر طرح کے لوگوں سے ایک ہی طرح ملتے اور سب کے مسائل کو کمال توجہ سے سنتے اور ان کے حل کی تدبیریں سوچتے اور بتاتے اور جتنا ہو سکتا اتنا کرنے کے لئے خوشی سے تیار رہتے ——— مولانا

نے اپنی امنگوں کو قوم کی امنگوں سے، اپنی ضرورتوں کو قوم کی ضرورتوں سے کچھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ ان کی انفرادی زندگی جماعتی زندگی اور جماعتی زندگی ان کی انفرادی زندگی بن گئی تھی درد دلیش صفت عوامی رہنما کی یہی شان ہوتی ہے اور یہی شان باقی و قائم رہتی ہے۔

آج مولانا ہم میں نہیں رہے، لیکن وہی دار العلوم دیوبند ہے، وہی جامعہ ملیہ ہے، وہی مسلم یونیورسٹی ہے، وہی ندوۃ العلماء ہے، وہی زمین اور وہی آسمان ہے، آفتاب اسی طرح چمکے گا اور چاند اپنی چاندنی سے فضا کو اسی طرح منور کرے گا ــــــ دیکھنا یہ ہے کہ اب اس آب و گل سے پھر کسی حفظ الرحمٰن کی تخلیق ہوتی ہے یا نہیں۔۔!

جناب محمد ضیاء الحق انصاری۔ ایم۔ اے۔ چلتا ضلع بھاگلپور۔

مشعلِ ہدایت

ہندوستان کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں برابر دو طرح کی طاقتیں کارفرما رہیں۔ ایک حکمرانوں (Rulers) کی اور دوسری خدا ترس فقیروں کی۔ حکمرانوں کی حکمرانی زمین۔ پہاڑ و پربت اور سمندروں پر رہی لیکن فقیروں کی حکومت ہندوستانی عوام کے دلوں پر رہی۔

مجاہدِ ملت کی ذات آخر الذکر سلسلہ کی عظیم شخصیت تھی۔ جہاں اس عظیم شخصیت نے قرآن اور حدیث کی تعلیم دیکر شریعتِ محمدی کی نشر و اشاعت کی اور الحاد اور ارتداد کا مقابلہ کیا۔ وہاں آزادئ وطن کے حصول میں کسی حریت پسند رہنماؤں سے پیچھے نہیں رہے۔ آزادی وطن سے کچھ پہلے اور اس کے بعد مجاہدِ ملت کے نمایاں کارنامے ایسے رہے جو یقیناً رہتی دنیا تک سنہری حرفوں میں لکھے جائیں گے۔

آزادی کے پہلے فرقہ پرست عناصر کے دام فرقہ واریت سے نکل کر برٹش سامراج کا مقابلہ کرنا جبکہ ہندوستان کے بہت سے علماء اور قوم پرور مسلمان اسی دام فرقہ واریت میں پھنس چکے تھے اس کے علاوہ تقسیم ہند کے فوراً بعد ہندو مسلم دنگوں سے گھبراتے ہوئے مسلمانوں کو راہِ فرار اختیار کرنے سے روکنا اور ایسے نازک وقت میں ان کے دلوں سے خوف و ہراس دور کرتے ہوئے مساوی شہری ہونے کا سبق دے کر ان کے پائے استقلال کو مضبوط کرنا مسلمانوں کی جائداد اور ان کے مطالبات کو حکومت سے منظور کرانا۔ نیز تقسیم ہند کی تلخیوں کے باوجود دستورِ ہند میں مسلمانوں کو مساوی شہری ہونے کا حق دلانا۔ غرضیکہ یہی کارنامے ہیں جس کی بدولت آج مسلمان ہندوستان میں باعزت زندگی گذار رہے ہیں۔

مجاہدِ ملت اور اُن کی جماعت (جمعیۃ العلمائے ہند) آزادی وطن کے بعد جماعتی طور پر سیاست سے الگ ہو گئی۔ بظاہر یہ ایک عجیب معمّہ ہے۔ جمعیۃ العلمائے ہند کی یہ پالیسی ظاہر بیں حضرات کے لئے یقیناً پریشان کن ہے اس لئے کہ آزادی وطن کے لئے ان لوگوں کا ایثار اور ان کی قربانیاں برابر ہوتی رہیں۔ لیکن جب ان کی جدوجہد بار آور ہوئی تو سیاست سے الگ ہو گئے اور اپنی جماعت کا رجحان از سرِ نو خالص مذہبی تبلیغ اور تعلیم کی طرف مرکوز کر دیا گیا۔ حالانکہ آزادی وطن کے لئے جدوجہد کی طرح حکومت میں بھی جماعتی طور پر اشتراکِ عمل ہونا چاہیئے تھا۔

میں جہاں تک سمجھتا ہوں یہ تبدیلی پالیسی اس لئے ہوئی ہے کہ جمعیۃ العلماء خالص مسلمانوں کی ایک مذہبی جماعت ہے اور حکومت کا دستور غیر مذہبی ہے چونکہ ہندوستان میں مختلف مذاہب ہیں اس لئے دستورِ ہند کا غیر مذہبی ہونا لازمی تھا۔ نیز جمعیۃ العلماء کا اشتراکِ عمل صرف ہندوستان کی آزادی کے لئے تھا وہ حاصل ہو گئی اور اس کی آزادی کے ساتھ ساتھ قریب قریب پورے دنیا کے ممالک اسلامیہ بھی آزاد ہونے لگے۔ اس لئے جمعیۃ العلماء اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر غیر مذہبی جمہوری حکومت سے مسلم عوام کو جو کچھ نقصانات پہنچنے کا امکان تھا اس سے بچانے کے لئے مستقل پروگرام مرتب کرنے میں لگ گئی۔ چنانچہ مجاہدِ ملّت نے مسلم کنونشن و سالانہ اجلاس جمعیۃ کے ذریعہ موجودہ حکومت کو مختلف مسائل کے سلسلہ میں متنبہ کر دیا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم، زبان و دیگر شعبوں کے سلسلہ میں دستورِ ہند کے مطابق مساوات برتے اس کے علاوہ مجاہدِ ملّت نے پورے ہندوستان میں جبری تعلیم ــ Compulsory education کے پیشِ نظر مذہبی تعلیمی بورڈ کے قیام کی ہدایت کر دی تاکہ خالی الذہن مسلم بچوں کے دلوں میں مذہبی تعلیم کا نقش و نگار باقی رہے اور آئندہ آنے والی نسلیں اسلامی امتیاز کو باقی رکھتے ہوئے مشترکہ تعلیم و صنعتی ترقیوں میں برادران وطن کی برابری حاصل کر سکیں۔

مجاہدِ ملت کا یہ آخری کارنامہ اسقدر اہم ہے کہ اگر مسلمان اس پر دل سے عمل پیرا ہوتے تو اُن کا اسلامی شعور اور تہذیب و تمدن اور اخلاق تاقیامت باقی رہینگے اور اگر اس کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا تو یقیناً مسلمان ہندوستان میں نام کے رہ جائیں گے

ڈاکٹر محمود قادری اسعد گورکھپوری

مجاہد ملت

میرے محسن اعظم حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کے اُن مشاہیر میں سے تھے جنھیں بچہ بچہ جانتا ہے، اور اگر نہیں جانتا ہے تو یہ اس کی بدقسمتی ہے، اسے جاننا چاہیئے۔ کیونکہ گزشتہ نصف صدی کی تاریخ میں اُن کی شخصیت ایک ایسا ممتاز مقام رکھتی ہے جسے مشعل راہ کہا جا سکتا ہے۔

انھیں یہ مقام کیسے حاصل ہوا؟ وہ عطیۂ خداوندی تھا۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے وہ زبان عطا فرمائی تھی جو شہد و شکر تھی، حنزل تلخ تھی پھول اور موتی بکھیرنے والی تھی اور دھار دار تیغ چلانے والی تھی، آتش بار تھی، برودت کار تھی۔ اگر ایک طرف وہ اپنی زبان فصاحت بیان سے گلزار کھلا سکتے تھے تو دوسری جانب خزاں کے تند و تیز جھونکے بھی چلا سکتے تھے۔ یہ کمال اس دور میں ہندوستان کے اندر صرف پانچ شخصیتوں کو حاصل تھا۔

۱۔ حضرت سحبان الہند مولانا احمد سعید صاحبؒ

۲۔ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

۳۔ بطل حریت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

۴۔ نواب بہادر یار جنگ، اور پانچویں حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو۔

افسوس! کہ ہم آج ان تمام بزرگوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ میں اس مختصر سے مضمون میں دیگر تمام بزرگوں کے انداز خطابت پر روشنی ڈالنا نہیں چاہتا۔ ان میں سے ہر ایک لاجواب تھا۔ حضرت سحبان الہند ایک ایسے خطیب تھے جن کی ایک تقریر سے سو تقریریں پیدا ہوتی تھیں۔ امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد ایک بڑے پُر دماغ اور فصیح مقرر کا درجہ رکھتے تھے۔ بطل حریت حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سحر بیان تھے۔ نواب بہادر یار جنگ حُسن تقریر سے موتی پرویا کرتے تھے، اور حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان تارہائے رگ جاں سے کھیلتے تھے۔ دیگر تمام بزرگوں کے میدان جُدا جُدا تھے لیکن مولانا حفظ الرحمان صاحب ہر میدان کے ہیرو تھے۔ ناقدین پر میرا یہ حملہ بار گزرے تو وہ ذرا تعصب کی عینک اتار کر دیکھیں کہ مولانا حفظ الرحمان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔ ایک مخصوص حلقہ یا دور سے ان کا تعلق تھا۔ انھوں نے اس نازک دَور میں ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے جس میں بڑے بڑے پہلوان سیاسی اکھاڑہ چھوڑ کر بھاگ چکے تھے اور ان کی زبانوں پر تالے چڑھ گئے تھے، لیکن یہ مرد خدا اپنی زبان کی ننگی تلوار لئے سر بکف میدان میں گھومتا رہا اور کلمات حق ادا کرتا رہا۔ اگر ایک طرف وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے ایک بڑے جرنیل کا درجہ رکھتے تھے تو دوسری جانب وہ ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی رہنما کا۔ اگر ایک طرف وہ کٹر کانگریسی تھے تو دوسری جانب کانگریس کی بدعنوانیوں کی بیخ و بنیاد کو بھی ہلا کر رکھ دیتے تھے۔ الیکشن کا زمانہ آتا تو سارے اختلافات بالائے طاق رکھ دیتے۔ اور کانگریس کی اس طرح حمایت کرتے کہ ان کی ایک تقریر دوسروں کی سیکڑوں تقریروں کی بنیاد بن جاتی۔ اور جہاں الیکشن سے فرصت حاصل کی، کانگریس پر ایک دشمن کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے اور بڑے بڑوں کو خراد پر چڑھا کر رکھ دیتے تھے۔ حکومت کی حمایت پر آتے تو ایسا انداز اختیار کرتے کہ لوگ پانی پانی ہو جائیں، اور جب کسی بات پر بگڑتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ حزب مخالف سے تعلق رکھنے والا یہ کوئی لیڈر ہے جو حکومت کے پرخچے اڑا کر رکھ دے گا۔

"اب کہاں زمانے میں دوسرا جواب ان کا"

مولانا حفظ الرحمان میں بیک وقت کتنی خوبیاں جمع تھیں ان کا اندازہ انھیں کو ہو سکتا ہے جو ان کی، صبح و شام دیکھنے والے تھے۔ احسان فراموشی اور سرپرست ناشناسی ہوگی اگر انھیں اس بات کے لئے خراج تحسین نہ پیش کی جائے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی کشتی کے واحد ناخدا حفظ الرحمان تھے۔ نہ گھر کا خیال نہ کپڑے لتے کی فکر، نہ سونے جاگنے کی پروا، نہ عزت و آبرو کی فکر، چھوٹی سے چھوٹی بات کے لئے سر بکف، تیغ براں حکومت سے بر سر پیکار۔ اور فرصت ملتے ہی پھر حکومت کے سب سے بڑے دوست اور بہی خواہ۔ انسانیت نوازی کا یہ عالم کہ کیا ہندو کیا مسلمان

بے امتیاز ہر شخص کی خدمت کے لئے کمربستہ ہر وقت تیار رہتے۔ نہ صبح دیکھتے تھے نہ شام، نہ جاڑے کی پرواہ نہ گرمی کا خیال۔ جب دیکھو دفتر میں بیٹھے ہیں، جسے دیکھو چلا آرہا ہے۔ جو چاہتا ہے سناتا ہے۔ قوت برداشت اور عفو کا یہ عالم تھا کہ گالیاں دینے والوں کو بھی نظرانداز کر دیتے تھے، اور چشم پوشی سے اس طرح کام لیتے کہ اُسے اس بات کا احساس بھی نہ ہوتا تھا . . . . کہ اس کے رویے سے مولانا باخبر ہیں۔ اکثر مولانا کے جاں نثاروں اور مدّاحوں کو غصہ بھی آتا، لیکن مولانا ڈانٹ پلا کر انھیں چُپ کر دیتے۔ بے تعصب بے لوث جذبۂ خدمت رکھنے والا یہ انسان صبح سے شام تک یہ صعوبت برداشت کرنے والا، اور تلوار کے سایہ میں پرورش پانے والا، اگر واقعی مجاہد ملت نہ تھا تو کیا تھا؟ مسلم کنونشن، حکومت اور مسلمان قوم دونوں پر اس کا سب سے بڑا احسان تھا۔ جان کی بازی لگا کر کنونشن طلب کیا اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر کے چلے گئے۔

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ!
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

تاثرات

از: مولانا مفتی محمد جمیل الرحمٰن سیوہاروی، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند

حفظ رحمٰن یعنی وہ ملت پناہ — آسمانِ ہند کے رخشندہ ماہ
کل وہ صد افسوس رخصت ہوگئے — آہ کیسا دن تھا یہ روزِ سیاہ
قلب اِن کی یاد میں بے چین ہے — ڈھونڈتی ہے ہر طرف ان کو نگاہ
الفراق اے حفظ رحمٰن الفراق — تیری فرقت ہے قیامت آہ آہ
یاد آتی ہیں وہ تیری مجلسیں — تھا مسلسل جن میں شورِ واہ واہ
یاد آتی ہے تری مشغولیت — خدمتِ مخلوق میں شام و پگاہ
یاد آتی ہیں وہ تقریریں تری — اور وہ تحسین اہل جلسہ گاہ
یاد آتی ہے تری فکرِ سلیم — قوم کے حق میں ہوئی جو شمعِ راہ
وہ مجاہد، وہ نثارِ شمعِ حق — جن کی جانبازی کی ہے خلقت گواہ
تھے جو مظلوموں کی ڈھارس کا سبب — بیکسوں کو جن سے ملتی تھی پناہ
کیا کہوں وہ کون تھے، کیا چیز تھے؟ — پیکرِ اخلاص تھے، بے اشتباہ
جسمِ وقف خدمتِ خلقِ خدا — اور دل مصروف ذکرِ لَا اِلٰہ

ہاتفِ غیبی نے فرمایا لکھو
جیل ہے ملت کے وہ پشتِ پناہ

۸۲ ۵۵ ۱۳

مجاہدِ ملّتؒ ـــــ بچپن اور نوعمری

از مولوی مقبول احمد صاحب سیوہاروی

خدا تعالےٰ مولوی حاجی شمس الدین مرحوم پر رحمتوں کے پھول برسائے جنھوں نے اپنے ایک بیٹے (مولوی فخرالدین) کو ڈپٹی کلکٹر بنایا ایک (مولوی بدرالدین) کو وکیل بنایا۔ ایک کو طبیب بنا کر خدمتِ خلق کا منصب بخشا (حکیم مولوی صلاح الدین) اور ایک کو ایسا بنایا جو نہ فقط عالمِ بے بدل تھا، نہ فقط بلند پایہ خطیب تھا، نہ فقط دانش مند مفکر تھا نہ فقط سیاست کی گتھیوں کو سلجھانے والا تھا، نہ فقط عوام کے دلوں کی دھڑکن اور ان کی زبان تھا بلکہ امام طریقت بھی تھا، جس کے سبب اس کی بے پناہ محبّت مخلوق کے دلوں میں بس گئی تھی، اس کی صحت، مخلوق کی صحت تھی، اس کی بیماری مخلوق کی بیماری تھی اور اس کی موت نے مخلوق پر اداسی طاری کر دی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰنؒ کے جذبۂ خدمت نے انھیں اتنے بلند مقام تک پہونچا دیا تھا جہاں ہر ایک کی رسائی مشکل ہی نہیں محال ہے۔

کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ میٹھی بات کہنا، الفاظ سے تسلی دینا، زخمی دل کو مشورہ دینا آسان ہے اور اسے ہر ایک کر سکتا ہے مگر مردانِ طریقت کا کام یہ رہا ہے اور یہی رہے گا کہ مشورہ بھی دیں چارہ سازی بھی کریں، بیمار کو تسلّی بھی دیں اور طبیب تک پہونچا کر علاج بھی کرا دیں — "یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا"۔

سوچئے!! ایک درجہ یہ ہے کہ راستہ بتا دیا جائے۔ حکیم کا گھر مشرق کی سمت ہے، گلی سے گذر کر نیم کا درخت ملے گا۔ پھر جنوب کی طرف جانا، آگے بڑا پھاٹک ہے، متصل سہ دری ہے۔ حکیم صاحب کا وہی مطب ہے۔

ایک درجہ یہ ہے کہ مریض کا ہاتھ پکڑا، چلنے کی سکت نہیں ہے تو سواری میں بٹھایا اور ساتھ لے جا کر حکیم کو دکھایا۔ سفارش کے ساتھ حال بیان کیا اور نسخہ لکھوا کر دوا لا دی۔ یہ "رہ نمائی" نہیں "رہبری" ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن رہ نمائی نہیں کرتے تھے، رہبری کرتے تھے اور ابتدائے عمر سے اُس وقت تک کہ بستر موت پر رہے اُن کا عمل اور کردار رہبری کا تھا۔

ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء

مولانا حفظ الرحمٰن پر نہ جانے کیسے کیسے بلند پایہ لکھنے والوں نے قلم اُٹھایا ہے۔ میں تو صرف اس لئے مجلسِ غم میں شریک ہونے آیا ہوں کہ وہ میرے رفیقِ حال تھے، ہم وطن، ہم محلّہ اور ایک ہی خاندان سے تھے گھر سے گھر ملا ہوا تھا۔ برابر برابر دروازے تھے۔ اُن کی معصوم صورت بھولا بھالا چہرہ اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ شاید جگر مرحوم نے اسی موقع کے لئے کہا تھا۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

گرمی ہے، دوپہر کا وقت ہے۔ مدرسہ فیض عام سے آ رہے ہیں بڑی بڑی کتابیں بغل میں دب رہی ہیں، اس وقت ان کی عمر ۱۰ سال کی تھی، صورت پر مسکینی اور سادگی، سعادت کا یہ انداز کہ جب مدرسہ سے آتے تھے راستہ میں کسی جگہ ٹھہرنا، بات کرنا اور ہنسی مذاق کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ کوئی بڑا بوڑھا ملا تو ادب سے سلام کیا اور گھر میں چلے گئے۔ ظہر کی اذان ہوتے ہی مسجد میں آ جاتے، نماز پڑھتے اور مدرسہ چلے جاتے تھے۔

میں اُن سے سولہ برس بڑا تھا۔ وہ چھوٹے ہونے کے سبب بے جھجک بات نہ کرتے میں بڑا ہونے کے سبب بے تکلف نہ ہوتا اور یہی عمل اُن کا آخر وقت تک رہا۔

خدمتِ خلق کا جذبہ اسی عمر میں موجیں مارنے لگا تھا۔ کسی کو بیمار سنتے تو پرسشِ حال کے لئے جاتے اور دیر تک بیٹھ کر تسلّی دیتے رہتے۔ برادری میں کوئی تقریب ہوتی تو ہاتھ بٹانے چلے جاتے اور پورے انہماک سے ہر کام میں مشورہ اور مدد دیتے۔

کسی کی میت ہوتی تو فوراً گھر پہونچتے اپنے ہاتھ سے غسل دیتے، کفن

پہناتے، جنازہ کے ساتھ جاتے اور میت کے دفن میں شرکت کرتے۔

انکسار اور فروتنی اتنی تھی کہ شفیع الرحمٰن جس کا حال ہی میں درد ناک قتل ہوا ہے، ایک نوربانت سے کسی بات پر لڑ پڑا اور اس کا تھان پھاڑ کر آگیا۔ نوربانت دھام پور کا رہنے والا تھا، سیوہارہ میں دکان تھی۔

اس واقعہ نے نوربانت برادری میں ہیجان پیدا کر دیا، صلح کے لئے جائے تو نوربانت کے ہاں کون جائے۔ اور وہ آئے تو کیوں آئے۔ کچہری عدالت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مولانا خود اس کے پاس گئے، خوشامد کی اور عدالت جانے سے روکا جس سے سیوہارہ کے مسلمانوں میں باہمی تصادم کا خطرہ ٹل گیا۔

یاد رہے کہ شفیع الرحمٰن صاحب مولوی صاحب کا خاندانی عزیز نہ تھا، ہم محلہ اور دوست کا برادر زادہ تھا۔

اُن کا صلح کل مشرب فقط اپنی برادری یا عزیزوں تک محدود نہ تھا بلکہ ہندو مسلمان سکھ عیسائی سب معترف ہیں اور انہیں یاد کرکے روتے ہیں۔ یہ ایسی خصوصیات تھیں جو بظاہر معمولی تھیں مگر صاحب نظر کے لئے نشان دہی کرتی تھیں کہ یہ شخص آگے چل کر کیا ہونے والا ہے۔ سچ کہا ہے سعدی نے

بالائے سرش ز ہوشمندی ... می تافت ستارہ بلندی

محلہ میں میلاد شریف کی محفلیں ہوتیں۔ زیادہ اجتماع بھی نہ ہوتا مگر مولانا آتے اور اپنے نقطۂ نظر کی مطابق مختصر تقریر کرکے بغیر مٹھائی لئے چلے جاتے۔

آپ جانتے ہیں کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں انسان کی کیفیات کیا ہوتی ہیں۔ رنگین خوابیں اور رنگین تصورات ہوتے ہیں۔ مجلس آرائیاں اور فلک شگاف نعرے ہوتے ہیں۔ مگر اس مرد مجاہد کا شاندار نظارہ بھی دیکھ لیجئے۔ سہسپور سیوہارہ کے ایک اسٹیشن بعد آتا ہے، اسی سہسپور کے اسٹیشن پر ایکسپریس کا ایک خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ حادثہ ایسا تھا کہ آس پاس کے دیہات والے بھی دوڑ پڑے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن خدا اُن کی قبر کو نور سے بھرے بے قرار ہوکر سہسپور پہونچے حادثہ کا نظارہ اتنا ہولناک تھا کہ دیکھ کر رو پڑے۔ پھر جس مستعدی اور ان تھک محنت سے، زخمیوں، ضرب رسیدہ مرد، عورت بچوں کی خبر گیری کی، اپنی کمر پر لاد لاد کر انھیں ہسپتال پہونچایا اور ملبہ سے نکالا، وہ نہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے نہ تحریر میں آسکتا ہے۔

جن لوگوں نے ریلوے حادثات دیکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ زخمیوں کی کراہٹیں ملبہ میں دبے ہوؤں کی چیخیں کتنی دلخراش ہوتی ہیں، مگر مولانا پر نہ گھبراہٹ تھی نہ خوف تھا، نہ زخمیوں کے خون سے لتھڑے ہوئے جسم سے نفرت اور گھن تھی بس مسلسل مدد تھی اور یہ سُن کر آپ تعجب کریں گے کہ پورے ایک دن اور ایک رات بھوکے پیاسے کام کرتے رہے تھے۔ اللہ اللہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

اس زمانہ میں مولانا عبدالغفور صاحب، مدرسہ فیض عام کے صدر مدرس تھے، تقریر میں خطابت نہ تھی اصلاح و موعظت زیادہ ہوتی تھی، مولانا حفظ الرحمٰن نے ان ہی کی شاگردی سے ترقی کی اور دورۂ حدیث کے لئے دیوبند چلے گئے۔

اس وقت دیوبند میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ مولانا حبیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم حافظ محمد احمد صاحب رحمہم اللہ جیسے فاضل اور یگانہ موجود تھے اور مولانا حفظ الرحمٰن کے زمانۂ تعلیم میں یہ سب حضرات سیوہارہ آتے رہے اور مولانا کے مہمان رہے۔

اسی زمانہ کی بات ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن نے ایک خواب دیکھا، انھوں نے دیکھا کہ روشن چاند آسمان سے ٹوٹ کر گرا ہے اور اُن کے گریبان میں داخل ہوگیا ہے اور پھر کرتہ کی آستین سے نکل کر آسمان پر چڑھتا چلا گیا ہے۔ ایسا یاد پڑتا ہے کہ جس وقت یہ خواب مولانا نے بیان کیا تھا مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی بھی موجود تھے۔

راقم الحروف نے کہا تھا کہ آپ شہرت کے آسمان پر چمکیں گے اور آپ کا سینہ انوار کا مرکز بنے گا۔

چند ہی دن بعد تحریک خلافت کا ظہور ہوا، مولانا بھلا اس موقعہ پر کیسے خاموش رہتے، تقریریں شروع ہوگئیں، جلسے ہونے لگے، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مدنی مالٹا سے تشریف لائے تو تحریک پورے شباب پر تھی اور سیوہارہ میں وہ تاریخی جلسہ ہوا جس کی یاد دلوں میں اب تک باقی ہے۔

اس جلسہ کا نظم ونسق عزت مآب حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر برقیات کے ہاتھ میں تھا اور وہی مختار کل تھے، جلسہ کے صدر مولانا مدنی تھے اور روح رواں مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ یہ جلسہ گویا اعلان جہاد تھا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن کی دلیری اور حق گوئی کے جوہر چمکے۔ اور راقم الحروف نے محسوس

گیا کہ اب وہ سولہ برس مجھ سے بڑے ہوگئے ہیں اور اُن کی قیادت میں ہر جلسہ میں شرکت ہونے لگی ۔ پھر سیوہارہ کا وہ مقدمہ شروع ہوا جس میں عوام وخواص جوق جوق تحریک میں شریک ہوگئے ۔

طے یہ ہوا تھا کہ مقدموں میں صفائی نہ دی جائے، اس لئے نہ کوئی صفائی تھی نہ وکیل کھڑا کیا گیا ۔ راقم الحروف نے بیان میں جو شعر پڑھا تھا وہ یہ تھا ۔

وہی قاتل وہی مخبر ہے وہی منصف ہے
اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر

اور اسی پر میرے بھائی عبداللطیف بجنوری نے جو سال گذشتہ تک پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے پولیس افسری سے استعفیٰ دیکر تحریک آزادی میں شرکت کی تھی ۔

اس مقدمہ میں مولانا بشیر احمد بھٹا مرحوم، راقم الحروف، برادر معظم مولوی حکیم ابرار احمد صدیقی مقیم دہلی، حکیم عبدالکریم مرحوم، میر مظاہر حسین مرحوم، مولوی رضی الحسنین اور دوسرے لوگ جن کے نام یاد نہیں ہیں غالباً پندرہ سولہ آدمی تھے ۔

مولانا بشیر احمد مرحوم کی یہ تجویز ہوئی کہ جب بھی مقدمہ کی پیشی ہو، ہماری جماعت قصبات اور گاؤں سے گذرتی اور تقریریں کرتی بجنور تک پہونچے اس تجویز پر عمل کرنے سے پورے ضلع میں ہیجان پیدا ہوگیا اور ہزاروں آدمی تحریک آزادی میں شامل ہوگئے

تقریروں میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا بشیر احمد بھٹا مرحوم کی قائدانہ حیثیت تھی اور راقم الحروف ان کی اقتدا کرتا تھا، آخر یہ گروپ بجنور جیل میں داخل ہوگیا ۔ بجنور کے سپرنٹنڈنٹ زبیڈ احمد صاحب تھے آسام کے رہنے والے سیاہ فام، فربہ جسم، چہرہ پر چیچک کے داغ، خوب پھیلی اور ناف تک لٹکی داڑھی، مزاج کے سخت تھے، ہفتہ بھر بھی نہ گذرا تھا کہ ہماری جماعت سے ٹکر ہوگئی ۔

گرمیوں کا زمانہ تھا، قیدیوں نے ٹکٹ کے پنکھے سرکنڈوں میں پھنسا کر ہمیں دیدیئے ۔ یہ خبر کسی نے زبیڈ احمد صاحب کو پہونچا دی ۔ صبح کو معائنہ کے لئے آئے تو پنکھوں کو دیکھ کر بولے "تم راجا کا لڑکا" یہ جملہ تین دفعہ کہا، سامنا مولانا بشیر احمد مرحوم کا تھا ۔ مولوی صاحب مرحوم غصہ میں لال ہوگئے، قریب تھا کہ جھپٹ پڑیں، میں نے اور مولانا حفظ الرحمٰن نے اشارہ کیا اور خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے ۔ اور جواب میں ہم نے کھانے کی ہڑتال کردی اور ہمارے اس اقدام نے جیل کے قیدیوں میں بغاوت کی روح پھونک دی ۔

ہمارے وارڈ کے قریب پنڈت دیورتن شرما جنرل سکریٹری آل انڈیا ہندو مہاسبھا پہلے سے جیل یاترا کے لئے آچکے تھے ۔ ہم سے اتنے قریب تھے کہ جنگلے کے دروازے سے جھانک کر باتیں کرلیتے تھے، انھوں نے بھی کھانا چھوڑ دیا اور ہم سے کہا جب تک زبیڈ احمد معافی نہ مانگے ہرگز کھانا نہ کھاؤ ۔

اب ایک دلچسپ قصہ سنئے ۔ زبیڈ احمد صاحب کی بیوی دلّی کے خاندان کی ایک شریف خاتون تھیں ۔ زبیڈ احمد صاحب اُن سے بہت متاثر تھے ۔ انھوں نے جب سنا کہ خلافت کے مولویوں نے کھانا چھوڑ دیا ہے تو خود بھی کھانا چھوڑ دیا ۔

ہماری بھوک کا کتنا اثر ہوا یہ تو ہم جانتے نہیں مگر بیگم صاحبہ کا حربہ اتنا کارگر ہوا کہ زبیڈ احمد صاحب کے حواس جاتے رہے ۔ بیگم صاحبہ نے کہا جب تک مولویوں سے معافی نہ مانگو گے میں ہرگز کھانا نہ کھاؤں گی اور کئی قسم کے کھانے پکا کر شوہر کو دیئے کہ ابھی جاؤ، میرا سلام کہو اور معافی مانگ کر کھانا کھلاؤ ۔

زبیڈ احمد صاحب بیوی کی خفگی کی تاب نہ لا سکے اور جیل میں آکر ہم سب سے کھلے لفظوں میں معافی مانگی اور ہم نے پنڈت شرما کے کہنے پر کھانا کھا لیا

ایسی حالت میں بجنور جیل میں ہمیں کیسے رکھا جاسکتا تھا، بریلی بھیجدیا گیا ۔ ڈسٹرکٹ جیل میں ہم ایسے وقت پہونچے کہ صبح ہونے میں دو گھنٹے باقی تھے اور جب تک سپرنٹنڈنٹ نہ آجاتے ہمیں پھاٹک سے جیل میں داخل نہ کیا جاسکتا تھا ۔

صبح کے وقت سپرنٹنڈنٹ آیا ۔ یہ آئرلینڈ کا شریف انگریز تھا ہم لوگ کھادی کے سبز چغے پہنے ہوئے تھے سینہ پر بٹن لگے ہوئے تھے جن پر خلافت لکھا ہوا تھا ۔ بٹن دیکھ کر بولا اچھا خلافت خلافت خلافت اور تعظیماً ٹوپی اُتارلی ۔ اندر لے کر چلا تو ہنستا ہوا، حکم دیا کہ ان لوگوں کے لئے دیوانی کا جیل صاف کرایا جائے ۔

دیوانی کا جیل اچھا خاصا مکان تھا ۔ پاخانہ بھی الگ تھا دروازہ بھی تھا جسے بند کرادیا جائے تو جیل سے الگ ہوجاتا تھا ۔ بجنور جیل میں ہم میں سے ہر ایک کو دو کٹورے لوہے کی چادر کے دیئے گئے تھے ۔ ایک کھانے کے لئے اور ایک پانی پینے کے لئے ۔ مگر بریلی کے سپرنٹنڈنٹ نے حکم دیا کہ مٹکے اور گھڑے منگوا کر پانی بھروا دیا جائے اور روز کے روز تازہ

پانی بھرا جایا کرے۔ مستقل ایک قیدی جو حافظ قرآن تھے انھیں ہدایت کی گئی کہ ہمارے پاس رہیں کھانا لائیں، پانی بھریں اور جو کام ہو انجام دیں رمضان شروع ہوگیا تھا، سحری کے لئے سبزی دال اور چاول اور شام کے کھانے پر فقط دال اور روٹی آتی تھی۔

عید آئی تو ہمارے کہنے سپرنٹنڈنٹ نے جیل کی چار دیواری میں نماز عید کا بندوبست کرایا اور تمام مسلمان قیدیوں کو اجازت دیدی کہ جو کوئی چاہے ہمارے ساتھ نماز ادا کرے۔ حکیم عبدالکریم مرحوم نے نماز پڑھائی۔

کچھ دن بعد سنٹرل جیل تبادلہ ہوگیا اور وہاں کے سپرنٹنڈنٹ جیل سے ہمارا ٹکراؤ ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جب بھی جیل کی گشت کے لئے آئے ہم اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوں، ہم لوگ اسے گوارا نہ کرتے تھے۔ مولانا بشیر احمد اور راقم الحروف کا یہ مشورہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل کے آنے کے وقت مولانا حفظ الرحمٰن چبوترہ پر بیٹھ کر تفسیر قرآن بیان فرمائیں اور ہم لوگ مودب بیٹھ کر سُنا کریں۔ تاکہ یہ کہا جا سکے کہ یہ ہماری عبادت کا وقت ہے اور عبادت کے وقت کسی کی تعظیم نہیں کی جا سکتی۔

ایک دلچسپ واقعہ اذان کا پیش آیا۔ میر مظاہر حسین مرحوم اذان دیتے تھے اور پوری آواز اور نعروں کے ساتھ اللہ اکبر کی تکرار کرتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ اور جیلر نے اعتراض کیا تو مولانا حفظ الرحمٰن نے مسکرا کر کہا:-

> "ہمارا عقیدہ ہے کہ جہاں تک اذان کی آواز
> جاتی ہے شیطان بھاگ جاتا ہے اس لئے
> ہم اذان پوری آواز سے دیتے ہیں۔

اس پر دونوں چلے گئے۔

بابا رامچندر لیڈر کسان سبھا اور حمید اللہ الہ آبادی بھی اسی جیل میں تھے مگر ہم سے دور تھے، دونوں نے پیغام بھیجا کہ اپنے قول سے ہٹنا نہیں اور پوری بلند آہنگی سے اذان دینا۔

ایک دن سپرنٹنڈنٹ جیل نے ہم سے پوچھا آپ دنیا میں کیا کام کرتے تھے، میں نے اور مولانا بشیر احمد نے کہا۔ جی! ہم چوری کرتے تھے ڈاکے ڈالتے تھے جیب تراشتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ اردو مشکل سے بولتا تھا۔ بولا نہیں نہیں، ہم یہ پوچھتا ہے کہ آپ لوگ دنیا میں کیا کام کرتے تھے، بہرحال ہم نے بتادیا اور سپرنٹنڈنٹ کے اس جملہ پر کہ دنیا میں کیا کام کرتے تھے دیر تک ہنستے رہے۔

جس زمانہ میں ہم جیل میں تھے، ہمارے خاندان والوں کو تسلی دینے کے لئے ملک کے مایہ ناز فرزند اور حکومت کے محبوب وزیر اعظم پنڈت نہرو اور مولانا آزاد سیوہارہ پہونچے اور ہم جیسے بینواؤں کے گھر گھر جاکر تسلی دی اور اپنی ہمدردی کا یقین دلایا۔

جیل سے واپس آئے تو ہم میں سے بہت سے رفیق مولانا کا ساتھ نہ دے سکے اور تھک کر بیٹھ رہے۔ مگر مولانا کے جوش اور ولولہ کا یہ حال تھا کہ ہر قدم اُٹھاتے وقت آسمان چھو لینا چاہتے تھے۔

بلاشبہ اُن کے مجاہدانہ عزائم اسی کے مقتضی تھے اور یہ سب اسی خواب کا پرتو تھا جسے وہ دیکھ چکے تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، انگریز بھگاؤ اور ۴۷ء کا کردار تو اس کو بچہ بچہ جانتا ہے اور پورا اخبار اسی سے بھر جائے گا۔

وہ تو شاید اس خواب کو بھول بھی گئے ہوں گے۔ مگر ہم میں سے کچھ لوگ خصوصًا راقم الحروف کو انتظار تھا کہ وہ وقت کب آتا ہے کہ مولانا کے کردار کی روشنی سے ہندوستان کا کونا کونا منور ہوگا۔

اور اب سب دیکھ رہے ہیں کہ وفات کے بعد بھی خواب کا عکس اور پرتو نظر آرہا ہے اور بڑے بڑے رہنما، حکومت کے وزیر اُن کے کردار کی روشنی سے اپنے دل کے چراغ روشن کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اور یہ "مجاہد نمبر" بھی اسی خواب کا پرتو ہے۔

مجاہد ملت : بچپن سے طالب علمی تک

غمگسار: (مولانا مفتی) محمد جمیل الرحمٰن سیوہاروی مقیم دیوبند

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع تھی دلیلِ سحر، سو خموش ہے
(غالبؔ)

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ ۱۳۱۸ھ میں عالم دنیا میں تشریف لائے۔ آپ کا اصل نام معزالدین تھا اور مستقبل نے ثابت کردیا کہ آپ فی الواقع اسم بامسمیٰ تھے یعنی خداوند ذوالجلال نے آپ کے ذریعہ دین متین کو عزت بخشی تھی۔ حفظ الرحمان آپ کا تاریخی نام تھا جب کہ رحمان کے لفظ کو الف کے ساتھ لکھا جائے۔ مولانا نے یہ تصریح خود مجھ سے بیان فرمائی تھی۔ ابوالقاسم کنیت فرماتے تھے۔ وطن مالوف قصبہ سیوہارہ ضلع بجنور محلہ مولویان تھا۔ مولانا ایک تعلیم یافتہ زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی الحاج مولوی شمس الدین صاحب صدیقی تھا۔ جو نہایت خوش عقیدہ، صالح، بزرگ اور علماء حق کے گرویدہ و پروانہ تھے۔ اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن گنج مرادآبادی (ضلع اناؤ) سے بیعت تھے۔ مولانا مرحوم ابتدائے شعور ہی سے متین اور مہذب واقع ہوئے تھے۔ اول تو متانت و تہذیب آپ کا خلقی و طبعی تقاضہ تھا لیکن خاندان کے بزرگوں کی تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ مکتبی تعلیم اپنے مکان پر حاصل کی۔ آپ کے والد ماجد نے آپ کو ہونہار دیکھ کر خاص طور پر آپ کو عربی تعلیم دلانے کا عزم کیا۔ چند ابتدائی کتابیں مدرسہ شاہی مسجد مرادآباد میں آپ نے پڑھیں۔ اس کے بعد مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں آپ کو داخل کردیا گیا اور درس نظامی کی تکمیل تک آپ اسی مدرسہ میں مصروف تعلیم رہے۔

مدرسہ فیض عام میں آپ کے مخصوص اساتذہ میں سے حضرت مولانا سید عبدالغفور صاحب سیوہاروی تلمیذ رشید حضرت مولانا سید احمد حسن صاحب امروہوی اور الحاج حافظ مولانا احمد حسن صاحب چشتی نیز مولانا سید آفتاب علی صاحب شاگرد رشید حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند تھے۔ یہ تمام حضرات اعلیٰ قابلیت سے متصف اور اخلاق فاضلہ سے مزکیٰ و مزین تھے۔ اساتذہ کے یہ معنوی محاسن و کمالات مولانا پر بھی اثرانداز ہوئے۔ جس کے بعد دیگر اکابر ملت کی خدمت میں پہونچنے پر ان اثرات میں مزید جلا پیدا ہوگئی۔ مولانا مرحوم بہت ذکی اور ذہین تھے۔ خدا نے آپ کو طبع وقاد ودیعت فرمائی تھی، اسی بناء پر آپ زمانہ تعلیم میں اپنی جماعت میں ہمیشہ نمایاں اور ممتاز رہتے تھے، اور آپ کے اساتذہ آپ کی بڑی قدردانی فرماتے تھے۔ خوش قسمتی سے اساتذہ نے حسن انداز سے آپ کی تعلیمی تربیت کی۔ اس نے شروع ہی میں آپ کو شاہراہ ترقی پر کھڑا کردیا اور پوری زندگی میں یہ تربیت آپ کی رہنما ثابت ہوئی۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپ کی اعلیٰ تعلیم کا زمانہ آیا تو ہفتہ وار مجلس میں تقریر کے لئے آپ کو نیز آپ کے ہم جماعت طلباء کو اسلام وغیرہ سے متعلق اہم موضوع دیے جاتے تھے اور آپ ہفتہ وار بلاناغہ اس موضوع پر تقریر کرتے اور اساتذہ سے داد و تحسین حاصل کرتے تھے۔ اس طرح آپ کو کتب بینی کا شوق بھی پیدا ہوا اور آپ کا مطالعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا اور انجام میں یہی طریق تربیت آپ کے اعلیٰ خطیب اور وسیع النظر ہونے کا سبب بنا۔ مدرسہ فیض عام میں تکمیل کے بعد آپ نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، اور بحر العلوم حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ کشمیری، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، حضرت میاں صاحب وغیرہم، جیسے آفتاب و ماہتاب اکابر ملت، نیز مفتی اعظم مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی جیسے شیخ طریقت سے استفادہ کا آپ کو طویل موقع نصیب ہوا۔ یہاں آپ نے دوبارہ دورۂ حدیث وغیرہ اعلیٰ نصاب کی تکمیل فرمائی۔ اور بلا شبہہ دارالعلوم دیوبند کے اس قیام نے آپ کی اعلیٰ قابلیت میں چار چاند لگا دیئے۔ دارالعلوم کے اس زمانہ طالب علمی میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب خلف اکبر حضرت مفتی اعظم قدس سرہٗ اور آپ کا ساتھ ہوا۔ جو آخیر لمحۂ حیات تک قائم رہا۔

مولانا کی سیاسی زندگی کا آغاز تحریک خلافت ہی سے ہو جاتا ہے مولانا کی سیاسی نشوونما میں حضرت مولانا بشیر احمد صاحب (بھٹہ) مرحوم کی رفاقت کو بہت بڑا دخل ہے اور ان دونوں بزرگوں کی یہ رفاقت بھی پوری یکسانیت کے ساتھ آخر تک قائم اور باقی رہی ہے۔ مولانا مرحوم

کے مخصوص دوستوں میں میرے برادر بزرگ جناب حاجی حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم تھے، اور دونوں اپنے مخصوص تعلق کی بنا پر ہمیشہ یکجان دو قالب نظر آتے تھے۔ بھائی صاحب کا وصال اب سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ہو چکا ہے۔ اور ان کی وفات پر ایک بیان میں مولانا نے فرمایا تھا کہ مجھے تو یہ امید تھی کہ حاجی صاحب مرحوم سے پہلے میں رخصت ہوں، اور وہ مجھ کو مٹی دیں گے۔ لیکن آہ وہ داغ مفارقت دے کر پہلے ہی چلے گئے، مگر ڈیڑھ سال آگے پیچھے ہی کیا۔ یوں سمجھئے کہ دونوں جگری دوست ساتھ ہی گئے اور ایک نے دوسرے کو چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ خدائے پاک دونوں کو رحمت خاصہ سے نوازے اور مغفرت تامہ نصیب فرمائے۔

اب اس رباعی پر اپنی گزارش کو ختم کرتا ہوں۔

در خلد حفظ رحمٰن آرام یاب بادا
عزت مآب بادا، ہم مستطاب بادا
گفتم کہ جیست ہاتف تاریخ ارتحالش
فرمود این دعائے غفران مآب بادا

۱۳ھ ۸۲

سنو مجاہد ملتؒ کی روح کہتی ہے

از:- احسن مفتاحی جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہوگلی۔

یہ کیسی آئی اچانک مصیبت عظمیٰ
کہ کہیے جس کو اے احسن قیامت صغریٰ
ہے بات کیا کہ "محمد میاںؒ" ہیں افسردہ[1]
ہیں "فخر دیںؒ" بھی نظر آتے آج آزردہ[2]
یہ بات کیا ہے کہ روتے ہیں ہند کے عالم
اداس اداس ہے کیوں آج ہر دل مسلم
یہ بات کیا ہے کہ طاری ہے ہر سو ایک جمود
بجھی بجھی سی طبیعت، مٹا مٹا سا وجود
یہ کس نے موڑ لیا منہ، یہ کون روٹھ گیا
یہ کس کی موت ہوئی، کون دہر سے اٹھا
سکون اب دل مضطر کو کون بخشے گا
اب آہ! کون ہمیں درس زندگی دے گا
کہاں ملے گا ہمیں ایسا ناظم اعلیٰ
یہ وقت کتنا "جمعیۃ" پہ آگیا ہے کڑا
صحیح ہے یہ کہ جو پیدا ہوا ہے آج خلا
وہ پُر کسی طرح احسن کبھی نہیں ہوگا
مگر سنو بھی تو دم بھرنے والو الفت کا
سنو ہے دل میں اگر جذبہ کچھ عقیدت کا
سنو مجاہد ملتؒ کی روح کہتی ہے
دلوں میں میری عقیدت تمھارے جھوٹی ہے
اگر ذرا بھی صداقت کا شائبہ ہوتا
تو عشق میری "جمعیۃ" سے بھی بڑھا ہوتا
یہ رسم ماتم و اظہار تعزیت چھوڑو
مرے اصول، مری بات پر عمل بھی کرو
اٹھو، بڑھاؤ "جمعیۃ" کا ہر طرف حلقہ
دلوں میں ہے مری الفت کا کچھ اگر جذبہ

[1] مولانا محمد میاں مدظلہ [2] حضرت مولانا فخرالدین صاحب مدظلہ۔

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن رح

از:۔ شاکر جلیل صدیقی شیرکوٹی

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علمائے ہند وممبر پارلیمنٹ کے بارہ میں ملک کے گوشے گوشے سے مضامین آئیں گے، اور "مجاہد ملت نمبر" کی زینت ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ادبی حیثیت سے تو میرا مضمون کوئی درجہ نہیں رکھتا۔ لیکن جو عزیزدارانہ تعلق اور قرب مجھے حاصل رہا ہے اور جس طرح میں نے ان کی خانگی زندگی سے ان کی بیرونی زندگی کی مطابقت کی ہے اس کے اعتبار سے میرا مضمون معلوماتی ہوگا۔ جذبات سے مجبور ہوکر چند سطریں بڑے اختصار کے ساتھ سپرد قلم کر رہا ہوں۔ لکھنے کو تو اور بھی بہت سی باتیں ہیں، لیکن انھیں نظرانداز کیا جارہا ہے۔

مولوی شمس الدین صاحب سیوہارہ ضلع بجنور کے معززین اور علماء دین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے بھوپال اور ریاست بیکانیر میں اسسٹنٹ انجینیر کے عہدہ پر مامور رہے۔ ان کی زمینداری مالگذاری کے علاوہ پانچ ہزار روپیہ سالانہ بچت کی تھی۔ مولوی شمس الدین صاحب کے چار لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔

بیٹے، مولوی ڈپٹی فخرالدین صاحب۔ مولوی بدرالدین صاحب وکیل۔ مولوی حفظ الرحمٰن اور حکیم صلاح الدین صاحب تھے

بیٹیاں، بتول فاطمہ اور عظمت النسا تھیں۔ بڑی لڑکی کی شادی مولوی انوارالحسن صاحب نائب صوبہ دار ریاست گوالیار سے اور دوسری لڑکی کی شادی حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر آبپاشی و برقیات سے ہوئی تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی والدہ محترمہ بڑی دیندار مخیر اور پابند صوم وصلوٰۃ خاتون تھیں اور حافظ عبدالرحمٰن صاحب مرادآبادی سے بیعت تھیں۔ مولانا کے منجھلے بھائی مولوی بدر الدین صاحب انتقال فرماچکے ہیں۔ مولوی ڈپٹی فخرالدین صاحب اور حکیم صلاح الدین صاحب بقید حیات ہیں۔ مولانا مرحوم کی والدہ محترمہ نے مولانا کے والد بزرگوار سے درخواست کی کہ میں حفظ الرحمٰن کو دینی تعلیم دلانا چاہتی ہوں۔ ان کی یہ درخواست منظور ہوئی۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم سیوہارہ کے عربی مدرسے میں حاصل کی۔ پھر وہاں سے دیوبند چلے گئے۔ حضرت مولانا انورشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بزرگوں سے فیض حاصل کیا۔ حضرت مولانا انورشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی پر ہمیشہ نازرہا۔ فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی خدمات انجام دینے لگے۔

اس کے بعد اساتذہ کے مشورہ پر سیٹھ یعقوب صاحب کی درخواست پر بسلسلہ تبلیغ ۱۹۳۶ء مدراس گئے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے، کہ مولانا مرحوم بچپن ہی سے مجاہدانہ خدمت خلق کا جذبہ دل میں رکھتے تھے۔

سیوہارہ میں ایک نومسلم جذامی، جس کی بہت بری حالت میں موت واقع ہوئی۔ اسے غسل دینے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ مولانا مرحوم نے اپنی کم عمری ہی میں اس جذامی کی تجہیز وتکفین اپنے ہاتھوں سے انجام دی۔

دوسرا واقعہ، نوادہ سہنسپور میں ٹرین کا حادثہ پیش آیا، سیکڑوں افراد مجروح ہوئے اور بہت سے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مولانا اتفاق سے اس مقام پر تھے۔ جلتی ہوئی آگ سے مجروحین کو نکال کر ان کی تجہیز وتکفین کی، خود اس حادثہ سے جھلسے گئے تھے۔ کافی عرصے تک زخموں کا علاج کراتے رہے۔

عنفوان شباب ہی سے جمعیۃ علماء وتحریک خلافت وکانگریس میں آزادیٔ وطن کے لئے طوفانی دوروں اور پُراثر تقریروں سے ہر جماعت کے محاذ پر سرگرم رہے اور وہ خدمات انجام دیں کہ ملک کے ممتاز اور سرگرم لیڈروں میں مقام حاصل کرلیا، مدارس کے قیام کے دوران ۱۹۲۸ء میں ڈابھیل تشریف لے گئے اور وہاں اپنے استاد حضرت مولانا انورشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں کلکتہ چلے گئے۔ وہاں دوسال مقیم رہے۔ وہیں سے مولانا نے لینے زوربیان اور ترجمہ قرآن شریف کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی شروع کردیا۔ جسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور

ایک مستقل ادارہ کے قیام کی بات لوگوں کے مشورہ سے سامنے آئی۔ مولانا مرحوم نے فیصلہ کیا کہ یہ ادارہ دہلی میں قائم کیا جائے، چنانچہ امروہہ میں تین سال درس و تدریس میں گذارنے کے بعد سیاسی مشغولیتوں کے ساتھ ۱۹۳۸ء میں دہلی چلے آئے۔ ندوۃ المصنفین کی بنیاد ڈالی، آج تک قائم ہے جس کے نگراں حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب ہیں اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی وغیرہ کی رفاقت میں بڑی شان سے چل رہا ہے۔ ایک ادبی رسالہ "برہان" بھی اس ادارہ سے شائع ہو رہا ہے۔

جمعیۃ علماء کی وابستگی اور مولانا کی خدمات وخلوص سے متاثر ہوکر اکابرین نے مولانا مرحوم کو ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ علماء کا ناظم اعلیٰ منتخب کیا یہ سلسلہ تادم واپسیں قائم رہا۔ جمعیۃ کی بقا کے لئے فنا فی الجمعیۃ ہوکر کام کیا۔ اپنے گھر اور اہل وعیال کے مستقبل سے اللہ کے توکل پر بھروسہ رکھتے ہوئے ہمیشہ لاپروا رہے۔ کبھی آرام کرنا نہ جانا۔ بیمار ہوں یا تندرست جاڑا ہو یا گرمی، آج یہاں ہیں تو کل وہاں، جوش خدمت میں اپنی صحت تک کا خیال نہ کیا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں کئی مرتبہ بچے۔ گولیاں سر پر سے اور دائیں بائیں قریب سے گزر گئیں۔ اللہ کریم کو اب تک حیات رکھنا تھا، اب تک زندہ رہے۔

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائپوری فرمایا کرتے تھے:۔

"مولانا حفظ الرحمٰن کی ۱۹۴۷ء کے خونی دور کے ایک دن کی خدمت ہم خانقاہی لوگوں کی تمام عمر کی عبادت سے زیادہ ہے"

مرحوم کچھ دنوں یو۔ پی اسمبلی کے ممبر رہے ہیں۔ چند مہینوں کے بعد ہی پارلیمنٹ کے انتخاب میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور تاحیات کامیاب ہوتے رہے۔

مولانا مرحوم کی قابل ذکر کتابیں

رسول کریم — قصص القرآن — اسلام کا اقتصادی نظام
اخلاق اور فلسفۂ اخلاق — بلاغ المبین — حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان وغیرہ وغیرہ۔

مرحوم کی یہ کتابیں بڑی مقبول ہوئیں۔

خدمت جمعیۃ علماء

نظامت عظمیٰ پر سرفراز ہونے کے بعد حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو چند در چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جمعیۃ مقروض تھی۔ نہ اخبار تھا نہ پریس، نہ ذاتی دفتر نہ جائیداد۔ یہ ان کی ہمت تھی اور استقلال، کہ انھوں نے قرضہ بھی ادا کر دیا، اخبار کا دوبارہ اجراء۔ الجمعیۃ بک ڈپو کا قیام عمل میں آیا اور "الجمعیۃ برقی پریس" دہلی کے ایک ممتاز پریس کی حیثیت سے منظر عام پر آ گیا۔ بک ڈپو کے ساتھ ایک چھوٹی سی لائبریری بھی قائم ہے جمعیۃ علماء ہند کی ذاتی املاک میں ایک بڑی عمارت اور اس سے ملحقہ جائیداد مجموعی طور پر ساٹھ ہزار روپے کی حاصل کر دی۔

مولانا مرحوم کے روزمرہ کے دفتری معمولات بھی انتہا نہیں رکھتے تھے۔ صبح کی نماز کے بعد گھر آتے، اور سب گھر والوں پر محبت بھری ایک نگاہ ڈالکر دفتر چلے جاتے۔

صبح کی چائے دفتر ہی میں جاتی تھی۔ دفتر کی چائے کے ساتھ ہی چائے مہمانوں کے ہمراہ پیتے تھے۔ مہمانوں میں دسترخوان پر کوئی تخصیص نہ تھی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سب ہی ہنس بول کر چائے پیتے۔ اس کے بعد مولانا دفتری امور کی دیکھ بھال شروع کرتے اور اطراف و اکناف ہند کے آنے والوں کی ضرورتوں اور پریشانیوں کو سنتے اور ان کے مناسب و معقول حل تلاش کر کے مدد فرماتے۔

یہ سلسلہ ۱ ½ بجے دن تک جاری رہتا۔ اس کے بعد گھر جا کر کھانا کھاتے اور پھر دفتر واپس آکر آرام فرماتے اور عصر کے وقت اٹھ جاتے اس درمیان میں ضرورت مند حضرات کو پوری اجازت تھی کہ عصر سے رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک پھر دفتر جمعیۃ علماء ہند میں ملاقاتیوں اور ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا" اور مولانا ان کی خاطر خواہ خدمت کرتے۔

استغنا کا یہ عالم تھا کہ جس کسی نے لکھا، اس کی درخواست اگر کوئی ضرورت خاص نہ ہوتی تو قبول فرماتے۔ بستر ہر وقت بندھا رہتا، اسے لیتے اور چلے جاتے۔

دفتر جمعیۃ علماء ہند کی مصروفیتوں کے علاوہ مولانا نے اپنی مرضی کے خلاف ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب موجودہ نائب صدر جمہوریہ ہند کے اصرار پر سنی مجلس اوقاف صوبہ دہلی کی صدارت قبول فرمائی اور اس سے متعلق تمام اداروں کی ذمہ داری سرانجام دی:۔

۱ — مدرسہ عالیہ فتحپوری
۲ — مسلم ہائر سکنڈری اسکول فتحپوری
۳ — دلی کالج اجمیری گیٹ۔
۴ — فتحپوری پبلک لائبریری
۵ — انجمن ترقی اُردو
۶ — حج کمیٹی بمبئی
۷ — مسلم یونی ورسٹی علی گڈھ
۸ — کانگریس وغیرہ کی میٹنگوں میں مستعدی اور پابندی سے اپنے فرائض ادا کرتے۔ حج کمیٹی کے دوران پارلیمانی امور کو بھی سبکدوش فرماتے رہتے۔

اخلاق

مولانا مرحوم بڑے مردم شناس اور بڑے مرنجان مرنج تھے، قوتِ برداشت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی کسی مخالف سے برسرِ کار ہونے کو کہتا۔ تو مولانا کا چہرہ سرخ ہوجاتا اور وہ سختی کے ساتھ منع کرتے حتیٰ کہ اپنے گالی دینے والوں سے محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتے۔

ایک مرتبہ کچھ لوگ اپنی ضرورت لے کر مولانا کے پاس آئے۔ مولانا نے فرمایا ، یہ کام مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی ان لوگوں کے اصرار اور خوشامد پر اپنے حلقۂ اثر میں ٹیلیفون بھی کیا ، اور وزراء کو ان کے کیس کی جانب متوجہ کرنے کے بعد خطوط بھی لکھے۔ ان مراحل کے طے ہونے کے بعد وہ لوگ دفتر سے جانے لگے۔ میں بھی اپنی ضرورت سے ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ جس کا ان لوگوں کو علم نہ ہوا۔ باہر نکلتے ہی انھوں نے مولانا کی شان میں گستاخانہ کلمات نکالے اور یہ کہا کہ۔ دیکھا کیسا کام کرایا — قریب تھا کہ میں ان سے دست و گریبان ہوجاتا — کہ پیچھے سے مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ان لوگوں کو محسوس نہ ہونے دیا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

اور مجھے گھر لاکر سختی سے کہا مجھے خواہ کوئی کچھ ہی کہے تم میرے معاملات میں قطعی دخل نہ دیا کرو۔ ورنہ میں تمھیں اپنے لئے اور اپنے آپکو تمھارے لئے مُردہ تصور کرلوں گا۔ اس دن کے بعد میری کبھی ہمت نہ ہوئی کہ میں کسی سے باز پُرس کرتا۔ لوگ سب کچھ کہہ جاتے اور مولانا ہنس کر ٹال دیتے۔ اور یہی کہتے کہ یہ لوگ مصیبت زدہ ہیں، اپنا غصہ اس طرح اُتار کر اپنے غم کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ انھیں نظرانداز کرو۔ لوگ پیچھے بادشاہ کو بھی گالیاں دیتے ہیں۔

مولانا مرحوم کی ساری زندگی سیاسی تگ و دو میں کانگریس کے ساتھ گزری اور اس درجہ کے کانگریسی شمار کئے گئے کہ بعض لوگوں نے انھیں وظیفہ خوار تک قرار دیا۔ لیکن مولانا مرحوم نے ملکی اور قومی مفاد کی وجہ سے اپنی وضع نہ بدلی۔ پورے خلوص کے ساتھ کانگریسی رہے پھر بھی انتخابات کے ختم ہوتے ہی مولانا مرحوم کا انداز حزبِ مخالف کے لیڈروں جیسا ہوجاتا اور وہ یہ کہتے کہ جتنا وطنِ عزیز کا میرے اوپر حق ہے اتنا ہی مسلم اقلیت کا ایک فرد ہونے کے ناطے سے مسلمانوں کا بھی مجھ پر حق ہے۔ چنانچہ حکومت اور کانگریس دونوں سے مسلمانوں کے لئے دشمن کی طرح لڑتے۔ ہندو۔ سکھ حضرات کے کیس بھی لے کر کھڑے ہوئے تو ان کا رویہ وہی ہوتا جو مسلمانوں کے لئے ہوتا تھا۔ کوئی تفریق نہ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی انتخابات میں حصہ لیا۔ بھاری تعداد میں ہندو ووٹوں سے کامیاب ہوتے۔ مسلمان ووٹ تو انھیں نوّے فیصدی ملتے ہی تھے۔ ہندو بھی دوسری پارٹیوں کے زور لگانے کے باوجود مولانا ہی کو ووٹ دیتے۔

آخری دنوں میں مولانا نے مسلمانوں کی خاطر مسلم کنونشن کیا۔ تمام پارلیمانی حلقہ کے مسلمانوں نے اسے شروع شروع میں قبول نہ کیا۔ حکومت کے اعلیٰ ترین ذمہ داران بھی اُسے فرقہ وارانہ تصور کرتے رہے اور یہ کنونشن نہ کرنے پر مصر رہے۔ لیکن مولانا کی بے باکی اور ہمت و استقلال نے یہ کنونشن کامیاب شان کے ساتھ کیا۔ ہندوستان کے تمام اخبارات اور کئی جماعتوں نے مخالفت کی لیکن مرحوم کے عزم و حوصلہ میں فرق نہ آیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین قائل ہوئے اور سکوت اختیار کرنا پڑا۔ مسلم کنونشن ہوا اور عالمی حیثیت سے کامیاب ہوا۔ حکومت کو بھی شکایت نہ ہوئی، اور مسلمانوں کے مسائل بھی سامنے آگئے اور مخالفین کے دانت کھٹے ہوگئے۔

مولانا مرحوم کے پسماندگان ہیں

ایک لڑکا اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ لڑکے کا نام لطف الرحمٰن عرف اسلم فیروز ہے۔ لڑکے اور دو لڑکیوں کی شادی ہوچکی ہے تین لڑکیاں غیر شادی شدہ ہیں۔ مرحوم کے تین پوتے اور ایک پوتی ہے۔ پوتوں کا نام اسعد فیروز۔ احمد فیروز۔ ارشد فیروز ہے۔ ماشاء اللہ بڑا پوتا اسعد فیروز بہت ہونہار اور پڑھنے کا شوقین ہے۔

(حافظ غفران احمد پروفیسر اینگلو اورنٹیل کالج دہلی)

مولانا حفظ الرحمن اور ان کا علمی مقام

کسی عظیم شخصیت کے علمی مرتبہ کا تعین بڑا ہی دشوار کام ہے۔ اس سلسلہ میں، ہم کو نہ صرف اُس شخصیت کا بنظر غائر مطالعہ کرنا پڑتا ہے، بلکہ اُس زمانہ کے سماجی رجحانات، اور مختلف مکاتب خیال کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ چونکہ ہر عظیم شخصیت، جہاں اپنے عہد پر مختلف زاویوں سے اثرانداز ہوتی ہے۔ اسی طرح اُس شخصیت پر بعض غیر محسوس تاریخی عوامل بھی اثرانداز ہوتے ہیں۔ اُس عظیم شخصیت کا کردار، کچھ خداداد الہامی صلاحیتوں اور کچھ اپنے زمانہ کے تاریخی تقاضوں اور سماجی حقائق سے مل کر بنتا ہے۔ چنانچہ اس شخصیت کے علمی یا کسی اور پہلو سے مرتبہ کے تعین میں، ہمیں ان سب باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کٹھن کام ہے۔

مولانا مرحوم، ایک عظیم تاریخی کردار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے۔ اور ایک جدوجہد و سعی مسلسل سے بھرپور زندگی گذار کر، ہم سے جدا ہو گئے۔ مولانا جس دور میں پیدا ہوئے۔ اور جن حالات میں انھوں نے اپنے نصب العین اور فرائض کی تکمیل کی۔ وہ ہم سب کے نزدیک بڑے صبر آزما اور جان جوکھوں کے کام ہیں۔ ان کا عہد شباب، دیوبند جیسی عظیم درسگاہ، اور ان علماء و شیوخ کی صحبت میں گزرتا ہے۔ جو اپنے وقت کا جوہر شمار ہوئے تھے۔ استاد الاساتذہ، علامہ انور شاہؒ صرف ایک علامہ ہی نہ تھے۔ بلکہ ایک مستقل مکتب خیال، اور مدرسہ فکر تھے۔ ان کا زمانہ دیوبند کے علمی شباب کا زمانہ ہے۔ مولانا کی شخصیت کی تشکیل میں، دیوبند کا ماحول، وہاں کے اساتذہ اور علامہ انور شاہ کا خصوصی فیض شامل رہا۔ دیوبند پچھلی صدی کی ایک علمی تحریک تھی۔ اس کے بانیو کی نظر میں، انگریز ڈپلومیسی اور ہندوستان کی غلامی کے حالات تھے۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ، اندرونی استحکام اور اسلام کے بنیادی عقائد و علوم و فنون، کی حفاظت کی جائے۔ انگریزوں نے ہندوستان کو عیسائی بنانے کا جو خیال بعد میں ترک کیا، اس کی ایک بڑی وجہ دیوبند کی دینی تحریک ہے۔ چنانچہ پھر انگریزوں نے ظاہر پرستوں کی جماعت پیدا کرنے پر اکتفا کیا۔

یہی وجہ ہے کہ جونہی علمائے دیوبند اس طرف سے مطمئن ہوئے۔ انھوں نے جارحانہ کارروائی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔ چنانچہ شیخ الہندؒ کی تحریک بجائے خود اس کی زندہ مثال ہے کہ کس طرح ایک اسلامی یونیورسٹی کا سربراہ اپنے دور کی عظیم طاقت سے ٹکر لینے کی کوشش کرتا ہے۔ آنے والا مورخ، ضرور اس سربراہ کے آہنی عزم کو خراج عقیدت پیش کرے گا ——

انگریزوں سے مقابلہ کا یہ سخت اور مادی رخ تھا۔ جو کہیں دفاعی کوشش اور کہیں جارحانہ کوشش کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اب مغربی افکار و نظریات کے تجزیہ و تنقید کا دور آیا۔ اگرچہ اس کی ابتدا بھی انیسویں صدی ہی میں پڑ چکی تھی۔ لیکن دیوبند نے اس کی جانب اصل توجہ علامہ انور شاہؒ کے زمانے میں کی۔ چنانچہ ان کے تلامذہ میں ہم کو یہ رجحان قوی تر نظر آتا ہے۔

—— مولانا حفظ الرحمن کے کردار کی تشکیل اسی دور میں ہوئی۔ اتفاق سے یہی وہ دور ہے۔ جس میں انگریزی سامراج کے خلاف ملک میں ایک عام بیداری کی لہر اٹھتی ہے۔ چنانچہ مولانا کو اپنی شخصیت تقسیم کر دینی پڑتی ہے۔ ایک جانب خدا نے اگر ان کو اعلیٰ ذہنی صلاحیت اور برتر فنی استعداد عطا کی تھی تو دوسری جانب ان کے نوشتۂ تقدیر میں، سیاسی رہنمائی کا فرض بھی لکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ سیاسی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح علمی دنیا سے ان کا رشتہ کمزور تر ہو جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے کے اکثر مفکرین کے ساتھ یہی ٹریجڈی پیش آئی کہ وہ زمانہ امن کی طرح، تمدن کو اپنے افکار و خیالات سے مالا مال نہ کر سکے، بلکہ زندگی کی سخت ترین جدوجہد نے ان کو اپنی صلاحیتیں دو طرف استعمال کرنے پر مجبور کر دیا۔ مولانا آزاد، مولانا محمد علی، علامہ اقبال اور مولانا حفظ الرحمن کے ساتھ یہی المیہ پیش آیا کہ سیاست کی وقتی و ہنگامی دنیا نے ان کو علمی و تحقیقی زندگی کے پرسکون ماحول سے چھین لیا۔ خاص طور پر مولانا موصوف تو اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے، اپنے وقت کے علمی امام شمار کئے جاتے۔ چونکہ ہم کو ان کی تالیفات اور علمی تحقیقات کے نفسیاتی تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سیاسی زندگی کا ذرہ برابر بھی پرتو نہیں۔ اس کے

برعکس، مولانا آزاد کی تصنیفات میں ان کی سیاسی زندگی کی گرما گرمی، اور جذبات آرائی ملتی ہے۔ علامہ اقبال نے شاعری کے ذریعے اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیت اور بلند فکری کی تسکین کا راستہ ڈھونڈ لیا۔ لیکن مولانا مرحوم سیاسی مصروفیتوں کی بنا پر اپنے علمی رجحان کی تسکین کا کوئی ذریعہ نہ پا سکے چنانچہ ان کے شعور میں ہمیشہ اپنی سیاسی زندگی سے ایک بیزاری کا سا رجحان پرورش پاتا رہا۔ اور اسی بنا پر۔ آخر وقت میں، ان کی شخصیت میں تلون، اور کچھ بے اطمینانی کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ جس نے مزاجی بےچینی، اور اس راہ میں انتھک محنت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا —— لیکن یہ بات ان کی تعریف میں ہی جاتی ہے۔ کہ ایک فرض پسند انسان کی حیثیت سے انھوں نے اپنے ذاتی رجحانات کو خیرباد کہہ کر، سیاسی دعوت کو قبول کر لیا۔

جو افراد علم دفن کی دنیا سے واقف نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک علوم وفنون کی دنیا، ایک خشک اور بے رنگ و رونق دنیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم اپنی آخری حد میں جاکر ایک رومان بن جاتا ہے۔ اور شخصیت اس میں اپنے آپ کو تحلیل کر دیتی ہے۔ مولانا کی تصنیفات میں ہمیں اس کی جھلک محسوس ہوتی ہے، اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اگر صرف اسی ایک میدان کے ہو رہتے، تو بھی اپنی انفرادیت اور برتر ذہنی صلاحیت کا لوہا، ساری علمی دنیا سے منوا لیتے۔ لیکن مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے۔ ہم جو کچھ چاہتے ہیں۔ وہی کچھ نہیں ہوجایا کرتا۔ ان کی شخصیت کے ان ہی مختلف زاویوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم ان کے علمی مقام کو پہچان سکتے ہیں۔

علمی کارنامے

مولانا نے اپنے علمی ترکہ میں ذیل کی تالیفات چھوڑی ہیں۔

۱۔ قصص القرآن (جلد اوّل تا چہارم)
۲۔ اسلام کا اقتصادی نظام
۳۔ اخلاق و فلسفہ اخلاق
۴۔ رسول کریم
۵۔ بلاغ مبین
۶۔ حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان

اب ہم ان کتابوں پر الگ الگ تبصرہ کرتے ہیں۔

۱۔ **قصص القرآن:۔** جیسا کہ موضوع سے ظاہر ہے قصص القرآن کے نام سے مولانا نے چہار جلدوں میں شرح و بسیط کے ساتھ تمام قرآنی قصوں کو جمع کر دیا ہے۔ اردو میں یہ تالیف اپنی نظیر آپ ہے۔ اس تالیف کے سلسلے میں جو اصول و مقاصد مولف کے پیش نظر رہے ہیں۔ ان میں سب سے مقدم یہ اصول تھے کہ قرآنی قصص کو معتبر طریقے سے بیان کیا جائے۔ اور ان کی تشریح، قرآن و احادیث صحیحہ کی روشنی میں کی جائے۔ دوسرے یہ کہ اسرائیلیات نے جس جس طرح، قصص کی حقیقی شکل کو مسخ کر دیا ہے، ان کی تحقیق کی جاتے کی۔ توریت و انجیل کی روایات کی صحیح حقیقت ظاہر کی جائے۔ ساتھ ہی قصص قرآنی سے حاصل شدہ، پند و موعظت اور قرآن کے مقاصد کو بہتر طور پر پیش کیا جائے۔ بلاشبہ مولف فاضل نے یہ کام بڑی کاوش سے انجام دیا ہے اور تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے، چنانچہ قصص القرآن کو ایک مستقل تفسیر کا درجہ دیا جا سکتا ہے اس میں ایک جامع اور بسیط تفسیر کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ قصص القرآن کی ترتیب اس طور پر ہے۔

مجلد اول:۔ اس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر، حضرت موسیٰ و ہارون کے عبور بحر قلزم تک کے واقعات و قصص ہیں۔ جن میں خاص طور پر، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔

مجلد دوم:۔ اس میں حضرت موسیٰ و اسرائیل کے بقیہ واقعات، سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے حالات تک، واقعات نہایت تحقیقی انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ بعض تحقیقات واقعی لاجواب ہیں۔

مجلد سوم:۔ اس جلد میں اصحاب کہف، اصحاب رقیم، سیل عرم اصحاب فیل، اور ذوالقرنین وغیرہ کی بحث خاص طور پر مذکور ہے کتاب تحقیقی مباحث سے گنجان ہے۔ اس میں خاص اور دلچسپ تحقیق ذوالقرنین، اور سد ذوالقرنین (سد سکندری) کی ہے۔ یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ قرآن میں مذکورہ، ذوالقرنین، سکندر یونانی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ذوالقرنین پہلے زمانہ میں ایک عادل اور مومن بادشاہ گزرا ہے۔ اور جس کے دور میں حضرت خضر علیہ السلام تھے۔ اسی نے وہ دیوار بنائی تھی۔ جو یاجوج و ماجوج قوم کو روکنے کی غرض سے تعمیر کی گئی تھی۔ عباسی خلیفہ واثق باللہ کے عہد میں ایک وفد اس دیوار کی تحقیق میں گیا تھا۔ جس نے اس دیوار کی تعیین کر دی تھی۔ مولانا کی تحقیق یہاں پر ذرا تشنہ ہے۔ وہ تقریباً تین چار دیواروں کا تذکرہ

کرکے، واثق باللہ کے دفاع کی تحقیق پر بحث ختم کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آیا آج بھی وہ دیوار کہیں موجود ہے۔ یا نہیں۔ یا استدادِ زمانہ سے مٹ چکی۔ تاہم ذوالقرنین، یاجوج ماجوج، اور سدّ کے بارے میں کئے گئے۔ وسیع مباحث کی داد دینی پڑے گی۔ یہ جلد تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔

مجلد چہارم: یہ پانچسو صفحات سے زیادہ پر پھیلی ہوئی اس جلد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک کے واقعات کا تذکرہ ہے۔ حضرت عیسیٰؑ سے متعلق خاص مباحث رفع سماء، پیدائش، حیات، اور قادیانی دعووں کی تکذیب، اس کتاب کے معرکۃ آرا مسائل ہیں۔ آنحضورؐ کی ایک گونہ سیرت اس جلد میں آگئی ہے۔ خاص مباحث واقعہ معراج اور غزوات نبوی ہیں۔

۲۔ اسلام کا اقتصادی نظام

اس تالیف میں مولانا نے اسلام کے اقتصادی نظام کو مدون شکل میں پیش کیا ہے۔ اور ان اصولوں کی نشان دہی کی ہے۔ جن پر اسلام کے اقتصادی ڈھانچے کی جدید اور ٹھوس عمارت اٹھائی جا سکتی ہے۔ ساتھ ہی اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام سے موازنہ کیا گیا ہے۔ ایک خاص پہلو اس تالیف کا یہ ہے کہ ان جدید نظام ہائے اقتصادی پر بھی نظر ڈالی گئی ہے۔ جو دنیا کے مختلف تاریخی مذاہب نے پیش کئے۔ بعد میں اسلامی معاشی نظام کی ترجیح ثابت کی ہے۔ اپنے موضوع پر کتاب جامع ہے اور اچھا مواد رکھتی ہے۔ آئندہ اسلامی اقتصادیات پر جو بھی کام ہوگا۔ تقدم کا مرتبہ مولانا کو ہی حاصل ہوگا۔ اگرچہ اردو میں، اس فنی نقطۂ نظر سے کچھ اور بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن وہ اتنی جامع اور گہری فنی معلومات اپنے اندر نہیں رکھتیں۔ گو مولانا نے اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کا بالواسطہ مطالعہ کیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں ان کی معلومات موضوع کے لئے بہت کچھ کافی ہیں۔ اہم ترین کارنامہ یہی ہے کہ اس میں اسلام کے اقتصادی نظام کا ایک خاکہ مثبت شکل میں پیش کر دیا گیا ہے۔

۳۔ اخلاق و فلسفہ اخلاق

کتاب کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ اخلاقیات پر مشتمل ہے مولانا کی یہ کتاب اخلاقیات کے موضوع پر اردو میں پہلی جامع ترین کتاب ہے۔ کچھ کتابیں ضرور موجود ہیں۔ لیکن قطعی نامکمل، اس لئے کہ اگر ان میں جدید نظریات ہیں تو قدیم نہیں —— تقابلی مطالعہ تو بہت دور کی بات ہے۔ اس کتاب میں قدیم و جدید، مذہبی و دنیوی، تمام نظریات کا نچوڑ ہے۔ اور اخلاقیات کے سلسلہ میں، قدیم و جدید نظریات پر نہ صرف سیر حاصل تبصرہ ہے۔ بلکہ اہم علمی تنقید بھی ہے پھر اسلام کے اخلاقی نظام کو پیش کیا گیا ہے۔ بعض اہم مباحث، مثلاً مباحث نفس و نفسانیت ماحول، کردار اور اس کے مبادیات وغیرہ بھی خاص قدر و قیمت رکھتے ہیں، اسلام کے اخلاقی نظام کے سلسلہ میں اخلاق فاضلہ، خیر و شر، اور نفس و روح کی حقیقت، عملی اخلاق وغیرہ کے مباحث، خالص فنی و تحقیقی انداز میں ہیں۔ اور ان سب میں، معتبر ترین مواد موجود ہے۔ اور قرآن و حدیث سے استدلال ہے

۴۔ رسول کریمؐ

سیرۃ نبوی پر مشتمل ایک بہترین اور معتبر درسی کتاب ہے۔ ابتداء میں ایک مفید مقدمہ ہے جس میں تاریخ کے مبادی مذکور ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مواد، قرآن و حدیث اور قابل سند تاریخ کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ خاص خاص مسائل کو تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں متعصب غیر مسلم مورخین کی جانب سے کئے گئے اعتراضات کو رد کیا گیا ہے۔ ہر باب کے بعد اس کا خلاصہ درج ہے۔ تاکہ طلبہ کو یاد کرنے میں آسانی ہو۔ کتاب کی زبان عام فہم اور رواں ہے۔ بلاشبہ ہم کو تدریسی کتابوں میں کوئی ایسی کتاب نہیں نظر آتی۔ جو اس طرح کا معتبر مواد یکجا رکھتی ہو اور ساتھ ہی اس میں غیر مسلموں کے تعصبات کو رد بھی کیا گیا ہو۔ کتاب تقریباً پونے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

۵۔ بلاغ مبین

یہ کتاب تبلیغ دین کے موضوع پر ہے۔ اس میں اعلاء حق اور تبلیغی اصولوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصہ میں، دعوت دین کے اصول قرآن اور حدیث سے جمع کئے گئے ہیں۔ درمیانی حصہ میں آنحضورؐ کے فرامین مبارک ہیں۔ جو کہ اپنے مختلف بادشاہوں اور سرداروں کے نام بسلسلہ دعوت دین بھیجے۔ آخر حصہ کتاب میں نتائج، جہاد کی حقیقت جزیہ کی تعریف اور دعوت حق کا مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ کتاب تقریباً

تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور مولانا کی ابتدائی تصانیف میں سے ہے۔

۶۔ حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان

مدراس کے ایک گاؤں، پیارم پیٹ میں مقامی مقلدین و غیر مقلدین میں اختلاف پیدا ہوا۔ اور نزاعی مسائل میں بحث کا دروازہ کھل گیا اور ایسا چند اہل حدیث علماء کی شدت کی وجہ سے ہوا تھا۔ مقامی لوگوں نے آپ کو دعوت دی۔ چنانچہ آپ تشریف لے گئے۔ لیکن مناظرہ یا مباحثہ کا موقع نہ آیا۔ چنانچہ ان نزاعی مسائل کا حل یا جواب ایک کتاب کی صورت میں یکجا کر دیا گیا۔ جو احناف پر اعتراض کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً قرآۃ خلف الامام، رفع یدین وغیرہ۔

تالیفات پر ایک نظر

مولانا کی تالیفات میں ہم کو سب سے ممتاز اور قابل فخر تالیف قصص القرآن نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اخلاق و فلسفہ اخلاق، اور اسلام کا اقتصادی نظام کا درجہ ہے۔ قصص القرآن نہ صرف یہ کہ موضوع کے اعتبار سے اہم تالیف ہے، بلکہ اس سے صاحب تالیف کی فنی و علمی عظمت کا احساس بھی ہم کو ہوتا ہے اور صرف یہی ایک تالیف، مولانا کو علامہ شبلی، مولانا آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی کی صف میں کھڑا کر دیتی ہے۔ مستقبل میں ادبی مورخ مولانا کو اردو کے طبقہ علیا کے مصنفین میں شمار کرے گا۔ تفسیر قرآنی، اتنا آسان کام نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ ایک جانب ہر لحظہ قرآن کی اہمیت و عظمت اور سلف صالحین کے مسلک کا خیال رکھنا ہوتا ہے تو دوسری جانب زمانہ جدید کے ارتقاء اور تحقیقاتی اسلوب کو ملحوظ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ اس راہ میں قلم کی ذرا سی لغزش ہمیشہ کے لئے پایہ اعتبار سے گرانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

" اخلاق و فلسفہ اخلاق " سے اردو میں ایک نئے فن کا آغاز ہوتا ہے۔ بڑے تعجب کا مقام ہے کہ اردو باوجود ایک بڑا علمی ذخیرہ رکھنے کے، اخلاقیات کے موضوع پر تہی مایہ ہے۔ شاید اسی کی جانب اس لئے توجہ نہیں کی گئی کہ یہ کام بڑا کٹھن اور دشوار ہے اور فلسفیانہ بصیرت چاہتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ہم کو مولانا کی فنی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے۔ " اسلام کا اقتصادی نظام " بھی اپنے موضوع پر اولین کوشش تو نہیں، لیکن منفرد اور ممتاز ضرور ہے۔ اگرچہ اردو میں، اس موضوع پر اب کافی مواد فراہم ہو گیا ہے۔ تاہم اس کی قدر و قیمت اپنی جگہ برقرار رہے گی۔ " بلاغ مبین " اور " رسول کریم " دونوں عام اردو داں طبقہ کے لئے لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ ان میں سلیس زبان اور عام فہم اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ ان سے مولانا کی ہمہ جہت ذہنی صلاحیت اور انشا پردازی کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

طرز تحقیق

مولانا ایک صاحب طرز محقق تھے۔ ان کا اپنا تحقیقی اسلوب تھا۔ ان کی تالیفات میں ہم کو ان کا یہ منفرد اسلوب تحقیق نمایاں نظر آتا ہے۔ موجودہ دور میں اسی اسلوب کو مقبولیت کی سند حاصل ہوتی ہے۔ جو اپنے فن اور شخصیت اور زمانے سے پوری طرح میل کھاتا ہو۔ مولانا کی فنی قابلیت کا معیار، ان کی شخصیت کی متانت و سنجیدگی، ذہنی و فکری بلندی پوری طرح ان کے اس اسلوب سے نمایاں ہے۔ ان کا اسلوب بنانے میں دیوبند کی نوے سالہ تاریخ، زمانہ جدید کی ادبی و علمی تحریکات اور خود ان کی اپنی الہامی صلاحیتیں شامل رہی ہیں۔ دیوبند کے فکری منبع نے مولانا کے قلم کو بہت کچھ دیا ہے۔ وہ، ولی اللٰہی افکار، اور سلف صالحین کے تصورات کا مرکز ہے۔ اس نے اسلامی علوم و فنون کی اشاعت میں ایک ناقابل فراموش حصہ لیا ہے۔ چنانچہ دیوبند کے اس پہلو کا اثر ہم مولانا کی تحریروں میں صاف صاف دیکھتے ہیں۔ ان کے افکار حضرت شاہ ولی اللہ اور علامہ انور شاہ سے خاص طور پر متاثر ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ نے ہندوستان کی علمی تاریخ بنائی ہے وہ ہندوستان میں احیائے دین کے علم بردار رہے ہیں۔ چنانچہ ایک عظیم مفکر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنے عہد کے تمام رجحانات کو سمجھا۔ اور ان سے نبرد آزما ہوئے۔ انھوں نے اسلامی تعلیم و فلسفہ عالیہ دینی تصوف کی روشنی میں کائناتی و تشریعی نظام کی تشریح کی۔ وہ امام غزالیؒ و امام رازی ہی کی طرح، اپنے دور کے ایک بلند فکر ہیں۔ علامہ انور شاہ اپنے دور کی وہ عظیم شخصیت تھی جو مغربی افکار سے ضروری طور پر واقف تھی اور تمام اسلامی افکار پر حاوی تھی۔ ان کے دور سے دیوبند کی علمی نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم ان کے شاگردوں، مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا مناظر احسن گیلانیؒ مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا محمد میاں صاحب میں اس علمی رجحان کو نمایاں اور قوی تر پاتے ہیں۔ علامہ انور شاہؒ کی علمی تحریک کا نتیجہ

اس نوخیز علمی نسل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مولانا کے اسلوب تحقیق کو خاص شکل دینے۔ اور منفرد مقام دلانے میں، یہ سب حالات اور خود ان کی شخصیت کے اوصاف کمال شامل ہیں۔ قدرت نے ان کو قدسی تخیل، اور ملکوتی فکر سے نوازا تھا۔ ان کا شعور، عرشی قندیل تھا جو تیرگی میں بھی نور بکھیرتا رہا۔

مولانا کے طرز تحقیق میں سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ فنی انداز کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اور قلم کی گلکاریوں میں حقیقت کے حسن کو نہیں بھول جاتے۔ ان کی نگاہ اپنے ہر جملے اور ہر لفظ پر ہوتی ہے۔ قرون وسطیٰ کے علماء کی طرح وہ خالص فنی شعور اور حدود کے ساتھ بحث کرتے ہیں۔ وہ ایسے اجتہاد کے شکار نہیں ہیں، جو بسا اوقات فنی عدم استعداد کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور زمانہ جدید کے بہت سے مصنفین میں پایا جاتا ہے۔ اسی بنا، پر فنی اعتبار سے، مولانا کی تالیفات، اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتی ہیں۔ اقتصادیات کے موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی "اسلامی معاشیات" کے نام سے قلم اٹھایا لیکن جو بات مولانا کی تالیف "اسلام کا اقتصادی نظام" میں ہے۔ وہ اس میں نہیں۔ بلاشبہ "اسلامی معاشیات" میں ایک بڑا مواد یکجا ہو گیا ہے۔ لیکن فنی اعتبار سے اس تالیف کی قدر وقیمت بہت کم ہے۔ کسی موضوع پر ایک بڑا مواد جمع کر دینا اور اس کو بہتر طور پر پیش کرنا ایک قابل تعریف بات ہے۔ لیکن خالص فنی انداز میں کوئی تالیف کرنا، قابل تعریف ہی نہیں بلکہ دشوار ترین بات ہے۔ تقابلی مطالعہ جچے تلے انداز میں اصول کی نشاندہی، موضوع کا منطقیاً اثبات، اور فنی استدلال۔ یہ سب کچھ ہو تو ایک فنی تالیف وجود میں آتی ہے۔

مولانا کے اسلوب تحقیق کا دوسرا بڑا وصف تجزیہ و تحلیل ہے۔ ہر مسئلہ پر اپنی رائے پیش کرنے اور نتیجہ نکالنے سے قبل، وہ زیر بحث مسئلہ کو ناظر کے سامنے کھول کر بیان کرتے ہیں۔ پھر اس پر بڑے جچے تلے انداز میں فلسفیانہ استدلال سے کام لیتے ہوئے اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں۔ ان میں تحقیق و تلاش اور حقیقت رسی کی بے پناہ صلاحیت ہے، وہ کھلے اور آزادانہ ذہن سے کام لیتے ہیں۔ کسی قسم کے علمی تعصب کو دخل انداز ہونے نہیں دیتے۔ اور یہی وصف ہے۔ جو ان کو ایک بلند محقق کے مرتبہ تک پہونچاتا ہے

ان کے اسلوب تحقیق کی تیسری بڑی صفت یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے، دین کے سرچشمے، یعنی قرآن و حدیث، کو اپنے استدلال کا ذریعہ بناتے ہیں۔ پھر سلف صالحین کی توجیہہ و تشریح کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اور سب سے آخر میں اپنے وجدان کو اپنی دلیل بناتے ہیں۔ ان ہی اوصاف کی بنا پر مولانا کو جدید علم کلام کی تاریخ میں خصوصی مقام دیا جائے گا۔

طرز تحریر

جس طرح وہ ایک صاحب طرز محقق تھے۔ اسی طرح وہ ایک صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ چنانچہ وہ اپنا ایک خاص اسلوب تحریر رکھتے ہیں۔ ان کے اسلوب تحریر میں نہ مشہور عام عالمانہ ثقافت ہے۔ اور نہ ہی متبذل قسم کی کوئی چیز۔ موقعہ و محل کے اعتبار سے ان کا قلم اسلوب بناتا جاتا ہے۔ وہ تحقیق کے مواقع پر انشا پردازی یا لفاظی سے کام نہیں لیتے، اسی لئے اگر ایک جانب، ان کی سنجیدہ تالیفات میں، عالمانہ اور مقالاتی زبان کی سنجیدگی اور متانت ہے تو دوسری جانب، عام اردو داں طبقہ کے لئے لکھی گئی کتابوں میں وہ انتہائی سلیس اور رواں و عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں۔ فہم مخاطب کے اعتبار سے ان کا انداز بیان تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ اور یہی بلاغت کا معیار ہے۔ چونکہ ان کی شخصیت مجلسی تھی۔ اور عوام سے ان کا براہ راست تعلق تھا۔ اس لئے وہ بیک وقت دو قسم کے انداز بیان اختیار کر سکتے ہیں۔ قصص القرآن، اخلاق و فلسفہ اخلاق اور اسلام کا اقتصادی نظام کا انداز بیان خالص علمی و مقالاتی ہے جب کہ "بلاغ مبین" اور "رسول کریم" کا انداز بیان، نہایت آسان فہم اور سلیس ہے۔ چنانچہ آخر الذکر دونوں کتابوں کا، ایک ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "اسلام ایک نیچرل مذہب ہے، اور اس کی نظرت، فطرت الٰہی و قانون قدرت کے موافق ہے، بے شک وہ جوگیانہ اصول پر عمل پیرا ہونے کا مدعی نہیں ہے اور نہ وہ رہبانیت کی اس تعلیم کو پسند کرتا ہے کہ کسی غار میں، یا پہاڑ کی چوٹی پر، زندگی یا زندگی کا بیشتر حصہ انسانوں کی خدمت سے جدا ہو کر گزار دو۔ اور خدائے برتر کے اس کارخانۂ نظم و نسق کو یونہی کسی صحیح نظام اور امن پسند دستور و آئین کے بغیر چھوڑ دو۔"
>
> (بلاغ مبین)

"فتح مکہ کے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب عزت واحترام کے ساتھ مکہ معظمہ میں داخل ہو گئے تو قریش ہی سے ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر خوف ودہشت کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ اور منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی۔ آپ نے نہایت شفقت ومہربانی سے، ارشاد فرمایا "گھبراؤ نہیں! اور خوف کو دل سے نکالو میں قریش ہی کی ایک خشک گوشت کھانے والی عورت کا بیٹا ہوں"

(رسول کریمؐ)

یہ دونوں اسلوب دراصل ایک ہی اسلوب کے دو رنگ ہیں۔ اور ان سے، ان کے منفرد اسلوب پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسلوب کا معنوی ربط اور درجہ تو بہر حال یکساں ہے۔ رہا ہیئت اور لفظوں کی ظاہری کیفیت کا سوال تو اس کا تعلق مولانا کی شخصیت کے دو پہلوؤں سے زیادہ ہے۔ ایک تو وہ سنجیدہ اور علمی پختگی کا پہلو، دوسرا ان کی ہر لمحہ مضطرب سیاسی زندگی کا پہلو، مختصر یہ کہ ایک بلند پایہ محقق اور عالی مرتبہ ادیب کی حیثیت سے ہم کبھی بھی ان کا نام فراموش نہ کر سکیں گے۔ فقط

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

حضرت مجاہد ملت کی ہمہ گیر شخصیت پوری انسانیت کے لئے ایک نمونۂ زندگی ایک اسوۂ رسول کا مکمل عکس اور العلماء ورثۃ الانبیاء کا اکمل ترین پرتو تھا، ہر وہ شخص جس نے آپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے وہ آپ ہے وہ آپ کی بے پناہ محبت آپ کے بے لوث خدمات اور آپ کے والہانہ ایثار وقربانی کا بجا طور پر معترف ہوگا، اور اس سے انکار جوہر کی ناشناسی اور ایک حقیقت کا ٹھکرانا ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ آپ نے اس فرقہ پرستی سے متاثرہ دور میں فرقہ پرستی کے انسداد کے لئے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں کہ وہ ہماری موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے ایک گرانقدر انعام ہے، اور ایک ضابطۂ عمل بھی،

اور اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ حضرت مولینا نے اس نازک دور میں جس طرح جمعیۃ علماء ہند اور قوم پرست مسلمانوں کی طرف سے قومی اتحاد اور فرقہ پرستی کی روک تھام کے لئے اس تندہی اور انہماک کے ساتھ نمایاں کام انجام دیئے کہ اس کی کوئی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے، اور چونکہ آپ کے یہ تمام تر خدمات نام ونمود اور مفاد پرستی کی سمیّت سے الگ تھلگ ایک خدمت قوم اور خدمت وطن کے لئے اخلاص کی صورت میں وجود پذیر ہوتے تھے، اس لئے ہمہ وقت آپ کا توکل اور بھروسہ اس ذات اقدس پر ہوتا تھا، جس پر آپ کا ایمان ویقین تھا، چنانچہ اس کی ایک ادنیٰ مثال آپ کا وہ لازوال مقولہ ہے جو آپ نے کبھی کسی موقع سے آل انڈیا کانگریس کے موجودہ صدر جناب ڈی سنجیویہ سے انھیں اولوالعزمی اور ارادے کی پختگی کی طرف ہمت دلاتے ہوئے فرمایا تھا۔ جس کو ہمارے صدر موصوف نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے، کہ "میں نے ایک اہم معاملہ میں ان سے گفتگو کی تھی اور انھوں نے مشورہ دیا تھا، کہ خدا پر بھروسہ رکھو صحیح کام کرو اور نتیجہ خدا پر چھوڑ دو" آپ کی اس نشان دہی میں کتنا وزن اور کس قدر اعتماد ہے، اس کو ہر ذی شعور اور باہوش انسان خود سمجھ سکتا ہے۔

بہرحال آپ کی عالمگیر شخصیت اور آپ کی مجاہدانہ اور وطن پرورانہ زندگی پوری دنیا کے لئے مشعل راہ ہے۔

مولانا اور فلسفۂ اخلاق

پروفیسر خواجہ محمد عبدالحی صاحب
شعبۂ فلسفہ ونفسیات۔
دیال سنگھ کالج۔ نئی دہلی

ہماری زندگی کی ابتدا اور انتہا کی پیدائش کا مبدا ان مادّیاتی نقطۂ نگاہ سے صرف انفرادی یا اجتماعی شعبہ ہائے حیات ہی نہیں ہیں بلکہ روحانی، ذہنی اور علمی حیثیت کو اگر زیرِ فکر لاکر صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو تصویر اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور اس کے اصلی اور اہم رُخ سامنے آجاتے ہیں۔ کون وفساد، حقیقت ومظاہر، اصلیت راز اور ظواہر، روح ونفس، ہستی مطلق، ہستی مقید ومخصوص، خالق ومخلوق اور شہود ومشاہد وغیرہ مسائل سے وابستہ خیالات ماضی ۔ بہت دور کی ماضی سے ۔ چلے آرہے ہیں ۔ کتنے خیالات ہیں؟ اور کتنے ان کو خیالات کا جامہ پہنانے والے؟ فلسفہ کیا ہے؟ کیا ایک فلسفہ ہے یا بہت سے فلسفے؟ جتنے ذہن اتنے خیالات اور جتنے منہ اتنی باتیں۔

اگرچہ خاموشی سے کام کرنا ایک بڑی خوبی ہے لیکن کچھ لمحات ایسے ہوتے ہیں کہ "احساس" کی دنیا میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ ایسے موقعہ پر زبان یا قلم کا جنبش میں نہ آنا ایک رُوحانی اور اخلاقی گناہ ہوتا ہے۔ احساسات کا سیلاب خطرناک بھی ہوتا ہے۔ لیکن ادراک تفکر کے سایۂ عاطفت میں بڑی امن مل جاتی ہے۔ اچھے آدمیوں کی رحلت ذہن ودماغ کو معطل کرنے والی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ان سے وابستگی کے راستے مختلف ہوتے ہیں کسی عالم، مفکر اور فلسفی سے رشتہ کی نوعیت رُوحانی، عقلی، ذہنی یا علمی ہوا کرتی ہے۔ یہ رشتہ اٹوٹ ہے، ایسے اصحاب کو ان کے ارشادات اور دیگر کارناموں کی وجہ سے سرمدیت حاصل رہتی ہے۔

ظاہری حیات کا عرصہ تنگ ہے بلکہ بہت تنگ اور اسی لئے اس کی قدر کی جاتی ہے۔ یہ زندگی کے لمحات قیمتی ہوتے ہیں لیکن قیمت کا معیار اور فیصلہ افراد، جماعتیں اور قومیں اپنی اپنی طرح اور الگ الگ کرپاتی ہیں۔

ماہ اگست کو ہمارے ملک کی تاریخ میں اچھا مقام حاصل ہے۔ ۱۹۶۲ء کی دو اگست کی صبح وشام اپنی مادّی تابناکی اور جگمگاہٹ کے باوجود ہندوستان کی عام فضا میں عموماً تعلیمی دنیا میں خصوصاً اپنی تاریکی میں بے مثال ثابت ہوئی۔ ہم سے ایک عالم، ایک سیاست داں، صوفی فلسفہ داں درویش کنارہ کش ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ علم وعمل کے توازن کا نادر نمونہ ہمارے سامنے نہ رہا۔ خدا پرستی وقوم پرستی کے معتدل مزاج کی تصویر کا رخ ہماری طرف سے پھر گیا۔ اسلامی تعلیمات، اور اُن کی فلسفیانہ بنیادوں کے ترجمان سے ہم محروم ہوگئے۔ انسان دوستی، فرض شناسی، عقلمندی اور جرارت ایسے اوصاف سے متصف شخصیت کو ہم نے کھودیا یہ وقت عبارت آرائی کا نہیں حق گوئی کا ہے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت اور سوانح حیات کے لب لباب کو اگر ایک لفظ میں ادا کیا جائے تو وہ ہے "حق گوئی"۔ حق کا مفہوم واضح کرنا آسان نہیں۔ فلسفہ ہزاروں سال کی جد وجہد کے باوجود اس مفہوم کو متعین نہ کرسکا اور سائنس اپنی روحانی بے مائیگی کی وجہ سے ان مسائل سے دوچار نہیں ہو پاتی۔ ہاں اور پھر "حق گوئی" اور بھی مشکل ہوجاتی ہے لیکن اس روزمرہ کی زندگی میں کسی بات کو اپنے طور پر "حق" خیال کرتے ہوئے بھی "حق گوئی" کی مثالیں پیش کرنے والے بہت کم ہی مل پاتے ہیں۔

ہندوستان بڑا خوش قسمت ملک ہے۔ بڑے بڑے انقلابات کے باوجود یہاں کا فلسفہ اپنی انفرادیت قائم رکھ سکا۔ مسیحؑ اور محمدیؐ پیغامات یہاں پہنچے۔ اور آج تک مذہبی دنیا کا جہاں تک تعلق ہے اپنی اپنی انفرادیت اور عظمت کے ساتھ مذاہبِ ہند کی صف میں اپنا مقام لئے ہوئے ہیں۔ مولانا مرحوم کے فلسفہ کی مبادیات کیا ہیں؟ کائنات کے متعلق اُن کا نظریہ کیا ہے؟ کون وتکوین اور تشریح کا مفہوم، مصداق اور طریقۂ تشکیل سے وابستہ وہ کیا رائے رکھتے ہیں؟ حیات، احساس اور علم وادراک ایسے بنیادی مسائل ہیں۔ وہ کیا خیالات رکھتے ہیں؟ وجدان، تخیل، تعقل اور پھر فہم وافہام اور تفہیم کی حقیقت اور اُن کے لواحقات سے وابستہ انھوں نے کیا کہا؟ خیر وشر، حسن وقبح اور حسن وتحسین، اچھے بُرے اور صحیح وغلط کے سلسلہ میں مولانا مرحوم نے کن بنیادی نظریات کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس مختصر تبصرہ سے بالاتر مسائل ہیں۔ مولانا ایک جگہ فرماتے ہیں ۔ "انسانی تخلیق کے بارے میں صرف تین رائیں پائی جاتی ہیں (۱) انسان خدائے برتر کی بہترین ایجاد ہے اور اس کی صناعی کا بہترین شاہکار اور یہ کہ وہ مستقل مخلوق ہے نہ کہ کسی تدریجی ترقی کا نتیجہ (۲) انسان کی ہستی قوانین طبعی کے زیر اثر بخت واتفاق کا نتیجہ ہے یہ کسی خالق کی مخلوق نہیں (۳) انسان کی تخلیق قوانین قدرت کے اصولوں کے مطابق تدریجی ارتقاء سے ہوئی ہے اور وہ مستقل مخلوق ہوکر عالم وجود میں نہیں آیا۔ تمام اہل مذاہب اور بعض علماء طبیعی پہلی رائے کے قائل ہیں۔" مولانا نے تفصیلی طور پر آخری دو نظریوں کی تردید کی ہے اور اخلاقی قدروں کے لئے قرآنی ارشادات کو بنیاد قرار دیتے ہوئے ناقدانہ طرزِ استدلال کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔

عام فلسفیانہ مسائل کے بارے میں مولانا کی رائے سے پہلے ہم کو اُن کی شخصیت کی طرف دیکھنا ضروری ہے۔ مولانا ایک مسلمان عالم باعمل تھے۔ تخلیق عالم کے سلسلہ میں ان کے نظریہ کی بنیاد قرآن کریم کے اس ارشادِ عالی سے قائم ہوتی ہے۔ "واذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خلیفہ ۰ الایۃ۔ اور کنت کنزاً مخفیاً فاحبیت ان اعرف فخلقت الخلق ۔ الحدیث۔

نظریۂ علم کی نوعیت اس مندرجہ ذیل ارشاد باری تعالیٰ سے ماخوذ اور اسی پر من وعن مبنی ہے۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الاسماء کلّھا۔ الآیتہ۔ چنانچہ مولانا حواس کے ذریعہ حاصل ہونے والی واقفیت کو اضافی، وقتی اور عارضی مانتے ہیں۔ یہ احساس یا تجربہ آخری اور حتمی جانکاری کا ذریعہ نہیں۔ اس کے ذریعہ ہم کو ان اشیاء کا اندازہ ہوجاتا ہے جو مظاہر اور ظواہر کی دنیا میں ہیں۔ حقیقت اور اصلیت کے راز و رموز کے لئے دوسرا راستہ ہے اور وہ ہے تعلیم ربّی خواہ وحی کی شکل میں ہو یا الہام، مشاہدہ یا خواب کی۔

مسئلۂ تکوین کے سلسلہ میں مولانا مرحوم دیگر مذاہب سے اتفاق کرتے ہیں جو خالق حقیقی کو مبدأ حیات، تکوین اور مسبب الاسباب قرار دیتے ہیں۔ مسئلۂ تکوین کے بارے میں مولانا کی یہ تحریر ان کے فلسفہ (کسی مفہوم میں) اور مذہبی شخصیت کو واضح طور پر روشن کردیتی ہے

"ہمارے دائرہ سے یہ باہر ہے کہ ہم "نظام تکوینی" سے بحث کریں۔ بلکہ ہم صرف "نظام تشریعی" (قانون تشریع) ہی کے دائرہ میں محدود رہ کر بحث کرسکتے ہیں۔" اسلام کا اقتصادی نظام صفحہ ۴۸۔

"اخلاق" کے بارے میں "انّک لعلی خلق عظیم" سے ایک معیار اعلیٰ مولانا کے عقائد میں شامل ہے۔

معیار شخصیت "ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" ارشاد عالی سے منشرح ہونے والے زرّیں اصول "تقویٰ" کو قرار دیا ہے۔

حیات اور اس کی قدر و قیمت، عبادت و ایثار وغیرہ کا منشا اور ان سے وابستہ مقاصد "ان صلوٰتی و نسکی ومحیای ومماتی للّٰہ رب العالمین" فرمان پاک سے متعین ہوتے ہیں۔

مبدأ و معاد کے لئے انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ایک جامع و مانع کلیہ ہے جو منشار تخلیق اور مقصد تخلیق دونوں کو واضح کرتا ہے۔

مختصراً مولانا کے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہے۔ مولانا کو ایک فلسفی کا مقام اس لئے نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اس میدان میں منطقیانہ انفرادیت نہیں رکھتے ان کو سقراط، افلاطون وارسطو یا ان کے علاوہ دنیا کے کسی خطہ میں شروع ہونے والے سلسلے میں منسلک کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن فلسفۂ مذہب اور پھر خصوصاً مسلم فلسفہ یا اسلامی فلسفہ کے علماء میں مولانا کا ایک اچھا مقام ہے۔ مولانا کی زندگی سیاسی امور سے وابستہ رہی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سیاسی ہنگاموں میں مولانا کی مثال "طوفان" اور "دیا" کی رہی اگرچہ باد صرصر یا پھونکوں سے یہ چراغ گل نہ ہوا لیکن ہر دیا ایک وقت معین تک ہی ضیاء پاشی کرسکتا ہے بحیثیت مجموعی مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ براہ راست فلسفہ سے وابستگی میں نہیں گزرا۔ مگر جو کچھ ہمارے سامنے اُن کے ارشادات ہیں ان سے ان کے بارے میں رائے قائم کی جاسکتی ہے

ایک طرف مشہور فلسفی کانٹ کی معقولیت اور منطق کی جھلک مولانا کے فلسفۂ اخلاق میں ہے اور دوسری طرف الغزالی کی فلسفیانہ ترجمانی موجود ہے۔ وجود باری تعالیٰ، روح حیات ثانیہ، وحی و الہام اور مقصدیت مولانا کے فلسفۂ اخلاق کی بنیادیں ہیں بحیثیت مجموعی مولانا کا "اخلاقیات" اسلامی اخلاقیات ہے۔ مذہب کو تقدم حاصل ہے۔ اور "اخلاقیات" کی تکوین و تدوین کی حقیقت و حدود اور خصوصیات مذہب مقرر کرتا ہے۔ "قلب" کا کام یقین کرنا ہے اور "عقل" ان سب کی ترجمان۔ "احساس" اور "لذت" کو مولانا کے فلسفۂ اخلاق میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ذرائع کی فہرست میں آتے ہیں بذات خود مقاصد نہیں انسان کی انسانیت، اس کی روحانی، قلبی اور وجدانی وعقلی حیثیات میں مضمر ہے۔ جسم، حواس اور جبلتی تقاضے محض ہماری حیوانیت کے ساتھ قدرتی طور پر وابستہ ضرور ہیں۔ اور اسی حد تک ان سے متعلقہ امور کو روح، ذہن یا قلب مطمئن کے احکام کی پابندی کے ساتھ اس حیات عارضی میں نباہا جاسکتا ہے۔

الغزالی کی طرح مولانا جذبات کی ہستی اور ان کی مخصوص حقیقت کے قائل ہیں۔ جسمانی جذبات اور جنسی لذت کا قلع قمع انفرادی یا اجتماعی طور پر انسان کی بھرپور زندگی نہیں بلکہ وہ اس معنی کر قطعاً غیر فطری بن جاتی ہے کہ اگر اس قسم کی کسی خوبی (ایسا سمجھ کر) ہر شخص منقدف ہوتا جائے تو نظام عالم قبل از وقت ہی اپنے کبھی ہوسکنے والے اختتام کو پہنچ جائے گا۔

کسی "نظریہ کی سچائی"، "خوبصورتی" اور "اچھائی" کے سلسلہ میں مولانا دو بنیادی باتوں کے قائل نظر آتے ہیں۔ ایک یکسانیت وہمواریت اور دوسری جامعیت وہمہ گیری لیکن مولانا منطقی پابندیوں میں الجھ کر جذبۂ شوق، عشق، اور جمالیاتی اور جبلتی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرتے

انسان کی قوت ارادی اور اس کے ارادہ کی فطرت ونوعیت اور اسکے اختیار کے سلسلہ میں ضمنی طور پر جو کچھ کہیں کہیں سے اندازہ ہوسکا ہے مولانا کسی حد تک عام علماء نفسیات کے ساتھ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہاں بھی وہ بنیادی طور پر اسلام کے مسئلہ تقدیر اختیار و جبر سے والبتہ متعدد آراء میں سے اہل سنت والجماعت کے مسلک پر ہیں اور ممتاز طریقہ پر یہاں ان کا مسلک حنفی متکلمین کا ہے۔

فعل اختیاری کی اچھائی یا برائی کے فیصلہ کے لئے معیار مولانا "نیک نیتی" یا "حسن نیت" کو قرار دیتے ہیں۔ اس کی بنیاد یورپ کے عہد وسطیٰ یا عہد جدید کے فلسفیوں کے نظریات نہیں بلکہ یہ معیار اس ارشاد نبوی سے قائم ہوتا ہے "انما الاعمال بالنیات"

مختصراً اعمال کے حسن و قبح کے سلسلہ میں مولانا "اسلامی طرز زندگی" کو اخلاقیات کی ہدایت میں بھی اصول اخلاق اور فلسفۂ اخلاق سے قریب تر سمجھتے ہیں جہاں انسان کچھ سادہ تا ایسے بنیادی امور کا مکلف ہوتا ہے مثلاً وہ ذہنی طور پر اس بات کا

یقین رکھتا ہے کہ وہ ہر لمحہ حاکم حقیقی کے سامنے حاضر ہے۔ سچائی ہی دکھ اور پریشانی سے نجات پانے کا راستہ ہے۔ اتفاق اور صلح ہی میں عافیت اور خیریت ہے حقیقی سرداری اپنے ہم جنسوں کی خدمت کرنا ہے۔ مادی ذرائع کے استعمال میں اعتدال ہی ان کا مناسب استعمال ہے۔ یہ زندگی ایک چلتی پھرتی چھایا ہے۔

اخلاق کا تعلق بنیادی طور پر اجتماع سے ہے۔ عملی طور پر اخلاق اور حسن اخلاق کے لئے ایک سے زیادہ افراد کی ضرورت ہے صرف ایک فرد واحد اگر کسی طرح تجرد کی زندگی کسی ایسے گوشہ میں گذار رہا ہے کہ جہاں دوسرے افراد کی کسی طرح رسائی نہ ہو اور وہ بھی اپنی جگہ دوسرے افراد سے قطعاً بے نیاز ہو تو اس کی زندگی نہیں کہا جاسکتا کس نوعیت کی ہوگی مگر وہ شخص انسانی حقوق و فرائض کی دنیا سے بہت دور رہو گا اور وہاں اخلاقی زندگی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوسکتا۔ "اخلاق" کا سوال "فرد اور جماعت" کے باہمی امتزاج سے وابستہ ہے۔ مولانا نے اجتماعی زندگی اور فرد و جماعت کے رشتہ کو اسلام کے نظریۂ اخوت اور انسان دوستی کے تحت (متعدد جگہ) واضح کرکے یہ ثابت کیا کہ فرد کی انفرادیت اور جماعت سے وابستگی میں اعتدال چاہئے اور اسی اعتدالیت میں اس مسئلہ کا حل اور فرد کی خوبی پوشیدہ ہے۔

حق حیات یا زندگی کا حق اور آزادی، انفرادی اور اجتماعی، وغیرہ حقوق کے سلسلہ میں مولانا ان کو "اخلاقیات" کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں۔ "آزادی" کے مفہوم کی وضاحت مولانا علماء متکلمین کے ساتھ ہو کر "آزادی" محدود کے قائل ہیں اور اخلاقی زندگی کے لئے آزادی اور حدود دونوں کو لازم خیال کرتے ہیں۔ "جبر مطلق" اور "آزادی مطلق" دونوں میں سے کسی ایک کے لئے "اخلاقیات" میں کوئی گنجائش نہیں۔ آزادی کے لفظ کے ساتھ دو لفظ اور آتے ہیں۔ "آزاد" اور "غلام" یہ الفاظ اسلامی تاریخ و ادب کے اندر ہی خصوصیت کے ساتھ استعمال نہیں ہوئے بلکہ ان کی وابستگی اسلام سے پہلے اور بعد ظہور اسلام غیر اسلامی دنیا سے بہت کچھ رہی ہے۔ اور آج تک (شاید) نام کے فرق کے ساتھ کم و بیش بہت سی جگہ موجود ہے اور موجود رہنا کسی حد تک ناگزیر بھی ہے۔ اس مسئلہ پر مولانا نے کئی طرح روشنی ڈالی ہے یہاں حضرت مولانا کی تالیف "اخلاق اور فلسفۂ اخلاق" کے صفحات ذیل خاص طور پر قابل ملاحظہ ہیں۔

از "بہرحال .... صفحہ ۲۹۸ ...... تا ... خیال رہے" صفحہ ۳۰۰

حقوق و فرائض اور فضائل و رذائل کے سلسلہ میں مولانا مسلمان فلسفیوں کے ساتھ ہیں۔ مولانا اسلام کے "رواداری" کے عام رجحانات سے بہت متاثر ہیں "تعاون" "مقاومت" "امداد و ایثار" ایسے اوصاف کے لئے "اخلاقیات" میں مولانا کے نزدیک اہمیت حاصل ہے۔

فارابی، ابن قیم، ابن رشد، الغزالی، ابن مسکویہ وغیرہ کی فلسفیانہ ترجمانیاں مولانا بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مستفیض بھی ہوتے ہیں۔ فارابی کے نظریہ "سعادت" ابن رشد اور الغزالی کے نظریہ "اخلاق میں تبدیلی"۔ ابن قیم کے ہمہ گیر مفہوم "خلق" کی مولانا مکمل تائید کرتے ہیں۔

فضائل و رذائل کے سلسلہ میں مولانا کے اقوال و آراء دیگر مسلم فلسفیوں کی طرح چند ایک مقامات پر فلاسفۂ یونان سے مل جاتے ہیں لیکن یہ محض اتفاق ہے۔ مولانا "مکارم الاخلاق" کے ترجمان ہیں اور ان کی تفصیلات ہی مولانا کے اخلاقیات کی جزئیات ہیں لیکن حقیقی طور پر یہ "مکارم الاخلاق" فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جہاں کہیں بھی کسی بھی ذہن انسانی نے کچھ نہ کچھ صحیح طور پر فطرت کا مطالعہ کیا اور اس کو سمجھا ہے اور اظہار کیا ہے۔ تو وہ ان "مکارم الاخلاق" کے یقیناً کچھ نہ کچھ مشابہ ہوگا مزید براں ایک اور بات کا بھی یہاں ذہن نشین رہنا ضروری ہے۔ فلسفہ کے مدون اور مستند طریقہ پر آغاز کے لئے تاریخ چند یونانیوں کے نام دکھلاتی چلی آرہی ہے۔ اس کے وجوہات کچھ بھی ہوں اور آئندہ تحقیقات کسی بھی نظریہ کی تشکیل کا باعث بن سکیں۔ یہ آگے کی بات ہے۔ فلسفہ کی ابتدا یونان میں ہوئی، ہندوستان میں یا کہیں اور • ایک پیچیدہ مسئلہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ انسان، خواہ اس کے ثبوت اور پیدا کردہ خیالات و نظریات کسی بھی شکل میں بنے اور مٹے ہوں۔ انسان کا شعور ان یونانیوں سے کہیں پہلے بیدار ہوچکا تھا لیکن تاریخ کی بے بسی یا ستم ظریفی کچھ بھی کہا جائے۔ اب تک جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے وہ یہ ہے کہ تمام علوم و فنون کے سلسلے انھیں چند یونانی علماء کے ناموں کے ساتھ وابستہ کردیئے جاتے ہیں اور بس یہ ایک حد آغاز بن جاتی ہے۔ اور تحقیق، تنقید اور تبصرہ کا معیار بھی اسی طرح قائم ہوتا ہے۔ جب اسلامی تعلیمات اطراف عالم میں پھیلیں تو ظاہر ہے علماء زمانہ نے ان کو انھیں رائج الوقت فلسفیانہ طرز و طریق سے جانچا اور بطور نتیجہ مسلم عالموں (فلاسفۂ اسلام) کو بھی انھیں طرز و طریق کے لحاظ سے سمجھانا اور ثابت کرنا پڑا۔ اس کا قدرتی طور پر یہ اثر ہونا تھا کہ فضائل اور رذائل کی یونانی فہرست اور اسلامی فہرست کے درمیان یکسانیت اور رشتہ بہت اجاگر ہوگئی اور متعصب شخصیتوں نے اس سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اس کو بنیاد بناکر یہ اعتراض کردیا کہ یہ اخلاقیات اپنی جزئیات میں یونانی اخلاقیات سے وابستہ ہیں یا وہاں سے مانگ لیا گیا ہے حالانکہ ایسا نہیں اور نہ تاریخ اس کو ثابت کرسکی۔ مولانا بھی اپنے طرز استدلال میں یہی روش اختیار کرتے رہے ہیں اور ہمارے اسلامی مدارس میں یہی طرز استدلال تاحال رائج ہے ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اپنی ابتدا وارتقاء مبادیات، عناصر، تفصیلات و جزئیات، موثرات و عوامل اور اثرات، ہر لحاظ سے اپنا مستقل وجود رکھتی ہیں۔

مولانا نے اسلامی نظریات، قدروں اور معیاروں کی فلسفیانہ طور پر رائج الوقت اصول اخلاق کے طرز استدلال کو نبا ہتے ہوئے ترجمانی کی ہے، عالم اسلام خصوصاً مسلم فلسفہ اور اردو سے وابستہ طبقوں کیلئے مولانا کی یہ ترجمانیاں شمع راہ ہیں اور قابل فخر سرمایہ بھی۔ طالب علموں

دانائے راز "حضرت مولانا حفظ الرحمن مجاہد ملت"

از

(ہز ہائی نس نواب مرزا امین الدین احمد خاں صاحب آف لوہارو)

مجھ سے اور میرے خاندان سے جو قدیم و ذاتی تعلقات مولانائے موصوف کے تھے اسی نسبت سے میں نے مولانا موصوف کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ لہٰذا میں ڈاکٹر اقبال کی زبان سے یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ :- بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جب کبھی مولانا سے متعلق پچھلے حالات اور موجودہ واقعات بالمقابل سامنے آتے ہیں تو دل پر ایک خاص حالت طاری ہو جاتی ہے۔ خاص کر جب دنیائے تصور میں ان کو باوجود پیرانہ سالی ان تھک حالت میں مصروف جد و جہد پاتا ہوں اور ساتھ ہی ان جیسی بے غرض اور سراپا خلوص ہستی سے وطن کو خالی دیکھتا ہوں تو مایوسی کی تاریکی میں کوئی راہ عمل نظر نہیں آتی۔

مولانا کی ذات گرامی ایک مرنجان و مرنج ہستی ہی نہ تھی بلکہ وہ اس ہمہ گیر قابلیت کے مالک تھے کہ جس کے باعث وہ ہر اعلیٰ سے اعلیٰ مسندِ قیادت اور بڑی سے بڑی ذمہ داری کے لئے باعث فخر تھے۔ اور کسی قسم کی اجنبیت دیئے کا تک محسوس ہوئے بغیر مساوات و جمہوریت کی بے مثال مثال تھے۔ وہ گلستان ہند کے ایسے دیدہ ور چمن آرا تھے جسے کانٹوں سے الجھ کر آبیاری گل و ریحان کا بڑا سلیقہ تھا وہ صرف مجاہد ملت ہی فی الواقع نہ تھے بلکہ مصلح قوم و محب وطن اور باہوش و خرد رہنما بھی تھے۔ ان کی اس خصوصیت کا کوئی جواب نہ تھا کہ وہ جب بعد از غور و خوض کسی بات کو صحیح مان لیتے تھے تو پھر میدان عمل میں آنے سے ان کو کوئی قوت اور بڑی سے بڑی طاقت روک نہیں سکتی تھی۔

مولانا میدان سیاست کے بے جگر سپاہی اور تہور آب جنرل کی حیثیت سے بارہا باطل کے خلاف لشکر کشی کرتے اور مظفر و منصور ہوتے دیکھے جا چکے ہیں اور اسی طرح تقریر کی اسٹیج پر بہترین خطیب مقرر اور ناصح و واعظ پائے گئے ہیں جو انھوں نے حمایت حق و صداقت اور خیر خواہی ملک و بہبودی وطن کے ذیل میں بارہا پارلیمنٹ کے پلیٹ فارم سے دو ٹوک اور برجستہ کیں۔

ان کی عقابی نظر ملک کے ہر حصہ پر یکساں پڑتی تھی اور تہ تک پہنچ جاتی تھی۔ وہ ہر مرض ملت کا مداوا اور ہر تکلیف بنی نوع کے ازالہ کی تدابیر کے لئے وقف کئے ہوئے تھے۔ ان کو بیرون کے مسلمانوں سے بھی اتنی ہی ہمدردی تھی بلکہ زیادہ سے زیادہ کسی دوسرے مقام کے طبقہ اہل اسلام سے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ وہ جب اپنے معالجہ کی غرض سے امریکہ کے لئے پا برکاب تھے اور مرض میں کافی شدت تھی تو میں ان کی مزاج پرسی کے لئے دہلی گیا مولانا سے نیاز حاصل کیا۔ مزاج پرسی کا جواب اور رسمی گفتگو کے بعد انھوں نے معائنے پورہ کے مسلمانوں کے حالات و مسائل پر استفسارات شروع فرما دیئے۔ وہ اپنی تکلیف کو بھول کر نہایت سکون و اطمینان سے بہت دیر اس موضوع پر مجھ سے گفتگو فرماتے رہے۔ ان کے ہر فقرے سے جذبات خلوص و ہمدردی پھوٹے پڑتے تھے۔

مولانا ہر طبقہ خیال کے لوگوں کے جذبات و معتقدات سے بھی خوب واقف تھے اور وہ ایک جید عالم، مفکر، مبصر، رہنما اور بیدار مغز مدبر بھی تھے اور صلح کل پیشوا بھی۔

مولانا کی وفات پر ملک کے مایۂ ناز اور ہر دلعزیز وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے جن تاثرات کا اظہار تعزیتی پیغام اور اپنی متعدد تقاریر میں کیا ہے۔ اس سے مولانا کی عظیم شخصیت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

میری دلی تمنا ہے کہ اس ناقابل فراموش فدائے ملت و وطن کی یادگار اس کے شایان شان قائم کی جائے اور اس کی مفصل سوانح عمری موجودہ اور آئندہ نسل کی رہنمائی و بصیرت کے لئے پوری آب و تاب کے ساتھ شائع کی جائے۔

آخر میں مولانا کے لئے دست بدعا ہوں کہ حق تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے اور اپنے جوار رحمت سے سرفراز کرے اور ان کے پسماندگان و احباب اور عامۃ المسلمین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ (آمین)
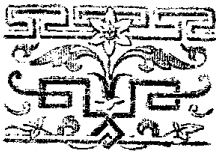
نالۂ غم

مولانا حالی مرحوم کے رنگ میں

از:- محمد مسلم مدرس مدرسہ بدرالاسلام، شاہ گنج۔ جونپور

حیف صد حیف ہو گیا رخصت
اس جہاں سے مجاہدِ ملت

ہاں وہ سرشارِ بادۂ وحدت
جان و دل سے تھا عاشقِ سنت

نازشِ ملک حافظِ ملت
قوم کے حق میں باعثِ عزت

صاحبِ فکر، مالکِ ہمت
چشمۂ خلق، پیکرِ جرأت

تھا یقیناً وہ بطلِ حریت
دلِ اعداء میں اس کی تھی ہیبت

ملک و ملت کے حق میں بے شبہ
ذات اس کی تھی باعثِ رحمت

دوستوں سے اسے نہ شکوہ تھا
دشمنوں سے اسے نہ تھی نفرت

وہ محبت کا اک سمندر تھا
نوعِ انساں سے اس کو تھی الفت

عزمِ محکم کے سامنے اس کے
بے حقیقت تھی قیصری سطوت

ہم غلاموں کو اس نے بتلایا
ہے غلامی کی زندگی لعنت

جان سے بھی عزیز تر تھا وہ
اب گوارا ہو اس کی کیوں فرقت

زخمِ دل جا کے کس کو دکھلائیں
دردِ دل کی دوا کہاں پائیں

نقشِ باطل مٹائے گا اب کون
قصرِ شداد ڈھائے گا اب کون

کون ہے جس پہ اعتماد کریں
بات بگڑی بنائے گا اب کون

جبکہ رہبر بھی ہو گئے رہزن
راہ سیدھی دکھائے گا اب کون

دل سے نفرت مٹائے گا اب کون
مئے الفت پلائے گا اب کون

قوم بے حس کو خوابِ غفلت سے
جب نہیں وہ جگائے گا اب کون

ہر اک طوفان کے مقابل میں
تان کر سینہ آئے گا اب کون

زندگی کی اندھیری راتوں میں
شمعِ عرفاں جلائے گا اب کون

ناخدا بن کے قوم و ملت کا
پار بیڑا لگائے گا اب کون

وقت پہ کام آئے گا اب کون
ڈوبتوں کو ترائے گا اب کون

کس کے جانے سے دل ہوا ناشاد
گلشنِ ملک و دیں ہوا برباد

ہند میں جو ہے سوگوار ہے آج   اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
یاس و حرمان و اضطرار ہے آج   دل محزون بیقرار ہے آج
قلب غمگیں کو ہو سکوں کیونکر   رحلتِ یار غمگسار ہے آج
غم فرقت سے کیا کہوں اس کی   دامنِ صبر تار تار ہے آج
آہ گلشن سے جاتے ہی اس کے   صورتِ گل نگہ میں خار ہے آج
گل پریشاں ہیں غنچے پژمردہ   جیسے روٹھی ہوئی بہار ہے آج
اَب وہ گھبرا گیا ہے دنیا سے   قصد اس کا سوئے مزار ہے آج
قوم کے بار جو اٹھاتا تھا   قوم کے دوش پہ سوار ہے آج
مُلک و ملّت پہ جو ہوا قرباں   جان اس پہ مری نثار ہے آج
اس کے جانے سے قوم و ملّت کا   آہ ٹوٹا ہوا حصار ہے آج
آہ اس ایک کے نہ ہونے سے   ملک و ملّت میں انتشار ہے آج

اس کے دَم سے تھی گرمئ محفل
اس کے جانے سے بجھ گیا ہے دل

قال تھا اس کا حال کی صورت   ہر عمل تھا کمال کی صورت
مقصد زیست کی تگ و دو میں   ہر قدم اعتدال کی صورت
زیر دستوں کے حق میں ذات اسکی   نظر آتی تھی ڈھال کی صورت
اس کے آئینۂ صداقت میں   رونما تھی جلال کی صورت
مرد مخلص کا ظاہر و باطن   اک مکمل جمال کی صورت
زیست اس کی تھا اک اک لمحہ   مستقل ماہ و سال کی صورت
اب کہاں دیکھنے کو پائیں گے   ایک روشن خیال کی صورت
کیا خبر تھی کہ اَب نہ دیکھیں گے   عالم خوشخصال کی صورت
آہ نظروں سے ہوگئی غائب   رہبر بے مثال کی صورت

عہدِ پیری میں بھی جوان تھا وہ
عزم و جرأت کی اک چٹان تھا وہ

اے مجاہد تری قیادت پر   کون ہے جس کو اعتبار نہ تھا
قلب پر اس کی حکمرانی تھی   ہم نے مانا کہ تاجدار نہ تھا
سخت تھا ملک و دیں کے اعدا پر   ظلم اس کا مگر شعار نہ تھا
بار ہر ایک کے اُٹھاتا تھا   اور خود وہ کسی پہ بار نہ تھا
اس کے الطاف عام تھے سب پر   دوستوں ہی پہ انحصار نہ تھا
پیار کرنا ہی اس کا مذہب تھا   شرپسندوں سے اس کو پیار نہ تھا
تخت اور تاج کا نہ تھا خواہاں   طالب جاہ و اقتدار نہ تھا

گرچہ تھا باعثِ بہارِ چمن — خود وہ آسودۂ بہار نہ تھا
جان و دل سے تھا قوم پر شیدا — پر تعصب کا وہ شکار نہ تھا

بے سہاروں کا وہ سہارا تھا
ڈوبتوں کے لئے کنارا تھا

حالِ دل جا کے اب کہیں کس سے — اس سا جب کوئی چارہ گر نہ ہوا
راستے ہی میں ہم سے منہ موڑا — آہ پورا ابھی سفر نہ ہوا
رہِ تنظیمِ ملک و ملت میں — کوئی بھی اس کا ہمسفر نہ ہوا
اس کی صحت کی کی دعا سب نے — پر دعا میں کوئی اثر نہ ہوا
لاکھ تدبیر کی معالج نے — اُف افاقہ اسے مگر نہ ہوا
عمر بھر جھیلیں سختیاں اس نے — عیش و راحت سے بہرہ ور نہ ہوا

آہ سارا چمن اُداس ہے آج
کل تلک آس تھی جو یاس ہے آج

ملک و ملّت کا پاسباں نہ رہا — گلشنِ دیں کا باغباں نہ رہا
علم کا بحرِ بیکراں نہ رہا — رونقِ بزمِ عارفاں نہ رہا
نطق کو فخر جس کی ذات پہ تھا — قوم کا وہ ہی ترجماں نہ رہا
کارواں کا خدا ہی حافظ ہے — کوئی اب میرِ کارواں نہ رہا
دور کیوں ظلم کی ہو تاریکی — عدل کا مہرِ ضو فشاں نہ رہا
بیکسوں پر ہو جس کی خاص نظر — اب کوئی ایسا مہرباں نہ رہا
جس پہ ہو اعتبار اب ایسا — کوئی معمارِ گلستاں نہ رہا
نازِ جمہوریت کرے کس پر — وہ سیاست کا آسماں نہ رہا

یادگارِ حسین احمدؒ تھا
رازدارِ حسین احمدؒ تھا

قوم کو بخشا زندگی کا شعور — منکشف اس پہ سب تھے سرِّ حیات
جو چمن میں بہار آئی ہے — ہیں اسی کے قدم کی سب برکات
اس کے فیضِ نظر کے صدقے میں — رشکِ خورشید بن گئے ذرّات
حرفِ آخر تھیں اس کی تحقیقات — قولِ فیصل تھے اس کے ارشادات
حلِّ مشکل تھیں اس کی توضیحات — دل میں لگتی ہوئی تھی اس کی بات
قابلِ قدر اس کی تنظیمات — ضامنِ امن اس کے بیانات
لائقِ رشک اس کی تعلیمات — ہیں گراں قدر اس کی تصنیفات
بزدلی کو وہ موت کہتا تھا — تھے بلند اس کے کتنے احساسات
صفحۂ دل سے مٹ نہیں سکتیں — حشر تک اب تو اس کی سب خدمات

اس کو تاریخ کیوں بھلائے گی — ملک و دیں پر ہوں جس کے احسانات
مشعلِ رہ ہے نقشِ پا اس کا — وجہِ تسکین تھی تو اس کی ذات
اے خداوند اس مجاہدؒ کے
تا قیامت بلند ہوں درجات

اضواء على تاريخ حياة:
الزعيم الهندي مولانا حفظ الرحمن السهواروي

للاستاذ محي الدين الالوائي - الازهري

إن النواميس الإلهية فى الأرض تقتضي أن تتطور الحياة بين الامم والشعوب حسب تقلبات الزمن، وتتبدل النظم فى الدول والحكومات طبقا لتغيرات العصر، ولا تستثنى من هذه القاعدة العامة والنواميس الطبيعية أمة أو شعب على وجه المعمورة وإذا تسربت عوامل الوهن والفساد إلى كيان قوم فتحطمهٔ الحوادث وتوهنه الكوارث فيسود فى الوطن نظام فاسد ويسيطر عليه مستبدون حتى تنتشر الفوضى فى صفوف أفراد الأمة وجماعاتها ويحيط بهم الجهل والخمود فهم كخشب مسندة لا تسرى فيهم الحياة ولا يدب فيهم دبيب الوعي الفكري والنشاط الذهني وتنقض عليهم الأعداء من كل صوب، وتمتص دماءهم القوى الاستعمارية والعناصر الطاغية -

وجرت سنة الله فى خلقه - عندما تتفاقم الأمور وينتشر الفساد فى البر والبحر بما كسبت أيدى الناس - أن يتقدم نفر من الزعماء الذين يشعرون بآلام قومهم ويفكرون تفكيرا عميقا فى عوامل الضعف وأسباب الداء لكى يبحثوا عن علاج نافع ودواء ناجح - وكل من هؤلاء الزعماء المصلحين لاقى متاعب وعقبات كأداء فى سبيل تحقيق أهدافه ونشر دعوته، ولكن هؤلاء الابطال واصلوا كفاحهم فى الحياة مجاهدين صابرين ويحبون المبادئ التى قاموا لأجلها اكثر من كل شئ آخر فى الحياة وما كانوا يعبأون بالعراقيل والمتاعب التى واجهوها فى سبيل الحق والاصلاح -

ومنذ نصف قرن من الزمن دخلت الهند فى مرحلة حاسمة فى تاريخها المديد ودبت فكرة الحرية والسيادة الوطنية فى قلب كل وطنى غيور واشتدت نار الكراهية والنفور ضد الاستعمار والطغيان - وتكاتفت العناصر الوطنية من مختلف الطبقات والطوائف فى سبيل الكفاح لأجل الحرية والاستقلال وتقدمت شخصيات بارزة من المسلمين الهنود إلى الميدان وتزعمت حركة الحرية والاصلاح - وجعلوا نصب أعينهم هدفين هامين أولا تحرير الوطن من نير الحكم الاجنبى والنهوض به كدولة حرة راقية على تدعم المساواة الانسانية والعدالة الاجتماعية بين أفراد الامة الهندية وجماعاتها بصرف النظر عن الاختلافات الدينية واللغوية والعنصرية، وثانيا إصلاح عقائد المسلمين والرجوع بهم إلى التعاليم الاسلامية الحقة وإبعادهم عن الخرافات والخزعبلات والتوهمات والاثبات فى قلوبهم الوعي الديني الخالص، والايمان الراسخ، لأن هذا هو السبيل الوحيد للنجاة فى الدارين -

وفى مقدمة هؤلاء الزعماء الأبطال الذين أنجبتهم الهند فى القرن العشرين، وأسدوا خدمات جليلة فى سبيل الامة والوطن ورفعوا راية العلم والدين فى ربوعها الشيخ الفاضل مجاهد الملة مولانا ابو القاسم معز الدين بن محمد حفظ الرحمن السهواروى ومن حقه على كل من عرف شخصيته وعلمه وفضله، ولمس آثار خدماته ومساعيه، أن يجدد ذكره ويحيى سيرته، ويبين أخلاقه وصفاته الحميدة للجيل الجديد فى القارة الهندية وخارجها سيما العالم العربي الذى له صلات وثيقة وروابط وطيدة مع الهند منذ القدم ومن بواعث السرور أن كثيرا من مسلمي الهند يعرفون تواريخ الشخصيات البارزة فى البلدان العربية قديما وحديثا وهم تواقون دائما إلى مزيد من الاطلاع على مجريات الأمور فى ذلك العالم الذى هو بمثابة القلب للعالم الاسلامي كله - واما علماء الهند المسلمون وطلاب العربية فيها مولعون باللغة العربية وآدابها ومكبون - بقدر ما تسمح لهم الظروف - على مطالعة الكتب والرسائل والمجلات العربية - وبهذا يتيسر عليهم الوقوف على تواريخ شخصيات العالم العربي وسيرهم، ونحن معاشر المسلمين الهنود نصرف جهودنا أولا وقبل كل اعتبار إلى نشر الدعوة الاسلامية والعلوم الدينية فى لغة قومنا لتكون فى متناول ايديهم وتستفيد منها العامة والخاصة

على حد سواء عملاً بقوله تعالى: "وانذر عشيرتك الاقربين" فصار - طبعا - معظم مؤلفاتنا وسير زعمائنا ونتائج أفكار علمائنا في اللغات السائدة العامة في القارة الهندية، ونتجت عن هذا الموقف قلة اطلاع الناطقين بالضاد على منتجاتنا الفكرية وأعمالنا الادبية وكتبنا التاريخية ولا ينبغي لنا أن ننسى في هذا الصدد أن الهند خرجت عددا من فطاحل علماء اللغة وآدابها وتبرعوا بمجموعة قيمة من المؤلفات العربية حول موضوعات شتى إلى المكتبة العربية وصارت محل استحسان وقبول لدى علماء العالم العربي وأدبائه ولكن هذا وذاك لا يسمن ولا يغني من جوع -

وأن الأمل لوطيد بأن يتقدم علماء العربية وكتابها في الهند إلى هذا المضمار لسد هذا الفراغ وإنارة الطريق أكثر فأكثر - إلى ساحة التعارف المعنوي والتعاون الأخوي بين أوصال العالم الاسلامي بواسطة اللغة العربية التي ما زالت ولا تزال نقطة التقاء وهمزة وصل بين قلوب المسلمين في مشارق الأرض ومغاربها -

وقد ساعدتني الظروف وشاء القدر للتعارف مع الزعيم البطل المجاهد مولانا حفظ الرحمن وقد ساعدني الحظ لتقضية حوالي سبع سنوات متتالية بجوار مولانا الجليل فكانت فرصة ثمينة للاطلاع على صفاته وخدماته وشخصيته ووجهات نظره في مختلف مرافق الحياة البشرية وفي ضوء هذه المعاصرة والاتصالات الشخصية وضوء ما عرفت من زملائه في الكفاح والخدمة وأقربائه أريد أن أضع أمام قارئ العربية مقتطفات من تاريخ حياته الوافرة ليكون نبراسا لشباب الجيل الحاضر وعبرة للجيل المقبل وعونا على توثيق عرى الماضي بالمستقبل والله هو الموفق -

مولده ونشأته : ولد معز الدين ابو القاسم محمد حفظ الرحمن في يناير ١٩٠٠ في عائلة صديقية بمدينة سهوارة في ولاية أترپرديش بشمالي الهند وسمي بمعز الدين ولكن والدته المحترمة كانت تدعوه محمد حفظ الرحمن وشاء القدر أن يشتهر بهذا الاسم فيما بعد وأما والده مولوي شمس الدين فعالم ديني جليل متمسك بأهداف الدين الحنيف وقد أصاب المرمى في تسمية ابنه "معز الدين" فصار معز الدين الله طول حياته وضحى بنفسه ونفيسه في هذا السبيل بدون ان يخاف لومة لائم -

ونشأ حفظ الرحمن منذ عنفوان شبابه مكبا على الدروس ومواظبا على الواجبات وظهرت فيه آثار العبقرية والشجاعة وبوادر رغبة الخدمة والتضحية، وبدأ تعليمه الابتدائي في مدرسة "الفيض العام" بسهوارة ثم انتقل إلى دار العلوم بديوبند وبعد التخرج منها واصل مهمته العلمية والدينية في التدريس والتبليغ وفي عام ١٩٢٤ تولى منصب التدريس بمدراس بجنوب الهند وأثناء إقامته هناك وضع اول كتاب له في اللغة الأردية وهو عن الاسلام والمسلمين في مليبار باسم: "مليبار مين اسلام (الاسلام في مليبار) ثم وضع كتابه المعروف "حفظ الرحمن لمذهب النعمان"

وفي عام ١٩٢٨ عين مدرسا في "داهبيل" بولاية "گجرات" في غربي الهند وبدأ في عام ١٩٣٦ تدريسه في كلكتا مع إمام الهند مولانا آزاد، وشب حفظ الرحمن مع قلب امتلأ نشاطا وهمة في سبيل العمل المتواصل والخدمة الانسانية وكان ينظر إلى الامور بثاقب فكره بعيدا عن قيود الفكر الذهني ويجول بعقله الوثاب في مختلف نواحي القضية التي هي في صدد النظر فيها بقلب حازم وعقل واع ومن عادته المتبعة في جميع المناسبات أن يختار المصلحة العامة على المصلحة الخالصة الذاتية ولعل هذه هي الصفة الحميدة التي جمعت قلوب زملائه حوله ووضعوا فيه ثقتهم الكاملة، واستمر هذا النشاط إلى آخر لحظة من حياته وحتى في فراش مرض الموت كان يهتم بشئون حزبه وجماعته وزملائه -

أخلاقه وصفاته : ومن الصفات المحمودة التي يتدارس فيها الجيل الجديد لسعة أفقه ورحابة صدره فكان حفظ الرحمن يرحب بكل فرد يأتي إليه فلا يعرف حينذاك الفوارق الحزبية أو الدينية أو السياسية ويتكلم مع الجميع في كل موضوع تتطلب الظروف التطرق إليه بدون خوف ولا وجل ولا مداهنة، وقد لاحظت مرات مجلسه في المقر الرئيسي لجمعية علماء الهند بدلهي مكتظا بالزوار من الشخصيات السياسية والدينية من داخل الهند وخارجها ولكن كلا منهم يجد نصيبه من الكلام والمناقشة معه في الموضوع

الذى أتى لأجله، وكانت سوعة فهمه وخفة معالجته للقضايا المطروحة أمامه تجعل الأمور هينة بحيث تدخل الثقة في قلب اليائس والطمانينة في ذهن المضطرب، وأما ثقة النفس فكانت بادية في معاملاته كلها سواء في معالجة القضايا الشائكة والبت في المنازعات وتصرفه مع حكام الدولة وفي المقترحات التي يقدمها إلى السلطات الحكومية وخطبه وكلامه وكان يعامل مع الجميع في غاية السخاء والكرم والجود، وامتازت شخصيته بالقناعة والايثار وخدمة الخلق ومراعاة حقوق الآخرين والحياة المتواضعة.

خدماته وأوجه نشاطه: ترعرع حفظ الرحمن في حظيرة فطاحل العلماء الدينيين والوطنيين الغيورين ونشأت فيه منذ الصغر الروح الاسلامية الوثابة والنزعة الوطنية الخالصة وساعدته على ذالك الترعرع المزدوج الظروف المحيطة بحياته الاولى والبيئة التي نشأ فيها والشخصيات التي شاء القدر أن يصطحب معها، ومن هنا تنوعت أوجه نشاطه وميادين خدماته، وفي كل ميدان أطلق لجام نشاطه وواصل كفاحه بقدم راسخة وقلب حازم لا يلين لملمات الزمن ووطأة الحوادث ولا تزل أقدامه عند الملمات.

وفي مكنتنا أن نقسم دوائر خدماته إلى اربع دوائر هامة حسب مقتضيات الأمة والوطن والعالم. وهي: الدينية والاجتماعية والعلمية والسياسية ومنذ أن أصبحت الهند دولة جمهورية مستقلة على أساس دستور علماني لا يقوم على أساس دين خاص، نفذت نظام التعليم العلماني في المعاهد الحكومية كلها واقتضت الظروف اتخاذ إجراءات خاصة لنشر التعاليم الاسلامية بين أطفال المسلمين بطريقة تتمشى مع النظام التعليمي في المدارس الحكومية لئلا يحرم طلابها من التعليم الديني وبذل مولانا حفظ الرحمن بصفة كونه أمينا عاما لجمعية علماء الهند وعضوا بارزا في حزب المؤتمر الوطني، في سبيل تسهيل التعليم الديني في أوساط المسلمين ونفث في قلوبهم روح الاعتماد على النفس والايثار في سبيل الصالح العام، ووضعت جمعية علماء الهند برنامجا خاصا لتنظيم التعليم الديني في شتى أنحاء الهند تحت إشرافها لتحقيق هذا الهدف المنشود — ودعى مولانا الأمة، برحلاته وخطبه ومقالاته إلى إدراك أهمية هذا المشروع لبث الروح الاسلامية في الجيل الجديد والمسؤوليات الجمة الملقاة على عواتق ولاة الأمور ....

، من المسلمين في هذا المضمار، وبفضل مساعيه انعقد في يناير عام ١٩٥٥ في مدينة بومبائي "مؤتمر التعليم الديني العام" وشكلت فيه لجنة التعليم الديني لعموم الهند وانتخب مولانا حفظ الرحمن أمينا عاما لها ومنذ ذلك الحين بذل جزءاً كبيرا من نشاطه في تأسيس المدارس العربية الدينية والهيئات الدينية والاشراف عليها وعلى المعاهد الاسلامية الكبرى في الهند مثل جامعة عليجره ودار العلوم بديوبند والجامعة الملية بدلهي وهلمجرا.

وفي الميدان الاجتماعي كان المرحوم يبذل مجهودات جبارة لحل القضايا والمنازعات الداخلية بين أفراد الأمة وجماعاتها في البلاد وفي الوقت الذي يبذل فيه مولانا مساعيه الجميلة لإيجاد التآلف والتآزر فيما بين المسلمين انفسهم كان يسعى بجهد بالغ للانسجام الطائفي والاتحاد القومي، وصرف اهتماما جماً في توثيق عرى الصلات الودية والروابط الاخوية مع العالم الاسلامي سيما الدول العربية فقد جعلت جمعية علماء الهند هذا التوثيق هدفا من أهدافها التي تنشد تحقيقها وأيدت جمعية العلماء ولاتزال تؤيد تأييدا كاملا القضايا العربية كلها وخاصة قضية العرب في فلسطين ورفعت صوت التأييد والمشاركة الوجدانية في الكفاح الوطني الذي جرى في كل من البلدان العربية مثل تونس والجزائر ومراكش، وفي أيام أزمة السويس اتخذت جمعية علماء الهند قرارا خاصا بيلاد العدوان الثلاثي وبؤيد حق مصر تأييدا تاما وساهمت الجمعية تحت إشراف هذا الوطني العظيم حفظ الرحمن في الترحيب بالشخصيات العربية الاسلامية التي تشرفت الهند بزياراتها السعيدة و في مقدمة هذه الشخصيات البارزة الرئيس جمال عبد الناصر وجلالة الملك سعود وجلالة ملك أفغانستان و

جلالة شاه إيران ورئيس وزراء لبنان السيد رشيد كرامة والسيد أنور السادات السكرتير العام للمؤتمر الاسلامى بالقاهرة وامثالهم وانتهز مولانا هذه الفرص السانحة للترحيب بهم وتبادل الآراء ووجهات النظر معهم حول الشؤون المتعلقة بالعالم الاسلامى بوجه عام، وقام بزيارة حج بيت الله الحرام لاداء فريضة الحج فى ۱۹۲۴ بينما كان مدرسا فى مدراس ثم فى عام ۱۹۵۶ وقام برحلات علمية وثقافية فى عدة بلدان بأفريقيا وآسيا - وكان يتصل دائمًا بالمكاتبات والمراسلات بالشخصيات العلمية البارزة فى العالم العربي -

ومنذ وصولى إلى دلهى عائدا من القاهرة فى عام ۱۹۵۵ اقترحت على مولانا المرحوم ومساعده الخاص السيد انيس الحسن فضيلة مولانا المفتى عتيق الرحمن العثمانى والأستاذ الجليل مولانا محمد ميان والعلامة الفاضل مولانا القاضى سجاد حسين وامثالهم من كبار علماء الهند الافاضل المولعين باللغة العربية وآدابها وشؤون المسلمين فى الهند ضرورة توثيق عرى التعاون الأخوى والتعاون الثقافى بين المنظمات الدينية والثقافية ورجالها وبين السفارات العربية ورجالها فى عاصمة الهند فلاقت وغنق هذه استحسانا وترحابا قلبيا حارا من مولانا وزملائه ووعد ببذل أقصى الجهود فى هذا السبيل، ثم تلبث أن تكاثرت الزيارات الودية وبدأ تبادل المجموعات العلمية والدينية، بين الجمعية وعدة سفارات عربية سيما سفارة الجمهورية العربية المتحدة، ونرى الآن، ببالغ الفرح والسرور التبادل الثقافى والعلمى بين الهند والعرب يجرى على قدم وساق ويرجع الفضل الاكبر فى هذا النجاح الباهر إلى الروح الاجتماعية المتنورة لمولانا الفاضل وفكرة الثاقب، ولا يسعنا فى معرض الكلام عن عوامل توثق العلاقات الثقافية والادبية والدينية بين الهند والعالم العربي والشخصيات البارزة التى تلعب دورا هاما فى تحقيق هذا الهدف المنشود، إلا أن نذكر بكل فخار واغتباط الخدمات التى يسد بها والمساعى الجميلة التى يبذلها العلامة الفاضل الأديب الكبير مولانا أبو الحسن على الندوى ورجال " ندوة العلما " لكهنو.

الفساد الطائفى : وعقب تقسيم القارة الهندية - الهند والباكستان - وقعت الكوارث المؤلمة فى البلاد واندلعت نيران الطائفية والفتن والفساد فى البلدين وتعرض الآلاف من الأبرياء للقتل والنهب والتشريد فكانت دلهى عاصمة الهند من المدن الرئيسية المنكوبة بتلك الفتن فقام حفظ الرحمن بكل حزم وشجاعة فى وسط المعمعة لخدمة الانسانية المنكوبة واضعا حياته فى كفة القدر وكان يعمل ليل نهار لمعالجة المجروحين وإغاثة المنكوبين وبث روح الثقة فى النفوس الضعيفة وإبلاغ السلطات المختصة والجهات الحكومية مجريات الأمور والتطورات فى المناطق المتاثرة بها، وايام الفتن الطائفية فى العاصمة الهندية كان مولانا حفظ الرحمن يزور يوميا المهاتما غاندى فى مقره فى " برلا هوس " بنيو دلهى ويطلعه على حقيقة الموقف فى المدينة وتجول مرات مع غاندى وغيره من كبار الدولة فى الاحياء المنكوبة وسعوا لإدخال روح البقاء والثقة فى نفوس العائلات الأقلية، وهكذا وضع حد للجنون الطائفى الذى شوه وجه الوطن العزيز -

وترتب على تقسيم البلاد والفساد الطائفى المشؤوم عدد من المسائل التى تمس الحياة الاجتماعية والاقتصادية والتعليمية للاقلية المسلمة فى الهند من مسألة ممتلكات ضحايا الفساد الطائفى إلى مسألة المساجد والمقابر التى صارت عرضة للتدمير والاستيلاء غير الشرعى من جانب اللاجئين الذين أخرجوا من الباكستان ظلما وعدوانا ولما هدأت الأحوال بفضل مساعى العناصر الوطنية المخلصة من رجال الحكومة وزعماء الأغلبية بدأت الثقة تعود إلى قلوب المسلمين، والممتلكات ترد إلى اصحابها، والجمهور يرجع إلى نداء المنطق والعقل السليم، وليس هذا العمل هينا فى بلد ضخم مثل الهند التى تعيش فيها مئات الطوائف وعشرات الأديان واللغات لا سيما بعد أن حكمها المستعمر ولمدة طويلة تحت شعار: " فرق تسد " ومن واجب كل وطنى غيور من الجيل الحاضر أن يبذل أقصى الجهود لمحو وصمة العار الذى أصاب جبين الهند وسمعتها بقصر النظر من العناصر الطائشة -

وإلى جانب الكفاح الوطنى والسعى للانسجام الطائفى قام مولانا بجهود متواصلة فى الميدان التعليمى فبينما كان

يسعى لرفع مستوى التعليم العام فى البلاد وبينما هو مع البرامج الحكومية بوجه عام صرف أهتماما خاصا نحو شؤون التعليم للاقلية المسلمة التى مازالت - ولا تزال - فى مؤخرة القافلة مع أن الاسلام ودستوره القرآن منح للعلم درجة لا مثيل لها فى تاريخ الأديان والدعوات ففرض طلب العلم على كل مسلم ومسلمة ولو بشق الأنفس ودعى إلى التعليم العام الاجبارى " هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون" نبذ أمولانا مساعيه لتلافى هذا النقص الوبيل فى جسم الأمة المسلمة فى الهند بقدر المستطاع، وماكان يحتفظ - فى كثير من أنظمة التعليم ومناهجها - بآراء العلماء الجامدين والمقلدين الخامدين بل كان ينظر إليه بعين مفتحة وعقل متنور بحيث تتفق مع المبادئ الاسلامية الحقة لأن العلم منبع الفلاح والجهل مصدر الفشل فى الحياتين -

وبذل مجهودا جبارا فى النهوض باللغة الأردية والدفاع عنها وهى لغة يتحدث بها المسلمون وغيرهم فى معظم أنحاء شمال الهند وفى بعض جهات جنوبها وبصفة كونها تكتب بالحروف العربية ومليئة بالالفاظ العربية والفارسية صارت بمثابة مكتبة عامة للأدب الاسلامى فى الهند وهى الآن إحدى اللغات الدستورية الهندية -

وتتجلى عبقرية مولانا حفظ الرحمن وروحه الوثابة فى تنظيم جمعية علماء الهند وتصريف دفة شؤونها بكل كياسة ومهارة منذ أن تولى منصب السكريتير العام لها فى مارس عام ١٩٤٢ وأن تاريخ جمعية علماء الهند لمرتبط ارتباطا وثيقا بخدمات حفظ الرحمن أكثر من أى شخص آخر من رجالها الكبار وأن روحه لا تزال تنير الطريق أمام القائمين بها والعاملين لها، وهو الذى أخذ بناصية الجمعية إلى شاطئ الأمان فى فترات عويصة قبيل استقلال الهند وبعده -

نشاطه السياسى : إن الميزة الكبرى التى امتازت بها شخصية مولانا حفظ الرحمن - دون كثير من زملائه حب الوطن، ومنذ البداية إلى النهاية كان يتمسك بمبادئ حزب المؤتمر الوطنى الهندى، وواصل كفاحه لأجل حرية الهند تحت رايته مع زملائه العظام غاندى ونهرو وآزاد وامثاله وبدأ نشاطه السياسى كعضو بارز مسموع فى حزب المؤتمر الوطنى الهندى منذ عام ١٩٢٤ وسجن وعذب مرات خلال كفاحه الوطنى ففى أول مرة سجن فى بجنور عام ١٩٢٢ ثم فى كل من ميرت (١٩٣٠) وسربلى ومراد آباد ودلهى وراولبندى (١٩٣٦) واستمرت هذه المعاناة إلى عام ١٩٤٢، واشترك فى المظاهرة التى نظمها غاندى ضد قانون الضريبة على صناعة الملح فى عام ١٩٣٠ وسجن فيه مع عدد من كبار زعماء البلاد، وكان حب الوطن جزأ من إيمانه العميق، وكان يواصل مساعيه إلى آخر لحظة فى حياته لأجل نهضة الوطن وتقدمه وناشد إخوانه المسلمين دائما لأن يكونوا دائما فى طليعة الخادمين للوطن والعاملين لأجله، وأعلن مرات بأعلى صوته فى خطبه وأحاديثه : بأننا لا نحب الوطن ونخدمه لأى غرض ذاتى أو مجاراة لأحد ولكننا نقوم به لأن حب الوطن جزء من ايماننا وتعاليم ديننا الحنيف وأن الهند وطننا العزيز ووطن آبائنا وأجدادنا الكرام فنحن نتمنى عزته ورفاهيتنا فى رفاهيته، ويذكرهم بقوله تعالى :. وإذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما وإذا مروا باللغو مروا كراما -

وفى شهر يناير عام ١٩٦٢ أصيب مولانا حفظ الرحمن بمرض السرطان ونقل إلى مستشفى السرطان الخاص فى بومبائ وتنافس فى معالجة مولانا الدكاترة المهرة من الهنود والأجانب وسافر مولانا يوم الاثنين الموافق للسادس عشر من شهر أبريل عام ١٩٦٢ إلى أمريكا ودخل فى مستشفى السرطان العالمى فى "مدبين" ولم تستطع القوى البشرية والمواهب الانسانية لدفع حكم القضاء فعاد مولانا إلى الهند من أمريكا يوم الثلاثاء الموافق ١٢ يوليه ١٩٦٢ وفى غداة الخميس الموافق للثانى من أغسطس عام ١٩٦٢ انتقل مولانا إلى جوار ربه بعد حياة حافلة زاخرة وذلك فى منزله الحكومى رقم ٤ شينغ لين دلهى الجديدة ودفن جثمان الفقيد مساء الخميس المذكور بجوار ضريح العلامة الشهير المحدث الكبير شاه ولى الله الدهلوى فى مدينة دلهى التاريخية فرحمه الله ولتكن حياته نبراسًا للعالمين -

مولانا حفظ الرحمٰن فی سطور.....

- ولد فی ینایر عام ۱۹۰۰ فی بیت شرف وعلم بمدینۃ سہوارہ بولایۃ اترپردیش بشمالی الہند
- کان والدہ المولوی شمس الدین عالماً دینیاً یتحدر من عائلۃ صدیقیۃ -
- اسمہٗ معز الدین وکنیتہٗ ابوالقاسم ولکنہ قد اشتہر بلقب "محمد حفظ الرحمٰن"
- اتم تعلیمہ الابتدائی فی مدرسۃ "الفیض العام" فی موطنہ ثم انتقل إلی دار العلوم دیوبند
- تولّی منصب التدریس فی مدراس عام ۱۹۲۴ اثناء اقامتہ ہناک وضع مؤلفہٗ الاول فی الأردیۃ عن الاسلام والمسلمین فی ملیبار وفی عام ۱۹۲۸ عین مدرساً فی داہبیل بولایۃ گجرات بغربی الہند
- فی عام ۱۹۳۶ تولّی التدریس فی کلکتہ مع امام الہند مولانا ابی الکلام آزاد
- سجن خمس مرات خلال کفاحہ الوطنی
- اصبح عضواً فی المؤتمر الوطنی الہندی عام ۱۹۲۴ واستمر فیہ الی آخر حیاتہ
- اشترک مع المہاتما غاندی فی المظاہرۃ التی نظمہا ضد قانون الضریبۃ علی صناعۃ الملح فی عام ۱۹۳۰م وسجن فیہا
- انتخب لمنصب السکریتر العام لجمعیۃ علماء الہند عام ۱۹۴۲م واستمر فی ہذا المنصب إلی یوم وفاتہ -
- فی عام ۱۹۴۲م سجن فی حرکۃ "اترکوا الہند" ضد الانجلیز واستمر فی السجن لمدۃ ثلاث سنوات -
- أصیب بمرض السرطان فی ینایر عام ۱۹۶۲ء وعولج بایدی مہرۃ الاطباء الہنود والاجانب فی الہند ثم سافر الی امریکا وقضی ثلاثۃ اشہر فی المستشفی العالمی للسرطان فی میدلیسن بامریکا وعاد إلی الہند صباح ۱۲ یولیو -
- توفی صباح یوم الخمیس الموافق للثانی من اغسطس عام ۱۹۶۲م -
- دفن بجوار ضریح العلامۃ الشہیر المحدث الکبیر شاہ ولی اللہ الدہلوی مساء الخمیس المذکور بمدینۃ دلہی -
- لہ ابن وخمس بنات -
- من مؤلفاتہ باللغۃ الاردیۃ ، الاسلام فی ملیبار ، وحفظ الرحمٰن لمذہب النعمان ، البلاغ المبین فی مکاتیب الرسول الکریم - الاقتصاد فی الاسلام - وقصص القرآن (فی اربعۃ اجزاء) وسیرۃ الرسول ، ولہ عدۃ مقالات وتصریحات قیمۃ تتناول شتی نواحی الحیاۃ فی الہند -

وحدت کلمہ اور مسلمانوں کی تنظیم

جناب مولانا محمد عاقل صاحب الہ آبادی آرگنائزر جمعیۃ علما ہند دہلی

مسلمانانِ ہند کی تنظیم وقتی سیاسی تعلیمی اصلاحی تقاضوں کے تحت مقامی، صوبہ اور کل ہند سیمانہ پر بنتی بگڑتی رہی یہاں تنظیم کی تاریخ و ارتقاء کے پہلو سے روشنی ڈالنا مطلوب نہیں۔ بتانا یہ ہے کہ حضرت مجاہد ملت رح کی نگاہ دوررس اس پر گئی کہ تنظیم کی بنیاد ٹھوس و پائیدار ہونی چاہیے کہ وہ تنظیم ہر زمان و مکان میں قائم رہ سکے۔ اور بہ تقاضائے احوال اس کے نظام و مقاصد اور عملی پروگرام کو باقی و جاری رکھا جا سکے۔ جمعیۃ علمائے ہند کی ابتدائی تنظیم مستند علماء دین پر مشتمل اور محدود تھی۔ ان جانباز علماء کرام کی مخلصانہ خدمات کا تقاضا تھا کہ جماعت میں ان کی قیادت و رہنمائی کو برقرار رکھا جائے۔ اس لئے ۱۹۳۸ء سے جمعیۃ کے دستور اساسی میں ترمیمات کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کے دائرہ کو ابتداءً میں ۲ر کی ممبری سے پھر ۴ر کی ممبری کا سے ہر مسلمان مرد و عورت تک وسیع کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علما ہند کو مسلمانوں کی عام تنظیم اور نمائندہ جماعت کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اس میں علماء کرام کو سربراہی حاصل رہی۔

مسلمانوں کی یہ ملی تنظیم اسلام کے اوّلین اور بنیادی اصول کلمہ توحید کی بنیاد پر قرار پائی۔ حضرت مجاہد ملت رح نے کارکنوں کی مجلس، خواص سے ملاقات اور عوامی جلسوں میں جمعیۃ کے مقاصد اور اس کی تنظیم کی جب بھی وضاحت فرمائی۔ مسلمانانِ ہند کی تنظیم کے اس بنیادی پہلو 'وحدت کلمہ' کو ضرور کھول کھول کر بیان کر دیا۔ آج ملک میں جمعیۃ علما ہند کے پلیٹ فارم پر مسلم عوام و خواص نظر آ رہے ہیں۔ ماضی میں خواہ وہ کسی تنظیم سے وابستہ رہے ہوں لیکن جمعیۃ علما ہند کو انھوں نے حضرت مجاہد ملت رح کی خدمات ملکی و ملی اور اس کی وحدت کلمہ کی بنیاد پر نمائندہ حیثیت سے ضروری مان کر اختیار کیا۔

حضرت مجاہد ملت رح کی زندگی میں دینی تعلیمی کنونشن بمبئی (جنوری ۱۹۵۵ء) میں اسی وحدت کلمہ کی بنیاد پر کامیاب ہوا، اور آج جتنی تعلیمی اصلاحی تحریکیں مسلمانوں میں چھوٹے بڑے پیمانہ پر چل رہی ہیں وہ سب اسی بنیادی اصول کو اپنائے ہوئے ہیں۔ بمبئی میں جمعیۃ علما اسٹیٹ کانفرنس ۸، ۹ر مارچ ۱۹۵۹ء کو ہوئی۔ شیخ المشائخ مولانا حکیم دیوان سید عنایت حسین صاحب رح (موصوف اب وصال فرما چکے ہیں) سجادہ نشین حضور خواجہ غریب نواز رح اجمیر نے اپنا مطبوعہ خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے فرمایا:۔

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب .... یہ قابل احترام ہستی اپنی علمی اور دینی قابلیت، اپنی خداداد ذہانت اور اپنی فعال سیرت کے لحاظ سے اُس مرتبہ اور اس کام سے بلند و بالا ہے جس میں حالات کی ستم ظریفی نے ڈال دیا ہے، اگر مولانا حفظ الرحمٰن مدرس بن کر بیٹھ جاتے اور دینی و علمی تصنیفات کا شغل اختیار کر لیتے تو ایک زبردست تعمیری کام ہوتا۔ ہزاروں تشنہ گانِ علم ان سے سیراب ہوتے، ان کے لئے ان کے شاگردوں کی بے پناہ عقیدت ہوتی اور ان کی تصانیف آئندہ نسلوں کیلئے فیض و افادیت دیرپا کی مالک ہوتیں۔ لیکن آپ حضرات نے انھیں مجاہد ملت بنا کر اجتماعی امور کے محاذ پر جھونک دیا ہے جمعیۃ علما ہند کی نظامت حفظ الرحمٰن کے لئے قابل فخر چیز نہیں ہے بلکہ اس عہدہ کو ــــ حفظ الرحمٰن سے چار چاند لگائے گئے ہیں۔ پارلیمنٹ کی ممبری ان کے شخصی عزت و وقار میں کوئی اضافہ نہیں کرتی بلکہ حکومت کے حلقوں میں یہ بھی ایک ذریعہ خدمت ہے۔ جس کے ذریعہ سے وہ عوام الناس کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اُمت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اعاظم رجال سے خالی نہیں ہے۔ ہند میں بھی بڑی بڑی شخصیتیں پڑی ہوئی ہیں لیکن وہ اس قول کے مصداق ہیں ؎

زاہد نہ داشت تاب جمال پری رُخاں　　کنجے گرفت و یاد خدا را بہانہ ساخت

مولانا حفظ الرحمٰن میں ذاتی صلاحیت و قابلیت بدرجہ اُتم تھی اور وہ سیاسیات و اجتماعیات سے الگ رہ کر اپنے لئے کافی فراخ وسائل فراہم کر سکتے

تھے۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کو بہانہ بنا کر ایک کونہ میں بیٹھ سکتے تھے۔ جمال پری رُخاں ہند سے نہیں بلکہ دیوان ہند کے آتشیں حملوں سے ان کا سروکار رہتا ہے لیکن درماندہ مسلمانان ہند کی عزت و سربلندی کے لئے انھوں نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا ہے یا بالفاظ دیگر اپنے جیون کو دان دیدیا ہے۔

بزرگان ملت! تقسیم وطن کے بعد بھی تعصب کے دیوزادوں نے صرف نسبت محمدی کو پیش نظر رکھ کر سُنی، شیعہ، اہل حدیث، حنفی، شافعی بوہرہ، خوجہ، قادیانی نامی جماعتوں کے افراد کو باہم نفرت کا شکار بنا نا چاہا۔ لیکن اس انقلاب نے مسلمانوں کے طبقات کی آنکھیں کھولدی ہیں اور وہ وحدت کلمہ کی حقیقت کے قائل ہوگئے ہیں۔

.... جماعتی حیثیت سے جمعیۃ علما ہند علم کلام کے مسائل اور ایسے عقائد کی بحثوں میں نہیں پڑتی جس سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو۔" (خطبہ صدارت صفحہ ۱۰ ـ ۱۱)

مرحوم سجادہ نشین کا یہ پیغام ملت اسلامیہ کی آج بھی رہنمائی کر رہا ہے کہ مجاہد ملت نے جس جماعتی تنظیم کو پروان چڑھایا ہے اس کو اپنی خصوصیات کے ساتھ برقرار رکھا جائے۔

رُخصت ہوا

ناھی ایم اے علیگ مالیرکوٹلہ

خیلِ ملت کا مجاہد پاسباں رخصت ہوا
کارواں کا یعنی مہرِ کارواں رُخصت ہوا

کام جس کے تھے سیاسیات میں عقدہ کشا
نام جس کا تھا ہر اک کا حرزِ جاں رُخصت ہوا

بندۂ احساں تھے دشمن تک بھی جس کے جیل دیا
آہ وہ روحِ اُمیدِ دوستاں رُخصت ہوا

دل تڑپ اُٹھتا تھا جس کا بے کسی پر قوم کی
وہ شفیقِ درد مند و مہرباں رُخصت ہوا

گردشِ افلاک مژدہ اُٹھ گیا ہے چارہ گر
خوب خوش ہو اے خزاں اب باغباں رُخصت ہوا

رہنمائے بے مثال و قائدِ اعظم اُٹھا
حفظ رحمٰن، غمگسارِ این و آں رُخصت ہوا

آہ کھویا قوم نے سالارِ عالی حوصلہ
مردِ کامل صاحبِ عزمِ جواں رُخصت ہوا

ہر گرہ کھلتی تھی جس کے ناخنِ تدبیر سے
وہ کہ تھا دانش دہِ دانشوراں رُخصت ہوا

اَب ہدایت کون دے بدلے ہوئے حالات میں
امتیازِ خیر و شر۔ سُود و زیاں رُخصت ہوا

جرأتِ حق گوئی لاثانی تھی جس کی آہ وہ
نغز گو، شیریں سخن۔ معجز بیاں رُخصت ہوا

زخمہائے سینہ چاکاں اب نہ ہوں گے مندمل
چارہ گر تھا جو مسیحائے زماں رُخصت ہوا

گرمیوں کو بزم کی ڈھونڈا کریں گے تشنہ لب
جس سے پُر رونق تھی بزمِ میکشاں رُخصت ہوا

آگیا تھا جس سے نالوں کو رسائی کا شعور
جس سے دردِ و سوزِ پائی تھی فغاں رُخصت ہوا

کیا بلائیں سر پہ آتی ہیں کسے معلوم ہے
سایہ افگن تھا جو بن کر سائباں رُخصت ہوا

دیکھنا یہ ہے کہ ناھی اَب کہاں آتی ہے موت
زندگی کا جو سہارا تھا یہاں رُخصت ہوا

ایک عظیم محبِّ وطن

از شری شام ناتھ ایم اے ایل ایل بی۔ ڈپٹی سنسٹو انفارمیشن گورنمنٹ آف انڈیا

مولانا حفظ الرحمٰن کی یاد کے ساتھ ایک ایسے محبِ وطن کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے جس کے ایثار و قربانی اور ہمت و جرأت کی کوئی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اُن کی خدمات سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

حریت اور آزادی کا ایک ایسا جذبہ مولانا کو قدرت سے ملا تھا کہ سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی اُن کے قدم نہ لڑکھڑا سکے۔

خوش نصیبی سے اُن کی تعلیم دیوبند کے اُس مشہور دارالعلوم میں مکمل ہوئی جو اپنے طلبار کو مذہبی تعلیم کے ساتھ غیر ملکی حکومت کے خلاف تربیت دینے میں بہت ممتاز رہا ہے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کی سیاسی اور وطنی خدمات آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ انھیں بزرگوں کی سچی یادگار مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ جمعیۃ علمار ہند کے تو وہ روح رواں تھے ہی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بھی نہایت سرگرم اور ممتاز اراکین میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ مادرِ وطن کی پکار کا جواب انھوں نے ہمیشہ عالی ہمتی، جوش اور ولولے کے ساتھ دیا۔ وہ متعدد مرتبہ برطانوی جیلوں میں اسیر رہے لیکن قید و بند کی سختیاں اور صبر آزما کلفت کبھی اُن کے ارادوں کو کمزور نہ کرسکیں۔ رہا ہوتے ہی وہ ایک نئی ہمت اور نئے جوش کے ساتھ وطنِ عزیز کی خدمت میں لگ جاتے تھے۔

۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں انھوں نے دلی کے مظلوموں اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد اور خدمت بڑی ہمت اور بہادری سے انجام دی۔ وہ اپنی جان کی پروا کئے بغیر مظلوموں کی مدد کے لئے ایسے علاقوں میں پہونچ جاتے تھے جہاں اُن کی سلامتی کے لئے بہت بڑا خطرہ ہوتا۔ ان بے لوث خدمات اور جاں فشانیوں کا اثر گاندھی جی پر بھی بہت گہرا تھا۔ اُن کے دل میں مولانا کے لئے غیر معمولی عزت اور محبت تھی۔ حضرت مولانا آزاد اور ہمارے محبوب وزیر اعظم پنڈت نہرو بھی مولانا کے ایثار اور عالی ہمتی کے ہمیشہ قائل اور معترف رہے

آزادی کے بعد ہمارے ملک کے سامنے بہت سے اہم معاملات اور مسائل آئے ہر موقعہ پر مولانا کی سیاسی فراست اور دوراندیشی نے الجھنوں کو سلجھانے میں بہت مدد دی۔ مجھے مولانا کے ساتھ بہت سے سیاسی اور سماجی کاموں میں شریک رہنے کا موقعہ ملا ہے میں بڑے احترام اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا کے دل میں اپنے وطن اور اہل وطن کی محبت ۔ ۔ ۔ کا ایک ایسا پرخلوص جذبہ موج زن رہتا تھا کہ جس پر خود ارضِ وطن کو ناز ہو سکتا ہے

دلی اور دلی والوں سے اُن کو شدید محبت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ خود بھی دلی والے ہوگئے تھے۔

مولانا تمام سیاسی مسائل میں بہت سلجھی ہوئی اور صاف رائے رکھتے تھے۔ تقسیم وطن کا نظریہ ان کو کبھی پسند نہیں تھا لیکن جب ملک کے ممتاز رہنماؤں نے اسے قبول کرلیا تو مولانا بھی سنجیدگی سے خاموش ہوگئے۔

مولانا ایک بہت بڑے مذہبی عالم تھے اور اپنے مذہب میں اُن کا عقیدہ اٹل تھا لیکن وہ تمام مذہبوں اور فرقوں کے لوگوں سے انتہائی حسن اخلاق اور لطف و محبت سے ملتے تھے عقیدے کا اختلاف اُن کی دوستی اور وضعداری میں کبھی حائل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُن کی ذاتی زندگی ایک درویش کی طرح انتہائی سادہ اور بے تکلف تھی۔ ملک اور قوم کی خدمت کی دُھن میں انھیں اپنے آرام اور صحت و تندرستی کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ فداکاری کا یہی انداز آخر اُن کی جان لیکر رہا۔ لیکن میرا عقیدہ ہے کہ ایسے صاحب ایثار اور بہادر دانسانیت محبان وطن مرکر بھی کبھی نہیں مرتے وہ اپنے اچھے کاموں اور اپنی بے بہا قربانیوں کی یاد کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

مولانا جیسے عظیم اور بہادر محبِ وطن سے محبت کرنے والوں کا ایک ہی فرض ہے کہ وہ اُن بلند مقاصد اور خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں جو مولانا کو زندگی بھر عزیز رہے۔ کسی اور یادگار کے مقابلہ میں ایسی یادگار زیادہ حقیقی اور پائدار ہوگی۔

غمِ مجاہد

چھیڑا صبا نے نالۂ سیہم کچھ اس طرح — ثابت رہے نہ جیب و گریبانِ صبحِ غم
کیفیتِ الم سے فضا ہی بدل گئی! — ہر شے اداس ہے تہہ دامانِ صبحِ غم
منظر اداس چشمِ نظارہ اداس اداس — ہستی ہے ایک خوابِ پریشانِ صبحِ غم
آتش بجاں ہیں لالہ و گل سوزِ ہجر سے — خوں ہو گیا ہے جوشِ بہارانِ صبحِ غم
سوسن خموش، نرگسِ شہلا کی آنکھ نم — ماتم کدہ ہے صحنِ گلستانِ صبحِ غم

برپا ہوا ہے فرش سے تا عرش ایک حشر
اس طرح نوحہ خواں ہیں خوش الحانِ صبحِ غم

نازِ کلام و جانِ خطابت نہیں رہا — جوشِ عمل تھا جس سے عبارت نہیں رہا
وہ مہرِ علم و دانش و ماہِ تمام فکر — دانائے دیں و رہبرِ ملت نہیں رہا
دل جس کا تھا خلوص و محبت کا آئینہ — وہ صاحبِ یقین و صداقت نہیں رہا
جس کی جبیں پہ رقص کناں تھی حیاتِ نو — وہ پیکرِ عزائم و حکمت نہیں رہا
وہ نکتہ سنج، نکتہ شناس اور نکتہ رس — تھا جو امیرِ فہم و فراست نہیں رہا
وہ جس کی زندگی ہی مسلسل جہاد تھی — مسلک تھا جس کا خدمتِ ملت نہیں رہا
میدانِ حریت کا وہ جانباز و جاں نثار — ہائے وہ اب مجاہدِ ملت نہیں رہا

میخانہ سوگوار ہے میکش ہیں دم بخود
ساقی کا لطفِ فیض و عنایت نہیں رہا

اسیرِ غم
مشہود احمد بہاری
رکن ادارہ تحریر
الجمعیۃ دہلی

فی ذمة الله

للشیخ الفاضل مولانا عبد الحمید النعمانی

فی صباح الثانی من اغسطس وأنا فی مکتبی فی معهد ملّت خاطبنی أحد اصدقائی بالمأساة قائلا ——— ان نشرة الاخبار الصباحیة من اذاعات الهند الیوم أعلنت — انه انتهی الامر وأن مجاهد الملة فاضت روحه الی جوار بارئه، لم یزد صاحبی علی ماقال کلمة ولم یسعنی بما اصابنی بغتة ان استزید لاجلست واجما وسقطت السماعة من یدی، کنت أقرأ النشرة عن صحته کل یوم فأجد فیها کلمات تنطق بالرجاء فی ابلاله بعض النطق، ثم تتبعها کلمات تهمس بالخطر، قد وقع فی معترك اللیل ماکنت احذره فانا لله وانا الیه راجعون۔

مات مجاهد الملّة فوا اسفاه فقدت البلاد بموته عالما دینیا، کاتبا قدیرا، خطیبا مصقاعًا زعیمًا مخلصًا، وطنیا صادقا، مجاهدا وفیا، تجسمت فی شخصه قوة الایمان وعظمة العمل المتواصل لأنبل غایة من غایات الحیاة، کما تجسمت فیه الجرأة والاقدام بالصبر والثبات، مهما تعاکسه الظروف وقد رما تعارضه الاحوال،

قد یکون رجلٌ إدارةً، وفردٌ منظّمةً، وقیسُ بنیان قومٍ والراحل الکریم رحمة الله علیه کان بملکاته ومواهبه، وهو هذا الرجل، وهو هذا الفرد، هو هذا القیس،

لقّبوه بمجاهد الملّة، وماأصدق ما لقّبوه به فحیاته کلها جهاد وکفاح، جهاد ضد الاستعمار البریطانی أیام عهده فی البلاد، وکفاحٌ ضد الاعتداء والعدوان أیام الحرّیة والاستقلال،

مات مجاهد الملّة، فیالهول الموقف، فقدنا بموته من قام فی الشطر الاوّل من حیاته علی وجه الانجلیز وجاهد فی سبیل استقلال الوطن وانقاذه من مخالب الاستغلال الاجنبی واحتمل عقابا علی ذلك، من متاعب التضحیات ومتاعب السجن ما احتمل، وکابد فی الشطر الثانی من حیاته فی سنه المتقدّم من المشقات، وماواجه من الأهوال ماتقشعر منها الجلود، عند ما قضت قسوة المقادیر بتقسیم البلاد، فتبدلت الارض غیر الارض علی ایدی المتطرفین المتعصبین من الهندوس، وأصبح المسلمون فی دیارهم کأنهم أغنام فی ارض مسبعة تولی رعیها الاسد،

فرأینا مجاهد الملة ورأی الذین سواء کانوا أنصارًا له أو خالفوا خطته، أن تجلّت فیه روح العزیمة والجهاد روح التضحیّة والتفانی، روح تتدفق قوةً وایمانًا تقاوم العصبیة المتطرفة الهندوکیة، وطاف بالبلاد من أقصاها الی أقصاها، وخطب الجماهیر المحتشدة فی الحفلات وفی البرلمان أمام أعضائه — ببلاغته الساحرة، واجتمع بالمسئولین فی المحاکم وقابل الوزراء ورئیس الوزراء وتحدث الیهم تماما غاندی عن کل ماحدث وعن کل ما اعتدی به المعتدون،

کان یقول — رحمة الله علیه — لمن ناقشه فی ذلك فی تلك الأیام ——— " نحن الذین حاربنا العصبیّة المتطرفة من المسلمین بالأمس أیام الانجلیز غیر مبالین بما تجره

علینا من الشدائد، وقفنا علی وجهها بکل ما استطعنا فمن هو أجدرنا الیوم وأحق أن تقاومعنا اذا صدرت عن الهندوس، وقام فی البرلمان فی ٢٩ من مارس من السنة الماضیة فقال فیما خطب ـــ

والذی یتراءی لنا منذ خمس عشرة سنة ونلمسه حتی یومنا هذا، أن البلاد عمّها العصیان وأنها ضعیفة الأمن، ضئیلة السلام، والهیئات المسئولة لا تقوم فیها بالقانون والتنفیذ بالقوة والضبط تمامًا، فاصبحت عرضة لطواری التمرد والتشویش ولیس ذلك ما یختص به عنصر دون عنصر ولا جنس دون جنس، فالهند و والمسلم والسیخ والمجوسی والیسوعی وما عدا هؤلاء من المواطنین کلهم یرون ویشعرون أن الحیاة فی هذه الأیام بلغت بهم طورًا یحسب حتی للنملة حسابًا ویقدّرلها ثمنًا، ولا یحسب للانسان أیّ حساب ولا یقدرله ولا لماله وعرضه ثمنًا مّا ـــ ما أرهب الموقف وما آلمه؟ ولیس ما یقنعنا ردًّا علی ذلك أن حکومة الهند لیست مسئولة عن هذا وأن علی حکومات الاقالیم أن تعتنی بالأمر وتقوم داخل حدودها باللازم ـ إننی أری ان المسئولیة فی أکبر درجاتها تعود الی الوزارة الداخلیة المرکزیة و أنها مفروض علیها أن تحاسب اعمال وزارات الاقالیم وتراقبها بالدقة اللازمة فتعلم ما بال الناس یخافون علی أنفسهم ویخافون المس بکرامتهم والعبث بعرضهم ویخافون ضیاع اموالهم واملاکهم وهم أحرار متمتعون بالاستقلال،

وهٰؤلاء الوزراء ایهم تنقصه فی عمله الإجادة ویفقده التمکین والاتقان فلا یملك جدارة القضاء علی ما یواجهه البلاد نوعًا من الفوضی فلیترك مقعده فی غرفة الوزارة ولیقدم استقالته"

یا لها من کلمات حق ویا لقائلها من ثقة و قوة وایمان،

اربعون سنة بکاملها ونزد علیها سنتین . قضاها الراحل الکریم کلها فی خدمة الدین وفی خدمة الوطن، قضاها بصفته وکیلًا عامًّا لجمعیة العلماء وبصفته عضوًا ممثلًا فی مجلس الامة الهندی الوطنی وفی بعض لجانها وبصفته مندوبًا فی البرلمان فی السنوات الاخیرة ـ

ذهب مجاهد الملة إلی جوار بارئه فلا نجتمع به بعد الیوم ولا نسمع منه خطبة ولا حدیثًا و لا نراه فی مکتبه جالسا او متکئًا فقد رحل عنا بجسمه ولکن بقیت لنا من حیاته ذکری لا تزال او قل ترکت لنا حیاته فکرة لا تنقطع وانما تنمو وتسمو فحیاته الحافلة بجلائل الاعمال رسمت لنا خطة بارزة الخطوط واضحة الحدود وهی یجوهرها جمعیة العلماء وأهدافها اداهها الله وابقاها ـ

ولیرقد مجاهد الملّة هادئًا مستریحا فملایین من الامة قد تأصل فیهم ما افنی حیاته وراء غرسه و نشره فهم یتمون عمله ویبنون فوق اساسه ـ

ولیبرد مجاهد الملّة فی مضجعه الایدی یظلله من الله رضوانه ویغشاه غفرانه ـ

مجاہدِ ملّت کا مشن

مسٹر ظہیر الدین صدیقی ایم، اے ایل ایل بی (علیگ)

مسٹر ظہیر الدین صدیقی ایم، اے (علیگ) جن کا مقالہ پیش نظر ہے۔ ایک ہونہار اہلِ قلم ہیں۔ ان کو اپنے دورِ طالب علمی ہی سے جمعیۃ علماء اور مجاہدِ ملّت کے ساتھ مخلصانہ تعلق رہا ہے۔ ۵۵ء و ۵۶ء میں آپ کو بطور سکریٹری حضرت مولانا مرحوم سے بہت قریب رہنے کا موقع بھی ملا۔ مسلم کنونشن کے شعبۂ نشر و اشاعت کی پوری ذمہ داری حضرت مجاہدِ ملّتؒ نے آپ ہی کے سپرد کی۔ اپنے اس قریبی تعلق اور وابستگی کے ساتھ یہ مختصر مقالہ اپنے مجاہدِ ملت نمبر کے لئے تحریر کیا ہے جو شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

(انیس الحسن)

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی رحلت سے مسلمانانِ ہند ایک عظیم مجاہد اور پُروقار رہنما سے محروم ہو گئے ہیں۔ مولانا مرحوم جس شدید بے چین رُوح کے ساتھ زندگی بھر مسلمانوں کی بہبود کے لئے جد و جہد کرتے رہے۔ اس نے اُن کی شخصیت کو حسنِ عمل کا ایک ہمہ گیر ادارہ بنا دیا ہے۔ ہمارے ملّی رہنماؤں کی تاریخ میں اتنی فعّال، متحرک اور عملی صداقت رکھنے والی شخصیتیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ اُن کی بے پناہ جرأت، ایمان کی حرارت، جذبہ کی توانائی، فکر کی پختگی اور اُن کے عظیم کارناموں نے انھیں ملّی تاریخ کا ایک شاندار کردار بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کو سربلند کرنے کی اُن کے دل میں ایک سرگرم تڑپ تھی جس نے اُن کو شب و روز متحرک رکھا۔ مسلمانوں سے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس پر انھوں نے بے خوفی کے ساتھ آواز بلند نہ کی۔ پارلیمنٹ ہاؤس ہو یا پبلک پلیٹ فارم، کانگریس میٹنگیں ہوں یا کلچرل اداروں کی کانفرنسیں ایوان ہائے وزارت ہوں یا تشدد کرنے والے گروہ، جبلپور ہو یا میرٹھ، دارالعلوم دیوبند ہو یا مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، مجلسِ اوقاف ہو یا انجمن ترقی اردو ہند، سیاسی کانفرنسیں ہوں یا سیرت کے اجلاس، طبیعت خواہ مضمحل ہو یا ناساز، وہ ہر جگہ ممتاز ہی نظر آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کی آواز تھے، اُن کا دماغ تھے، ان کا سہارا تھے اور اُن کی امید تھے۔ وہ اُٹھے تو ایسا لگا گویا اُن کی امیدیں ٹوٹ گئیں، ان کی ڈھارس جاتی رہی۔ مجاہدِ ملّت کی ایک عہد آفریں شخصیت تھی۔ اُن کی زندگی تعمیر مستقبل کے فلسفۂ عمل کی تفسیر تھی۔ اُن کی ذات اجتماعی کرکیٹر کا شعوری سرچشمہ تھی، وہ جید عالم دین تھے، ممتاز سیاسی لیڈر تھے، سحر انگیز خطیب و ادیب بھی۔ لیکن میرے نزدیک ان کی بڑائی کا ایک دراز بھی ہے اور وہ یہ کہ وہ ایک دردمند انسان تھے، گوشت اور ہڈی کے، اصول اور ایمان کے، خلوص اور محبت کے، شفقت اور مروّت کے، شرافت اور اخلاق کے، ایک نظریے اور مقصد کے۔ ظرف کی بلندی اس سے نمایاں تھی کہ کبھی انھوں نے اپنی شخصیت پر خول نہیں چڑھائے ظاہری حسن سے لے کر باطنی جوہر تک، گھر میں، مجلس میں، دفتر میں، ریلوے اسٹیشن پر گاڑی کے کسی ڈبے میں یا جلسۂ عام میں، وہی یکسانیت و یک آہنگی، نہ تصنع اور تکلّف کے پردے ہیں اور نہ تضاد و تناقض۔ مسکراتے تو لبوں پر کشادہ اور بلند پیشانی پر تقدس ہانت سایہ فگن ہوتی، غصّہ فرماتے تو آنکھوں میں دلی شفقت کا طوفان کرن بن کر اُبھرتا۔

جمال و جلال دونوں اُن کی انسانیت کے ہم دوش و رفیق، عفو و درگذر ان کا شیوہ، ان کی محفل میں زاہد، عابد، شاعر، ادیب، لیڈر، امیر، غریب سب ہی موجود رہتے، زندگی کے ہر مسئلہ پر گفتگو ہوتی اور مولانا ایک ایک فرد کو پوری پوری اہمیت دیتے دسترخوان پر نواب صاحب کے ساتھ مولوی حمد اللہ جان کو بھی اصرار و محبّت کے ساتھ بٹھاتے اور عوام کے روزمرہ کے مسائل پر دیوتائی ذہن کے ساتھ نہیں بلکہ ایک انسان کی حیثیت سے سوچتے۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ابھی تک اتنا بڑا آدمی نہیں دیکھا جو ایک ہی وقت اتنا عظیم سیاسی لیڈر، ممتاز عالمِ دین اور بے پناہ صلاحیت اور طاقت والا ہو اور جس نے ہمارے لئے ایک مشن بھی چھوڑا ہو۔

مجاہدِ ملّتؒ نے جمعیۃ علماء ہند کو ایک متحرک اور فعال جماعت کی شکل میں ہمارے درمیان چھوڑا ہے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی، اپنی بھرپور صلاحیتیں اور تمام تر فکری اور عملی قوتیں جمعیۃ علماء کے لئے وقف کر دیں اور وہ جمعیۃ علماء ہند کی وسعت فکر و عمل کی سرگرم ترین علامت (Symbol) بن کر ہندوستان کے افق پر اُبھرے۔ جمعیۃ سے اُن کو تفویض ملی

تھی اور جمعیۃ کو اُن سے فکر و عمل کا فیضان (Inspiration) ملتا تھا۔ مولانا مرحوم کی شخصی اور عملی صلاحیتیں بہت وسیع تھیں اسی نسبت سے انھوں نے جمعیۃ علماء کے جماعتی ڈھانچے اور میدانِ عمل کو بھی وسیع کیا جس طرح وہ عملی سرگرمیوں کے لحاظ سے صرف ایک طبقہ کے (Section) ہوکر نہیں رہے۔ اسی طرح جماعتی سرگرمیوں کا رُخ بھی انھوں نے ہر جانب موڑ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ رہنماؤں کے شخصی عمل کے اُن کی جماعت کے ساتھ ربط کی تاریخ میں یہ روشن ترین باب ہے جس نے جمعیۃ علماء کو آج تمام مسلمانوں کی اُمنگوں اور عزائم کا مرکز بنا دیا ہے۔ اس میں ہر مکتب خیال اور عقائد کے حضرات شامل ہیں سنّی بھی ہیں اور شیعہ، دیوبندی بھی ہیں اور غیر دیوبندی بھی، اہلِ حدیث بھی ہیں اور سجادہ نشین بھی، جید علماء بھی ہیں اور صوفیا بھی، جمعیۃ علماء کی اسی خصوصیت نے اس کو ہندی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنا دیا ہے۔ ہمیں مجاہدِ ملّت کے بعد جمعیۃ علماء کی اس خصوصیت کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہئے اور مجاہد ملّت نے فکر و عمل کی جس نہج پر جمعیۃ کو چھوڑا ہے اس کو نہ صرف قائم رکھنا ہے بلکہ انہی خطوط کو بنیاد بنا کر تیزی کے ساتھ آگے بھی بڑھانا ہے۔ جوشِ عمل اور فکر و نظر کی اسی وسعت کو باقی رکھنا ہے اور اس طرح عوام کے ساتھ اپنے رابطہ تنظیم کو زیادہ سے زیادہ بڑھانا ہے۔

وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ جمعیۃ علماء میں مسلمانوں کی نئی نسل کے لئے بھی جگہ نکالی جائے۔ ہندوستان کے مسلم نوجوان ذہنی طور پر مایوسی، انتشار اور ہیجان کا شکار ہیں، نہ اُن میں ملّی مسائل پر غور و فکر کرنے کا رجحان ہے اور نہ اجتماعی فرائض سے آگاہی، حتیٰ کہ تعلیم یافتہ نوجوان بھی مذہبی زندگی اور دینی عمل سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ طبقہ ہماری اجتماعی زندگی سے اسی رفتار سے بے تعلق ہوتا گیا تو خطرہ ہے کہ آنے والی نسلوں کے مستقبل کا کون ضامن ہوگا۔ ضرورت ہے کہ جمعیۃ علماء اور اس کے رہنما زندگی اور زمانے کے نئے تقاضوں اور رجحانات کا گہرا مطالعہ فرمائیں اور جدید ماحول کے مطالبات کی روشنی میں ایسا طریقہ کار مرتب فرمائیں کہ ہماری جماعت کا نئی نسل کے ساتھ ذہنی ربط قائم ہو سکے۔ عمل کی قوت (Force of action) وسیع النظری اور اخلاق و ایثار کو بنیاد بنا کر ہم نوجوانوں کی دینی حس کو بیدار کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے اور اُن کی ذہنی تعمیر و تربیت کر سکیں گے اور ان میں حسنِ عمل کی پرجوش رُوح اُبھار سکیں گے۔ یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جب معاشرے کے نئے تقاضوں، غور و فکر کے نئے خطوط و جہد و عمل کی نئی بنیادوں اور موجودہ جماعتی تنظیموں کے نفسیاتی خدوخال کا حقیقت پسندانہ مطالعہ کیا جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ پوری قوم مردہ ہو چکی ہے یا اس میں سربلند ہونے کی تڑپ فنا ہو چکی ہے یا تمام اچھائیاں ایک ہی جگہ جمع اور محدود ہو کر رہ گئی ہیں یا آج اہلِ بصیرت زعماء کی قلّت ہے۔ اگر آج کمی ہے تو صرف ایسی اسپرٹ کی جو ملّت کے منتشر اور بکھرے جوہر کو ایک جگہ مجتمع کر سکے۔ مجاہد ملت نے یہ بھی کر دکھایا اور پوری دنیا نے دیکھا کہ ہندوستان میں آج بھی کتنے مسلمان دانشور ہیں، اہلِ فکر ہیں، اہلِ دل ہیں۔ مسلم کنونشن مولانا حفظ الرحمٰنؒ اور جمعیۃ علماء کا تاریخ ساز اور عظیم کارنامہ ہے۔ جس سے مسلمانانِ ہند کے لئے عزم و عمل کی مؤثر راہیں متعین ہوئی ہیں۔ وہ مسلمانانِ ہند جو آگ اور خون کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے بعد آزاد ہندوستان میں نئی حیثیت لے کر ابھرے۔ نئے ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کی ابتداء لکھنؤ میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس سے ہوئی جو امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزادؒ کا بہت بڑا مدبرانہ کارنامہ تھا جس میں فرقہ پرستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دفن کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مجاہد ملتؒ ایک ناقابلِ تسخیر طاقت بن کر ہندو اور مسلم فرقہ پرستی سے ٹکراتے رہے اس کے بعد مسلم کنونشن نے مسلمانوں کے روشن مستقبل کی تعمیر کی نشاندہی کی۔ مجاہدِ ملتؒ نے کنونشن کے داعی کی حیثیت سے جمہوریہ ہند میں مسلمانوں کے لئے طریق کار متعین کیا اور ثابت کر دیا کہ سیکولر ریاست مذہب کی نفی نہیں کرتی۔ افسوس کہ مولانا اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مگر وہ مسلمانوں کی تعمیرِ مستقبل کا مشن جمعیۃ علماء کے سپرد کر گئے۔ ان کا صحیح جانشین پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے اب جمعیۃ علماء اور اس کے ارکان کو اجتماعی فکر اور اجتماعی عمل سے مجاہدِ ملت کے مشن کو پورا کرنا چاہئے۔ آج جمعیۃ علماء کو مولانا حفظ الرحمٰنؒ نے بے پناہ ذمہ داریاں سپرد کی ہیں وہیں ہندی مسلمانوں پر بھی فرض عائد کیا ہے کہ جمعیۃ علماء کے ساتھ اپنی وابستگی کو مضبوط کریں اور اس کی سرگرمیوں کا ایک طاقتور جزو بنیں! یہی مجاہد ملتؒ کا مشن تھا اور یہی قفسِ عنصری سے پرواز کرتی ہوئی اُن کی مقدس روح کا آخری پیغام!

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا

اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑو۔

حضرت مجاہد ملتؒ کی

چند یادگار تقریریں

سبق آموز مکتوب اور بصیرت افروز بیان

چند تاریخیں ایک نظر میں

محمد عثمان پورہ معروف اعظم گڈھ

پوچھا جاتا ہے کہ حضرت مجاہد ملتؒ کا آبائی وطن سیوہارہ ضلع بجنور ہے لیکن آپ کی آخری آرام گاہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندانی مزارہ میں بنائی جاتی ہے آخر یہ کیوں ہے؟ آپ بھی بعد رحلت اپنے وطن منتقل کئے جا سکتے تھے۔ جس طرح حضرت شیخ الہندؒ دہلی سے دیوبند لائے گئے تھے۔ اس میں کھلا ہوا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو مبارک تحریک اولاً حضرت شاہ صاحبؒ نے شروع کی تھی مجاہد ملتؒ اسی سلسلہ کی آخری کڑی ہیں۔ قدرت نے ڈھائی صدی کے بعد مجاہد ملتؒ کو شاہ صاحب کی آغوش میں بھیجکر واضح کر دیا کہ اس لائق سپوت نے اس بیڑے کو سالم پار کرکے ہمکنار کر دیا جس کی ابتدائی حضرت شاہ صاحبؒ نے شروع کی تھی۔ یہ تحریک اشاعت علم خدمت خلق اخلاص وطن دوستی۔ جہاد کے فتوے، بالاکوٹ اور شاملی کے میدان ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت، جزائر انڈمان و مالٹا کی اسارت، ریشمی خطوط کی تحریک ترک موالات اور قید و بند کی صعوبات وغیرہ سے گذر کر ۱۹۴۷ء پر ختم ہوتی ہوئی خالص تعمیری پروگراموں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ مجاہد ملت کے کارناموں کو سمجھنے کے لئے ڈھائی سو سال پیچھے پلٹنا ہوگا۔ جس کے لئے دفاتر درکار ہیں۔ یہاں اس سلسلہ کی چند اہم تاریخیں بطور فہرست پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ایک نظر میں ایک اجمالی خاکہ سامنے آجائے۔

واقعہ	تاریخ	
حکومت مغلیہ شہنشاہ بابر سے بہادر شاہ ظفر تک	از سنہ ۱۵۲۶ء	تا سنہ ۱۸۵۷ء
ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگلینڈ میں بنیاد	۲۴ ستمبر سنہ ۱۵۹۹ء	
بعہد جہانگیر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ہندوستان میں قیام	۱۱ جنوری سنہ ۱۶۱۳ء	
ولادت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بعہد عالمگیرؒ	سنہ ۱۷۰۳ء / ۱۱۱۴ھ	وفات سنہ ۱۷۶۱ء
ولادت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ	سنہ ۱۱۵۹ھ	وفات سنہ ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء
ولادت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ	سنہ ۱۱۶۱ھ	وفات سنہ ۱۲۳۳ھ
ولادت شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ	سنہ ۱۱۶۷ھ	وفات سنہ ۱۲۳۰ھ
ولادت مولانا سید احمد صاحب شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ	سنہ ۱۷۸۶ء	
شہادت مولانا سید احمد و مولانا اسماعیلؒ بمقام بالاکوٹ	سنہ ۱۸۳۱ء	جہاد کی ابتدا سنہ ۱۸۲۶ء
جنگ پلاسی	۲۳ جون سنہ ۱۷۵۷ء	۵ شوال سنہ ۱۱۷۰ھ
وارن ہیسٹنگز ہندوستان کا پہلا گورنر	سنہ ۱۷۷۲ء	
وفات مولانا فضل حق خیرآبادی بسلسلۂ اسارت بجزیرہ انڈمان	۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / سنہ ۱۸۶۱ء	ولادت سنہ ۱۷۹۷ء
ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے سلسلہ میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا فتویٰ	سنہ ۱۸۰۳ء	
شہادت سلطان ٹیپو	۴ مئی سنہ ۱۷۹۹ء	
ہندوستان کا مشہور جہاد حریت اور انگریزوں کی باضابطہ حکومت	سنہ ۱۸۵۷ء	
علماء دیوبند کا شاملی میں زیر امارت حاجی امداد اللہ جہاد اور حافظ ضامن کی شہادت	سنہ ۱۸۵۷ء	سنہ ۱۲۷۳ھ
شہادت مولانا احمد اللہ شاہؒ مدراسی	۱۵ جون سنہ ۱۸۵۹ء	۳ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ
مدرسہ دار العلوم دیوبند کی بنیاد (مسجد چھتہ میں)	سنہ ۱۸۶۷ء	۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۳ھ
سرسیدؒ نے علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی	یکم جون سنہ ۱۸۷۵ء	
کانگریس کی بنیاد	سنہ ۱۸۸۵ء	
مسلم لیگ کی بنیاد	سنہ ۱۹۰۶ء	
تنظیم جمعیۃ علماء ہند و حادثہ جلیانوالہ باغ	سنہ ۱۹۱۹ء	
تحریک شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ و مفتی اعظم مولانا محمد کفایت اللہؒ	سنہ ۱۹۱۹ء	
بنیاد جامعہ ملیہ و تحریک ترک موالات	سنہ ۱۹۲۰ء	

واقعہ	تاریخ	
کانگریس کی مکمل آزادی کا نصب العین		سنہ ۱۹۲۹ء
جمعیۃ علماء ہند کا کانگریس کے ساتھ غیر مشروط تعاون	سنہ ۱۹۳۰ء	
تحریک انقلاب عرف ریشمی خطوط کی تحریک تا اسارت مالٹا	از سنہ ۱۹۱۲ء	تا ۲۰ رمضان سنہ ۱۳۳۸ھ / ۸ جون سنہ ۱۹۲۰ء
شیخ الہندؒ کا فتویٰ ترک موالات	۳ ذی قعدہ سنہ ۱۳۳۸ھ	
آزادی ہند	سنہ ۱۹۴۷ء	
جنگ عظیم اول	از سنہ ۱۹۱۴ء	تا سنہ ۱۹۱۸ء
جنگ عظیم ثانی	۳ ستمبر ۱۹۳۹ء	
ولادت حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ ظفر احمد	۲۲ صفر سنہ ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء	وفات سنہ ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء
ولادت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ خورشید حسین	سنہ ۱۲۴۸ھ	وفات سنہ ۱۲۹۷ھ
ولادت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ	سنہ ۱۲۴۴ھ	وفات سنہ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء
وفات مولانا احمد حسن صاحبؒ امروہوی	سنہ ۱۳۳۰ھ	
ولادت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ (علمبردار ریشمی خطوط)	سنہ ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء	وفات سنہ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء
ولادت مولانا عبید اللہ صاحب سندھیؒ	سنہ ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء	وفات سنہ ۱۹۴۴ء
مولانا عبید اللہ صاحبؒ کی ہجرت کابل	سنہ ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء	
مولانا کی پچیس سال بعد مختلف ممالک سے مراجعت ہند	سنہ ۱۹۳۹ء	
ولادت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ	سنہ ۱۲۹۲ھ	
ولادت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ	سنہ ۱۲۸۰ھ	
ولادت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ	سنہ ۱۲۹۲ھ	وفات سنہ ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۳ء
ولادت امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ فیروز بخت	سنہ ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء	وفات سنہ ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء
ولادت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ چراغ محمد ۱۲۹۶	سنہ ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء	وفات سنہ ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء
وفات سحبان الہند مولانا احمد سعیدؒ صاحب	سنہ ۱۳۷۹ھ / ۱۹۵۹ء	
ولادت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہارویؒ	۱۰ جنوری	سنہ ۱۹۰۱ء / ۱۳۱۸ھ
کل ہند مسلم کنونشن طلب کردہ مجاہد ملتؒ	۱۰، ۱۱ جون ۱۹۶۱ء	۲۸، ۲۹ ذی الحجہ سنہ ۱۳۸۰ھ
وفات مجاہد ملتؒ ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند	۲ اگست ۱۹۶۲ء	۳۰ صفر سنہ ۱۳۸۲ھ

یوم میلاد سرورِ کائنات پر آل انڈیا ریڈیو سے مجاہد ملتؒ کی ایک تقریر

انسان ہمیشہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی یادگار مناتا ہے۔ اپنی تاریخ کے اونچے سے اونچے رہنماؤں اور لیڈروں کی، بادشاہوں اور شہنشاہوں کی، بہادروں اور جرنیلوں کی، باکمال ہنرمندوں اور اپنے وقت کے ہیرو کہلانے والوں کی یاد مناتا ہے۔ اُن کے نام پر دن منائے جاتے ہیں مجلسیں اور محفلیں منعقد ہوتی ہیں جلسے جلوس، تذکرے اور تقاریر کی رسوم ادا کی جاتی ہیں اور مرنے والوں کے اوصاف و کمالات کو یاد کر کے داد دی جاتی اور اُن کے بقاء دوام کی سبیل پیدا کی جاتی ہے۔

آج کا دن بھی ایک تاریخی جشن مسرت اور دنیائے انسانی کی ایک عظیم الشان یادگار ہے لیکن ایک ایسی یادگار جو اپنی آن و شان میں دوسری یادگاروں سے نرالی اور انوکھی ہے۔

آج ہم اس برگزیدہ ہستی یعنی رسول خدا سرور کائنات محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یادگار منا رہے ہیں جنکی اقدس و ارفع شخصیت، جن کی تعلیم و دعوت، قیادت و سیادت اور کمال انسانیت تاریخ عالم کی وہ زندہ جاوید یادگار ہے جو اپنے کسی تذکرہ یا یادگار کے منائے جانے کی محتاج نہیں ہے۔ اگرچہ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اُن کی یاد اور اُن کا تذکرہ ہمارے لئے سرمایۂ سعادت اور آیۂ رحمت ہے۔

ابتداء آفرینش سے آج تک دنیا میں بے شمار نامور انسان، ہزاروں ریفارمر اور مُصلحین گذرے ہیں لیکن ایک ریفارمر اور ایک سچے نبی و رسول کے درمیان جو سب سے بڑا امتیاز ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی مصلح، ریفارمر، لیڈر یا رہنما کے بہترین کیریکٹر کے لئے یہ وصف کافی سمجھا جاتا ہے کہ جس شعبۂ حیات میں وہ رہنمائی کر رہا ہے اُس میں اُس کی اخلاقی برتری اور کردار و گفتار کی صفائی قابل تقلید ہو باقی دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں کتنی ہی خامی، کمی اور کوتاہی کیوں نہ ہو، اُس پر انگشت نمائی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن نبوت و رسالت کا منصب اس سے بالکل جدا اور بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ بالخصوص وہ مقدس ہستی جس کی رسالت و نبوت اپنی جلالت شان اور رفعت قدر کے لحاظ سے تمام انبیاء و رسل کے لئے بھی اُسوہ اور معیار قرار پائی اُس کے لئے از بس ضروری تھا کہ اُس کی خلوت و جلوت اور زندگی کا ہر شعبہ اس درجہ صاف، روشن اور کامل و مکمل ہو کہ نقص و عیب یا خامی و کمزوری کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سن و سال کے اعتبار سے اگرچہ پونے چودہ سو سال کی طویل مدت گذر چکی ہے لیکن رسول اکرم، سرور عالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدس کا ایک ایک لمحہ اور اُن کی زندگی کا ایک ایک ورق آج بھی ہمارے سامنے اسی طرح روشن ہے جیسے آج ہی کی بات ہے۔ اُن کی خلوت اور اُن کی جلوت، خانگی اور نجی زندگی بھی اور بیرونی زندگی بھی۔ اُن کے معاملات و اشغال بھی اور اُن کا رہن سہن بھی، اُن کا لباس اور وضع و قطع بھی اور ان کا قول و عمل یا اخلاق و کردار بھی، غرض زندگی کا ہر ہر شعبہ دنیا کی رہنمائی کے لئے آج بھی آفتاب عالمتاب کی طرح چمک رہا ہے۔

ولادت باسعادت سے لیکر زندگی کے آخری لمحات تک آپ کی سیرت پاک لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ کا مرقع اور رُشد و ہدایت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔

آپکے بچپن کی تاریخ دیکھئے تو دنیا کے عام بچوں کی طرح کھیل کود، سیر و تماشہ، لغویات اور بیہودگیوں اور طفلانہ حرکات و مشاغل کی جگہ، سنجیدگی و متانت، کرامت نفس و شرافت، طہارت و لطافت اور برمحل افکار و اشغال کا ایک حیرت انگیز اور قابل تقلید نمونہ آپ کو ملے گا۔

آگے بڑھئے اور نبی کریمؐ کے عہد شباب کا مطالعہ کیجئے۔ ایک انسان کی زندگی میں جوانی کا دور سب سے نازک دور ہوتا ہے لیکن جب آپ محمد عربی فداہ روحی ابی و امی کی سیرت کے اس دور کے ابواب پڑھیں گے تو حیرت ہوگی یہ دیکھ کر کہ وہاں بھی عام انسانی سطح سے بہت بلند، اور غلط جذبات و رجحانات سے بالکل الگ، حلم و بردباری، پیرانہ فراست و دانشمندی، ریاضت و تزکیہ نفس اور مخلوق خدا کی خدمت کا ایک قیمتی سلسلہ ہے جو شب و روز کا عام مشغلہ اور صبح سے شام تک کا کاروبار ہے۔

اور سب سے آخر میں جب آپ نبی کریمؐ کے عہد پیری کا مطالعہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ سیرت پاک کے آخری تیئس سال اس عظیم الشان انقلاب کی تاریخ ہیں جو آپ کی حیات مقدسہ کا مقصد و منتہا ہے۔

خاتم الانبیاء، سرکار دو عالم، رسول اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی

ولادت باسعادت ایک ایسی سرزمین، ایک ایسے گھرانے اور ایک ایسی قوم میں ہوئی جہاں تعلیم، تہذیب، تمدن غرض ارتقاء انسانی کے ذرائع مفقود و ناپید تھے۔ آپ کی ذات مبارک اس عالم میں وجود میں آئی کہ باپ کا دست شفقت شروع سے دیکھا ہی نہیں اور چند سال بعد ہی ماں کے آغوش محبت سے بھی محروم ہو گئے لیکن تاریخ ماضی کے اوراق شاہد ہیں کہ دنیوی اسباب و ذرائع سے یکسر محرومی کے باوجود آپ نے ایک بن کھیتی کی سرزمین میں رہ کر نہ صرف ایک غیر مہذب اور غیر متمدن قوم کو انسانیت عظمیٰ کے بلند درجہ پر پہنچایا اور گلہ بانوں اور ساربانوں کو جہاں بانی اور انسانی قیادت و سیادت کے جوہر بخشے بلکہ ٹھیک ایسے وقت میں جبکہ کفر و شرک، ظلم و عدوان، زیردستوں کی مظلومیت اور زبردستوں کا تشدد اور زندگی کی ہر شاخ میں افراط و تفریط کی تاریکیاں دنیا پر چھائی ہوئی تھیں، آپ نے عدل و انصاف، توحید الٰہی، خدمت خلق اور ہمدردی عالم کی روشنی دنیا کو دکھلائی۔ اور کائنات مذاہب و ملل میں ایک ایسا پاک اور عظیم الشان انقلاب پیدا کیا جس نے مذہب، سیاست، معشیت، معاشرت غرض دنیا کی چلتی پھرتی اور متحرک زندگی میں جہالت و تاریکی کو فنا کر کے روشن و تابان آفتاب حقیقت کی طرف رہنمائی کی۔

آپ نے مذہب کی بنیاد خدا پرستی اور عقل و شعور کی افادیت پر رکھی انسانوں کو انسان کی غلامی سے نکال کر خدا کی دی ہوئی صداقت "کلام الٰہی" کی روشنی میں آزادی بخشی۔ آپ نے ظلم و تعدی کو عدل و انصاف سے، تحکم و استبداد کو جمہوریت و شورویت سے، انسانوں کی باہمی کشمکش اور طبقاتی جنگ کو تعاون و مساوات اور اخوت و ہمدردی سے، کفر و جہالت کو خدا پرستی و توحید الٰہی سے بدل کر دنیا کا نقشہ ہی کچھ سے کچھ بنا دیا۔

آپ نے ایک طرف اس دور کے پھیلے ہوئے فسق و فجور، ظلم و جور اور جورع الارض کی شخصی حکومتوں کے تختے الٹ کر انسانوں کو عدل و مساوات کی قدر و عظمت بخشی اور دوسری طرف سادگی اور غربت و مسکنت کو اپنا طغرائے امتیاز بنایا۔ چنانچہ آپ کی پوری زندگی میں آپ کا لباس پیوند لگے ہوئے کپڑے، آپ کا بستر پرانی کھال کا ایک نمدہ اور خدا کا بچھایا ہوا فرش زمین، آپ کا مکان و محل کھجور کی ٹٹیوں کا ایک چھوٹا سا حجرہ اور آپ کی غذا جو کی روٹی، کچھ کھجوریں اور پانی کا ایک پیالہ رہی۔ اسی سادگی اور مسکنت کے عالم میں آپ نے خدا کے بھروسہ اور اپنے دست بازو کے بل پر جائز و حلال روزی بھی کمائی۔ بکریاں بھی چرائیں اور شام کے بازاروں میں تجارت بھی کی اور دوسری طرف قوم و قبائل کے نزاعات کے وہ فیصلے بھی کئے جو عدل و انصاف کے نادر نمونے کہے جا سکتے ہیں۔ آپ کی دیانت و صداقت کا یہ عالم تھا کہ قوم نے امین صادق کے لقب سے یاد کیا اور آپ کے دشمنوں نے بھی اپنی امانتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے آپ ہی کی دیانت اور آپ کی ذات مقدس پر اطمینان کیا۔

آپ ہی کی ذات ستودہ صفات ہے جو انسانی عفت و پاکدامنی، اعتدال و میانہ روی اخلاق و کردار کی صفائی اور محاسن انسانی کا مکمل ترین نمونہ اور انسانیت کے عروج و کمال کی سب سے اعلیٰ مثال ہے۔ خود لسان نبوت کا ارشاد ہے:۔ بُعِثتُ لاتمم مکارم الاخلاق ۔ میں دنیا میں اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کے حسن و مکارم کی تکمیل کر دوں اور مکارم اخلاق کی ایک زندہ جاوید یادگار دنیا کے سامنے چھوڑ جاؤں۔ چنانچہ آپ کا لایا ہوا وہ پیغام جو انسان کو حقیقت اور سچائی کی راہ دکھاتا ہے اسی اعلیٰ مشن کی تعبیر اور آپ کی سیرت پاک اور اس کی عملی تفسیر ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم کی تعلیمات رشد و ہدایت کے وہ سرچشمے ہیں جو ہمیں انسانیت اخوت و محبت، حق گوئی و حق پرستی، ظالم سے درگذر اور مخلوق خدا کے ساتھ حسن سلوک، مواسات و بھائی چارہ گی، اور ہمدردی و غمخواری، زیردست و بے نوا کی مدد اور تعدی و دست درازی کے انسداد کے وہ اعلیٰ اصول بتلاتی ہیں جو دنیا میں ہمیشہ انسانی سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لئے لازمی اور بنیادی اصول ہیں

ساڑھے تیرہ یا پونے چودہ سو سال گذر چکے ہیں کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مکہ کی پہاڑیوں سے اپنی آواز دنیا کو سنائی تھی لیکن وہ آج بھی دنیا میں اسی طرح گونج رہی ہے اس لئے کہ یہی حق و صداقت کی آواز ہے جو کبھی فنا نہیں ہو سکتی اور یہی وہ پیغام ہے جو انسان کو انسانیت اور اخوت و محبت کی راہ بتلاتا ہے

کوئی شبہ نہیں کہ اس پیغام رحمت کا لانے والا اور عالم انسانی کو فلاح و بہبودی کی راہ بتلانے والا دنیا کے انسانیت کا سب سے بڑا محسن تھا اور آج کا دن جبکہ ہم محسن اعظم کی یاد منا رہے ہیں تمام عالم کے لئے عید و مسرت کا دن ہے وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین ۔ اللھم صل علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین ؕ

لکھنؤ کی تاریخی کانفرنس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں

حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کا مجاہدانہ خطاب

کانفرنس کے آخری اجلاس میں جمعیۃ علماء ہند کے ترجمان مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے کانفرنس کی کارگزاری اور تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی ولولہ انگیز تقریر میں فرمایا!

جو حالات ہمارے سامنے ہیں کہ انسان خود انسان کے خون کا پیاسا ہے ہم نہیں سمجھ سکتے کہ ان کو کن الفاظ سے تعبیر کریں، وحشت اور درندگی کا لفظ بھی کافی نہیں ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ وحشت اور درندگی اس حالت سے شرم کر رہی ہے۔ شیر اور بھیڑیئے جو سب سے زیادہ وحشت ناک درندے مانے جاتے ہیں۔ وہ دوسرے جانوروں کا خون چوس کر درندگی کی پیاس بجھاتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو وہ بھی نہیں پھاڑتے، یہ حضرت انسان ہیں کہ خود اپنے ہم جنس بچوں اور عورتوں اور کمزور انسانوں کو ذبح کرتے ہوئے نہیں شرماتے۔

عوام کی وحشت اور درندگی کا علاج حکومت کا فرض ہے لیکن اس کا کیا علاج جب خود معالج اور امن کے ذمہ دار وحشت زدہ ہو جائیں، آج ذبیحہ گاؤ یا ناجائز اسلحہ کا الزام لگا کر جس طرح مسلمانوں کو پریشان کیا جا رہا ہے وہ اسی وحشت زدگی کا نتیجہ ہے۔

جمہوریہ ہند، مساوات یکسانیت آزادی رائے اور آزادی ضمیر کے اصول پر قائم کیا گیا ہے۔ کانگریس ان اصولوں کی علمبردار ہے آج یہ فرض کانگریس کا ہے کہ ان اصول کو ملک میں کامیاب کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دے۔ جس وقت مسلمانوں پر فرقہ واریت کا بھوت سوار تھا ہم نے ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا۔ ہم خود اپنوں سے ٹکرائے آج مسلمانوں کی فرقہ واریت ختم ہو چکی ہے۔ آج جن سنگھ اور مہاسبھا کی فرقہ واریت ملک کو تباہ کر رہی ہے ہم نے جس طرح مسلم فرقہ واریت کا مقابلہ کیا اسی طرح ہم ہندو فرقہ واریت کو بھی پیروں سے مسل کر دم لیں گے۔ ہم ہندیونین کے رگ و ریشہ کو فرقہ واریت سے پاک کر کے دم لیں گے ورنہ اس کوشش میں ختم ہو جائیں گے،

یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

آپ نے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ کیا بزدلی ہے کہ تم در و دیوار سے وحشت زدہ ہو، تم خود اپنے سایہ سے ڈر رہے ہو، اگر تم کل تک بہادر تھے تو آج بزدل کیوں ہو گئے، اسلام اور بزدلی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے مسلمان سب کچھ ہو سکتا ہے مگر بزدل نہیں ہو سکتا۔ مسلمان حق بات کہنے میں ہمیشہ دلیر ہوتا ہے مسلمان ناانصافی برداشت نہیں کر سکتا۔ خوف و ہراس، بزدلی اور نامرادی کو دل سے نکال دو یہاں سے یہ عہد کر کے جاؤ کہ ہر ایک ناانصافی کا مقابلہ ڈٹ کر کریں گے۔ بیشک ہم وفادار ہیں، مگر ہم مادر وطن کے وفادار ہیں۔ وفاداری کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ہم کسی کلکٹر یا کسی سرکاری افسر یا وزیر کے فعل پر کسی قسم کی نکتہ چینی نہیں کر سکتے۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا کہ حکام کی چاپلوسی وفاداری ہوا کرتی تھی۔ حکومت وزراء حکومت اور افسران حکومت کا پہلا فرض ہے کہ وہ ملک اور وطن کے وفادار رہیں، اگر ہم وفاداری کے خلاف کوئی حرکت دیکھیں گے۔ تو یقیناً مقابلہ کریں گے۔ کانفرنس نے تمہیں مشورہ دیا ہے کہ مشترک سیاست میں حصہ لو۔ اور کسی سیاسی جماعت میں شرکت کرو۔ جو ہندو مسلمانوں کے لئے مشترک ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کانگریس میں شرکت کرو۔ کیونکہ اس سے بہتر کوئی جماعت ہمارے سامنے نہیں ہے مگر کسی خوف یا ڈر کی وجہ سے کانگریس میں ہرگز شریک نہ ہو، اگر تم پناہ ڈھونڈنے کے لئے کسی جماعت میں شریک ہوتے ہو تو اس سے نہ جماعت کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ نہ تمہاری یہ شرکت ملک کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ فرقہ وارانہ سیاسی پلیٹ فارم غلط ہے۔ اس غلطی کو ختم کرو۔ اور مشترک پلیٹ فارم پر ملک کی مشترک سیاست میں حصہ لیکر ملک کی ترقی پذیر جماعت کی طاقت بڑھاؤ ہمت بلند رکھو خدمت وطن کے سچے جذبے کے ساتھ آگے بڑھو تمہیں انصاف اور حق وصداقت کا سر بلند کرنا ہے، اگر تم نیک مقاصد کے لئے ڈٹ گئے تو خدا کی مدد تمہارے ساتھ ہوگی۔

اخبارات میں یہ تقریر شائع ہوئی تو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدیر صدق نے فوراً ایک کارڈ لکھا جس کے الفاظ بجنسہ یہ تھے۔

السلام علیکم، مسلم کانفرنس لکھنؤ میں آپ کی تقریر پڑھکر ع

غازی چو توئی رواست کا فربودن

جزاک اللہ خیر الجزاء۔ والسلام۔

دعاگو، دعاخواہ

عبدالماجد یکم جنوری ۱۹۴۸ء
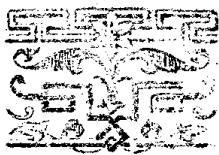
انڈین مسلم کنونشن میں

مجاہدِ ملت کے بصیرت افروز ارشادات

انڈین مسلم کنونشن منعقدہ نئی دہلی ۱۰-۱۱ جون ۱۹۶۱ء میں بحیثیت صدر استقبالیہ مجاہد ملت رحمتہ اللہ علیہ نے اپنا جو گرانقدر خطبہ ارشاد فرمایا وہ مولانا مرحوم کے افکار و عزائم کی ایک روشن تصویر تھی اور ملک و ملت کے نام اِس جانباز مجاہد کا آخری پیغام۔ انڈین مسلم کنونشن جس طرح تاریخ کا رُخ بدل دینے والا واقعہ تھا اسی طرح مولانا مرحوم کے یہ ارشادات بھی تا دیر زندگی کی مایوسیوں میں ہدایت و بصیرت کا سر و سامان بنے رہیں گے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر "مجاہد ملت نمبر" کے صفحات مولانا مرحوم و مغفور کے اسی آخری پیغام سے آراستہ کئے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے!

"انیس الحسن"

حاضرین محترم! اس اجتماع میں شرکت کے لئے جو دعوت نامہ آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا اس پر داعی کی حیثیت سے متعدد معزز حضرات کے نام درج ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس اجتماع کے داعی صرف وہی حضرات نہیں ہیں بلکہ یہ دعوت اُن کروڑوں انسانوں کے دلوں کی آواز ہے جو اس عظیم ملک کے شہری ہوتے ہوئے اور ایک جمہوری دستور کے سایہ میں رہتے ہوئے بھی خود کو زندگی کی راہوں میں پامال اور قدم قدم پر اپنے جائز حقوق سے محروم پا رہے ہیں اور اس صورت حال کے تسلسل نے ان کے اس اضطراب کو اپنی انتہا تک پہنچا دیا ہے کہ کسی طرح ملک و ملت کے سربراہ جمع ہوں اور ان کے درد کا کوئی علاج اور ان کے اضطراب و مشکلات کا کوئی حل تلاش کریں تاکہ کسی صورت، ان کی زندگی بھی سکون و اطمینان سے آشنا ہو سکے۔

حضرات محترم! یہ وسیع اور عظیم الشان ملک جو ہمارا وطن عزیز ہے، صدیوں سے مختلف فرقوں اور ملتوں کا گہوارہ اور مختلف زبانوں اور عقائد و رسوم کا سنگم رہا ہے۔ وطنیت کے لازوال رشتہ نے اِس ملک کی وسیع آبادیوں کو زبان، تہذیب اور رسم و رواج کے تمام اختلافات کے باوجود ہمیشہ ایک اکائی بنائے رکھا ہے، یہی وحدت و اتحاد، باہمی تعلقات کی خوشگواری اور تعاون درحقیقت اس ملک کی سب سے بڑی قوت اور اس کے استحکام اور ترقی کی بُنیاد ہے۔ یہی "وحدت" وہ عظیم طاقت تھی جس کے بل پر ہم نے برطانوی اقتدار سے نجات پائی اور ملک کو آزادی کی نعمت نصیب ہوئی۔ افسوس کہ ملک کی تقسیم نے ہماری اس بے پناہ طاقت کو کمزور کیا اور ہمارے اندر خود پرستی، فرقہ پرستی، تنگ دلی و تنگ نظری کے وہ شگاف پیدا کئے، جن سے ہماری "وحدت" کا شیرازہ بکھرا اور دنیا نے ہمارے انتشار کا تماشہ دیکھا۔ تقسیم وطن کے ساتھ ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں جو حوادث پیش آئے آج ان کی یاد بھی شریف اور سنجیدہ انسانوں کی نگاہیں شرم و ندامت سے جھکا دیتی ہے۔ وہ سب کچھ تنگ دلی اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کا ایک وقتی بخار یا ایک ہنگامی سیلاب تھا جو اپنی پوری تباہ کاریوں کے ساتھ ملک کے ایک سرے سے اُٹھا اور دوسرے سرے تک گزرتا چلا گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اس وقت بھی جمعیۃ العلماء ہند نے ملک کو مہلک اثرات سے پاک و صاف کرنے کے لئے مرحوم و مغفور امام الہند حضرت مولانا ابو الکلام آزاد کی رہنمائی میں پورے ملک کے اصحابِ فکر و تدبیر کی ایک عظیم کانفرنس آزاد مسلم کانفرنس کے نام سے لکھنؤ میں بلائی تھی جس نے ملک بھر میں ایک نئی فضا اور مفید نتائج پیدا کئے۔ کاش کہ وہ صورتِ حال اِس وقت کے ساتھ ختم ہو گئی ہوتی، مگر افسوس کہ اس کے بعد سے اب تک ۱۳ سال کا جو ریکارڈ ہمارے سامنے ہے وہ اس حقیقت کی برملا شہادت ہے کہ تنگ نظری، فرقہ واریت اور جارحانہ جتھ بندیوں کے مہلک جذبات اس پورے عرصہ میں کارفرما رہے ہیں۔ پچھلے کچھ عرصہ میں زبان کے نام پر گجرات و مہاراشٹر اور آسام و بنگال میں اور مذہب کے نام پر یو۔ پی۔ بہار اور مدھیہ پردیش وغیرہ کے مختلف شہروں اور دیہات بالخصوص جبل پور اور ساگر میں جو کچھ ہوا، اس کے بعد شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اس صورت حال میں نہ صرف یہ کہ اختلاف زبان و مذہب کے نام پر لاکھوں باشندگان ملک کے لئے

زندگی اجیرن بن رہی ہے بلکہ اس طرح خود ملک کی صحت و سالمیت بھی پنپ نہیں سکتی۔

پھر جو طبقہ اِس فرقہ واریت، تنگ نظری اور مسموم جذبات کا سب سے زیادہ تختۂ مشق بنا ہے وُہ اس ملک کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت یعنی "مسلمان" ہیں جن کو جمہوری دستور کے مطابق مساویانہ حقوق کے دلانے میں خود اکثریت کے شریف اور سنجیدہ اصحابِ فکر و نظر کی مسلسل کوششیں بھی ابھی تک بار آور نہیں ہو سکیں۔ مسلم اقلیت کے خلاف یہ جارحانہ فرقہ واریت اور معاندانہ جذبات صرف عوامی زندگی میں ہی اثر انداز نہیں، بلکہ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت کے دائروں میں بھی اس کی چھاپ بہت گہری ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جا بجا مسلم اقلیت آئے دِن ایک شر پسند گروہ کے ہاتھوں جان و مال اور عزّت و آبرو کی یک طرفہ بربادیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے، پھر تماشہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ جارحیت اور غنڈہ گردی کی ان وارداتوں کو "ہندو مسلم" فساد کہہ کر حقیقت حال پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ واقعتاً (جیساکہ میں نے ہند پارلیمنٹ میں بھی اور اس کے باہر بھی بار بار کہا ہے) اِن واقعات کو ہندو مسلم فساد کہنا ہندوؤں اور مسلمانوں۔ دونوں کے ساتھ ناانصافی کھلی ہوئی توہین اور حقیقت کی غلط تعبیر ہے۔ ملک کے عوام۔ ہندو اور مسلمان۔ عام طور پر فرقہ پرست عنصر کی ان حرکتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں باہم یک جہتی کے رجحانات اُبھر رہے ہیں۔ درحقیقت غنڈہ گردی کی یہ تمام وارداتیں اسی مسموم ذہنیت کی اُبھاری ہوئی اسکیمیں ہوتی ہیں جو مختلف بہانوں اور تدبیروں کے ساتھ بروئے کار لائی جاتی ہیں اور اکثر و بیشتر مقامی ایڈمنسٹریشن کا تعاون اور پُشت پناہی ان کو حاصل ہوتی ہے

ایک طرف ہماری شہری زندگی میں ان حوادث کا تسلسل اور دوسری طرف سرکاری ملازمتوں، تعلیمی اداروں، نصاب کی کتابوں، صنعت و حرفت کے مرکزوں، تجارت کے وسائل اور کاروباری میدانوں تک میں مسلم اقلیت کے ساتھ امتیازی سلوک، حق تلفی، ناانصافی، ملک کے مختلف حصوں میں مسلم اوقاف اور مساجد کی بربادی اور ویرانی نیز مجالسِ قانون ساز میں ناکافی نمائندگی کی شکایتوں نے جو افسوسناک شکل اختیار کر لی ہے اور پچھلے ۱۲ سال کی سرگذشت نے اس کا جو ریکارڈ بنایا ہے اس سے آپ سب بخوبی واقف ہیں۔ آج اس کی تفصیلات کو دُہرانا سراسر غیر ضروری ہے۔

یہ تشویشناک صورت حال نہ صرف یہ کہ مسلم اقلیت کے لئے انتہائی اضطراب کا باعث بن رہی ہے، بلکہ ساتھ ہی ملکی صحت و سالمیت کے لئے بھی کینسر سے زیادہ خطرناک اور تعمیر و ترقی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج خود اکثریتی طبقہ کے وہ تمام نیک نہاد افراد جو اس ذہنی گراوٹ اور تنگ دلی سے بالاتر ہو کر معاملات کو دیکھتے، سوچتے اور سمجھتے ہیں۔ اس صورت حال سے اسی قدر نالاں اور پریشان ہیں جس قدر خود مسلم اقلیت بے چین و مضطرب ہے، انہیں بھی یقین ہے کہ اختلاف مذہب و مسلک کے نام پر ملک کی اتنی بڑی آبادی کو پامال اور برباد کرنے کی کوشش پورے ملک کے لئے خودکشی کے مرادف ہے، چنانچہ آج بیرونی خطرات سے پہلے جو اندرونی خطرہ وطن عزیز کے امن و استحکام کو چیلنج کر رہا ہے وہ یہی مسموم ذہنیت اور فرقہ پرستی کے مہلک جذبات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح آج ہم وطن عزیز کے مستقبل میں سچی جمہوریت اور قومی یک جہتی کو کارفرما دیکھنے کے لئے مضطرب ہیں اور اسی جذبہ کے ساتھ آج یہاں سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔ اسی طرح بلالحاظ مذہب و ملّت، وہ تمام اصحاب فکر و تدبر جن میں خود ملک کے وزیر اعظم (پرائم منسٹر) کی شخصیت بھی شامل ہے اس سنگین صورت حال سے بہت متاثر اور فکرمند ہیں اور پوری اہمیت کے ساتھ اس سوال پر غور کر رہے ہیں کہ کیونکر جذبات کے اس غلط بہاؤ کو روکا جائے اور ملکی سالمیت اور قومی یک جہتی (نیشنل انٹی گریشن) کو برقرار رکھنے کے لئے ایڈمنسٹریشن اور عوام کے دائروں میں کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

یقیناً ملک کے سچے رہنماؤں کی یہ توجہ ہماری تحسین و تصویب کی مستحق ہے اور ہماری آرزو ہے کہ ان کی کوششیں عملی زندگی میں بہتر نتائج پیدا کر سکیں۔

سامعین کرام! آج ہی نہیں بلکہ آج سے بارہ سال پہلے بھی انہی خطرات و نتائج پر نگاہ رکھتے ہوتے ملک کے تمام دور اندیش رہنماؤں نے دستور ساز اسمبلی میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس عظیم ملک کی فلاح و ترقی کے تمام نقشے سیکولرازم اور جمہوریت کی بنیادوں پر ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے ملک کے لئے وُہ بہترین دستور (کانسٹی ٹیوشن) مرتب کیا جس کا بنیادی تصوّر ملک کی وحدت (اکائی) ہے اور جو اس ملک میں ایک ایسا ترقی پذیر معاشرہ (سوسائٹی) پیدا کرنا چاہتا ہے جس میں جمہوریت کی فراخدلی کارفرما ہو اور مذہب و خیال کے اختلافات کے باوجود ملک کے تمام باشندے شہری زندگی میں مساویانہ حقوق سے بہرہ مند ہوں کہ ان کے باہمی تعلقات میں خوشگواری قائم رہ سکے اور وہ سب پوری خوش دلی کے ساتھ وطنِ عزیز کی تعمیر و ترقی کے لئے کام کر سکیں یقیناً یہی نقطۂ نظر صحیح نقطۂ نظر ہے اور آج جو تکلیف اور جو شکایت ہے وہ صرف یہ کہ عملی زندگی میں اس نقطۂ نظر سے مسلسل انحراف ہو رہا ہے۔

ہمارا موقف و مقام

آج ہم اس لئے جمع ہو رہے ہے کہ گزرے ہوئے تیرہ برسوں کی سرگذشت کو سامنے رکھتے ہوتے سوچیں اور غور کریں کہ وطنِ

عزیز کی وسعتوں میں سیکولرازم اور جمہوریت کی حقیقی فضا پیدا کرنے اور دستور ہند کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لئے آخر کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور مسلم اقلیت کے ساتھ ہونے والے غیر دستوری، امتیازی سلوک، ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا مداوا کیوں کر ہو اور کون سے وسائل کام میں لائے جائیں کہ ہمیں اس طبقاتی کش مکش، بدامنی، بے اطمینانی اور پامالی کی زندگی سے نکل کر دوسرے باشندگانِ وطن کے ساتھ ساتھ آبرومندانہ اور مساویانہ زندگی میسّر آسکے اور موقع مل سکے کہ ذہنی یکسوئی اور دلی اطمینان کے ساتھ ہم بھی وطن کی خوشحالی، ترقی اور سربلندی کے لئے اپنی بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ کام کر سکیں۔

بفضلہ تعالیٰ ہمیں اعتماد ہے اپنی نیت اور اپنے عزائم پر جو وطن کی خیر خواہی اور خیر سگالی کی راہ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں ساتھ ہی ہمیں اعتماد ہے کہ اپنی اس کوشش اور جستجو میں ہم تنہا نہیں ہیں بلکہ ایک خاص عنصر کو چھوڑ کر جو فرقہ پرستی، تنگ نظری اور تنگدلی کی تاریکیوں میں بہت دور جا چکا ہے اور اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں کھو چکا ہے۔ اُس عنصر کے علاوہ اس ملک کے سب ہی سنجیدہ اور شریف انسان (خواہ وہ کوئی بھی مذہب و مسلک رکھتے ہوں) ہمارے ساتھ ہیں۔ ہماری پریشانیوں اور اضطراب کا اُنہیں بھی احساس ہے۔ سیکولرازم اور جمہوریت کی پامالی سے وہ بھی نالاں ہیں

ان ہی احساسات و عزائم کے ساتھ آج ہم یہاں جمع ہوئے ہیں کہ پوری سنجیدگی، احتیاط اور سچّے قومی و تعمیری جذبہ کے ساتھ ان مسائل و معاملات پر غور کریں جو ایجنڈے کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں

ہمیں اس وقت اس کا بھی پورا احساس ہے کہ نامساعد حالات میں یہ ایک نہایت اہم اور نزاکتوں سے بھرپور کام ہے، جس کا بیڑا ہم نے اٹھایا ہے، خدا کرے کہ ہم اس ذمہ داری کو خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکیں اور ہمارا یہ جرأت مندانہ اقدام ملک و ملّت کی راہ میں مفید اور کامیاب اقدام ثابت ہو۔

مسلمانوں سے گزارش

حضرات محترم! مسلمانانِ ہند کے اس عظیم نمائندہ اجتماع کے موقع پر جو خصوصیت سے مسلم اقلیت کے ایک عام اور مسلسل اضطراب کی ترجمانی کے لئے یہاں منعقد ہو رہا ہے بے جا نہ ہوگا کہ خود مسلمانانِ ہند کی خدمت میں بھی گزارش کروں کہ وہ اپنی اس پُر آشوب زندگی میں ظاہری تدابیر و وسائل کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اعتماد علی اللہ اور صبر و استقلال کی زیادہ سے زیادہ صلاحیتیں پیدا کریں۔ اسوۂ رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اپنا نصب العین بنائیں اور اسلام کی بنیادی تعلیمات سے سبق لیتے ہوئے اپنے اندر وہ اسپرٹ پیدا کریں کہ تکالیف و مصائب کے طوفانوں سے گزر کر بھی وہ احساس کہتری، پامالی اور مایوسی کا شکار نہ ہوں اور ان کے اس یقین میں کوئی تزلزل نہ آئے کہ اپنی وطنی زندگی میں ہمیں جو بھی حوادث و مشکلات درپیش ہیں وہ بہرحال وقتی اور دنیوی مصائب ہیں اور ہمارا حقیقی اعتماد کارسازِ حقیقی کی رحمت اور اُس کی رضا جوئی پر ہی ہے۔ قرآن حکیم نے ہمیں بتایا ہے۔ اِنَّہٗ لَا یَیْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکَافِرُوْنَ ﴿خدا تعالیٰ کی رحمت سے وہی مایوس ہوتے ہیں جنہیں خدا پر ایمان اور بھروسہ نہیں ہے۔)

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا۔ ہر تنگی و پریشانی کے ساتھ آسائش و راحت بھی ضرور ہوتی ہے۔

اس عظیم الشان ملک میں جو ہماری طرح اور بھی متعدد مذاہب اور فرقوں کا پیارا وطن ہے "نبی رحمت صلعم" کے نام لیواؤں اور اس رسولِ برحق کے امتیوں کا (جس کی شان میں فرمایا گیا ہے۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (آپ محاسنِ اخلاق کا ایک بے مثال نمونہ ہیں) فرض ہے کہ اپنی زندگی میں اخلاق و کردار کی وہ بلندیاں پیدا کریں کہ دنیا ان کے وجود کو امن و رحمت کا سایہ محسوس کرے۔ ان کی وطن دوستی، خیر اندیشی اور اخلاق کریمانہ کو نمونۂ عمل قرار دے اور اس سے سبق حاصل کرے۔

آج پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہمارے اندر اپنے موقف کا صحیح احساس اور شعور پیدا ہو۔ اس پیارے دیش کی ہزار سالہ تاریخ میں ہم برابر کے شریک و سہیم اور اس دعوتِ حق کے علمبردار رہے ہیں جو پورے عالمِ انسانیت کے لئے امن و رحمت کا پیغام اور ہمدردی و خیر سگالی کا سرچشمہ ہے۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اس ملک میں ہماری زندگی کسی اجنبی اور تماشائی کی زندگی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بناؤ اور بگاڑ کے ساتھ ہمارا چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے ملی جلی وطنی زندگی میں اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ اپنے وطنی فرائض سے بھی کوئی غفلت ہمارے لئے جائز نہیں ہو سکتی۔ میرا تو یقین یہ ہے کہ اگر ہمارے اندر وطن کی سچی محبت اور اپنے فرض و منصب کا صحیح احساس بیدار ہے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمیں اپنے حقوق سے دیر تک محروم نہیں رکھ سکتی۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿ (اللہ کی مدد ہمیشہ ان کے ساتھ ہوتی ہے جو کردار و عمل کے کھرے اور نیکوکار ہوں۔

(ماخوذ از خطبہ استقبالیہ انڈین مسلم کنونشن)

ملکی سالمیت اور قومی یک جہتی

جمعیۃ علماء ہند کا اہم کردار

مسلم کنونشن کے بعد مجاہد ملتؒ کا ایک بیان

ہندوستان کی جنگ آزادی کی تحریک میں جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ روشن اور شاندار رہی ہے آزادی سے قبل کے دور میں جمعیۃ علماء نے قومی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے بڑی جرات و دلیری کے ساتھ جنگ کی۔ وہ ملک کی تقسیم کی برابر مخالف رہی اور اس نے پرانی مسلم لیگ کی دو قومی تھیوری کی شدت کے ساتھ مذمت اور مخالفت کی۔ وہ آزادی کی جنگ میں صف اول کی جماعتوں میں تھی۔ کانگریس کے ساتھ اس کا قریبی تعاون رہا اور اس کے کارکنان نے برطانیہ کے خلاف تمام دوسرے محبان وطن کے ساتھ قومی تحریکوں میں برابر کا حصہ لیا اور ان کی ایک بڑی تعداد نے اس تحریک میں اپنے جان و مال کی قربانی دی۔ آزادی کے بعد سے جمعیۃ علماء نے ہندوستانی دستور کے غیر مذہبی ڈھانچے کی پوری طرح حمایت کی اور قومی سالمیت کے حصول کے لئے نہایت تندہی سے کام کیا اور کر رہی ہے اس طرح ہم جمعیۃ علماء کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک آزادی سے پہلے کی تاریخ اور دوسرے آزادی کے بعد کی تاریخ

آزادی کی تحریک میں عظیم رول

آزادی کی تحریک میں اس نے جو عظیم الشان رول ادا کیا ہے۔ اس پر کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں آزادی کے بعد ۱۹۴۸ء میں جمعیۃ علماء نے حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رہنمائی میں سیاسی سرگرمیوں سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور وہ "قانون ساز اسمبلیوں اور دیگر اداروں کے انتخابات سے الگ ہو گئی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان سیاست سے بالکل الگ رہیں جمعیۃ کے ممبروں کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ انفرادی حیثیت سے کسی بھی ایسی جماعت میں حصہ لے سکتے ہیں جو سیکولرزم پر یقین رکھتی ہوں۔ البتہ ان کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی فرقہ پرست سیاسی جماعت یا ادارے میں حصہ لیں۔

قومی یک جہتی کا استحکام

جمعیۃ علماء کی سرگرمیاں اگرچہ مذہبی، سیاسی اور ثقافتی میدان تک محدود ہیں۔ لیکن اس نے اپنے اغراض و مقاصد میں قومی یک جہتی کے استحکام کا مقصد شامل رکھا اور اسے اہمیت دی ہے۔ جمعیۃ علماء کے دستور کی دفعہ ۵ میں اس بات کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جمعیۃ علماء ہند، ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اتحاد و یک جہتی رکھنے کا کام کرے گی۔ اپنی مذہبی، سماجی، اور ثقافتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ جمعیۃ علماء نے ہمیشہ قومی یک جہتی کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ جمعیۃ علماء کے تمام ذمہ دار لیڈروں اور نمایندوں نے اپنے قول و فعل سے ہندوستانی دستور کی غیر مذہبی نوعیت کی حمایت و تائید کی ہے اور سیکولر عناصر کے استحکام کے لئے تمام قومی جماعتوں خاص طور پر کانگریس کے ساتھ پورا پورا اشتراک و تعاون کیا ہے۔ جمعیۃ علماء کی یہ قومی اور سیکولر پالیسی آفتاب کی طرح روشن ہے۔

جمعیۃ علماء مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی اور ثقافتی جماعت ہے۔ لیکن وہ ان کوششوں سے الگ نہیں ہے جو عوام کی یک جہتی اور قومی سالمیت کے لئے کی جا رہی ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند ان تمام طاقتوں کی تائید و حمایت کرتی ہے جو قومی یکجہتی کے لئے کام کر رہی ہیں۔ جمعیۃ علماء کا یہ کردار ایک بے داغ کردار ہے جسے ان تمام ہندو اور مسلمانوں نے سراہا ہے جو اپنے اندر قومی احساس رکھتے ہیں۔

سبق آموز ارشادات

مجاہد ملتؒ کی ایک تقریر کے کچھ اقتباسات

ماضی کی تاریخ اس لئے سامنے لائی جاتی ہے کہ پچھلے واقعات کو سامنے رکھ کر مستقبل کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ جو قومیں صرف پدرم سلطان بود کہہ کر زندہ رہنا چاہتی ہیں وہ تاریخی دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح جو قومیں ماضی کے واقعات کو سامنے نہ رکھیں وہ بھی اپنا مستقبل بہتر نہیں بنا سکتیں اس لئے ہمیں یہ بتانا ہے کہ ان تین دنوں میں اس پلیٹ فارم پر سے جو کچھ کہا جائیگا اور مسلمانوں کے جو معاملات اور حالات سامنے لائے جائیں گے ان کا فرقہ پرستی سے دور کا بھی تعلق نہیں ہو سکتا۔ آج بہت سے آدمی خاص کر ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ ایسے ہیں جو ہمارے اوپر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں اور ایسا الزام لگانا بہت آسان ہے لیکن ملک کے دستور اور انصاف کے تقاضوں کے لئے بہت ضروری ہے اور ملک کا قانون ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم اپنی مشکلات کو بیان کریں اور ان کو دور کرنے کا مطالبہ کریں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ فرقہ پرستانہ بات ہے ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ملک کی آزادی حاصل کرنے والوں نے جمیعتہ العلماء کے پلیٹ فارم سے ہمیشہ بلا لومتہ لائم جس بات کو حق سمجھا ہے کہا ہے اسی لئے آج انہیں حق ہے کہ وہ ان معاملات کو سامنے لائیں جن سے مسلمانوں کو تکلیف پہونچ رہی ہے آج جو ان کو فرقہ پرست کہتے ہیں اُن سے زیادہ جاہل کوئی شخص نہیں ہے۔

آج اگر جمیعتہ العلماء ہند مسلمانوں کے معاملات کو اس نظر سے دیکھتی ہے کہ قومی حکومت میں مسلمانوں کا کیا مقام ہونا چاہیئے تو اس کو پورا حق ہے۔ ملک کا بٹوارہ ایک پولٹیکل بات تھی بٹوارہ کے لئے ہندو جماعتوں کو بھی دوش دیا جا سکتا ہے۔ مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کو بھی دوش دیا جا سکتا ہے لیکن اب جو لوگ ہندوستان میں بس رہے ہیں یہاں کے چالیس کروڑ باشندے ہیں جو ایک بہتے ہوئے سمندر کی طرح ہیں ان میں ہندو بھی ہیں پارسی بھی ہیں سکھ بھی ہیں اور عیسائی بھی ہیں ان سب کا یہ حق ہے کہ وہ یہاں امن اور عزت سے رہیں اور اگر مسلمان بھی یہ بات کہیں کہ وہ بھی اپنے اس ملک میں باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اسے فرقہ پرستی کہہ کر دبایا نہیں جا سکتا۔ جو حق اس ملک سے یہاں کی اکثریت کو ہے وہی اقلیت کو بھی ہے جہاں تک ملکی آزادی کا تعلق ہے یہ فرقہ پرست کیا ہمارے مقابلہ میں آ سکتے ہیں جمیعتہ کے خدام نے تو اس وقت انگریزی گولیوں کا مقابلہ کیا جب فرقہ پرست بہت بزدلی اور گھبراہٹ کے ساتھ کنڈیاں بند کئے بیٹھے تھے آج ہماری قربانیوں سے ملک آزاد ہے فرقہ پرست ہمیں طعنہ دیں ان کی بیوقوفی ہے۔

مساوی حقوق

آج ملک آزاد ہے سب کو برابر کا حق ہے لیکن ہم ان باتوں کو کہتے ہوئے ڈرتے ہیں خود دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کو اس درجہ ڈی مورالائز کر دیا گیا ہے اس درجہ احساس کمتری اور خوف میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ وہ ان باتوں کو کہتے ہوئے جھجکتے ہیں چاروں طرف نگاہ اٹھاکر دیکھتے ہیں کہ ہماری اس بات سے ہندو خوش ہوگا یا نہیں۔

ہم اس ملک میں رہنے والے ساڑھے چار کروڑ مسلمان یہاں اس لئے نہیں ہیں کہ کسی کی چاپلوسی کریں یا یہ سمجھیں کہ اس سے ہندو خوش ہوگا یا پنڈت نہرو خوش ہوں گے اگر جمیعتہ کے خدام کے دل میں ایک منٹ کے لئے بھی ایسا خیال گذرے تو میں کہوں گا کہ اس سے بڑی بزدلی اور نفاق کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ ہم کہتے ہیں کہ جس طرح یہ ملک اکثریت کا ہے اسی طرح اقلیت کا بھی ہے۔ جس طرح ہندو کا ہے اسی طرح مسلمان کا بھی ہے۔ جس طرح پنڈت نہرو کا ہے اسی طرح حفظ الرحمٰن کا بھی ہے یہ ایک جمہوری ملک ہے۔

سیکولرازم

۱۴ برس گذر گئے کہ ہم نے اپنا سیکولر آئین بنایا۔ سیکولر کے معنی بہت سے لئے جاتے ہیں کوئی اس کے معنی لادینی حکومت لیتا ہے۔ کوئی ایسی حکومت کے لیتا ہے جو تمام مذاہب کو ختم کر دے گی۔ لیکن ہم اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر یہاں کا دستور اور قانون ملک کے بسنے والوں کے مابین کوئی تفریق نہیں کرے گا۔ اس ملک میں بسنے والی چھوٹی سی چھوٹی ۳ آدمیوں کی اقلیت کو بھی وہی حق حاصل ہوگا جو یہاں کی نوے ۹۰ فی صدی اکثریت کو حاصل ہوگا۔ مذہب یا کسی اور بنیاد پر کسی کا حق نہیں دبایا جائے گا۔ ہم نے یہ دستور اپنے لئے بنایا ہے اور اس دستور نے یہاں کے ہر بسنے والے کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنا دستوری حق طلب کرے۔ ہمیں اس بات کا طعنہ کیوں دیتے ہو کہ پاکستان میں تو سیکولر دستور نہیں ہے ہم نے پاکستان بننے سے پہلے پاکستان کی مخالفت کی ہم آخر تک تقسیم وطن کے خلاف

رہے لیکن جب کہ پاکستان ایک ملک بن گیا ہے ہم بھی کہتے ہیں کہ پاکستان والے اپنے ملک میں خوش رہیں ان کے کسی فعل کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی ہم پر تو صرف اپنے فعل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم نے ایک سیکولر جمہوری نظام کو اپنایا ہے یہاں کا ہر بسنے والا برابر کا حق رکھتا ہے۔ جب یہ حقیقت ہے تو ہم جائزہ لیں کہ پارلیمنٹ میں جو قانون بنا وہ ہم پر کسی کا رحم و کرم نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کی وہ تاریخ ہے جس کے پیچھے اگر جلیانوالہ باغ ہے تو قصہ خوانی بازار بھی ہے۔ جب بات یہ ہے تو کوئی طعنہ نہیں دے سکتا کہ مسلمان مطالبات کی بحث کیوں کرتا ہے۔ ہر شخص کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا کہ ۴½ فیصدی تو بہت ہوتے ہیں اگر کوئی ½ ۴ آدمیوں کا معمولی سا فرقہ بھی ہے تو اُسے بھی حق ہے کہ وہ اپنے حق کے لئے آواز بلند کرے اور اُسے اس کا حق دینا ہوگا۔

تاریخ دہرائی جارہی ہے

وقت آگیا ہے کہ تاریخ کے اس موڑ پر ہم کھل کر بحث کریں کہ ملک کی آزادی کو ۲۸ برس گذر گئے ہیں لیکن مسلمان اور مسلم اقلیت مسلسل پریشان ہے ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ آخر کیوں ؟

پریشانی کا علاج

اس مسلسل پریشانی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ آیئے غور کریں کہ کس طرح اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک بات کا تعلق آپ سے ہے اور دوسری بات کا تعلق برادران وطن سے ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کا اپنا ایک ذہن ہے اور وہ ذہن یہ ہے کہ یہ ہمارا بھی اسی طرح وطن ہے اور اس ملک پر ہمارا بھی اتنا حق ہے جتنا کسی دوسرے کا جس طرح ان کو رہنے کا حق ہے اسی طرح ہم کو بھی رہنے کا حق ہے۔ اس سلسلہ میں میں ایک مثال دیا کرتا ہوں اس سے پہلے بھی یہ مثال میں عرض کرچکا ہوں لیکن بات کو سمجھنے کے لئے یہ بات بہت ضروری ہے اس لئے عرض کرتا ہوں۔ یہ میرا جسم ہے اس کے بہت سے حصہ ہیں۔ پیر ہیں۔ ہاتھ ہیں۔ سر ہے۔ دل ہے۔ دماغ ہے جگر ہے۔ ہر ہر حصہ کا اپنا اپنا مقام ہے۔ بلاشبہ سر کو یہ حق ہے کہ وہ کہے میں سب سے اوپر ہوں۔ دل کو یہ حق ہے کہ وہ کہے کہ میرے دم سے خون کی گردش کا نظام باقی ہے۔ دماغ کو حق ہے کہ وہ دعویٰ کرے کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تو مجھی سے قائم ہے۔ ہاتھ پیروں کو حق ہے کہ وہ اپنا اپنا راگ گائیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب خوبی اور بڑائیاں اسی وقت تک ہیں جب تک کہ یہ تمام اعضاء ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک جسم ہیں پھر بھی نہیں بلکہ اس جسم کی حالت تو یہ ہے کہ ایک معمولی سے ناخن میں ایک پھانس چبھ جاتی ہے تو دیکھو کیا حال ہوتا ہے نہ دل کو چین ہے نہ دماغ کو سکون نہ ہاتھ کو راحت ہے۔ نہ پیر کو آرام سارا جسم ہی اس درد سے بے چین رہتا ہے۔ بس اس ملک کی مثال بھی ایک جسم کی مثال ہے اس میں رہنے بسنے والے اس کے ہاتھ پیر دل دماغ ہیں۔ ہمارے ہندو بھائی شوق سے اس جسم کا اپنے کو دل دماغ کہہ لیں۔ اس کے ہاتھ پیر بن جائیں۔ لیکن یہ یاد رکھیں کہ اگر ناخن کے برابر بھی کسی اقلیت کے سینہ میں ذراسی پھانس چبھنے لگی تو وہ بھی چین اور آرام محسوس نہ کریں گے۔ ہمیں یہ شوق نہیں کہ ہم اس جسم کے دل و دماغ کہلائیں۔ اپنی بڑائی جتائیں۔ لیکن ہم ضرور بتادینا چاہتے ہیں کہ ہم کو کیا ہم سے کم اقلیت کو بھی کوئی تکلیف پہونچے گی تو سارا جسم اس وقت تک درد میں مبتلا رہے گا جب تک اس پھانس کو نکال نہ دیا جائے گا۔ آج ہم یہی کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ان ۲۸ سالوں میں مسلسل پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے ان پریشانیوں کو دور کیا جائے ورنہ سارا جسم درد اور بے چینیوں میں مبتلا رہے گا۔ اس درد کا علاج ڈھونڈنا ہوگا۔ اس تکلیف کو دور کرنا ہوگا۔

حبّ وطن

یہ دیش ہمارا دیش ہے یہ ملک ہمارا ملک ہے اس کے ذرہ ذرہ سے ہم کو محبت ہے اس وجہ سے محبت ہے کہ وطن کی محبت ہمارا مذہبی فریضہ ہے میرا مذہب مجھے بتاتا ہے کہ وطن کی محبت ایمان کا جزء ہے۔ ایک حدیث میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرمارہے تھے تو شہر مکہ معظمہ کی طرف بار بار دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اے مکہ تو مجھے اتنا عزیز ہے کہ اگر میری قوم مجھے نہ نکالتی تو میں تجھے ہرگز نہ چھوڑتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وطن سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اس لئے میں کہتا ہوں کہ ہمیں سوچنے کا ڈھنگ بدلنا ہے ہمارا ملک آزاد ہے۔ آج اقلیت کی درخواست رحم و کرم کی درخواست نہیں ہے۔ ہم کسی سے بھیک نہیں مانگ رہے ہیں ہم اپنا حق مانگ رہے ہیں۔ ہر شہری کو ہر ایک چھوٹے بڑے کو ہر افسر کو یہ حق ہے کہ وہ اپنا جائز حق مانگے۔ ہمیں اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے کچھ طاقت بنانی ہے وہ طاقت توپ اور بندوق کی طاقت نہیں ہے۔ وہ ایٹم بم اور راکٹ یا میزائل کی طاقت نہیں ہے۔ وہ طاقت ہے اس دل کی یاد رکھیں جس کے پاس دل کی طاقت ہے اُسے کوئی طاقت نہیں دبا سکتی۔

اسی طاقت سے ہمیں اپنے حقوق کی کے لئے لڑائی لڑنی ہے۔ اس ملک کے تمام معاملات کا ہم سے تعلق ہے۔ اس ملک میں اگر کوئی کمزوری ہے تو ہم اُسے دور کریں گے۔

ہم تماشائی بن کر اس کا تماشا نہیں دیکھیں گے۔

گاندھی جی کے آخری ایّام — دہلی میں

حضرت مجاہدِ ملّت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مقالہ

گاندھی جی کا حادثۂ قتل آخری جنوری ۱۹۴۸ء میں پیش آیا۔ اُن کی زندگی کے آخری ایام دہلی میں گذرے اور حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کو ان ایام میں گاندھی جی سے بہت قرب حاصل رہا۔ اسی لئے ہفتہ وار بیداری مالیگاؤں نے مولانا مرحوم سے فرمائش کی تھی کہ آپ اس عنوان پر کچھ تحریر فرمائیں۔ اس فرمائش کی تعمیل میں حضرت مولانا نے جو مختصر مقالہ مجھے املاء کرایا تھا وہ بعد میں مدینہ اور الجمعیۃ میں شائع ہوا۔ اس کی ایک نقل اب تک میرے پاس محفوظ تھی جو آج خود مجاہد ملت نمبر میں شائع کی جا رہی ہے...... اس لئے کہ اس سے ۱۹۴۷ء کی زندگی اور شب و روز کا نقشہ کچھ یاد آجاتا ہے۔

"سید انیس الحسن"

مہاتما گاندھی ایک انسان تھے۔ لیکن عام انسانوں کی سطح سے بہت بلند! قدرت نے اُن کی طبیعت میں جو انمول خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں آج دنیائے انسانیت اُن کے بیان کی محتاج نہیں ہے۔

مہاتما گاندھی آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ وہ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن اُن کی زندگی کا کوئی گوشہ ہماری نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اُن کا مقصدِ حیات اور وہ مشن جس کو انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا تھا آج ہمارے سامنے پوری طرح روشن ہے

اُن کی زندگی ایک ایسی کھلی کتاب ہے جس کا کوئی ورق، کوئی صفحہ، کوئی سطر اور کوئی لفظ پوشیدہ اور مخفی نہیں۔ وہ جو کچھ بھی تھے اور جیسے کچھ بھی تھے! اچھے یا برے! کھرے یا کھوٹے! دنیا کے سامنے اپنی صاف اور صحیح شکل میں کھڑے ہیں، اور اب کوئی بھی لائف لگار بہت آسانی کے ساتھ فیصلہ کر سکتا ہے کہ گاندھی جی کیا اور کیسے تھے۔!

یوں تو گاندھی جی کی پوری زندگی ایک عظیم الشان مقصد اور ایک پاکیزہ مشن کو کامیاب بنانے میں گذری، لیکن اُن کی زندگی کا سب سے بہتر اور قیمتی دور جو قربانی، خدمت، ایثار اور فداکاری کے اعتبار سے اُن کی عمر بھر کی قربانیوں پر بھاری ہے، وہ اُن کے آخری ایام زندگی ہیں جو انہوں نے دہلی میں گذارے!

عمر و سن کے اعتبار سے اُن کا یہ زمانہ اگرچہ بڑھاپے کا زمانہ تھا لیکن بڑھاپے کے ان ایام میں اُن کی فطری اور طبعی صلاحتیں اور خوبیاں اپنے پورے شباب پر آگئی تھیں! عمر بھر اگر وہ اپنے مشن کے لئے سخت سے سخت آلام و مصائب کا مقابلہ کرتے رہے اور ہر دشوار گذار منزل سے گذرتے رہے تو ان آخری ایام میں انہوں نے ایک عظیم الشان مقصدِ حیات کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی چھوڑ دیا۔ یعنی اپنی جان عزیز کی بازی لگائی اور آخر کار جان دے کر اپنے مشن کو کامیاب بنایا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ گاندھی جی اپنی جان دے کر کروڑ ہا انسانوں کے لئے صلح و آشتی کی جیتی جاگتی تصویر چھوڑ گئے۔

کروڑوں نفوس پر مشتمل ایک قوم جو اپنے اعمال سے خودکشی کی تیاریاں کر چکی تھی، راہ بھول چکی تھی، اور بھٹک چکی تھی، اور ہر طرح تباہی کے کنارے پہونچ چکی تھی، گاندھی جی اپنی جان دے کر اس بڑی قوم کو انصاف اور سچی انسانیت کی راہ دکھلا گئے۔ انہیں زندہ رہنے کے گر بتا گئے اور زندگی کے اصول سمجھا گئے

آہ! جانے والے! خدا تجھے تیرے احسانات کا بدلہ دے۔!

مجھے یوں تو ۱۹۱۹ء سے کانگرس کے ناتہ کے باعث گاندھی جی سے تعلق رہا ہے اور ان کی رہنمائی میں مسلسل کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ لیکن ان آخری ایام میں جب وہ دہلی میں رہے حالات نے مجھے ان سے بہت ہی قریب رکھا تھا۔ ان دنوں روزانہ اُن سے ملنے، ساتھ رہنے، گھنٹوں گفتگوئیں کرنے کا موقعہ ملا۔ اور خلوت وجلوت میں اُن کی بلند اخلاقی، صاف دلی، اور ہندوستان کے تمام باشندوں سے یکساں محبّت کی سچائی کا جو اثر مجھ پر اور میرے محترم ساتھی حضرت مولانا احمد سعید صاحب پر ہُوا اُس کے بیان وتشریح کے لئے بڑی وسعتیں درکار ہیں۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ مہاتما جی کی زندگی کا جو سب سے زیادہ بہترین اور قیمتی دور تھا وہی ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بدتر اور شرمناک دور بھی تھا ملک کی یہ حالت تھی کہ اچھے اچھے سنجیدہ دماغ وقت کی رَو میں بہ چکے تھے، انسانی خون کی وہ ارزانی تھی جو دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی۔ کشت وخون کا بازار اس قدر گرم تھا کہ کبھی نہ ہُوا گا۔ انسانوں کے دماغوں پر بربریت اور درندگی کا وہ بھوت سوار تھا کہ معصوم بچپن ہو، یا دلعزیز جوانی، قابلِ رحم اور ناتوان بڑھاپا ہو یا عصمت و پاکدامنی کا واسطہ دے کر امان وپناہ چاہتی ہوتے بے بس نسوانیت! خونخوار انسانوں کی تیغ تیز سب پر برابر چلتی چلی جاتی تھی! آناً فاناً چند ہی دنوں میں سرزمین ہند کا ایک بڑا حصّہ خونِ انسانیت سے لالہ زار ہو چکا تھا۔ اور کونسا گناہ تھا جو ان دنوں ہندوستان کی زمین پر خدا اور خود کو بھولے ہوئے انسانوں سے سرزد نہیں ہُوا۔ شاید انسانی جرأت، دریدہ دلیری اور بے رحمی اِس سے بھی زیادہ ترقی کبھی نہ کر سکے!

گاندھی جی ان دنوں بنگال سے فارغ ہو کر بہار کے مظلوم ستم رسیدوں کی اشک شوئی و دلداری کے لئے گاؤں گاؤں کی خاک چھان رہے تھے کہ یکایک دہلی کی آہیں اور کراہٹ کی صدائیں اُن کے کانوں تک پہونچ گئیں اور اُن کے دل کو تڑپا گئیں۔ فوراً مضطر ہو کر دہلی پہنچے۔

سب سے پہلے جب وہ اسٹیشن پر آئے تو خود اُن کا بیان ہے کہ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ دہلی میں ایسا حادثہ پیش آیا ہے۔ سردار پٹیل مجھے لینے کے لئے اسٹیشن آئے تھے اُن کا چہرہ اُترا ہُوا تھا اور خلافِ معمول انہوں نے ملتے ہی اپنی ظرافت آمیز باتیں نہیں کیں! تب مجھے اندازہ ہوا۔

دہلی پہونچکر گاندھی جی برلا ہاؤس میں ٹھہرے۔ اس قیام کے دوران میں سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ گذرے ہوئے حوادث ان کو دکھائے جائیں اور واقعات کی پوری نوعیت اُن کو بتائی جائے۔

میں پہونچا۔ واقعات سنائے اور پھر ان کو وہ تمام پناہ گزین دکھلائے جو پہاڑ گنج قرولباغ، سبزی منڈی اور دوسری جگہوں سے ظلم وستم اور لوٹ مار کا شکار ہو کر اپنی جانیں بچا کر آ گئے تھے اور جامع مسجد، مدرسہ حسین بخش، عیدگاہ، پل بنگش، کوچہ چیلان، نظام پیلس میں پناہ گزین ہو گئے تھے اور زبان حال سے اپنی دردناک تباہی کی داستان سنا رہے تھے۔

پہاڑ گنج، سبزی منڈی، قرولباغ وغیرہ کی المناک تباہی کے تمام مناظر دکھلائے، فساد کا شباب تھا، بے گور وکفن لاشیں، خاکستر شدہ عظیم الشان عمارتیں اور برباد شدہ عبادت گاہیں ان کو دکھلائیں۔

گاندھی جی صرف ایک بڑے لیڈر ہی نہیں تھے ورنہ انہوں نے ان تمام مناظر کو محض ایک بڑے لیڈر کی طرح دیکھ کر معاملہ کو یہیں تک ختم کر دیا بلکہ وہ تمام انسانیت کے ایک بہت بڑے ہمدرد تھے، انہوں نے دل کی ایسی ہمدردی کے ساتھ ان تمام مناظر کو دیکھا اور واقعات کو سنا گویا تمام تباہی و بربادی خود ان کے گھر کی ہوئی ہے!

چنانچہ واقعات کی یہ تصویریں اُن کے دل پر نقش ہو گئیں! اور پھر انہوں نے اس کے علاج کے لئے وہ سب کچھ کیا جو شاید ہزاروں اور لاکھوں انسانوں سے نہ ہو سکتا!

جہاں کہیں کوئی حادثہ ہوا وہ خود پہنچے۔ ظالموں کو بھی سمجھایا اور اُنہیں ظلم سے رکنے کی تلقین کی اور دوسری طرف مظلوموں کی دادرسی کی۔ خود جا جا کر اُن سے ملے۔ اُن کی تکالیف معلوم کیں اور پھر بے چین ہو کر اُن کا انتظام کرایا۔

گاندھی جی جب سے دہلی آئے تھے اُس دن سے اُن کی زندگی کے آخری دن تک حضرت مولانا احمد سعید صاحب نائب صدر جمعیۃ العلمائے ہند، میں اور مسٹر سید محمد جعفری رکن مجلس عاملہ جمعیۃ العلمائے ہند اور حافظ محمد نسیم صاحب ٹین والے ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ وہ ہم سے ہر روز نئے واقعات کی پوری تفصیل پوچھتے اور پھر اُن کو نوٹ کر کے ضروری بندوبست کراتے۔

ہماری روزمرہ آمد ورفت کے نتیجہ میں انہوں نے ابتدائی دو ہفتوں کے بعد مجھ سے فرمایا کہ میں اگرچہ تم سے پہلے سے بھی واقف ہوں اور دوسرے ساتھیوں سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت ہے تاہم ان حالات میں دماغی توازن کو باقی رکھتے ہوئے جس طرح آپ حضرات نے معاملات میں مبالغہ اور رنگ آمیزی کے بغیر مجھ کو صحیح اطلاعات بہم پہنچائیں۔ بلکہ واقعات سے ایک حد تک کم۔ چونکہ مجھے اپنے دوسرے خصوصی ذرائع سے اس کا اندازہ ہو گیا ہے اس لئے میں مجبور ہوں کہ دہلی کے حوادث سے متعلق آپ ہی لوگوں پر پورا بھروسہ کر دوں۔

اور پھر (چونکہ ترجمانی اکثر میرے سپرد رہتی تھی) میری طرف ہنستے ہوئے مخاطب ہوتے اور فرمایا کہ آپ کو روز کا حساب روز دینا پڑے گا اور دیکھئے یہ خیال کرکے کہ میرا دل دکھی ہوگا آپ کسی بات کو چھپاتے نہیں۔"

ہماری روزمرہ کی آمدورفت کے باعث گاندھی جی نے ہم پر سے ملاقات کی پابندیاں اٹھالی تھیں اور پھر وقت، بے وقت ملاقات کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ گاندھی جی دن کے گیارہ بجے سے ایک بجے تک آرام کیا کرتے تھے ہمارے جانے کا طریقہ یہ تھا کہ ہم اکثر آرام کے وقت سے قبل اور کبھی بعد میں بھی جایا کرتے تھے۔

اُن کی ان تمام ملاقاتوں میں یوں تو ہر دن اُن کی بلند اخلاقی اور تمام انسانوں کے لئے خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں اُن کی دلی ہمدردی و دلسوزی کے نظائر دل پر نقش ہوتے جاتے تھے لیکن یہ واقعہ عمر کے آخری حصہ تک بھی نہیں بھلایا جاسکتا کہ جب دہلی کے مسلمانوں پر گذرے ہوئے حوادث و واقعات کو انہوں نے دیکھا اور سنا تو ایک دفعہ ایک اہم گفتگو کے بعد (جس میں پنڈت نہرو، مولانا آزاد اور سردار پٹیل بھی شریک تھے) انہوں نے ہم سے فرمایا کہ آپ نہایت اطمینان سے لکھنؤ کانفرنس میں جایئے اور پھر آپ کی واپسی کے ایک آدھ ہفتہ بعد میں آپ کو کوئی صحیح جواب دے سکوں گا۔

لکھنؤ کانفرنس سے واپسی پر جب ہم پہلی مرتبہ پہونچے تو وہ بے حد خوش اور مسرور نظر آتے تھے بار بار کانفرنس کی کارروائیوں کو پوچھتے اور سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ کانفرنس کی کامیابی پر مبارکباد دی اور فرمایا جو کچھ ہوا میری خوشی کے عین مطابق ہوا ہے۔!

غالباً اس کے بعد جب ایک اتوار کو ہم ملنے گئے تو کوئی خاص بات پیش نہ آئی اور حسب معمول ملاقات کے بعد واپس چلے آئے۔ پیر کا دن چونکہ مہاتما جی کی خاموشی کا دن ہوتا تھا اس لئے ہم خاص صورتوں کے علاوہ پیر کو نہیں جاتے تھے۔ کہ اچانک اس پیر کو برلا بھون میں سنا کہ مہاتما جی نے مرن برت رکھنے کا اعلان کردیا ہے۔ اگلے روز جب ہم پہونچے اور مولانا آزاد کی موجودگی میں ہم نے گلہ و شکوہ کیا کہ آپ نے ہمیں اطلاع کئے بغیر ایک ایسا اہم قدم اٹھایا ہے جس سے دوسری قسم کے خطرات بھی پیدا ہوسکتے ہیں اور پھر یہ کہ آپ کی زندگی تنہا آپ کی زندگی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی زندگی ہمارے اور انسانی خدمت و محبت کے لئے ایک بیش بہا زندگی ہے۔

اس پر انہوں نے تبسم پُرنم فرمایا۔ میں نے ہندوستان کے دونوں حصوں میں حیوانیت کا جو نقشہ دیکھا اور سنا اور پھر دہلی میں جو کچھ گذرا اس کو دیکھ کر میری آنکھیں شرم سے نیچی تھیں۔ میں سر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ہندوستان کے دونوں حصے اپنی حیوانیت سے ہندو دھرم اور اسلام کو جو نقصان پہونچا رہے ہیں دنیا کی آنکھیں اس کو بھلا نہیں سکتیں!

آج میں خوش ہوں، آنکھ اُٹھانے کے قابل ہوں اور فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے پاس فقط ایک جان ہے۔ آج میں ہندو مسلمانوں میں محبت پیدا کرنے اور اُن کے دلوں کو ملانے کے لئے اور فتنہ فساد کے تمام رشتوں کو ختم کردینے کے لئے اپنی جان کی بازی لگا چکا ہوں۔ میں یہی کرسکتا تھا۔ اس سے زیادہ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔

گاندھی جی نے اپنی زندگی میں بار بار برت رکھا مگر اس دفعہ کے مرن برت کی شان سب سے ممتاز اور سب سے بڑھ کر تھی ہمارے علاوہ گاندھی جی کے تمام ہی مقربین اور مخلصین نے اُن سے یہ سفارش کی کہ وہ اپنا ارادہ بدل دیں لیکن گاندھی جی فرقہ واریت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو اپنے جس مضبوط ارادے سے جان کی بازی لگا کر ختم کردینے کا فیصلہ کرچکے تھے کوئی نکتہ بیت اور سفارش اُن کے اس ارادہ میں تزلزل پیدا نہ کرسکی۔

چند روز گذر گئے اور اُن کا مرن برت جاری رہا یہاں تک کہ اُن کی قوت اور صحت خطرہ کی طرف جانے لگی اور ملک کے ہر فرقہ اور ہر گوشہ میں اُن کی طرف سے تشویش پیدا ہوگئی۔ مسلمان بھی پریشان تھے اور غیر مسلم بھی!

اور آخر کار مولانا آزاد نے گاندھی جی کی خدمت میں پہونچ کر کہا کہ اگر ہم سب اور عام ہندو، مسلمان، سکھ مل کر اپنے دلوں میں یہ طے کرلیں اور آپ سے بھی یہ وعدہ کریں کہ ہم اس مشن کو پورا کردیں گے جس کے لئے آپ نے برت رکھا ہے تو پھر آپ کو برت کھولدینا چاہیئے۔

اس پر مہاتما جی نے کہا کہ ہاں! اگر میں یہ دیکھ لوں گا کہ میری جان کے خوف سے نہیں بلکہ واقع میں دلوں کی صفائی اور سینوں کی اصلاح کے بعد ہندو، مسلمان، سکھ، سب مجھ سے پختہ وعدہ کرینگے کہ آئندہ وہ سب بھائی بھائی کی طرح رہیں گے اور جو کچھ ہوچکا اس کو دہرایا نہ جائے گا تو میں برت کھول دوں گا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے برت کو ختم کرنے کی سات شرطیں رکھیں کہ ان کو پورا کرنے کے لئے مجھے اطمینان دلایا جائے وہ ساتوں شرطیں اختصار کیساتھ یہ ہیں!

(۱) دہلی کے مسلمانوں کو آزادی اور حفاظت کے ساتھ رہنے سہنے اور چلنے پھرنے کی آزادی ہو۔ (۲) پہاڑ گنج، قرول باغ، سبزی منڈی اور ان تمام علاقوں میں بھی اُن کو آنے جانے کی آزادی ہو جہاں آج وہ نہیں جاسکتے! (۳) دہلی کے جو مسلمان اِن علاقوں سے برباد ہوکر چلے گئے ہیں اگر وہ آئیں اور پھر اپنے گھروں میں بسنا چاہیں تو ان کو مکانات واپس کردئے جائیں گے اور اُن کو رہنے کی سہولتیں دی جائیں گی۔ (۴) تمام مسجدیں اور عبادت گاہیں خالی اور محفوظ کردی جائینگی

(۵) ریلوے اور دوسری سواریوں میں گشت وخون کا سلسلہ ختم کر دیا جائیگا۔
(۶) اور پھر کسی پاداش میں اُن کا اقتصادی یا کسی طرح کا بائی کاٹ بھی نہیں کیا جائیگا۔
(۷) دہلی و نواح دہلی میں مسلمانوں کے جو مذہبی میلے ہوا کرتے تھے (جیسے قطب صاحب۔ مہرولی کا عرس) وہ آئندہ بھی حسب دستور ہو سکیں گے۔
ان شرائط کو دیکھئے ہر ہر شرط اور ہر ہر نکتہ گاندھی جی کی گہرائیوں سے ابھر نے والی اُس عام ہمدردی، محبت اور سب کی بہتری کے لئے یکساں تڑپ اور بے چینی کی ترجمانی ہے جو آج کسی دوسرے انسان کا حصہ نہیں۔ آخر کار سب نے گاندھی جی سے مل کر وعدہ کیا کہ ہم ان شرائط کو پورا کریں گے اور پھر ان کا برت کھلوایا گیا۔
دنیا نے دیکھا کہ گاندھی جی کے اس برت نے وہ کام کیا جو بڑی بڑی طاقتیں نہیں کر سکی تھیں۔ دہلی کی فضا میں غیر معمولی تبدیلی ہو گئی۔ حالات کا رنگ بالکل ہی بدل گیا۔!

ع اِدھر سے اُدھر پھر گیا رُخ ہوا کا !

سرشکِ خونیں

(اطہر صدیقی۔ دیوبند)

(مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان کے سانحۂ ارتحال پر ایک تاثر)

زندگی ہے باعثِ غم وجہ اندوہ ملال
درس جو دیتا رہا مہر و محبت کا ہمیں

حسرت و حرماں کی یورش سے مٹا جاتا ہوں میں
اُف وہ جانِ بازِ وطن وہ نازشِ ہندوستاں

آہ کس کی موت سے اے اطہرؔ غمگیں نوا
عمر بھر ٹوٹے دلوں کی جو صدا سنتا رہا

"آج ہر شئے میں کسی شئے کی کمی پاتا ہوں میں
نبضِ گیتی پر رہیں جس کی ہمیشہ انگلیاں

عزم و استقلال کا تھا جو کہ اک کوہِ گراں
چھین لی ہم سے اجل نے وہ متاعِ بے بہا

آہ وہ مردِ مجاہد، وہ وحیدِ روزگار
مدتوں روئیں گے جس کو آہ اب اہلِ وطن

وہ مفسّر، وہ مفکّر، وہ خطیبِ بے مثال
کون ہو گا غمزدوں کا اب رفیق و غمگسار

دردِ ملّت سے جو رہتا تھا ہمیشہ بیقرار
کون سلجھائے گا اب گیسوئے دوراں کی شکن

کون ہو گا اب محافظ تیرا اے اُردو زباں
فرصتِ یک لحظہ کس نے مانگ کر لے موت سے

کس کو ہو گی تیرے غم میں اتنی آشفتہ سری
چاک داماں کی ترے فرمائی تھی بخیہ گری

مشکلات دور کرنے کیلئے جد وجہد کرو لیکن مایوس نہ ہوں مایوسی سے عملی زندگی معطل ہو جاتی ہے

حکومت ہماری مشکلات دور کریگی، ہم بھیک نہیں اپنا حق مانگتے ہیں حکومت مجبور ہوکر ہمارا حق دیگی!

جمعیۃ علماء ضلع گڑگانوہ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر!

جمعیۃ علماء کی ضرورت اور خدمات پر تبصرہ، میووں کی مشکلات دور ہونیکی یقین دہانی

۹؍ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو فیروز پور میں ضلع جمعیۃ علماء کی مجلس منتظمہ کا ایک روزہ اجلاس ہوا۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی آمد سے فائدہ اٹھاکر مقامی کانگریس نے حضرت مولانا کی تشریف آوری کی خوشی میں ایک عصرانہ دیا جس میں مولانا موصوف نے ایک تقریر بھی کی مجلس منتظمہ کے جلسہ میں میووں کے متعلق کئی قرار دادیں بھی منظور کی گئیں، "مشکل کو دور کرانے کے لئے میدان میں اتر جاؤ۔ شکایت کرو ضرور۔ ارشاد باری ہے لاتیئسوا من روح اللہ (یعنی اللہ کی مہربانی سے مایوس نہ ہو۔ یہ الفاظ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے سپاسنامہ کے جواب میں کہے۔

تقریر شروع کرتے ہوئے حضرت مولانا نے جلسہ میں اپنی موجودگی پر اظہار مسرت کیا اور کہا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ آج ۱۹۴۷ء سے ابتک کی ساری کہانی آپ کو سناؤں کیونکہ اس طرح ہم آنے والے زمانہ کے لئے ایک راہ عمل متعین کر سکیں گے تاریخ اسی کا نام ہے۔ قرآن نے پچھلے واقعات کو اسی نقطہ نظر سے بیان کیا۔ تاریخ اسی لئے بیان کی جاتی کہ انسان اس سے سبق حاصل کرکے اپنے مستقبل کو روشن کرے

مولانا نے فرمایا مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے جس وقت میں فیروز پور جھرکہ پہونچا اس وقت میں آپ میں بہت کم لوگوں سے واقف تھا لیکن جب میں نے یہ سنا کہ میوات میں گولیاں چل رہی ہیں تو مجھ سے نہ رہا گیا اور ناواقفیت کے باوجود جیپ میں بیٹھکر یہاں پہونچ گیا۔ میں نے اس وقت دیکھا کہ یہاں چاروں طرف لاشیں نظر آرہی ہیں۔ اس وقت مجھے لوگوں نے یہاں آنے سے روکا تھا لیکن میرا احساس فرض مجھے یہاں کھینچ لایا۔ یہ واقعات میں نے صرف اس لئے بیان کیے کہ آپ مجھے نیا نہ سمجھیں کہ آپ کی حالت اور مشکلات سے واقف نہیں ہوں۔ آپ کی تمام مشکلات اور سارے حالات کا مجھے علم ہے اور ان کو دور کرنے میں میں اور میرے ساتھی برابر کوشش کرتے رہے ہیں۔ خدا کے فضل سے حالات پہلے سے بہتر ہو گئے ہیں۔ آپ نے میرے اور میرے ساتھیوں کی آمد پر سپاسنامہ پڑھا۔ اس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں۔ یہ بات میں رسمی طور پر نہیں کہتا بلکہ اپنے قلبی جذبات کا اظہار کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے متعلق حسن ظن کا اظہار کیا۔ وہ مجھے ویسا ہی بنادے۔"

میری زندگی کا ایک مشن ہے میں کہتا ہوں کہ اپنی مشکلات بیان کرو۔ انکو دور کرنے کے لئے میدان میں اتر جاؤ۔ شکایات کرو۔ اپنی مشکلات ضرور بیان کرو لیکن مایوس نہ ہو۔ مایوسی کا تصور بھی نہ آنے دو۔ مایوسی موت ہے۔ مایوسی سے عملی زندگی معطل ہو جاتی ہے۔ لاتیئسوا من روح اللہ۔ اللہ کی مہربانی سے مایوس نہ ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ آپ دکھی ہیں !!

سپاسنامہ میں چودہری صاحب وغیرہ نے جو کچھ کہا وہ سب سر آنکھوں پر ہے۔ مگر نا امید نہ ہیجئے۔ حالات بہت بہتر ہوگئے ہیں۔ حالات بہت کچھ بدلے ہیں اور بہتر ہو گئے ہیں۔ خدا کے فضل سے ہم بہت آگے بڑھ چکے ہیں ہم نے پچھلے حالات میں صرف کھانا پینا اور عیش کرنا سیکھا تھا لیکن حالیہ واقعات سے ہمیں ایک جھٹکا سا لگا۔ ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ ہم نے صبر و استقلال کی مثال پیش کی کہ آنے والی نسلیں ہمیں ہمیشہ یاد رکھیں گی اور عزت و احترام سے ہمارا نام لیں گی،

ہندوستان کی ریڑھ کی ہڈی

مولانا نے ۱۹۴۷ء کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے میواتیوں کو یاد دلایا کہ گاندھی جی نے گھا سیڑے کے میدان میں گوپی چند بھارگو سے کہا تھا کہ میو ہند کی ریڑھ کی ہڈی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی اہمیت کو گاندھی جی نے بھی تسلیم کیا تھا۔ اور آپکی امداد بحالی کو وہ بھی بہت اہم سمجھتے تھے۔ اور اسپر زور دیتے تھے گاندھی جی کے اس قول نے جتنا اثر کیا وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ آج اسے آپ بھی محسوس کر رہے ہیں۔ گاندھی جی اور کانگریس کی خدمات کا اقرار کرنا چاہیئے۔ بہت کچھ ہوا اور بہت کچھ ہونا

باقی ہے۔ جو کچھ ہونا باقی ہے۔ وہ ہو کر رہیگا انشا اللہ تعالےٰ۔ مگر آپ ہمت نہ ہاریں کسی اور طرف نہ دیکھیں۔ پاکستان کی طرف نظر نہ اٹھائیں۔ حکومت ہماری مشکلات دور کریگی۔ یہ بات صرف ہمارے لئے نہیں بلکہ سارے ملک کے لئے ضروری ہے۔ ہم بھیک نہیں مانگتے کوئی ہمارا آقا نہیں، ہم خود آقا ہیں۔ ہم اپنا حق مانگتے ہیں۔ حکومت مجبور ہو کر ہمیں ہمارا حق دیگی۔

مسجدوں کا مسئلہ

آپ اپنی بات کہتے ہیں میں دہلی کے واقعات بتاتا ہوں وہ تو راجدھانی ہے۔ جہاں دنیا بھر کے ملکوں کے سفیر بیٹھے ہیں۔ وہاں بھی بعض مساجد مقفل ہیں لیکن میں مایوس نہیں ہوں نقشہ میں بارہ آنے رنگ بھرا جا چکا ہے۔ ۴ آنے رنگ بھرنا باقی ہے۔ جب میں اس بات کو دیکھتا ہوں تو میری ڈھارس بندھ جاتی ہے۔ اور ہم خدا کے فضل پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے وزیراعظم اور اپنی سیکولر حکومت کے قانون کی بنا پر امید رکھتے ہیں کہ ایک دن ایسا آئیگا جب ہم اپنے حالات پر پورا قابو پالیں گے میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ آپکی مشکلات کا احساس محکمہ بحالیات کو بھی ہے۔ اور وزیراعظم کو بھی لیکن جس طرح ہمیں کچھ مشکلات درپیش ہیں۔ اسی طرح حکومت کے راستے میں بھی مشکلات حائل ہیں ہمیں امید ہے کہ یہ مشکلات بہت جلد دور ہوجائینگی

جمعیۃ علماء کی تنظیم

جمعیۃ علماء کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مولانا نے فرمایا ۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں مختلف جماعتیں تھیں۔ میں نے جمعیۃ علماء کے سکریٹری کی حیثیت سے اور ایک مسلمان کی حیثیت سے کئی دن اور کئی راتیں اس فکر میں گذاریں کہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمانان ہند کے لئے جمعیۃ علماء سے بہتر کوئی جماعت ہوسکتی ہے۔ میں دیانت داری کے ساتھ اس نتیجہ پر پہونچا کہ آج کل کے حالات میں مسلمانان ہند کے لئے جمعیۃ علماء سے بہتر کوئی جماعت نہیں ہوسکتی۔ غور کیجئے اگر مسلمان کسی فرقہ پرست جماعت میں شامل ہوں گے۔ تو اکثریت میں فرقہ پرستی بڑھے گی۔ اور نئے نئے شبہات پیدا ہوں گے۔

بدلے ہوئے حالات میں فرقہ پرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج کے حالات میں ایسی کوئی جماعت کامیاب نہیں ہوسکتی اکثریت میں بعض فرقہ پرست جماعتیں ہیں لیکن اگر مسلمانوں نے بھی یہ راستہ اختیار کیا تو یہ جماعتیں زیادہ مضبوط ہوجائیگی غرض جس لحاظ سے بھی سوچئے سیاسی پارٹیاں سب فرقوں کی مشترک ہونی چاہئیں البتہ مختلف فرقوں کی الگ الگ مذہبی اور ثقافتی جماعتیں بن سکتی ہیں۔ ہندوستان کے دستور نے ہمیں اس کی اجازت بھی دی ہے کہ مذہبی تعلیم کی حفاظت کے لئے اپنی علیحدہ مذہبی جماعتیں منظم کریں۔ ان حالات کے پیش نظر جمعیۃ علماء پر غور کیجئے اس کا ایک شاندار ماضی ہے۔ زمانۂ حال میں اس کے سامنے ایک جامع پروگرام ہے

جمعیۃ علماء نے جنگ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ اس کا ماضی بہت تابناک ہے اسکی خدمات بہت درخشاں ہیں اس پر فرقہ پرستی کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اگر کوئی شخص ایسا کہتا ہے تو اسے حماقت سمجھنا چاہئے۔ سمجھدار آدمی جانتے ہیں کہ یہ جماعت جو کچھ کہتی ہے فرقہ پرستی کے جذبہ سے نہیں کہتی بلکہ ملک کی تعمیر اور استحکام کے جذبہ سے کہتی ہے۔

وقف بل

اس کے بعد حضرت مولانا نے جمعیۃ علماء کی خدمات پر روشنی ڈالی اور ایک مبسوط اور مدلل تبصرہ میں بتایا کہ وقف بل پارلیمنٹ میں منظور کرالیا گیا ہے جو اب صدر جمہوریہ کی منظوری کے بعد ایکٹ بن چکا ہے۔ مشرقی پنجاب میں وقف بل کے نفاذ سے آپکی تمام تعلیمی اور سماجی مشکلات دور ہوجائیں گی۔ اس کی آمدنی سے آپ کے بہت سے مسائل حل ہوں گے اوقات کی آمدنی بربادی سے محفوظ رہیگی۔ اور آپکی تعلیمی اور دوسری ضروریات کے کام آئے گی۔ وقف بل کے نفاذ سے زمین کے مسئلہ کے سوا مساجد اور اوقاف کے مسائل حل ہوجائیں گے۔

آپ نے بڑھتی ہوئی پارٹی بازی کی مذمت کی۔ اور اس کے نقصانات پر روشنی ڈالی آپنے فرمایا۔ صرف نکتہ چینی سے مشکلات دور نہیں ہوسکتیں اپنے دماغ کو صاف کرکے خلوص سے مذہبی اور قومی خدمت کرنے کی ضرورت ہے آپ جس مشترک سیاسی جماعت میں چاہیں شامل ہوں لیکن مذہبی تعلیم اور اوقاف کی تنظیم کے کام میں جمعیۃ علماء کا ساتھ دیں اور فرقہ پرست جماعتوں سے الگ رہیں۔ اس بات کا خیال رکھئے کہ ذاتی اغراض میں پھنس کر جماعتی زندگی کو نقصان نہ پہونچے آپ تعمیری نکتہ چینی کیجئے۔ اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ لیکن تخریب نہ کیجئے اور اسے ناقابل معافی جرم سمجھئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ حضرات نے سر جوڑ کر کام کیا تو آپ اپنی مشکلات پر قابو پالیں گے۔ لیکن اگر آپ پارٹی بندی کے جھگڑوں میں اُلجھے رہے تو آپ سخت نقصان اٹھائیں گے۔

میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ آپ اپنی مشکلات ضرور بیان کیجئے۔ ان کو دور کرنے کے لئے جد و جہد بھی کیجئے۔ مگر مایوسی سے بچئے۔ اور مشکلات سے مغلوب نہ ہوجئے۔

دستوریہ ہند میں قومی زبان کے مسئلہ پر مولانا حفظ الرحمٰن کی زبردست تقریر!

صرف ہندستانی ہی اس مُلک کی قومی زبان بن سکتی ہے۔ مہاتما گاندھی کی بھی یہی خواہش تھی خود کانگریس بھی تیس سال تک اسی کا پرچار کرتی رہی

ہندی زبان صرف ایک طبقہ کو مرعوب کرنے کے لئے ٹھونسی جا رہی ہے

ہندی پریمیوں کی لچر دلیلوں کا مدلل جواب

"تیس سال تک کانگریس کے پلیٹ فارم سے یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی جو فرانٹیر تک شمالی ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور زبان کا رسم الخط ہندی اور اردو ہوگا۔ مہاتما گاندھی بھی آخر تک اسی زبان کے حامی رہے لیکن آج میں یہ دیکھکر حیران ہوتا ہوں کہ ہم نے کانگریس کے اور مہاتما گاندھی کے اس اصول کو ٹھکرا دیا اور صرف ہندی زبان کو ملک کی قومی زبان بنانے پر زور دینے لگے" یہ تھے وہ الفاظ جو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ممبر دستور ساز اسمبلی نے پیر کے دن شام کو ۷ ½ بجے تقریر کرتے ہوئے فرمائے۔

شام کے اجلاس میں ہندوستان کی قومی زبان کا وہ مسئلہ پیش ہوا جس پر پورے ملک کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں اور جس نے پچھلے دنوں میں خصوصی اہمیت حاصل کر لی تھی۔

مولانا سے قبل جن دوسرے ممبران نے تقریریں کیں ان میں سیٹھ گوبند داس ہندی ساہتیہ سمیلن کے ممبر بھی ہیں اور مسٹر نذیر الدین احمد کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں سیٹھ گوبند داس نے اُردو کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا اور یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ وہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے کہا کہ اس زبان میں بھیم ارجن کے ذکر کے مقابلہ میں سہراب اور رستم کا ذکر کیا گیا۔ مسٹر نذیر الدین احمد نے بنگالی یا سنسکرت کو قومی زبان بنانے پر زور دیا اور کہا کہ اگر سنسکرت زبان قومی زبان قرار پا گئی تو اسے سیکھنے میں ہندی اور غیر ہندی علاقوں والوں کو یکساں دشواری پیش آئیگی اور کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہ ہوگی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ترمیم یہ تھی کہ ہندوستان کی قومی زبان ہندوستانی ہونی چاہئیے۔ جو دیوناگری اور اُردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے۔

مولانا نے فرمایا، زبان کا مسئلہ سارے ملک میں خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے کانگریس کی تیس سالہ جنگ آزادی میں جب کبھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا تو تمام کانگریس میں اس پر متفق تھے لیکن میں یہ دیکھکر حیران ہوں کہ جس مسئلہ پر ہم کل تک متفق تھے۔ آج اس ایوان کے اندر بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آرہی ہیں۔ مہاتما گاندھی کے نزدیک چار باتیں سب سے زیادہ اہم تھیں ان میں سے ایک یہ زبان کا مسئلہ بھی تھا۔ ابتداء میں گاندھی جی ہندی ساہتیہ سمیلن کے ممبر رہے اور اسکو آگے بڑھانے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ہندی سے مراد وہ زبان نہیں ہے جسے وہ خود چاہتے تھے بلکہ وہ ایک ایسی زبان ہے جو اپنے دائرہ کو وسیع نہیں بلکہ اُسے تنگ کرتی ہے تو وہ اس سے الگ ہوگئے اور اعلان کیا کہ ہندی سے میرا مطلب اس زبان سے ہے جو شمالی ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور جسے ہندو مسلمان اور سب لوگ سمجھتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے اس کے بعد ہندی اتھوا ہندوستانی کی آواز بلند کی اور ہندوستانی پرچار سبھا کے ذریعہ اس زبان کو فروغ دینے کی جدوجہد شروع کر دی۔

۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کے بھیانک حادثہ سے جبکہ مہاتما جی ہم سے چھین لئے گئے تین روز قبل انہوں نے دوران گفتگو میں مجھ سے فرمایا تھا کہ اب امن و امان ہوتا جا رہا ہے جس طرح تم لوگوں نے قیام امن کے سلسلے میں میری امداد کی ہے۔ اسی طرح تمہیں ہندوستانی کے پرچار میں بھی ساتھ دینا ہوگا۔ اور ہم نے ان سے اس بات کا وعدہ کیا مگر افسوس وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہوگئے۔ خیال تھا کہ مہاتما جی کے زبان کی خواہشات کا احترام کیا جائے گا۔ لیکن مجھے سخت زبردست حیرانی ہے کہ کل تک جو لوگ ہندوستانی کا پرچار کر رہے تھے۔ انہوں نے گاندھی جی کے اصول کو پس پشت ڈالدیا۔ اور آج وہ صرف ہندی کو ملک کی قومی زبان بنانے پر زور دے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس معاملہ میں مہاتما گاندھی کا نام نہ لیا جائے۔ لیکن اس کے لئے میرا جواب یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کے نزدیک زبان کا مسئلہ بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔

مہاتما جی نے اس زبان کو کبھی ہندی نہیں کہا بلکہ ہمیشہ انہوں نے ہندوستانی کہا انہوں نے بڑی جستجو اور غور و خوض کے بعد یہ نام پسند کیا تھا۔ یہ ایسی زبان ہے۔ جسے قصبات اور دیہات تک میں رہنے والے تمام لوگ سمجھتے ہیں۔ اس کے برعکس

ہندی زبان وہ زبان ہے جس کے دائرہ کو تنگ کیا جاتا ہے۔ ہندی کے پریمی کبھی یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ وہ اس زبان میں دوسری زبان کے الفاظ نہیں رکھیں گے۔ لیکن عملی طور پر کیا ہو رہا ہے اس کی مثال یوپی میں دیکھ لیجئے۔ جہاں ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کر لیا گیا ہے۔ عام فہم الفاظ کو نکالا جا رہا ہے جنھیں ہر کس و ناکس آسانی کے ساتھ سمجھتا ہے وہ چن چن کر اُردو کے الفاظ کو نکال رہے ہیں، اس کا ثبوت یوپی میں بلوں اور قرار دادوں کے وہ مسودے ہیں جو اسمبلی میں پیش کئے جاتے ہیں لیکن یہ کوشش کتنی غیر حقیقی ہے۔ اس بات سے ظاہر ہے کہ جو ممبران بلوں کو ہندی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں ان الفاظ کو نہیں بولتے۔ فی الواقع آج یوپی میں وزیر اور عدالت جیسے الفاظ کا بولنا بھی ایک جرم سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ اُردو زبان کوئی ایسی زبان نہیں ہے۔ جسے مسلمان اس ملک میں باہر سے لاتے ہوں وہ نہ عرب سے لائے اور نہ ایران سے وہ ہمارے پریم و محبت اور باہمی میل کا نتیجہ ہے۔ سیٹھ گوبند داس نے ابھی مجھ سے پہلے کہا کہ اُردو میں ہندوستان کی چیزوں کے مقابلہ میں غیر ملکی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ یہ قطعی طور پر غلط ہے اور بے بنیاد الزام ہے۔ دنیاوی باتوں کو چھوڑ دیئے اُردو شعر کہتے . . . . . وقت شاعروں نے اس ملک کو نظر انداز نہیں کیا:۔

نظیر اکبر آبادی کا شعر سنئے (سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
بادلوں پر لئے پھرتی ہے ہوا گنگا کا جل)

اس شعر میں شاعر نے مکہ مدینہ یا آب زمزم کا ذکر نہیں کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتا میرے بھائی کے دماغ میں ایسی کونسی چیز ہے جو گاندھی جی کے اصول کو ٹھکرا رہے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کا مصرعہ سنئے۔؎

(سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ)

موت تک کے اس ذکر میں بھی شاعر نے ہندوستانیت کو مدنظر رکھا ہے اور اس کی نظر غیر ملک پر نہیں گئی۔ اسی طرح خسرو نے جو شاعری کی اس میں ہندوستان ہی کی باتوں کو مدنظر رکھا۔

ہندی زبان کے متعلق میں یہ نہیں کہتا کہ اُسے نہ سیکھا جائے۔ لیکن جس طریقہ پر اس زبان کو ایک ادبی زبان بنایا جا رہا ہے۔ وہ مخصوص طبقہ کی زبان بن جائے گی۔ اور اگر اس طرح اُردو کو بھی ادبی زبان بنا یا گیا تو وہ بھی ایک خاص طبقہ کی زبان ہو کے رہ جائے گی۔ صرف ہندوستانی ہی زبان وہ زبان ہے جو ہندوستان کے عوام کی زبان ہے۔ مہاتما گاندھی نے بھی اسلئے فرمایا تھا کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہو سکتی ہے کیونکہ اس میں سب زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔

اس اصول میں کیوں تبدیلی ہوئی اس کا جواب مجھے نہیں مل سکا جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ صرف تقسیم کے اثرات ہیں۔ اگرچہ یہ کہا جاتا ہے۔ کہ ہندی زبان کو رائج کرنے میں فرقہ وارانہ جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غیر ارادی طور پر فرقہ وارانہ جذبات سے متاثر ہو کر ہم قدم اٹھاتے ہیں۔ جس طور پر اس وقت زبان کا مسئلہ حل کیا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد صرف ایک فرقہ کو مرعوب کرنا ہے۔

سنسکرت اور تہذیب

سیٹھ گوبند داس نے ابھی تہذیب اور سنسکرت کا ذکر کیا اور کہا یہ ہے کہ آزادی کے بعد اس ملک کے اندر دو سنسکرتیاں اور تہذیبیں نہیں رہ سکتیں۔ اگر تہذیب اور سنسکرتی کی بنیاد زبان پر ہے تو ہندوستان میں ایک درجن سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایک سنسکرتی کے لئے ان سب زبانوں کو ملیامیٹ کر دینا چاہیئے۔

حیرت ہے کہ ہم کس طرح تنگ نظری کی پالیسی پر چل رہے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ ایک چھوٹا سا ملک ہے وہاں چار زبانوں کو سرکاری حیثیت حاصل ہے میرے بھائی نے روس کا ذکر کیا ہے کہ وہاں صرف ایک زبان اور ایک تہذیب اور ایک ہی جیسے نام بسے جاتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح نہیں ہے روس میں ساٹھ سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور وہاں رہنے والے مسلمانوں کے نام آج بھی عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہیں ان حالات میں ہندوستانی زبان کو ختم کرنا اور اس کی جگہ سخت ہندی رائج کرنا کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ صرف تقسیم ملک کے اثرات ہیں۔ اور اس ہندی کے جواز کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔

اس ملک کی زبان اگر کوئی سرکاری زبان بن سکتی ہے تو وہ صرف ہندوستانی ہی ہے جسے اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں لکھا جائے۔ ہندی رسم الخط کو اول درجہ میں رکھا جا سکتا ہے لیکن ثانوی درجہ میں اُردو رسم الخط ضرور ہونا چاہیئے اور اسمبلی۔ عدالتوں وغیرہ میں اس رسم الخط کو قانونی حیثیت ہونی چاہیئے۔

جہاں تک انگریزی ہندسوں کا سوال ہے تو جب انگریزی کو پندرہ سال تک برقرار رکھا جا رہا ہے اس کے ہندسے بھی باقی رہیں گے اور اس سے ہمارے کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ اگر ان کے ذریعہ آسانی پیدا کرتی ہے۔ تو انھیں ضرور رکھا جائے۔ علاقائی زبانوں کی جو فہرست بنائی گئی ہے۔ اس سے میں پوری طرح متفق ہوں:۔

میں آخر میں پھر اپیل کروں گا کہ ہماری زبان ہندوستانی ہونی چاہیئے کیوں کہ یہی ایک آسان زبان ہے جو ملک کی زبان ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے ملک کی حکومت ایک غیر مذہبی اور سیکولر حکومت ہے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہم ہندوستانی کو ہی اپنی قومی زبان تسلیم کریں۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ - ملک کے نظامِ تعلیم اور نصابی کتابوں کے معاملہ پر

پارلیمنٹ میں ایک بصیرت افروز تقریر!

۵؍مارچ [illegible] کو لوک سبھا میں وزارت تعلیم کے مطالبات زیر بحث کے دوران حضرت مولانا حفظ الرحمٰنؒ صاحب نے اپنی تقریر میں مرکزی وزیر تعلیم کو نصاب کی کتابوں میں ایک خاص مذہب کے پروپیگنڈے اور دوسرے مذاہب کی اہانت کے مضامین کی طرف خاص توجہ دلائی اور نصاب کی کتابوں کی تیاری کے موجودہ طریق کار پر مشاورانہ نکتہ چینی کی۔ ساتھ ہی نصاب کی کتابوں کو خالص سیکولر بنانے پر بھی زور دیا۔ آپ نے اپنی تقریر میں علی گڈھ یونیورسٹی کے بارے میں بھی کچھ ممبروں کے اعتراضات کا نوٹس لیا اور صاف صاف کہا کہ شاید کسی خاص مصلحت کے ماتحت یونیورسٹی کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ حضرت مولاناؒ کی یہ تقریر ذیل میں شائع کی جا رہی ہے

محترم ڈپٹی اسپیکر صاحب! میں آج ایک خاص بات کی طرف محترم ایجوکیشن منسٹر صاحب کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ ان پچھلے چند برسوں میں اس بات کی طرف مختلف موقعوں پر پارلیمنٹ میں توجہ بھی دلائی گئی ہے لیکن ابھی تک اس میں کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ ہمارا کانسٹی ٹیوشن بننے کے بعد یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ جہاں تک تعلیم اور شکشا کا تعلق ہے گورنمنٹ صرف سیکولرازم اور نیشنلزم کے مطابق کتابوں کے کورس کو اپنی تعلیم کے اندر جذب کرے گی کسی کے مذہب اور کسی کے دھرم کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت پر نہیں ہے۔ یہ بات ہم نے بہت ہی مفید سمجھی اور یہ صحیح قدم ہے جو کہ یقیناً تعلیم کے سلسلے میں سیکولر اسٹیٹ میں ہونا چاہیے لیکن بدقسمتی سے ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ذریعہ جو کتابیں پرائمری ایجوکیشن میں اور مڈل کی تعلیم میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں جاری ہیں ان میں یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ بہت واضح طور پر ان کتابوں میں کسی خاص انداز سے اس طرح کے بیان اور اس طرح کے مضمون لائے جاتے ہیں جن میں خاص طور پر مسلمانوں یا اسلام کے بارے میں جتنا بھی خلاف لکھا جا سکے لکھا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اگر یہ بھی ہو تو کم سے کم اس طریقہ سے لکھا جائے جس سے کسی ایک مذہب کا پروپیگنڈہ ہو اور دوسرے مذہب پر اس کا برا اثر ہو۔ اس بارے میں پچھلے برسوں میں گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشن منسٹری کے سامنے اور ایجوکیشن منسٹر مولانا آزاد مرحوم و مغفور کے سامنے بھی میں نے تقریباً ۲۵، ۳۰ کتابیں مختلف طور سے پیش کر کے ضبط کرائی تھیں۔ ان کی تحقیق کی تو معلوم ہوا اور اسٹیٹ گورنمنٹوں نے بھی تسلیم کیا کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس طرح وہ کتابیں داخل کی گئیں۔ اور آخر کار وہ ضبط کی گئیں لیکن ۲۵، ۳۰ کتابیں ضبط ہونے کے باوجود آج ایک سلسلہ برابر سیلاب کے طریقہ سے ہم دیکھ رہے ہیں، دانستہ یا نادانستہ جس طرح بھی ہو ایک سیلاب کی طرح کا سلسلہ جاری ہے اور کتابوں میں دونوں چیزیں برابر موجود ہیں۔ پچھلے زمانہ میں تقریباً ۱۵ کتابوں کے بارے میں ایک فہرست بنا کر بھی بھیجی گئی۔ ہم نے یہ بتلایا کہ اس قسم کی کتابیں اس قابل نہیں ہیں جو کہ تعلیم میں رکھی جا سکیں۔ وہ بہت مضر ہیں اور اس سے دوسرے مذاہب کی ہانی بھی ہوتی ہے۔ اور سیکولرازم اور نیشنلزم کے خلاف بھی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں وہ سیلاب رکتا نظر نہیں آتا۔

جب ہم کبھی کبھی ایسی تقریریں کرتے ہیں تو کتابیں مانگی جاتی ہیں ہم وہ کتابیں مہیا کر دیتے ہیں لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محکمہ تعلیم یہ سمجھتا ہے کہ صرف ان چند کتابوں کے بارے میں شکایت تھی اور اس نے شکایت دور کر دی۔ حالانکہ صورت حال یہ نہیں ہے صورت حال دو چار دس بیس یا پچیس کتابوں کو یہاں پیش کر دینے تک بھی نہیں۔ آج اگر کوئی کمیٹی بٹھلائی جائے اور اس بارے میں اہمیت کے ساتھ تحقیقات کرائی جائے تو بلا مبالغہ میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس فی صدی کتابیں پرائمری اور مڈل تعلیم کے کورس میں اس قسم کی داخل ہیں جن میں سیکولرازم کے خلاف ایک خاص مذہب کا پروپیگنڈہ کسی نہ کسی طریقے سے ہے۔ یا کھلی ہوئی کسی دوسرے مذہب کی ہانی اور اس کے متعلق اس قسم کی توہین موجود ہے چاہے وہ الہامی کتاب کے بارے میں ہو مثلاً

قرآن کریم یا پیغمبر صلعم کے بارے میں یا مسلمان بادشاہوں کے خاص واقعات کے بارے میں۔

شری پرکاش ویر شاستری گوڑ گاؤں۔ کوئی نمونہ پیش کیجئے

مولانا حفظ الرحمٰن۔ میں نمونہ پیش کرنے کے لئے نہیں کھڑا ہوں۔ لیکن اس طرح کی ۲۵، ۳۰ کتابیں ضبط ہو چکی ہیں اور ۱۰۵ کتابوں کی فہرست دی جا چکی ہے۔ نمونہ کی ذمہ داری میں نہیں لے سکتا لیکن اس کے لئے چیلنج کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان کی تمام اسٹیٹوں میں تحقیقات کرائی جائے اور تقریباً ۵۰ فی صدی کتابیں ایسی کورس کے اندر ثابت نہ ہوں تو اس سے زیادہ جرم میرے خلاف یا میری ذمہ داری کے خلاف کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ یہ چیزیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں یہاں پر کوئی دو چار کتابوں کا حوالہ نہیں دیتا یہاں ایک وقت وہ بھی تھا جب کتابیں پیش کی گئیں، ان کے اقتباسات بھی پیش کئے گئے لیکن آج میں اس بیماری کو دق کے درجہ کی سمجھ کر یہ گذارش کر رہا ہوں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو خاص طور پر چیک کیا جائے۔

مختلف کانفرنسوں میں تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں وہ تجاویز مختلف انجمنوں جمعیۃ علماء ہند اور دوسری انجمنوں جیسے انجمن ترقی اردو کی طرف سے بھی آئی ہیں جن میں دو باتیں کہی گئیں ایک بات یہ کہ ایک سب کمیٹی ہو جو اس قسم کی باتوں کو چیک کرے۔ ابھی ابھی کرانتی کی لہریں نام کی ایک کتاب ہم نے اپنے ایجوکیشن منسٹر محترم کو ۱۶ یا ۱۷ دن ہوئے دی تھی۔ انھوں نے خود ہی مجھ سے اقرار کیا کہ اس کے اندر بہت سخت اور قابل اعتراض مضمون اسلام کے خلاف ہیں اور وہ کئی برسوں سے اتر پردیش میں پڑھائی جا رہی ہے۔ اس کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے لیکن کوئی بات آگے نہیں بڑھتی۔ اس طرح کے واقعات بہار میں، راجستھان میں یو پی میں، مدھیہ پردیش میں اور دوسری اسٹیٹوں میں برابر جاری ہیں۔ اس لئے میں تو دق کے درجہ کی بات کہہ رہا ہوں لہٰذا اس بات کا لحاظ ہونا چاہیے۔ آج مسلمان عوام کہتے ہیں اور ہم کو طعنے دیتے ہیں کیوں صاحب یہ سیکولرازم ہے، یہ سیکولر اسٹیٹ کی کتابیں ہیں جن میں کھل کر اسلام کے خلاف قرآن کے خلاف، قومی اصول کے خلاف یہ باتیں موجود ہیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اس تعلیمی سیکشن کو جو تعلیم ہی کا حصہ ہے اس کو غالباً کسی ایک مذہب کے پروپیگنڈے کے تبلیغی ادارے کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال بہت ناقابل برداشت ہے اور تعلیم کے بارے میں تو بالکل ہی برداشت کے قابل نہیں ہے۔ اس لئے کہ تعلیم تو بچے کے دماغ کو شروع سے ہی ایک خاص طریقہ پر کنٹرول کرنے کے لئے ہے۔ ضرورت دو باتوں کی ہے۔ ایک ایسی کمیٹی بنے جو کہ اس چیز کو مختلف ریاستوں میں چیک کرے اور اس قسم کی کتابیں جو ہوں ان سب کو خارج کرائے اور ان کو کورس سے نکال دیا جائے اور دوسرے یہ کہ آئندہ جو ہماری ٹیکسٹ بکس کمیٹی ہو اس میں دو باتیں ہونی چاہئیں یا تو یہ کہ جو مضمون اور جو پیپر لکھا جائے وہ اس مذہب کے آدمی سے لکھوایا جائے۔

اسی سال یہاں دہلی میں ایک کتاب اس قسم کی لکھی گئی۔ جب میں نے اس کی بابت مصنف صاحب سے جا کر بات چیت کی تو یہ پایا کہ واقعی مصنف صاحب بہت سیدھے سادھے آدمی تھے اور ان کا مقصد اسلام کی توہین کرنا نہیں تھا۔ انھوں نے معذرت میں کہا کہ میں کیا کروں مجھے اسلام مذہب کے بارے میں جو باتیں معلوم تھیں وہ میں نے اس میں لکھدی ہیں۔ اور کوشش سے میری کتاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی کتابوں میں شامل ہو گئی۔

بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ کوئی بھی کتاب ایرا غیرا لکھ مارے اور وہ یوں ہی مذاق کے طور پر ٹیکسٹ بک کمیٹی کی کتابوں میں شامل ہو جایا کرے۔ ایسے شخص سے جو نہ ایکسپرٹ ہو اور نہ جس میں تعلیمی مہارت ہو اس طرح کتابیں لکھوانا کہاں تک واجب اور مناسب ہے۔ اس لئے ٹیکسٹ بک کمیٹی میں اگر ایسے ماہر جو کہ کسی طرح کا تعصب نہ رکھتے ہوں اور جو کہ اس مذہب کو صحیح طور پر سمجھتے ہوں۔ ان کے ذریعہ اس طرح کی کتابوں کو لکھوا لیا جائے تو وہ بہتر طریقہ ہو سکتا ہے۔ لیکن میں چاہتا تو یہ ہوں کہ وہ کتابیں جو ہمارے اسکولوں میں ہوں ان میں سوائے سوشلزم کے دوسری کوئی چیز نہ ہو۔ بیشک مسلمانوں کے نبیوں کا ان میں ذکر ہو بیشک بہتر سے بہتر۔ جو ہمارے ہندوستان میں رشی منی گذرے ہیں ان کا ذکر کرو اور تواریخ کی حیثیت سے ان کا ذکر کرو لیکن ایسے ایگریسو بیان کرو اور وہ طریقے نہ بتلاؤ جس سے کہ ایک مذہب کا تصادم دوسرے مذہب سے ہوتا ہو اور ایک مذہب کی توہین دوسرے مذہب کے ذریعے ہوتی ہو۔

یہ کام ان مجلسوں کا ہے جو باہر مناظرے ہندو مسلمانوں کے سکھ مسلمانوں کے یا سکھ ہندوؤں کے کرا کر ان کو آپس میں لڑاتی رہیں۔ یہ کام ہمارا نہیں ہے گورنمنٹ کا نہیں ہے اور ایک سیکولر اسٹیٹ کا نہیں ہے۔ اس بنا پر میں بہت دکھ سے یہ بات کہنے کو تیار ہوں کہ اس چیز کو بہت ہی معمولی سمجھا جاتا ہے اور وقتی تقریر کے ذریعہ یہ چیز ختم کر دی جاتی ہے اس پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے یہ اصول کی بات ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سبجکٹ ایسا ہے جس پر صوبوں کو اپنے اپنے طریقہ پر چلنے کا اختیار رہے لیکن اس بات کا خیال تو بہت ضروری ہے کہ تعلیم سیکولرازم کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو۔ تمام ریاستوں کو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔

شری سی کے بھٹاچاریہ (مغربی دیناج پور) کیا میں آنریبل ممبر سے یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ کیا وہ صرف ہندی کتابوں کا ذکر کر رہے ہیں یا دوسری زبانوں کی کتابوں کا بھی جن کتابوں کا وہ ذکر کر رہے ہیں ان کے بارے میں انھیں صاف کرنا چاہیے کہ وہ کس زبان

سے تعلق رکھتی ہیں ہو؟

مولانا حفظ الرحمٰن ۔ جی ہاں ایک نہیں کئی زبانوں میں ایسی کتابیں موجود ہیں

ڈپٹی اسپیکر۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کوئی ایک زبان نہیں ہے۔ بلکہ ایک سے زیادہ زبانیں ہیں۔

مسٹر سی بھٹا چاریہ ۔ میرا آنریبل ممبر سے کہنا یہ ہے کہ ممبر موصوف ہندوستان کی سب زبانوں سے واقف نہیں ہیں۔ اس لئے جب وہ اس قسم کا الزام لگاتے ہیں، تو انھیں ان زبانوں کی وضاحت کرنی چاہئے جن کے بارے میں وہ کہنا چاہتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن ۔ میں نے ہندی زبان کو اس لئے مخصوص نہیں کیا کیونکہ جیسا میں نے کہا گجراتی زبان میں بھی ہیں۔ مراٹھی (وتامل) میں بھی ہیں۔ میں نے کسی خاص زبان کے بارے میں نہیں کہا بلکہ میں نے تو کہا کہ دوسری زبانوں میں بھی اس طرح کی کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر کے۔ ایل۔ شریمالی (وزیر تعلیم)۔ آنریبل ممبر نے کچھ عرصہ قبل ایک خاص کتاب کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی جس کو میں نے دیکھا میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب میں بعض قابل اعتراض حصے تھے میں متعلقہ حکام کو لکھ رہا ہوں کہ وہ اس کی طرف توجہ دیں۔ اگر آنریبل ممبر نے اس قسم کی دوسری کتابوں کی طرف دھیان دلایا تو میں یقیناً ان کی طرف توجہ دوں گا۔ اور متعلقہ ذمہ داروں سے کہوں گا کہ وہ ان کتابوں میں سے قابل اعتراض حصے نکال دیں

مولانا حفظ الرحمٰن ۔ جیسے کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اس قسم کی بہت سی کتابیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ایسا سب زبانوں میں ہو رہا ہے۔ گجراتی زبان میں ہو رہا ہے، ہندی زبان میں ہو رہا ہے، اُردو زبان میں ہو رہا ہے اور دوسری زبانوں میں ہو رہا ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ پرائمری اور مڈل اسکولوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے وہاں پر خاص طور سے دھیان رکھیں کہ ایسی کتابیں بچوں کو نہ پڑھائیں اس بارے میں دو تجاویز ہیں۔ ایک تو یہ کہ ریاستوں میں ایک اس طرح کی سب کمیٹی ہو جو اس بات کی تحقیقات کرے کہ ایسی کون سی کتابیں ہیں جن میں کسی مذہب کی توہین کی گئی ہے۔ یا جن میں کسی ایک خاص دھرم کے لئے کوئی ایسا پروپیگنڈہ ہو رہا ہے جس کا دوسرے مذاہب پر اثر برا پڑتا ہے۔ دونوں باتوں میں سے اگر کوئی بھی چیز ہو تو ایسی کتابوں کو ٹیکسٹ بک میں سے نکال دیا جائے اور انھیں کورس میں قطعی طور پر شامل نہ کیا جائے۔ دوسرے ٹیکسٹ بک کمیٹی میں ایسے ارکان مستقل طور پر ہونے چاہئیں جو اس بات کی جانچ کریں کہ وہ کتاب جس کو ہم کورس میں شامل کر رہے ہیں وہ دونوں چیزوں سے صاف ہے اور نیشنلزم اور سیکولرازم کے مطابق ہے یا نہیں۔

مسلم یونیورسٹی

یہاں ہاؤس میں مسلم یونیورسٹی کا بھی چرچا ہوا ہے۔ میں بھی اس کے بارے میں کچھ عرض کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ ایک خاص یونیورسٹی کے لئے کس طرح پر یہاں لوگوں نے اسے کریٹی سائز اور کنڈم کیا۔ شروع سے لے کر آخر تک میں نے دیکھا کہ وہ لوگ جن کی زندگی گاندھی جی کے داہنے اور بائیں گذری اور جن لوگوں نے اپنی زندگی ملک کے لئے تج دی، لاکھوں روپیہ برباد اور تباہ کر کے انھوں نے اپنے ملک اور وطن کی آزادی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ بہت ہی معمولی طریقہ سے گویا کوئی بات ہی نہیں ہے، ان کے نام لے لے کر یہاں ان پر نکتہ چینی کی گئی اور ان کے خلاف آواز اٹھائی گئی یہ چیز بہت تکلیف دہ ہے۔ اس طرح اگر یہ چیزیں آتی ہیں تو یقیناً نامناسب ہے۔ اب اگر یہ سمجھا جائے کہ کسی یونیورسٹی کا مالی انتظام یا تعلیمی نظام خراب ہے تو اس کو بہتر بنانے کی کوشش ہونی چاہئے۔ لیکن اس طرح کھلے طور پر نکتہ چینی نہیں ہونی چاہئے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص پروپیگنڈہ ہے جو کسی خاص مصلحت کی بنا پر مسلم یونیورسٹی کو بدنام کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے بارے میں کہا گیا کہ ایک مکان سے جسے مسلم یونیورسٹی نے خریدا ہے غیر قومی سرگرمیوں کا اڈہ بنا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں طلباء اور اساتذہ کے علاوہ کوئی بھی ایجنسی دیکھی نہیں ہے جو جاری ہو۔ یونیورسٹی میں بہتر طور پر پڑھائی کا کام چل رہا ہے۔ وہاں نیشنلزم اور سیکولرازم اتنی قوت سے جڑ پکڑ رہے ہیں کہ اس کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مسٹر پرکاش ویر شاستری۔ کیا یہ صحیح ہے کہ اس مکان میں ایک خاص نقطۂ نظر رکھنے والے طلباء اور اساتذہ جاتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن ۔ یہ جتنا بیان کیا گیا اس کی حقیقت وائس چانسلر نے بھی بیان کر دی ہے یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اس طرح کا جھوٹا اور غلط پروپیگنڈہ ایک خاص مقصد کو لے کر مسلم یونیورسٹی کو بدنام کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ آج مسلم یونیورسٹی میں جو سرگرمیاں ہیں ان کے متعلق میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اینٹی کمیونل اور نیشنل ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں جو سیکولرازم اور نیشنلزم کی سرگرمیاں بڑھ رہی ہیں اس کی کوئی تعریف نہیں کی گئی بلکہ اس کو غلط طور پر کریٹی سائز ہی کیا گیا

دلی میں اردو

چوتھی بات آخری طور پر میں یہ عرض کرنی چاہتا ہوں کہ جہاں تک دلی کا تعلق ہے منسٹر صاحب کو اردو کے بارے میں خاص طور سے توجہ دینی چاہئے لیکن اس بارے میں کسی دوسرے وقت گذارش کروں گا۔

اس وقت میں کتابوں کے بارے میں توجہ دلانا چاہتا ہوں، اور خاص کر کورس کے بارے میں میرے دل پر چوٹ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اسکولوں میں کتابیں منظور کرنے کا ایسا معقول اور مستقل انتظام کرنا چاہئے کہ کوئی شکایت پیدا نہ ہونے پائے ٭

محض لیکچروں اور تقریروں میں عمدہ الفاظ ادا کر دینے سے زبان کا مسئلہ حل نہیں ہوگا!

اُردو ہندی کی رقیب نہیں ہے۔ یہ سمجھنا بھی ٹھیک نہیں کہ اُردو سے ہندی کو نقصان پہونچے گا!

لوک سبھا میں حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب کی مفصل تقریر!

دہلی، یوپی، اور بہار میں اُردو کو علاقائی زبان کی حیثیت دینے کا مطالبہ

دسمبر ۵۵ء میں لوک سبھا میں حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحبؒ نے حد بندی کمیشن کی رپورٹ پر بحث میں حصہ لیتے ہوئے اُردو زبان کے حق میں ایک مدلّل تقریر کی اور اُسے دہلی یوپی اور بہار میں علاقائی زبان کی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا۔ آپ نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ کمیشن نے جس طرح جنوبی ہند میں زبان کے مسئلہ کو اہمیت دی شمالی ہند کے معاملہ میں اس نے اس کو پیش نظر نہیں رکھا۔ حضرت مولانا نے اپنی تقریر میں اس امر کی وضاحت کردی کہ اُردو زبان ہندی کی رقیب نہیں ہے۔ اور نہ ہی اُردو کی ترقی سے ہندی کو نقصان پہونچے گا۔ حضرت مولانا نے اقلیتوں کے تحفظات کو سراہا لیکن محض تحفظات کو ناکافی قرار دیتے ہوئے اقلیتوں کی شکایتوں پر خصوصی طور سے توجہ دینے کی اپیل کی۔ مولانا کی تقریر جو بیس منٹ تک جاری رہی پوری توجہ کے ساتھ سنی گئی۔ اور تالیوں کی گونج میں آپ نے تقریر کو ختم کیا

⁂

محترم چیرمین صاحب۔ کئی روز سے حد بندی کمیشن کی رپورٹ پر بحث ہو رہی ہے۔ جس زمانہ میں کمیشن کی رپورٹ کا چرچا ہوا تھا۔ اس وقت میرا خیال یہ تھا کہ یہ مسئلہ وقت سے کچھ پہلے ہے۔ بہتر ہوتا کہ ابھی ہم اپنے اقتصادی پنج سالہ پروگرام پر توجہ دیتے۔

محترم پنڈت جی نے حوالہ دیا تھا کہ جس طرح ایک بڑی شخصیت سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ۶۰۰ ریاستوں کے مسئلہ کو حل کرکے ہمارے ہندوستان کی یکجہتی پیدا کی ہے اسی طرح ہم لوگوں کو اس مسئلہ کو بھی دیکھنا چاہیئے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بیشک اس عظیم شخصیت نے جس طرح ۶۰۰ ریاستوں کو ختم کرکے ہمارے ہندوستان کی یکجہتی پیدا کی وہ معاملہ آج حد بندی کمیشن کے بارے میں مجھے نظر نہیں آتا۔ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں اور میرا یقین ہوگیا ہے کہ جو کچھ میں نے سوچا تھا وہ ٹھیک تھا۔ اس لئے کہ جو بحث اس وقت تک ہماری لوک سبھا میں آئی اس پر میں نے تو یہ دیکھا کہ بعض دفعہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوک سبھا نہیں ہے بلکہ ایسی جنگی کونسل ہے جس میں ایک اسٹیٹ سے دوسری اسٹیٹ کو یا گورنمنٹ آف انڈیا کو الٹی میٹم دیا جا رہا ہے۔ اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ کاش اس وقت ہماری توجہ اس کے بجائے اقتصادی پروگرام کی طرف ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔ لیکن جب یہ مسئلہ سامنے آگیا ہے تو مجھے بھی چند باتیں کہنی ہیں:

⁂

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ حد بندی کمیشن کی رپورٹ ہمارے حد بندی یا باؤنڈری کمیشن کے پاس سے سامنے آئی ہے لیکن اس نے زبان پر بھی بہت مشکل اور کافی بحث کی ہے اور دکھنی ہندوستان کے اندر لنگویج یا زبان کے مسئلہ پر اسٹیٹ بنانے میں بہت کافی مضبوط اور اہم حصہ لیا ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شمالی ہندوستان میں اس طرح سے اس مسئلہ کو نہیں لیا گیا۔ ابھی کل ہمارے محبوب لیڈر پنڈت جواہر لال نے اُردو کے بارے میں بہت زبردست تقریر فرمائی تھی۔ لیکن میں ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اُردو کے مسئلہ کو صرف لیکچر یا تقریروں کے ذریعہ بیان کر دینے سے حل کیا جا سکتا ہے۔ شری ٹنڈن جی نے بھی جس طرح وضاحت کے ساتھ کل اُردو کے بارے میں فرمایا تھا۔ اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی لیکن یہاں تو اگلے قدم کا سوال ہے جس میں شاید ان کو بھی اختلاف ہوگا۔ میں یہ کہتا ہوں زبانوں کے مسئلہ کے بارے میں ایک اسٹیٹ ایک لنگویج کے اصول پر بہت توجہ دی گئی ہے لیکن یہ کوئی چیز نہیں ہے۔ ہم اس پر چلنا نہیں چاہتے۔ اگر ایک اسٹیٹ میں دو یا تین زبانیں ہیں تو ہم اس کی سرکاری حیثیت کو تسلیم کریں۔ جبکہ ہم نے ہندی کو پورے ہندوستان کی سرکاری زبان تسلیم کرلیا۔ قومی زبان تسلیم کرلیا۔ تو کسی بھی زبان کے بارے میں یہ سمجھنا کہ وہ ہندی کا درجہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ٹھیک نہیں ہے یہ سمجھنا کہ اُردو ہندی کی رقیب ہے۔ اور اگر اُردو کو کوئی علاقہ دیا جائیگا تو اس سے

ہندی کو نقصان پہونچے گا۔ اس پر مجھے اختلاف ہے۔ ہماری چودہ زبانیں ہیں جس طرح بنگلا۔ گجراتی، مراٹھی، تامل، ملیالم وغیرہ کو اسٹیٹ لنگویج کی حیثیت دی جاتی ہے۔ اس طرح کیا وجہ ہے کہ اردو کے مسئلہ میں وہی پوزیشن اختیار نہیں کی گئی۔

میں ادھر توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ محض لیکچروں اور تقریروں میں عمدہ سے عمدہ الفاظ ادا کرنے سے کسی زبان کا مسئلہ سرکاری طور پر حل نہیں ہو سکتا۔ آج ایک مقام اور ایسا علاقہ بتلانا چاہئے جیسے یوپی ہے، بہار ہے، دلی ہے۔

جس طرح دوسری زبانوں کے علاقہ ہیں جن میں کہ وہ زبانیں سرکاری حیثیت پاکر پھیلیں گی اور پھولیں گی اسی طرح سے اردو بھی سرکاری حیثیت پاکر پھلے گی پھولے گی اور صحیح طور پر اپنے قدموں پر کھڑی ہو سکے گی میں سمجھتا ہوں کہ رپورٹ میں اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے آج اس ہاؤس کو اس طرف توجہ دینی چاہئے۔ اس لئے کہ اس کا کوئی علاقہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے۔ تحفظات میں ضرور اس کا ذکر آتا ہے جیسے کہ یہ کوئی اقلیت ہو گئی ہے۔ جیسے ہندوستان کی اور زبانیں ہیں اسی طرح سے اردو بھی ہے۔ یہ ہندو مسلمان کا سوال نہیں، یہ بھارت کی زبان ہے۔ لیکن وہ کسی اسٹیٹ کی زبان نہیں ہے۔ جس طرح اور زبانوں کے پاس ان کے علاقہ ہیں اسی طرح سے اردو کے لئے بھی ایک علاقہ ہونا چاہئے۔

ایک آنریبل ممبر:۔ آپ کون علاقہ چاہتے ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن:۔ میں یوپی کا علاقہ چاہتا ہوں۔ دلی اور یوپی میں اسکو سرکاری ریجنل لنگویج کی حیثیت حاصل ہونی چاہئے۔ دلی صوبہ میں بھی اس کو یہی جگہ ملنی چاہئے۔

جناب کل بات کرتے کرتے ہمارے ٹنڈن جی نے توجہ دلائی تھی کہ اردو زبان تو ضرور ہندوستان کی ہے لیکن ان کو اس سے اختلاف ہے کہ رسم الخط بھی ہندوستان کا ہے۔ میں بہت ادب سے ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اردو رسم الخط ہندوستان کا نہیں ہے وہ عربی سے لیا گیا ہے۔ فارسی سے لیا گیا ہے دونوں ہی رسم الخطوں سے وہ بنا ہے۔ لیکن میں ان کی توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ کسی زبان کے رسم الخط کا دوسری زبان کے رسم الخط سے فائدہ اٹھانا کوئی عیب نہیں۔ سندھی زبان نے دوسری زبانوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن جو رسم الخط آج ہم ہندوستان میں اردو کے لئے استعمال کر رہے ہیں وہ عربی رسم الخط نہیں ہے۔ عربی رسم الخط سے ہم نے فائدہ ضرور اٹھایا ہے۔ لیکن اس سے فرق کر دیا ہے جو عربی کا رسم الخط ہے اس کو نسخ کہتے ہیں اور جو اردو کا رسم الخط ہے اسکو نستعلیق کہتے ہیں۔ اس طرح سے اردو اور عربی رسم الخط میں کافی فرق ہے اردو کو بھی ہندوستان کی ہی چیز سمجھا جاتا ہے اس لئے میں آپ کی اور ہاؤس کی توجہ دلاتا ہوں کہ اردو کا مسئلہ نہایت ضروری ہے۔ اور اس بات کو حق ... اردو کو کیوں کوئی علاقہ نہ دیا جائے۔

جہاں تک دوسرے سوالات کا تعلق ہے ان میں اقلیت کا سو... میں مانتا ہوں کہ اقلیت کو تحفظات دیکر امداد دی جاتی ہے لیکن بعض ... ہوتے ہیں کہ محض حفاظت یا تحفظات سے ہی اقلیت کا کام نہیں چلتا ... مطالبہ پر غور کرنا چاہئے۔ کہ جو چیز مانگی جارہی ہے اور جو چیز ... ہے وہ کیا ہے۔ اور اس کو کیا دقت اور کیا پریشانی ہے۔ اور اگر ... چیز تحفظات سے حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں۔ میں اس مسئلہ کے متعلق کشن گنج کی مثال پیش کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہاں ساڑھے تین ... جن کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کو بنگال کا حصہ نہ بنایا جائے۔ میرے نزدیک ... وجہ ہے کہ جس سے ان کی پریشانی ظاہر ہوتی ہے ۱۹۵۰ء کے فسادات ... بنگال میں جہاں بیچارے مظلوم پناہ گزیں آرہے تھے۔ یہاں کے مسلمان ... کی بناء پر اکھڑ گئے تھے۔ اس وقت کچھ مسلمانوں کے بسانے کا سوال ... نے اس پر توجہ دی اور وعدہ کیا کہ وہ مسلمان جو پاکستان نہیں گئے ... بسائے جائیں گے اور ان کو ضرور مکان دیئے جائیں گے۔ لیکن آج آٹھ ... لیکن پھر بھی ہزاروں مسلمان ایسے موجود ہیں جن کے بارے میں کہ ... ہوڑہ، دیناج پور، جلپائی گوری اور بہت سے ایسے مقامات میں ... ہندوستان کے ہی رہنے والے ہیں وہ یہاں کے ہی باشندے ہیں اور ... گئے اس کے باوجود بھی وہ اپنے گھروں سے محروم ہیں۔ آج تک ... ایک حکم بنگال گورنمنٹ نے نکالا جس میں اس نے کہا کہ جب تک پناہ گزیں ... متبادل طور پر نہیں ہو جائے گا اس وقت تک ان کو مکانات نہیں ... اس چیز کو صحیح نہیں مانتا۔ ہوں ان کو پناہ گزینوں کے ساتھ ملا ... یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان ہی میں رہ رہے ہیں اور پاکستان بھی نہیں ... جو اپنے گھروں سے محروم کر دیئے گئے ہیں یہ بیچارے اپنے گھروں کو ... حیران ہوتے ہیں کہ اپنے ہی گھروں میں ان کو جانے کی اجازت نہیں ... ایسی حالت کو دیکھکر جو باہر کے بسنے والے ہیں وہ بھی حیران ہوں گے ... ہے کہ پھر یہی چیز ان کے سامنے آئے۔ ان پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ... ہے۔ تحفظات سے یہ سوال حل نہیں ہو گا۔

اب میں کچھ دوسرے سوالوں کی طرف آتا ہوں۔ اقلیتوں کی ... شخص ایسی بات کہتا ہے جو ... فرقہ پرستی کی بات ہو تو میں نہیں ... مان لی جائے۔ اس کو بالکل بھی نہیں مانا جانا چاہئے۔ اسکو ...

اور اسکو پیروں تلے روند دینا چاہئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اقلیت والے کوئی بھی بات کہیں اسکو فرقہ پرستی کی بات ہی آپ کہتے جائیں یہ مناسب نہیں ہے ۔ اقلیتوں کو جو دقتیں ہیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے ۔ میں سمجھتا ہوں پنجاب کا مسئلہ ہے وہ بھی ایک اقلیت کا مسئلہ ہے ہماچل کو الگ رکھنا چاہتے ۔ اور پیپسو اور پنجاب کو ایک کر دینا چاہئے ۔ فضل علی صاحب نے رپورٹ دی ہے اور جو کچھ انہوں نے کہا ہے یا تو وہی مان لیا جائے یا آپ دوسری طرح سے اسے حل کریں یہ آپ کی مرضی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اقلیتوں کا جو مسئلہ ہے اسکو اس طرح ٹالا نہیں جانا چاہئے بلکہ ان کو جو ڈیفکلٹیز ہیں ان کو جو دقتیں ہیں جو پریشانیاں ہیں ان کو دور کرنا چاہئے ۔ ان کو ہر طرح سے مطمئن کرنا چاہئے ۔ ان کو مطمئن کرنے کی بات سوچنی چاہئے ۔ اور ایسا راستہ اختیار کرنا چاہئے جس سے کہ ان کے دلوں میں بھروسہ پیدا ہو ۔ ہندوستان کے ایک ٹکڑے کو ادھر سے ادھر کر دینے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ دقت تب ہوتی ہے جب ان کی ہر بات کو فرقہ پرستی کہکر ٹال دیا جاتا ہے ۔

مسٹر جوکھم الوا ۔ کیا میں آنریبل ممبر کو متوجہ کر سکتا ہوں کہ اس ایوان میں بحث کا معیار بہت اعلیٰ رہا ہے ۔ اور خواہ آنریبل ممبر کا کتنا ہی احترام میرے دل میں ہو کیا میں ان سے درخواست کر سکتا ہوں کہ وہ کسی اور قسم کی باتیں درمیان میں نہ لائیں ۔

مسٹر چیرمین (پنڈت ٹھاکر داس بھارگو) ۔ میں سمجھتا ہوں ہر آنریبل ممبر اس بات کو ذہن میں رکھتا ہے ۔ جب کوئی ممبر تقریر کر رہا ہو اس سے یہ کہنا کہ وہ بحث کا معیار بلند رکھے اس پر بہتان لگانا ہے یہ مناسب بات نہیں ہے ۔

ایک آنریبل ممبر ۔ ممبر موصوف نے جو کچھ کہا ہے اسے وہ واپس لیں ۔

میں گذارش کر رہا تھا کہ درحقیقت ان مسئلوں کو اس طرح سے دیکھنا چاہئے اور اس طرح سے ان پر نظر رکھنی چاہتے جس سے کہ اقلیتوں کو تسلی ہو کہ ان کی باتوں کی طرف بھی دھیان دیا جاتا ہے ۔ اور ان میں بھروسہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

(تلنگانہ کا مسئلہ) تلنگانہ کا مسئلہ بھی اس قسم کا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ وشال آندھرا بنانا ٹھیک بات ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ تلنگانہ کو موقعہ ملنا چاہئے کہ وہ بھی ایک اسٹیٹ رہ سکے ۔ اور ایک اسٹیٹ کی طرح سے ہی وہ چلے اور اس کے بعد آپ آہستہ آہستہ وشال آندھرا میں اس کو شامل کر سکتے ہیں ابھی تک اسکو ایک اسٹیٹ کی شکل میں ہی رہنے دیا جانا چاہئے ۔ اور بعد میں وشال آندھرا میں شامل کریں ۔

(یوپی کا مسئلہ) یوپی کا جو مسئلہ ہے اس کے بارے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے خوشی ہے کہ آج یوپی ممبران اس بات کو سوچتے ہیں کہ جو بات سارے ہندوستان کے فائدے میں ہو وہی کی جائے ۔ بہت سے لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ اس کا پارٹیشن ہو ۔ میں ان میں سے ہوں جو یہ بات چاہتے ہیں کہ پارٹیشن نہ ہو ۔ ہم اس کو ایک اور مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں ۔ اگر یوپی کے پارٹیشن سے سارے ہندوستان کو فائدہ پہنچتا ہے تو اس کے لئے کوئی بھی قربانی ہیں کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے ۔ لیکن اگر ہندوستان کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے اور صرف اس لئے کہ چند ممبر یہ چاہتے ہیں کہ یوپی کا پارٹیشن ہو ۔ ہمکو یہ نہیں کرنا چاہئے میں اسکو کوئی معقول بات نہیں مانتا ۔

دہلی کا سوال ۔ جہاں تک دہلی کا سوال ہے مجھے اس میں بہت دلچسپی ہے ۔ کانسٹی ٹیوشنل اسمبلی میں جب لالہ دیش بندھو گپتا جی نے دہلی اسٹیٹ کے بارے میں آواز اٹھائی تھی اس وقت میں نے ان کی تائید کی تھی میں نے ان کو متنبہ کیا تھا جیسا کہ دوسرے آنریبل ممبر نے کہا ۱۹۱۸ء میں حکیم اجمل صاحب نے انٹرنیشنل کانگریس میں سب سے پہلے اس مسئلہ کو اٹھایا تھا ۔ آج محض اس لئے کہ کچھ کانگریسی آپس میں لڑ رہے ہیں اس واسطے آپ دلی کو الگ اسٹیٹ نہیں رکھ سکتے ہیں اسکو مناسب خیال نہیں کرتا یہ چیز معقول نہیں ہے ۔ اس طرح سے دلی کی حکومت کو جو افسران کے ہاتھ میں اور حکام کے ہاتھ میں سونپ دینا ٹھیک ہوگا ۔ ۲۰ لاکھ لوگوں کو ان افسروں کے رحم پر چھوڑ دینا اچھی بات نہیں ہے ۔ ان کو ترقی کرنے کا پورا موقعہ ملنا چاہئے ۔ میں چاہتا ہوں کہ دلی کو ضرور ایک مستقل اسٹیٹ کا درجہ دے دیا جائے اسکو ایک کارپوریشن کا درجہ دے کر ٹال نہیں دینا چاہئے یہ اسٹیٹ جس جمہوری نظام کے قابل ہے وہی نظام اسکو ملنا چاہئے

مدھیہ پردیش کا جو صوبہ بنا ہے اس کا سواگت کرتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ یہ پردیش اسی طرح سے بنایا جانا چاہئے تھا ۔ جہاں تک گجرات اور مہاراشٹر کا تعلق ہے جس کے بارے میں یہاں پر بہت زبردست تقریریں ہوئی ہیں ۔ ان کو سن کر تو میں ڈر سا گیا تھا اور سوچنے لگا تھا کہ خدا جانے اب کیا ہوگا ۔ یہاں پر چیلنج دیئے گئے اور الٹی میٹم دیئے گئے میں سمجھتا ہوں کہ جو حل کانگریس ورکنگ کمیٹی نے تجویز کیا ہے اس کو مان لینا چاہئے ۔ وہ فیصلہ بالکل صحیح ہے بمبئی اسٹیٹ کو الگ ہی رکھنا چاہئے اسے الگ رہ کر ہی ترقی کرنے کا موقعہ ملنا چاہئے ۔

یہ میرا خیال ہے جو میں آپ کے سامنے رکھنا چاہتا تھا ۔ اور میں چاہتا ہوں کہ ہاؤس ان پر غور کرے ۔ اور صحیح فیصلہ کرے ۔ میں ایک بار پھر کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے اسکو سرکاری علاقائی زبان کی حیثیت دی جائے جہاں تک اقلیتوں کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں کہ تحفظات دے دینے سے کام نہیں چلے گا ۔ اس طرح سے ان کے مسئلے حل نہیں ہو سکتے ان کو پوری طرح سے بھی مطمئن کرنا چاہئے ان چند لفظوں کے ساتھ میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ جو خیالات میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں ان پر ہاؤس غور کرے گا ۔ اتنا کہہ کر میں آپکا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔"

فرقہ وارانہ فساد پستی ذہن و کردار کا شرمناک مظاہرہ

آزادی کے بارہ سال کے بعد بھی اگر فرقہ پرستی یوں ہی جاری رہی تو ہم کبھی انسانیت کے کنبہ میں عزت کی جگہ نہ پاسکیں گے

اپریل ۱۹۵۹ء کے ہنگاموں کے بعد مجاہد ملت کا بیان

(اقتباس)

مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال میں پچھلے ہفتہ جو افسوسناک حوادث پیش آئے ان کو سرسری یا اتفاقی واقعہ کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ چند ہی روز پہلے مبارک پور اور بعض دوسرے مقامات میں فرقہ پرستی اور لاقانونیت کے کھیل کھیلے جاچکے تھے۔ ان سے متصل ہی بھوپال بھی فتنہ و فساد کا اکھاڑہ بن گیا اور وہاں بھی وہ سب کچھ ہوا جس کا اعادہ و بیان نہایت تکلیف دہ اور شرمناک ہے

اخبارات میں کچھ خبریں دیکھنے کے بعد مجھے اس کا موقع بھی ملا کہ ۴ اپریل کو خود بھوپال پہنچ کر وہاں کے عوام و خواص اور مختلف حلقوں سے پیش آمدہ واقعات کی تحقیق کی اور ان کے پس منظر میں ان اسباب و محرکات کا بھی کچھ ادراک کر لیا جنھوں نے کسی سوچے سمجھے مقصد کی خاطر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائی اور بے گناہ عوام کی زندگی اجیرن کردی

مدھیہ پردیش میں سیاسی اقتدار کے لئے مختلف گروپوں کی باہم کشمکش کسی وقت بھی ایسے حادثات کو جنم دے سکتی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ بھوپال میں تہوار سبھا کے گزشتہ انتخابات سے فرقہ پرست عناصر کی بے اطمینانی اور بیزاری بھی ایک بڑا سبب تھی کہ بھوپال کو یہ روز سیاہ نصیب ہوا۔ اسباب و عوامل کے سلسلہ کی تیسری کڑی افسوس کہ خود لا اینڈ آرڈر کے ذمہ دار یا حکومت کی مشنری بھی ہے جس کے پرزوں پر ابھی تک احساس و فرض منصب کا نکھار پوری طرح روشن نہیں ہوسکا ہے۔ یا جن میں فرقہ واریت کا پٹرول ابھی تک خشک نہیں ہوا ہے کہ ہر آنچ کے ساتھ وہ خود بھی تیزی کے ساتھ بھڑکنے لگتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ پیچ کا معاملہ بھی آج کی دنیا میں اہمیت رکھتا ہے۔ حکومت کے لئے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ اس پوائنٹ کو برملا تسلیم کرے۔ لیکن بھوپال کے در و دیوار کی خاموش گواہی کو جھٹلانا بھی دشوار ہے۔ افسوس کہ واقعات کی ترتیب اور ہنگاموں کی نوعیت صاف بتاتی ہے کہ مقامی حکام اور پولیس اسٹاف کی یک طرفہ دلچسپیاں ہنگاموں میں برابر شریک رہی ہیں۔

جس ملک میں اقلیت و اکثریت کا چولی دامن کا ساتھ ہو وہاں حکومت کی مشنری فرقہ واریت کے زہریلے جراثیم سے پاک نہ ہو تو امن و انصاف کا نظام آخر کب تک قائم اور محفوظ رہ سکے گا۔

پس اخباری بیان میں واقعات کی تفصیل پیش کرکے کوئی مفید مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے تفصیلات تک جائے بغیر میں صرف اسی پر اکتفا کروں گا کہ بھوپال میں جو کچھ ہوا وہ بہت اندوہناک اور مدھیہ پردیش کی حکومت کے لئے انتہائی شرم و ندامت کا ایک داغ ہے۔ ان ہنگاموں میں اقلیتی فرقہ کو جس طرح برباد اور مرعوب کیا گیا وہ ہماری اخلاقی گراوٹ اور دماغی افلاس و پستی کا ایک افسوسناک مظاہرہ تھا جس سے اس عظیم ملک کی نیک نامی اور وقار کو صدمہ پہنچا۔ ہم سب ہی کو اپنی اپنی جگہ سوچنا چاہئے کہ آج آزادی کے بارھویں سال میں بھی اگر ہمارے اخلاق و کردار کا یہی ریکارڈ رہا اور فرقہ پرستی کا بھوت اب بھی ہمارے سر سے دور نہ ہوا تو ہمارے مخلص رہنماؤں کی وہ تمام کوششیں جو وہ اس عظیم دیش کو خوش حال اور دنیا میں سربلند و نیک نام بنانے کے لئے مسلسل انجام دے رہے ہیں رائیگاں رہیں گی، اور انسانیت کے کنبہ میں ہم کبھی بھی کوئی عزت کی جگہ نہ پاسکیں گے

میں نے دہلی واپس پہنچ کر بعض اخبارات میں دیکھا کہ بھوپال کے مالی نقصانات کا اندازہ ایک ارب یا ایک کروڑ روپے تک ہے۔ یقیناً یہ بہت ہی مبالغہ اور واقعہ کے خلاف ہے جو صحیح واقعات پر برا اثر ڈال سکتا ہے۔ مالی نقصان کتنا بھی ہو وہ اس درجہ تک نہیں پہنچ سکتا اور اس پر بھوپال کے مسلمانوں کو اپنے مالی نقصانات اور بربادیوں کا اتنا احساس نہیں ہے جتنا انھوں نے مقامی پولیس کی لاقانونیت اور جابرانہ تشدد و توہین کی چوٹ کو محسوس کیا ہے، اس لئے بھی کہ یہ رمضان المبارک کے ایام تھے اور پولیس کی تمام زیادتیوں کا شکار بھوکے پیاسے روزہ دار ہوتے۔ اس بیان کو ختم کرتے ہوئے ایک جملہ اُن ہتھیاروں کے متعلق بھی کہوں گا جو مسلمانوں کے قبضہ سے برآمد ہوئے اور سرکاری اعلانات کے تحت پریس میں ان کا ڈھنڈورا پیٹا گیا۔ یہ کچھ دستور سا ہوگیا ہے کہ ہر ایسے موقع پر مسلمانوں کو جرم و قصور کے گھیرے میں کھینچنے کے لئے ان کے قبضہ سے ہتھیار برآمد کرلئے جاتے ہیں۔ بھوپال میں یہی ہوا۔ لیکن آپ حیران نہ ہوں یہ سن کر کہ اس انبوہ میں یہ ہتھیار چاقوؤں اور گھریلو استعمال کی چھریوں سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ اسی قسم کے ہتھیار ۱۹۴۷ء میں نئی دہلی کے سینٹرل سکریٹریٹ میں ایک صاحب نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو دکھائے تھے۔ بھوپال میں یوں بھی رام پوری چاقوؤں کا عام رواج ہے۔ ان کا منشا کسی کی جان لینا اور خون کی ندیاں بہانا نہیں ہوتا۔ پھر بھی ایسے موقعوں پر اسلحہ یا ہتھیار کے نام سے پروپیگنڈہ کرنا اس پست ذہنیت کی طرف غمازی کرتا ہے جو یقیناً فرقہ پرستی اور ایسے ہنگاموں کی پرورش کرتی ہے اور یہی دراصل ہمارے ملک کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔

حوادث جبلپور و ساگر کے بعد ہند پارلیمنٹ میں
مجاہد ملّت کی پہلی تقریر

(۵ رمضان ۱۳۸۰ھ - ۲۱ فروری ۱۹۶۱ء)

پاکستان کا نام لے کر مسلم اقلیت کو دبایا نہیں جا سکتا۔

"میں کہتا ہوں کہ جو کچھ آج میں یہاں کہہ رہا ہوں وہی وہاں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس (اجین) میں کہا گیا، میں اس باڈی کا ذمہ دار ہوں، میں ان تجویزوں اور تقریروں کے لئے ذمہ دار ہوں ان میں کوئی بات نیشنلٹی کے خلاف یا سکولرزم کے خلاف نہیں کہی گئی، وہاں یہ شکایت کی گئی کہ مسلم اقلیت کو دبایا جا رہا ہے، فرقہ پرستی ابھرتی آرہی ہے جو کچھ کہا گیا ٹھیک کہا گیا ہے۔ اگر آج ان باتوں کے حق میں سیٹھ گووند داس جی یا دوسرے ہندو بھائی نہیں بولتے تو پھر مجبور ہو کر حفظ الرحمٰن کو بولنا پڑتا ہے۔ اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔

فرقہ پرستی ابھر رہی ہے اور حکومت بے بس ہے۔

درسی کتابوں میں عقائد کی توہین برداشت نہیں کی جا سکتی۔"

جناب ڈپٹی اسپیکر صاحب!

پریسیڈنٹ کے ایڈریس پر کل سے بات چیت ہو رہی ہے، ملی جلی چند باتیں ہیں جن کو اپنے اپنے خیال کے مطابق ہر ایک پیش کر رہا ہے۔

چین اور ہندوستان کی سرحد

جہاں تک چین کا معاملہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے متعلق مختلف طریقوں سے ہاؤس میں دوسرے وقت میں بھی بحث ہوئی ہے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس میں دو رایوں کی گنجائش نہیں ہے یہ چین جس کے متعلق ہندوستان نے ہر موقف پر ٹھہراؤ اور ہر موقع پر اچھے طریقوں سے اس کا ساتھ دیا۔ اس چین نے چین کی حکومت نے موجودہ چین کی کمیونسٹ حکومت نے ہندوستان کے ساتھ بہت بے وفائی کی اور انتہائی شرافت سے گری ہوئی زندگی کا ثبوت دیا۔

جہاں تک بارڈر کا مسئلہ ہے ہماری حد ایک لمبی لکیر ہے میکماہن لائن اور اس طرف کشمیر کی وہ حدود ہیں جو کہ اس ملک کی سرحد تک ہیں چین کی طرف سے بار بار ان کے بارے میں چھیڑ کی جاتی ہے۔ ایسے قدم اٹھائے جاتے ہیں جن سے ہندوستان کے مقصد اور کاز کو نقصان پہونچے ان حدود کو مغلوں کے زمانہ سے آج تک بغیر کسی اختلاف کے ہندوستان کی حدود مانا گیا ہے آج ان کے بارے میں بحث کرنا اور ہندوستان کی زمین پر ناجائز قبضہ کی کوشش کرنا اور جس حصہ پر اس نے ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے اس کو اپنے ملک کا حصہ بنانا یہ ایسی چیزیں ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ دنیا میں، دنیا کی زندگی میں جب اخلاق نہ ہو، روحانیت نہ ہو، صرف مادیت پیش نظر ہو تو جتنا بھی کچھ ہو وہ کم ہے۔

حکومت ہند کی پالیسی

ایسے موقع پر اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یا تو ہم جنگ کریں یا دوسرے طریقوں سے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ آج ہمارے پرائم منسٹر اور ہر ایک عقلمند آدمی یہ سوچتا ہے کہ آج کے زمانہ میں یہ جنگ ساری دنیا کی جنگ ہو سکتی ہے اور بڑی بڑی تہذیبیں برباد ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے طریقے سے اس کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گورنمنٹ کی اس پالیسی کو ہم سپورٹ کرتے ہیں اور پورے طریقہ سے اتفاق رائے کرتے ہیں

کہ ایک طرف وہ مضبوط ہے کہ ایک انچ زمین بھی کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہیں جانے دے گی اور دوسری طرف اس نے ارادہ کر رکھا ہے کہ اگر کسی ملک کی طرف سے کوئی جارحانہ کارروائیاں ہوئیں تو ان کا سامنا کیا جائیگا اور جو کارروائیاں اس سلسلہ میں ہو چکی ہیں ان کو حل کرنے کی کوشش کی

جائے گی، اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

کانگو کا مسئلہ

باہر کے معاملات کے سلسلہ میں کانگو پر بحث ہوئی ہے۔ بیشک وہ ایک مظلوم قوم ہے اور مظلوموں کا ساتھ دینا ہمارا شیوہ۔ ہمارا شعار اور ہماری عادت ہے۔ ہم برابر ایسا کرتے رہے ہیں اور آج بھی کانگو کے معاملہ میں ہم اسی طرف ہیں جہاں پبلک کا رجحان ہے وہاں پر بلجیم کی طرف سے کالونیلزم کا جو غلط، بھیانک اور گھنونا مظاہرہ کیا جا رہا ہے وہ ناقابل برداشت ہے وہاں پر ایک فارین (بیرونی) طاقت نے ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے کو تباہ کروانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلہ میں مسٹر لوممبا اور ان کے کچھ ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔

اپنے ملک کا معاملہ مدھیہ پردیش کے واقعات

ان باتوں کے متعلق فائیو ایر پلان کے متعلق اور پنچایت راج کے متعلق کہنے کے لئے بہت سے موقع ہیں، کہا جاتا رہا ہے اور کہا جاتا رہے گا۔ لیکن ایک بحث خود بخود ہاؤس کے سامنے آگئی ہے اور آنی چاہئے تھی میں بھی اس پر کچھ کہنا چاہتا ہوں، مجھے اس بات پر مایوسی ہوئی کہ ۳ تاریخ سے لے کر ۹ تاریخ تک جبل پور، کٹنی، ساگر، دموہ، نرسنگھ پور، سرد یا اور کتنے ہی مقامات پر فساد ہوئے، اور بربادی ہوئی آگیں لگیں، مکان برباد ہوئے اور دوکانیں جلائی گئیں اور جان و مال کا نقصان ہوا۔ لیکن ۱۴ تاریخ کو پریذیڈنٹ صاحب کا جو ایڈریس آتا ہے اس میں ایک لائن بھی اس سلسلہ میں ہمارے سامنے نہیں آئی ہے اس میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا کہ اس بارے میں کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے گا جس سے اس قسم کے واقعات پھر نہ ہوں۔ کیوں کہ کسی سیکولر اسٹیٹ کے لئے اس سے زیادہ ندامت اور شرمندگی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ وہاں سامپردائکتا (فرقہ پرستی) اس طرح منہ کھولے کھڑی رہے اور شروع سے آخر تک اس کا سلسلہ کہیں نہ کہیں جاری رہے اور ہم اس کو روک نہ سکیں۔

انفرادی واقعہ کو قومی واقعہ بنانے کا ظلم

جبل پور میں ایک واقعہ ہوا ایک انڈیوجول واقعہ۔ ایک انتہائی شرمناک واقعہ ہوا جس کی سزا ذمہ دار شخص کو ملنی چاہیئے۔ لیکن ایکشن اور ری ایکشن کا یہ مطلب کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک انڈیوجول نے ایک بات کی ہو تو پوری کمیونٹی کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ یہ طریقہ کار کسی طرح سے ملک کے مفاد میں نہیں ہے بلکہ وہ انتہائی نقصان دہ ہے۔ اس بنا پر یہ بات بہت قابل توجہ ہے کہ پچھلے دنوں میں اسی مدھیہ پردیش میں بھوپال میں جو فساد ہوا تھا وہاں پر کسی کو سزا نہیں ملی کسی مجرم کو اس کی خطا پر پکڑا گیا۔ کسی غنڈے اور شرارت پسند کو سزا نہیں دی گئی۔ ان حالات میں مختلف مقامات میں فسادات ہوئے ہیں۔ اور وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم کھلے دل سے من مانی کر سکتے ہیں جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں حکومت ہمارے مقابلہ میں بے بس ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ اس کے سوا دوسری کوئی بات نہیں ہے۔

ہندو مسلم فساد نہیں ہے غنڈوں کی اسکیم ہے

میں ایمانداری سے کہہ سکتا ہوں کہ ان فسادات کو ہندو مسلم فسادات کہنا ہندوؤں اور مسلمانوں کی توہین کرنا ہے۔ یہ فساد ہندو اور مسلمان نہیں کرتے ہیں۔ میں آپ سے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کی پبلک جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں۔ آج بھی کانوں پر ہاتھ دھر رہی ہے کہ یہ بلا، یہ مصیبت، یہ عذاب کہاں سے نازل ہوا۔ یہ ہندو مسلم فساد نہیں ہے اور ان کو فرقہ وارانہ فساد کہنا بھی غلط ہے۔ غنڈوں اور شرارت پسندوں نے ایک اسکیم بنائی ہے اور اس اسکیم کے ماتحت وہ جب چاہے تب فساد کرتے ہیں۔ درحقیقت اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جب انکوائری ہوگی تو اس میں یہ بات صاف ہو جائے گی۔

ایڈمنسٹریشن کی مجرمانہ چشم پوشی

ایڈمنسٹریشن نے جان بوجھ کر اس میں چشم پوشی کی یا ماتحت پولیس کے افراد نے ساتھ دے کر بربادی کرانے کی کوشش کی۔ اس وقت حکام نے لوکل حکام نے ایڈمنسٹریشن نے اپنی کمزوری بھی دکھائی اور اس سازش میں ان کا حصہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ بقول سیٹھ جی کے (سیٹھ گوبند داس) ۳/۴ تاریخ کو یہ واقعہ پیش آیا تھا اور اس کی روک تھام ہو سکتی تھی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اسپیشل پولیس کے جو دستے بلائے گئے تھے وہ کیوں واپس چلے گئے تھے جس کے نتیجہ میں ۷ تاریخ اور ۸ تاریخ کی درمیانی رات کو اس قدر ہولناک بربادی ہوئی۔ جان بوجھ کر ایک سائڈ کی اس طریقے سے بربادی کرائی جائے یہ کسی طریقے سے بھی ہندوستان کے لئے زیبا نہیں ہے۔ ہم پاکستان اور ایوب کے خلاف اعتراض کریں وہ ہمارا حق ہے کوئی ہمارے معاملہ میں دخل نہ دے۔ ہم میں اتنی طاقت ہے کہ ہم اپنے ہندوستان میں اپنے معاملات کو حل کر سکتے ہیں۔ سکھوں نے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں جان کی بازی لگا کر، ساتھ ساتھ شریک ہو کر ملک کو آزاد کرایا ہے جنھوں

نے "دو نیشن تھیوری" کو ماننے کے لئے جان کی بازی لگائی ہے۔ اپنوں سے گالیاں کھائی ہیں۔ جیلیں بھگتی ہیں۔ چاقو کھائے ہیں۔ ان کو آج ان باتوں سے کوئی ڈر نہیں ہو سکتا کہ جب بھی کوئی ایسی فساد کی من مانی بات کی جائے۔ مسلم اقلیت کی تکلیف کی بات آئے تو اخباروں یا تقریروں میں فوراً پاکستان کے حوالے دیدیئے جائیں۔ پاکستان ریڈیو کے حوالے دیئے جائیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس کا پاکستان سے جوڑ تھا۔ اس کا فلاں چیز سے جوڑ تھا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس طریقہ سے حقیقت کو دبایا نہیں جا سکتا اور اگر اس طریقہ سے حقیقت کو دبانے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے ملک کو کوئی لابھ اور فائدہ نہیں ہو سکتا بلکہ ملک کو انتہائی نقصان ہو سکتا ہے۔

یک طرفہ بربادی کیوں

اس حالت میں ہمیں اس بات کا کیا خوف ہے کہ کوئی کہتا ہے اور پاکستان کے ساتھ جوڑنے کا تیکنک کیوں اپنایا جاتا ہے ہم اس کے خلاف ضرور آواز اٹھائیں گے۔ کیا ہر جگہ ظلم اور بربادی ہوتی رہے گی اور اس کے بارے میں مسلمان اقلیت کسی بات کو کہے گی تو یہ کہہ کر اس کا منہ بند کر دیا جائے گا کہ پاکستان سے جوڑ ہے۔ پاکستان ریڈیو سے جوڑ ہے۔ اس طریقہ سے حقیقت کو دبایا نہیں جا سکتا ہے۔ یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ اس طریقہ سے ایک اقلیت کو دبانے کی کوشش کی جائے۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ جبل پور میں ایک سانحہ کی اس طرح بربادی کیوں ہوئی۔ جبل پور میں دو جانب سے کوئی بات ہوئی ہو مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا پھر یہ بھی بتایا جائے کہ کس طرح ۹ تاریخ کو ساگر۔ کٹنی۔ دموہ۔ نرسنگھ پور۔ سروپا اور تمام دیگر مقامات پر ۱۲ سے ۴ بجے تک سازش سے سینکڑوں مکان جلا کر خاک کر دیئے گئے۔ کیا پولیس اور ایڈمنسٹریشن کے موجود ہوتے ہوئے کوئی اس طریقہ سے بربادی کر سکتا ہے۔ اطمینان کے ساتھ پٹرول چھڑکا گیا۔ اطمینان کے ساتھ آگ لگائی گئی۔ بڑی بڑی قلعہ نما عمارتیں خاک سیاہ کر دی گئیں۔

اقتصادی مار

ایک ایک انسان کا دس دس بارہ بارہ لاکھ کا نقصان ہوا۔ کالے خاں محمد حنیف کی کوئی معمولی فرم نہیں تھی دس بارہ لاکھ کا اس کا نقصان ہو گیا اس کی بیڑی کی تجارت تھی وہ مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس کو اقتصادی مار مار کر برباد کر دیا گیا۔ فیروز آباد میں چوڑیوں کی تجارت تھی۔ وہاں مسلمانوں کی صنعت و حرفت کو تباہ کیا گیا۔ کیا کچھ فرقہ پرست عناصر نے یہ طے کر لیا ہے کہ اس طریقہ سے مسلمانوں کو جو موجودہ اکانومکس اور اقتصادیات میں خود بدحال ہیں اسس ملک میں بالکل تباہ کر کے بھکاری اور فقیر بنا کر چھوڑ دیں اور یہ حکومت بے بس ہو۔ بے چارہ ہو اور کچھ نہ کر سکے۔ سب کچھ ہو جائے تو پھر اس کی انکوائری ہوتی پھرے اور اس کے بعد یہ کرو۔ وہ کرو۔ آخر اتنا بڑا واقعہ ہو کیسے گیا۔ تین ضلعوں میں بارہ جگہ کیسے واقعات کیسے ہو گئے۔ حکومت کو اس پر غور کرنا چاہیئے۔

دلّی کا واقعہ

مجھے اس کا احساس ہو رہا ہے کہ ان معاملات میں کب تک تسلسل جاری رہے گا۔ کیا پورے ہندوستان کو اس میں لپیٹ دیا جائے گا۔ ابھی دو تین دن پہلے دہلی میں بھی یہی تیکنک چلی تھی۔ لیکن وہاں کے ہندو اور مسلمان۔ ہم لوگ جو وہاں رہتے ہیں ابھی رات کو وہاں پہنچ کر تین بجے تک رہے اور ہندو لیڈروں کے ساتھ جو وہاں موجود تھے اس بات کی کوشش کی کہ اس کو کسی طریقے سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جن کے پاس طاقت۔ شکتی اور مادی پاور نہیں ہے۔ جب وہ اس طریقہ سے اس معاملے کو حل کر سکتے ہیں، تو ایڈمنسٹریشن۔ حکومت کے افراد۔ لوکل اتھارٹیز اگر چاہیں تو کیا امن قائم نہیں ہو سکتا۔

شرارت پسندوں کی حوصلہ افزائی

اگر حکومت بے بس نظر آتی ہے اور شرارت پسند لوگ جو کچھ چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔

آج سب معاملوں میں ان کی مخالفت کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ زور شور کے ساتھ پارلیمنٹ میں یہ تو کہا جاتا ہے کہ فرقہ پرستی کو کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ہو کیا رہا ہے مسلم اقلیت تباہ بھی ہو رہی ہے اور برباد بھی ہو رہی ہے اور ایکشن اور ری ایکشن کے نام پر شرارت پسند لوگ جو چاہتے ہیں کرتے جا رہے ہیں۔ اس طرح کی باتیں ہونے دینا کسی بھی سیکولر اسٹیٹ کے لئے مناسب نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

زندگی کے مختلف پہلو اور مسلم اقلیت کا حال

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ مسلم اقلیت کا ملازمتوں میں کیا حال ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس کی انکوائری کی ہے کہ ان میں اقلیتوں کو کیوں نہیں لیا جا رہا ہے۔ کیا اقلیتوں کے جتنے بھی بچے ہیں۔ مسلمانوں سکھوں اور عیسائیوں کے جتنے بھی بچے ہیں وہ اتنے نالائق ہو گئے ہیں کہ ان کے

لئے کوئی جگہ ہی نہیں ہے ۔ اسٹیٹ گورنمنٹس کے گزٹ چھپے ہوئے ہیں گورنمنٹ آف انڈیا کے گزٹ چھپے ہوئے ہیں بتایا جائے کہ ان پچھلے چودہ برسوں میں اقلیتوں کے کتنے لڑکے نوکریوں میں لئے گئے ہیں ۔ پہلے تو ان کو انٹرویو میں ہی نہیں بلایا جاتا ہے اور اگر بلا بھی لیا جاتا ہے، تو اُن کو جگہ نصیب نہیں ہوتی ہے ۔ وہ تباہ اور برباد ہو رہے ہیں ۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ رزرویشن کا سوال نہیں ہے ۔ لیکن اگر کوئی ایسے حالات میں رزرویشن کی بات کہتا ہے یا ریزرویشن کی بات کو اٹھاتا ہے تو اُسے فرقہ پرست کہا جاتا ہے اور اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ اُس نے ریزرویشن کا لفظ کیوں کہہ دیا ۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ سیکولر اسٹیٹ کے وہ لوگ کیا فرقہ پرست نہیں ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ملازمت میں نہ لیا جائے اور ان کو تباہ اور برباد کیا جائے ان کی اقتصادیات اور ان کے طریقہ زندگی کو ختم کیا جائے ۔ آج مسلم اقلیت کو بھی یعنی ایک کمیونٹی کو دبانے کے لئے نہ ملازمت میں لیا جاتا ہے نہ تجارت کرنے دیا جاتا ہے روز مرہ کی جو شہری زندگی ہے ۔ جو امن کی زندگی ہے اس تک کو بھی دینے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں ۔ میں پوچھنا چاہتا کہ اس سے زیادہ بھی کوئی فرقہ پرستی دوسری ہو سکتی ہے ۔ اس کا کیا مطلب ہے میں یہ نہیں کہتا کہ اکثریت کے سبھی لوگ بُرے ہیں ۔ اُن میں سے تھوڑے بُرے ہیں ۔ اس میں ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہیں ہے، ہندو مسلمان کا کوئی جھگڑا نہیں ہے ۔ دونوں گلے ملنے کو تیار ہیں ۔ لیکن چند شرارت پسند لوگ اکثریت میں ایسے ہیں جو کہ اقلیتوں کو اس طرح سے دبانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اگر ان کی ہاؤس میں بھی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی کی جائے تو کیا ہوگا ۔ کیسے کام چلے گا ۔ کیسے ہماری اسٹیٹ سیکولر اسٹیٹ بن سکے گی ۔ آخر سیکولر اسٹیٹ کا مطلب کیا ہے صرف سیکولر اسٹیٹ کہہ دینے سے وہ سیکولر اسٹیٹ نہیں بن جاتی ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روز مرہ کی جو زندگی ہے، اس کو بسر کرنے کا سبھی کو حق حاصل ہو ۔ ملازمت سبھی کو پانے کا حق حاصل ہو ۔ تجارت کرنے کا سبھی کو حق حاصل ہو ۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ اقلیتوں کو آج نوکریاں نہیں ملتی ہیں ۔ ملک کی اقتصادیات میں تجارت میں پرمٹ نہیں ملتے ہیں ۔ فائیو ایر پلان میں کوآپریٹیو سوسائٹیز کو جو جگہ ملی ہوئی ہے، اُن کے بارے میں ان کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ۔

نصاب کی کتابیں

اسی طرح ٹیکسٹ بک کی بات ہے ۔ اس کے بارے میں ہم نے ایک شکایت کی تھی اور وزیر تعلیم کو ایک کتاب دکھائی تھی اور انھوں نے ہماری بات کو صحیح تسلیم کیا تھا اور کہا تھا کہ اس قسم کی کتابیں نہیں پڑھائی جائیں ۔ سوال یہ نہیں ہے کہ تیوہاروں کا ان میں کیوں ذکر کیا گیا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ دیوالی ہی کا، دسہرہ ہی کا کیوں ذکر کیا گیا ہے یہ سب ہندوستان کے تیوہار ہیں کسی کو اس میں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا ۔ لیکن جہاں اکثریت کے تیوہار کا ذکر ہے وہاں مسلمانوں کے جو تیوہار ہیں ۔ عید ہے بقرعید ہے شب برات کیا ہے محرم کیا ہے ۔ یا سکھوں کے تیوہار ہیں عیسائیوں کے تیوہار ہیں ان کا بھی اُن میں ذکر ہونا چاہئے تھا ۔ اگر یہ کیا گیا ہوتا تو سیکولر اسٹیٹ کے اصولوں کے عین مطابق ہوتا ۔ لیکن اس کے برخلاف اس طرح کی باتیں ان کتابوں میں لکھی ہوئی ملتی ہیں کہ آؤ بچو بھگوان کرشن کی پوجا کریں ۔ آپ بتائیں کہ مسلمان کے بچے یہ کیسے کریں گے ۔ بھگوان کرشن کی پوجا ہندو کر سکتے ہیں ۔ لیکن مسلمان سکھ ۔ عیسائی کیسے کر سکتے ہیں ۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کی چیزیں پڑھانے کا اقلیتوں کے بچوں کو آپ کو کس نے حق دیا ہے ۔ مسلمان اپنے خداوند قدوس کی عبادت کرتے ہیں ۔ سکھ اپنے طریقے سے کرتے ہیں ۔ عیسائی اپنے طریقے سے ۔ اور ان کو پورا حق حاصل ہے ۔ آپ کو کس نے حق دیا ہے کہ آپ دوسرے مذہبوں کی توہین کریں ۔ خدا اور رسول کی توہین کریں اور یہ پرچار کریں کہ وہ سب اس طرح کی چیزوں کو پڑھیں ۔ آپ کو نہیں چاہئے تھا کہ آپ کتابوں میں اس طرح کے مضامین لکھواتے اور اس طرح کتابوں کو ٹیکسٹ بکس میں جگہ دیتے مگر ٹیکسٹ بک کمیٹی نے یہ ارادہ کیا اور اس نے اس طرح کی کتابوں کو چُنا ہمیں معلوم ہے کہ محض بعض رشتہ داروں سے بعض جاننے والوں سے اس طرح کی چیزیں لکھوا دیں جو اگرچہ تعصب کی بنا پر نہیں لکھی گئیں ۔ تنگ نظری کی بنا پر نہیں لکھی گئی ہوں، بلکہ ناواقفیت کی بنا پر لکھی گئی ہیں ۔ میں نے ایک لکھنے والے سے اس کے بارے میں پوچھا اس نے بتایا کہ میں اسلام کے بارے میں جانتا نہیں تھا اس لئے ایسا ہی لکھ دیا ہے ۔ چونکہ ٹیکسٹ بک کمیٹی میں کسی کا کوئی رشتہ دار آ گیا تو اُس کی سفارش سے یہ کتاب ٹیکسٹ بک میں آ گئی ایسی کتابیں نہیں آنی چاہئیں اور اس طرح کی چیزوں کو اس میں جگہ نہیں ملنی چاہئیے ۔ اس طرح کی چیزوں کے خلاف ہم بولیں گے سیکولر اسٹیٹ کے اندر اس قسم کی کتابیں، خاص طور پر بیسک ایجوکیشن کے اندر اور پرائمری تعلیم کے اندر ہرگز ہرگز نہیں لگنی چاہئیں ۔ نہیں پڑھائی جانی چاہئیں ۔

جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس اجین

سیٹھ جی نے جمعیۃ علماء کے بارے میں کہا کہ وہ بہترین باڈی ہے اور اس نے ہندوستان کی آزادی میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ لیکن اجین میں ایسی تقریریں ہوئی ہیں جن کو پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے میں

کہتا ہوں کہ جو کچھ میں آج یہاں کہہ رہا ہوں، وہی سب کچھ وہاں کہا گیا ہے۔ میں اس پارٹی کے لئے ذمہ دار ہوں۔ میں اس کی تجویزوں اور اس کی تقریروں کے لئے ذمہ دار ہوں۔ ان میں کوئی بات نیشنلٹی کے خلاف نہیں کہی گئی ہے وہاں پر یہ شکایت کی گئی ہے کہ مسلم اقلیت کو دبایا جا رہا ہے۔ فرقہ پرستی ابھرتی جا رہی ہے اور حکومت بے بس ہوتی جا رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی باتیں کہنے میں کون سی اعتراض کی بات ہو سکتی ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے ٹھیک کہا گیا ہے۔ ان باتوں کے لئے اقلیت کے حق میں اگر آج سیٹھ جی نہیں بولتے ہیں یا رگھوناتھ سنگھ جی نہیں بولتے ہیں یا دوسرے ہندوستانی نہیں بولتے ہیں تو پھر مجبور ہو کر حفظ الرحمٰن کو بولنا پڑتا ہے تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اکثریت خود ان چیزوں کو کہتی۔ لیکن اگر وہ نہیں کہتی ہے اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ اقلیتیں تکلیف میں ہیں۔ ان کی یہ مجبوریاں ہیں۔ وہ بے بس ہیں تو پھر اس پر کیوں اعتراض ہوتا ہے۔ بہرحال اس طرح کی چیزوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا ہے۔

انکوائری کا مطالبہ

بیشک اس کی ضرورت ہے کہ انکوائری ہو اور ہائی لیول انکوائری ہو۔ اگر ایڈمنسٹریشن میں کچھ لوگ اس کے لئے ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے کوتاہی کی ہے تو ان کو سزا ملنی چاہیئے۔ آج مدھیہ پردیش کی سرکار نیلیور ہوئی ہے۔ بھوپال سے لے کر آج تک کے جو واقعات ہوئے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا چاہیئے کہ اسے کوئی حق حاصل نہیں ہے حکومت کرنے کا۔ اس طریقہ سے تباہ کر کے۔ کرش کر کے۔ برباد کر کے ہمیں یہاں رکھا جائے گا تو یقینی طور پر اس کے نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔ میں اسپیکر صاحب اور ڈپٹی اسپیکر صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ کوئی قانونی پوزیشن ایسی لائیں جس سے آسام اور بنگال کے معاملات پر لسانی فسادات کی بنا پر جب یہاں بحث ہو سکتی ہے۔ پارلیمنٹری ڈیلی گیشن وہاں جا سکتا ہے، ویسے ہی مدھیہ پردیش کے فسادات کے بارے میں بھی بحث ہو۔ پی ایس پی نے جمعیۃ علماء نے۔ کمیونسٹ پارٹی نے۔ کانگریس کے افراد نے سبھی نے مانا ہے کہ بہت بڑی تباہی آئی ہے تین ضلعوں کے مختلف حصوں میں۔ اس پر بحث ہونی چاہیئے اور کھل کر بحث ہونی چاہیئے اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور اگر بحث ہو تو صفائی کے ساتھ سارے معاملات سامنے آئیں گے۔

پاکستان کا حوالہ بے معنی

جو تجویز بھگت درشن جی نے پیش کی ہے اس کی تو میں تائید کرتا ہوں، لیکن جن معاملات کا میں نے ذکر کیا ہے اُن کے بارے میں پھر سے کہتا ہوں کہ پاکستان کا حوالہ دے کر آپ بچ نہیں سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر کہ پاکستان کے ساتھ ان کا تعلق ہے، کام چل نہیں سکتا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ ناگپور ٹائمس میں یہ لکھا ہے۔ مگر کیا آپ نے اسٹیٹسمین میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے ہندوستان ٹائمز میں جو چھپا ہے۔ اس کو پڑھا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا میں جو چھپا ہے اس کو پڑھا ہے۔ آپ کو چاہیئے تھا کہ آپ اس کو بھی پڑھتے جنھوں نے کہا ہے کہ صرف ایک سائڈ ہی کو برباد کیا گیا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس کا تقاضا تھا کہ وہاں الیکٹو نائیز لگتے۔ جس طرح کی وارداتیں ہوئی ہیں ان کو کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا ہے یہ طریقہ زندگی کا نہیں ہے۔ اس طرح کے طریقوں کو بدلنا ہوگا اور صحیح معنوں میں سیکولرزم کو لانا ہوگا۔ گاندھی جی کے بنائے ہوئے اخلاقی معیار اور نیشنلزم کو لانا ہوگا۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ اکثریت میں سبھی لوگ بُرے ہیں۔ اکثریت میں جو فرقہ پرست ہیں وہ جو کارروائی چاہے کریں۔ من مانی کریں۔ خوش رہیں اور جو مسلمان اقلیت میں ہیں یا دوسری اقلیتیں ہیں ان کو ہمیشہ ہی دبانے کی کوشش کریں اور پاکستان کا حوالہ دے کر اس کو ایک تکنیک کے طور پر استعمال کر کے۔ اس قسم کی حرکتیں وہ کرتے جائیں اس کو کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ہم اس کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں ہاؤس برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، ممبر صاحبان برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ سب ہی کو اس کے خلاف آواز بلند کرنی ہے اور یہ کوشش کرنی ہے کہ صحیح معنی میں یہاں پر سیکولرزم قائم ہو۔

(۲۱ر فروری ۱۹۶۱ء - ۵ر رمضان ۱۳۸۱ھ)

پارلیمنٹ میں دوسری تقریر

۷ر شوال ۱۳۸۰ھ - ۲۹ر مارچ ۱۹۶۱ء

"امن وامان میں ناکام کانگریسی وزارتوں کو اخلاقی طور مستعفی ہو جانا چاہیئے۔ اگر وہ استعفی نہ دیں تو وزارت داخلہ انکو نا اہل قرار دیکر کرسی سے ہٹائے۔"

الجمعیتہ کا پرچہ یہاں (لوک سبھا میں) پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا لکھا ہے اس میں؟ اس میں اتنا ہی تو لکھا ہے کہ جب تم تباہ و برباد ہو رہے ہو تو تم قانون کا احترام کرتے ہوئے اپنی جگہ ڈٹ کر رہنے کے لئے جتنا مقابلہ کر سکتے ہو کرو۔"

مسلمانوں کے بارے میں میں کہہ سکتا ہوں کہ اُن کو اُن کا حق نہیں ملا ہے ان کے ساتھ بالکل انصاف نہیں کیا گیا ہے اُن کو بالکل اگنور کر دیا گیا ہے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے آپ گزٹ اٹھا کر دیکھیں کتنے مسلمان ملازمتوں میں لئے گئے ہیں۔

"یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس جمعیتہ علماء کے لاکھوں آدمیوں نے اپنی قربانیاں دے کر ہندوستان کو آزاد کرانے میں حصہ لیا سیکولرزم نیشنلٹی قائم کرنے کے لئے جدو جہد کی سیکولرزم کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور خون بہایا آج اس کو بدنام کیا جارہا ہے۔

ہم جان دینے کے لئے تیار ہیں اگر ہندوستان سے باہر کا کوئی ملک اپنی آنکھ بدل کر ہندوستان کو دیکھے، گولیوں کے سامنے بھی ہم سینہ تانے رہیں گے۔ لیکن اس کے برعکس ہم اس طریقے سے مسلمان اقلیت کو برباد اور تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ یہ طریقہ آپ کو بدلنا ہوگا، انصاف دینا ہوگا اور صحیح طور پر انتظام کرنا ہوگا۔

محترم اسپیکر صاحب!

منسٹری آف ہوم افیرز کے بارے میں کئی دن سے بحث جاری ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا یہ محکمہ بہت ہی اہم ہے ملک کے امن وامان کا تعلق اسی سے ہے اور لوگوں کی معاشی زندگی اور سروسز کا تعلق بھی اسی سے ہے۔ میں بہت افسوس کے ساتھ مجبور ہوں چند ایسی باتیں گذارش کرنے پر جن کے بارے میں جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں اگر پیش نہ آتیں تو آج مجھ کو ہاؤس میں کہنی پڑتیں۔

جہاں تک لا اینڈ آرڈر کا تعلق ہے، جہاں تک ملک کے امن و امان کا تعلق ہے، جہاں تک لوگوں کے جان ومال اور آبرو کا تعلق ہے اس معاملہ میں ۱۹۴۷ء سے لے کر اس وقت تک ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ایک لالیس نیس پیدا ہو چکی ہے اور ملک میں صحیح معنوں میں مضبوطی اور قوت کے ساتھ لا اینڈ آرڈر پر عمل نہیں کیا جارہا ہے اس میں کسی ایک فرقے کا سوال نہیں ہے۔ ہندو مسلمان سکھ عیسائی پارسی جتنے بھی بستے ہیں۔ آج کل ایسی زندگی ہو گئی ہے کہ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ ملک میں ایک چیونٹی کی قیمت تو ہو سکتی ہے لیکن انسان کے جان ومال اور آبرو کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یہ بات بہت خطرناک اور تکلیف دہ ہے اور اس بارے میں یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ اسٹیٹ گورنمنٹوں کا کام ہے کہ وہ اپنے اپنے مقاموں پر ان چیزوں کا لحاظ کریں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی منسٹری آف ہوم افیرز کی ذمہ داری یہ نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑی ذمہ داری منسٹری آف ہوم افیرز کی ہے اس کا فرض ہے کہ وہ اسٹیٹس کی ہوم منسٹریوں کے کام کو خاص طور سے چیک کرے۔ وہ دیکھے کہ وہاں کس طرح سے کام ہو رہا ہے اور لوگ اپنے جان ومال اور آبرو کے بارے میں کیوں یہ محسوس کرتے ہیں کہ آج ہم آزاد اور محفوظ نہیں ہیں۔ میں حفظ الرحمٰن ہونے کی حیثیت سے یہ گناؤں کہ پچھلے تیرہ برسوں میں کتنے فسادات ہوئے ہیں۔ اور ان فسادات میں اقلیتوں اور خاص طور پر مسلم اقلیت کا کتنا نقصان ہوا ہے۔ کتنی تباہی ہوئی ہے تو یہ ایسی چیز ہے کہ جبلپور اور ساگر نے اس کو بالکل ننگا کر دیا ہے

واقعات اس طرح ہوئے ہیں کہ آج اُن کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے ہماری خواہش ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہاؤس کو بھی یہی خواہش ہے کہ کم سے کم لاانیڈ آرڈر کے بارے میں ایسی مضبوط پالیسی اختیار کی جائے کہ جس سے اسٹیٹس گورنمنٹس بھی اگر ہٹنے کی کوشش کریں تو ہٹ نہ سکیں۔ اسٹیٹس گورنمنٹس میں خاص طور پر ہوم منسٹر جتنے بھی ہیں

جتنے بھی حضرات ہوم منسٹر ہیں اگر ان میں کوئی ایسی کمزوری ہے کہ وہ اس طرح کی چیزوں کو سنبھال نہیں سکتے ہیں تو یہ اُن کا فرض ہے ان کی ڈیوٹی ہے۔ ان کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ مستعفی ہو جائیں اور اگر وہ ناکام ثابت ہوئے ہیں تو اس طرح کرسیوں پر بیٹھے نہ رہیں۔

ہمارے سامنے شری لال بہادر شاستری جی کی مثال موجود ہے۔ جب وہ ریلوے وزیر تھے تو کئی بار ایکسیڈنٹس ہوئے تھے جس طرح سے کہ اور منسٹریوں کے بارے میں ہوتے رہتے تھے لیکن ایک سخت ایکسڈنٹ ہوجانے کے بعد انھوں نے اپنے آپ استعفیٰ دے دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ میں ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کی کوشش کروں اور اگر عام طور پر کامیاب نہیں ہوں تو مجھے اس جگہ پر نہیں بیٹھے رہنا چاہیئے۔ لیکن بڑے بڑے فسادات ساگر میں۔ دموہ میں۔ کٹنی میں جبلپور میں ہو جائیں اور جو منسٹر ہیں وہ اسی طرح بیٹھے رہیں۔ کرسیوں پر قائم رہیں اور لوگوں کی جان و مال اور آبرو برباد ہوتے دیکھتے رہیں، یہ ان کے لئے کیسے جائز ہوسکتا ہے۔ چاہے یہ اقلیتوں کا سوال ہو یا اکثریت کا۔ ہمیں سبھی کی حفاظت کرنی ہے اور خاص طور پر اقلیتوں کی تو پوری قوت اور مضبوطی کے ساتھ کرنی ہے۔ میں یہ ایمانداری کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ پورے ملک کا سوال ہے۔ ملک کی آزادی کا سوال ہے، ملک کے وقار کا سوال ہے، ملک کی شانتی کا سوال ہے، ملک کی سالمیت کا سوال ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص طور پر توجہ دی جائے۔

سروسز کا جہاں تک تعلق ہے میری گذارش ہے کہ میں نے پچھلی تقریر میں بھی اس طرف توجہ دلائی تھی کہ آپ مجھ سے فیگرز (اعداد و شمار) نہ مانگیں۔ بلکہ آپ کو اس بات کا پتہ ہونا چاہیئے کہ ان چودہ سالوں میں گزیٹیڈ پوسٹس اور نان گزیٹیڈ پوسٹس میں اقلیتوں کے لوگ اور خاص طور پر مسلمان کس حد تک لیئے گئے ہیں مسلمانوں کے بارے میں کہہ چکا ہوں کہ ان کو ان کا حق نہیں ملا ہے ان کے ساتھ بالکل بھی انصاف نہیں کیا گیا ہے ان کو بالکل اگنور کر دیا گیا ہے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آپ اپنے گزیٹ اٹھا کر دیکھیں کہ کتنے مسلمان ملازمتوں میں لئے گئے ہیں۔ بجائے اس کے آپ مجھ سے مطالبہ کریں کہ میں فیگرز آپ کو دوں یہ سرکاری گزٹ موجود نہیں؟ ان سے سارے فیگرز آپ کو مل جائیں گے۔ ہزاروں کی تعداد میں جگہیں نکلتی ہیں اور میں جاننا چاہتا ہوں ان میں کتنے مسلمان لئے جاتے ہیں۔ میں نے پچھلی بار کہا تھا کہ آپ یہ نہیں فرما سکتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد تمام مسلمان ناقابل ہوگئے ہیں، نااہل ہوگئے ہیں۔ اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان کو ملازمتوں میں نہیں لیا جاتا اور کیا وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے۔ آخر انہیں اس ملک میں رہنا ہے یہاں جینا ہے اور یہیں مرنا ہے تو وہ کہاں روزی پائیں اور ان کے نوجوان کہاں جائیں اور کس طرح سے اپنے آپ کو برباد ہوتے دیکھتے رہیں۔ قابل سے قابل نوجوان مسلمان ہوتے ہیں۔ فرسٹ ڈویژن میں وہ آتے ہیں۔ فرسٹ ڈویژن یونیورسٹی میں ان کی آتی ہے لیکن کوئی ان کو دو کوڑی کو نہیں پوچھتا ہے اور جب اس طرح کی کوئی شکایت کی جائے تو ہم سے فیگرز مانگتے ہیں یہ کہاں تک مناسب ہے کیا یہ ممکن ہے کہ میں تمام ہندوستان میں گھوم کر تمام گزیٹ جمع کروں اور آپ کو لاکر فیگرز بتاؤں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے آفس میں اس کا سکریٹریٹ ہے۔ صوبوں میں اسٹیٹس میں سکریٹریٹ ہیں آپ ان کا ریکارڈ ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا کہ مسلمانوں کی نسبت یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ ملازمتوں کے لئے درخواستیں نہیں دیتے ہیں۔ انٹرویو میں نہیں آتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی انٹرویو میں نہیں گیا ہے تو وہ مجبوری کی وجہ سے نہیں گیا ہے۔ اس لئے کہ بہتر سے بہتر پوزیشن کے باوجود چودہ چودہ مرتبہ درخواستیں دینے کے باوجود اگر اس کو انٹرویو تک میں نہیں بلایا گیا اور وہ مایوس ہوگیا ہے تو یہ ایک نیچرل سی بات ہے میں چاہتا ہوں کہ اس طرف خاص طور سے آپ کی توجہ جائے۔

ایک اور بات میں مختصر طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں ایک وقت تھا جب ریلوے ملازموں کے بارے میں اور ساتھ ہی دوسرے ملازموں کیلئے کچھ ایسے احکام ہوئے تھے اگر کسی آئی ڈی ان کی رپورٹ کر دے تو ان کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے اگر کسی کی ایکٹوٹیز خراب ہوں تو اس کے بارے میں ایسا کیا جاتا

تھا لیکن جب سی آئی ڈی نے اس کا غلط استعمال شروع کیا تو ہم نے ایسے معاملے سردار پٹیل کے سامنے پیش کئے اور ان سے خاص طور پر کہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کہ سی آئی ڈی جس کے بارے میں چاہے اس کے بارے میں بے دلیل کوئی چیز لکھ دے اور اس کو نوکری سے برطرف کر دیا جائے کیا یہ کوئی مسئلے کا ٹھیک حل ہے۔ اس وقت سردار پٹیل نے کہا تھا کہ کیبنٹ نے متفقہ طور پر طے کر دیا ہے کہ سی آئی ڈی کا لکھ دینا کافی نہیں ہوگا جب تک کہ وہ برابر اس کے بارے میں ریزنز اور دلیلیں نہ دے کہ فلاں فلاں ایکٹوٹیز اس نے دیکھی ہیں جو قومی نقطۂ نظر کے لئے مضر ہیں اور جب تک ایسا نہیں ہوگا ان کے خلاف کارروائی نہیں کی جائے گی۔ لیکن پچھلے دنوں سے ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ یہی طریقہ چل رہا ہے کہ مسلمانوں کو جماعت اسلامی کا ممبر بتا کر اور کبھی فرقہ پرست ایکٹوٹیز بتا کر تنہا سی آئی ڈی کی رپورٹ پر جس میں کوئی ریزن اور دلیل نہیں دی گئی ان کو الگ کر دیا گیا۔

شری تیاگی (دہرہ دون) ایسا ہوا ہے؟

مولانا حفظ الرحمن۔ سات کیسز میرے پاس ہیں جن میں تین کیس بڑی مشکل سے ٹھیک کرا سکا ہوں۔ چار کیسز ابھی بھی جاری ہیں۔ خدا جانے اور ہندوستان میں اس طرح کے کتنے کیسز ہوں گے یہ تو وہ کیسز ہیں جو میری نظر میں آئے ہیں۔ بہار میں عتیق کا معاملہ تھا جو کہ ڈیڑھ پونے دو سال کے بعد بڑی جدوجہد کے بعد ٹھیک ہوا۔ کوئی ناجائز کارروائی اس نے نہیں کی تھی لیکن ایک لفظ سی آئی ڈی نے لکھ دیا کہ وہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھتا ہے اور وہ برخاست کر دیا گیا۔ راجستھان کا کیس موجود ہے اور وہ چل رہا ہے اور اس طرح سے خدا جانے اور کتنے کیس ہوں گے۔ ایک پلان کہئے یا ایک ٹیکنک کہئے جب چاہتے ہیں کسی کو جماعت اسلامی کا ممبر بتا کر یا کسی کو اور بتا کر برطرف کر دیا جاتا ہے باقی سارے کے سارے چاہے وہ جن سنگھ سے تعلق رکھتے ہوں یا ہندو مہا سبھا سے ان کو برداشت کر لیا جاتا ہے۔ اور ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جاتا۔

یہ پہلا موقع ہے جب مسلم اقلیت کی تباہی کے بارے میں جبلپور ساگر وغیرہ کے واقعات سے متاثر ہو کر اس ہاؤس کے ہندو مسلم سکھ پارسی وغیرہ سبھی ممبر صاحبان نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ یہ بہت بھاری زیادتی ہوئی ہے اور بہت ہی برا ہوا ہے۔

اور بہت سی جماعتوں نے اسٹیٹمنٹس (بیانات) دیئے بھی ہیں لیکن اس کے باوجود ہوتا کیا ہے کہ اس ہاؤس میں بعض بھائی ہیں جو چاہتے ہیں کہ اس کو ہلکا کرنے کے لئے الٹا مسلم اقلیت ہی کو مجرم قرار دیا جائے۔ کبھی جمعیۃ علماء کا نام لیا جاتا ہے کبھی الجمعیۃ اخبار پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ اس اخبار نے کیا لکھا ہے؟ یک دھرم کا کوئی قصور نہیں ہے، آرگنائزر کا کوئی قصور نہیں ہے، اس قسم کے اخبارات جو مسلمانوں کو انتہائی طور پر ذلیل کرتے رہتے ہیں ان کو پاکستانی بتاتے رہتے ہیں اور صاف لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے ان کے رہنے کے لئے کوئی مقام نہیں ہے، ان کو یہاں نہیں رہنا چاہئے اور اسی طرح جن اخبارات میں قتل تک کی دھمکیاں لکھی جاتی رہی ہیں ان کا کوئی جرم نہیں ہے اس میں۔ اس میں اتنا ہی تو لکھا ہے کہ جب تم تباہ و برباد ہو رہے ہو تو تم قانون کا احترام کرتے ہوئے ہر جگہ پروٹسٹ کر رہنے کے لئے جتنا مقابلہ کر سکتے ہو کرو۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ قانون ہاتھ میں لے لو، قانون کا احترام مت کرو۔ لیکن ضرور کہا گیا ہے کہ مایوس نہ ہو ڈیمارلائز نہ ہو ڈٹ کر ڈیفنس کرو۔ ایسا کرنا تمہارا حق ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اس میں کون سی بری بات ہے جو لکھی گئی ہے یہاں پر الجمعیۃ کے تراشے پڑھے جاتے ہیں۔ میرے پاس بیسوں تراشے ہیں جن کو میں پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ وقت نہیں ہے کہ سبھی کو میں پڑھ کر سناؤں لیکن ایک دو کٹنگ میں پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں۔ پرتاپ میں جو یہ لکھا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کبھی مسلمانوں کو پاکستانی بنایا جاتا ہے اور کبھی اور کسی طرح سے اشتعال دلایا جاتا ہے۔ اس میں لکھا ہے:۔

رہ گیا سوال مسلمانوں کی وفاداری کا۔ اس کا جواب ہندوستان کے مسلمان خود دے سکتے ہیں اور افسوس سے کہا جائے گا کہ ان کے دل میں آج بھی پاکستان کے لئے ہمدردی ہے۔

آگے چل کر اس نے لکھا ہے:۔

"پچھلے دنوں بیدر کے شہر میں مسلمانوں نے کھلے بندوں پاکستانی جھنڈا لہرایا اور پاکستان کے حق میں نعرے لگائے اس سے پہلے ایسا ایک واقعہ مدراس میں بھی ہو چکا ہے کیا اس کے بعد بھی سوال کیا جائے گا کہ کیوں مسلمانوں پر شک کیا جا رہا ہے"۔

حالاں کہ یہ سب الزامات غلط ثابت ہو چکے ہیں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:۔

"مولانا صاحب نے یہ بھی مطالبہ کر دیا کہ نوکریوں میں مسلمانوں
کے لئے جگہ مخصوص ہونی چاہیئے، گویا کہ مولانا صاحب بھی
اپنے آپ کو ہندوستانیوں کا نمائندہ تصور نہیں کرتے بلکہ صرف
مسلمانوں کا، ایسی حالت میں اگر فرقہ پرستی زور پکڑ جائے تو
کیا تعجب ہے"۔

آگے چل کر لکھا ہے :۔

کیا یہ واحد واقعہ ہے اپنی قسم کا۔ کیا روزمرہ ایسے واقعات نہیں
ہو رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں دہلی میں اس طرح کا ایک واقعہ
ہوا کیا پردھان منتری بتائیں گے کہ یہ کیوں اور کیسے ہوا۔ اور
اسکی بابت سرکار نے کیا کیا۔ کیا یہ امر واقعہ ہے یا نہیں کہ جبلپور
کے واقعہ کے بعد ناگپور میں ایسا ہی واقعہ ہوا اور شہر کی پولیس کے
آشواسن پر پورا ایک ہفتہ اس واقعہ کو شائع نہ کیا گیا۔ کیا واقعہ
ہے یا نہیں کہ پچھلے ری پبلک ڈے پر ناسک ضلع کے مالی گاؤں
کے مسلمانوں نے پاکستانی جھنڈا لہرایا۔ بیدر میں جو کچھ ہوا اس
کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ جب سرکار نے ان مسلمانوں کے خلاف
کوئی کارروائی نہ کی تو لوگوں کو ہڑتال کرنا پڑی۔ فیروزآباد میں
ایک مسجد سے جنم اشٹمی کے جلوس پر پتھر پھینکے جاتے ہیں جبلپور
میں مسجد سے گولی چلائی جاتی ہے اور تیزاب سے بھرے بلب
پھینکے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے ایک واقعہ ہو تو
اسے نظر انداز کریں لیکن جب یکے بعد دیگرے ایسے واقعات
ہو رہے ہوں اور پولیس حرکت میں نہ آئے کیوں کہ اوپر بیٹھے
کانگریسی وزیروں کو مسلمانوں کی ووٹیں چاہیئیں اور اس
لئے وہ مسلمان غنڈوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں
کر سکتے"۔

ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

فرقہ پرستی اور پنڈت نہرو

کانگریس ورکنگ کمیٹی اعلان کرتی ہے کہ جبل پور کے واقعات
کی تحقیقات کی جائے گی۔ بیشک یہ ہونی چاہیئے۔ لیکن یہ بھی
تو بتا دیا جائے کہ آسام کے حالیہ فسادات کی تحقیقات کیوں
نہ کی گئی؟ کیا جبل پور کے واقعات کی تحقیقات اس لئے ہوئی
ہے کہ اس میں ہندوؤں کو بھی رگڑا جا سکے گا اور آسام کی
اس لئے نہیں کہ وہاں کانگریسی حکومت کی نالائقی اور کانگریسیوں
کی جانبداری منظر عام پر آ جائے گی یہ دو عملی ہے جو کانگریس کو
بدنام کرتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آسام کے بدمعاشوں کو تو
معاف کر دیا جائے کیوں کہ وہ کانگریسی ہیں اور جبل پور میں
لوگوں کو دھر لیا جائے کیوں کہ وہ کانگریسی نہیں۔ ...... یہ
نہیں ہو سکتا کہ بدمعاشوں کی تو حوصلہ افزائی کی جائے اور فرقہ
پرستوں کو سزا دی جائے، ملک کے کسی بھی کونے میں اگر ایک
بھی قصوروار کو معاف کیا جائے گا تو اس کا اثر ملک کے
چالیس کروڑ باشندوں پر ہوگا۔ حکومت کرنا بچوں کا کھیل
نہیں ہے۔ پنڈت نہرو اور ان کے ساتھیوں کو سمجھ لینا
چاہیئے کہ ان کے اپنے عمل سے فرقہ پرستی بڑھ رہی ہے اور یہ
اس لئے بڑھ رہی ہے کہ فرقہ پرست یہ دیکھ رہے ہیں کہ نہرو
حکومت میں ان بدمعاشوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں جو
کانگریسی ہیں یا کانگریسیوں سے وابستہ ہیں۔ تخریبی عناصر
سب ایک ہیں چاہے یہ جبل پور رہتے ہوں اور چاہے
آسام میں"۔

اس طرح کی اشتعال انگیز تحریریں مسلمانوں کے خلاف لکھنا کیا فرقہ پرستی
نہیں ہے اور کیا یہ ٹھیک ہے یہ کونسا طریقہ ہے اس سے امن وامان کیا قائم
رہ سکتا ہے کس طرح سے اس کا تحفظ ہو سکتا ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے
کہ جس جمعیۃ علماء کے لاکھوں آدمیوں نے اپنی قربانیاں دیکر ہندوستان
کو آزاد کرانے میں حصہ لیا۔ سیکولرزم سٹیبلشٹی قائم کرنے کے لئے جدوجہد
کی، سیکولرزم کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اپنا خون بہایا آج اسی کو
بدنام کیا جائے۔

اگر ایک ایسے موقع پر جب مسلمانوں کی یہ بربادی ہوئی اس نے دو
چار آرٹیکلس ایسے لکھ دیئے جس میں کہ مسلمان بالکل ڈیمارلائز نہ ہو جائیں،
بے بس نہ ہو جائیں تو وہ فرقہ پرستی ہے اور صبح سے شام تک جو آگ ان کے خلاف
برسائی جائے اسے کوئی فرقہ پرستی نہیں کہتا۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

سچ کہا ہے کسی شاعر نے ؎ جب کوئی فتنہ زمانہ میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں تربت میری

سارا قصور جو ہے وہ مسلمان بیچارے کا ہے۔ اس ہندوستان میں جب سے پارٹیشن ہوا ہے مسلمان سے زیادہ غنڈہ مسلمان سے زیادہ بے ایمان اور غیر وفادار کوئی ہے ہی نہیں، یہ کس قدر افسوسناک پہلو ہے لیکن ابھی ہماری ہوم منسٹری کی طرف سے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا گیا جس سے اقلیتوں کو خاص طور پر مسلمان اقلیتوں کو یہ خیال پیدا ہو کہ ہم بھی اس ملک کے برابر کے باشندے ہیں۔ ہم سیکولر اسٹیٹ کو مانتے ہیں ہم نے اپنی جانیں دی ہیں۔ آج کسی فرقہ پرست کو اس ملک سے کیسے محبت ہو سکتی ہے۔ جب انگریزی گولیاں چل رہی تھیں تو یہ سب کنڈی اور کواڑ بند کرکے بیٹھے تھے آج ہو سکتا ہے ان کو اپنے ملک سے محبت نہ ہو لیکن جنھوں نے ۳۲ء میں چاندنی چوک میں کھڑے ہو کر مسٹر علی سپرنٹنڈنٹ سے کہا تھا کہ گولی مار سکتے تو مار مگر آزادی کا عہدنامہ پڑھا جائے گا اور جو لوگ ملک کی خاطر جیلوں میں سڑ سکتے ہیں ان سے زیادہ ملک کا دوست کون ہو سکتا ہے مگر آج وہ سارے فرقہ پرست ہیں۔ ان کے اخبار فرقہ پرست ہیں اور وہ لوگ جو کانگریس یا نیشنلسٹ جماعتوں کے صدقے میں اس آزاد ملک میں بیٹھے ہیں اور ہمیشہ فرقہ پرستی برتتے رہے ہیں وہ الٹے دوسروں کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کیوں ہے، مجھے ان سے شکایت نہیں ہے مجھے ہوم منسٹری سے شکایت ہے، مجھ کو اس کی شکایت ہے کہ اسٹیٹوں کے اندر جو ہوم منسٹر آپ مقرر کرتے ہیں ان کے کام کو دیکھا نہیں جاتا۔ اسٹیٹ کے اندر اگر آپ لا اینڈ آرڈر کی ذمہ داری کسی کو دیں تو آپ کو چیک کرنا ہوگا کہ وہ صحیح طور پر عمل کر رہا ہے یا نہیں۔ ساری ذمہ داری آپ کے اوپر ہے اسٹیٹ کے اوپر نہیں۔ اگر اسٹیٹ گورنمنٹیں اس طرح کرتی ہیں تو وہاں کانگریس کی گورنمنٹیں ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اخلاقی طور پر وہاں سے مستعفی ہوں اور اگر استعفیٰ نہ دیں تو آپ ان کو اس کرسی سے ہٹا کر کہیں کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ذمہ داری لے سکیں۔

آج جبل پور میں جو ڈیشل انکوائری ہو رہی ہے ہمارے سامنے یہ آیا تھا کہ وہاں تین آدمی اس کے لئے رکھیں جائیں گے ایک جج ہوگی جس میں کوئی نہ کوئی سپریم کورٹ کا جج ہونا چاہیے تھا جس میں خود مدھیہ پردیش کا جج ہونا چاہیے تھا۔ ایک جج صاحب بیچارے آئے۔ میں ان کے خلاف کچھ نہیں کہتا وہ ٹھیک ہی ہوں گے لیکن ایک گوالیار کے جج صاحب مقرر کر دیئے گئے وہ بھی اس حالت میں کہ جبلپور اور ساگر کے سارے حکام جنھوں نے ان مسلمانوں کو تباہ کرنے میں حصہ لیا ہے یا چشم پوشی برتی ہے وہ وہاں موجود ہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اپنے کانوں سے سنا ہے آج بھی وہ حکام کہہ رہے ہیں کہ اگر ہمارے موافق مسلمانوں نے گواہی نہ دی تو ان کا وارنٹ کاٹ دیا جائے گا اور وہ جیل میں بھیج دیئے جائیں گے۔ آج ان میں سے کسی کا تبادلہ نہیں ہوا ہے۔ ایسی حالت میں لوگوں کو کیسے انصاف ملے گا۔ اگر جوڈیشل انکوائری ہو تو اس میں مہربانی کرکے باہر کے جج رکھے جائیں۔ ایک سپریم کورٹ کا جج ہونا چاہیئے ایک ساؤتھ کا جج ہونا چاہیے۔ گوالیر کے جو صاحب موجود ہیں وہ بھی رہیں لیکن تمام حکام کا ٹرانسفر لازمی ہے۔ ورنہ یقینی طور پر اس انکوائری سے کبھی بھی انصاف نہیں ہو سکتا اور ہم کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے اور کوئی بھی انصاف پسند ہندو مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ یہ میں ہی نہیں کہتا بلکہ انصاف پسند ہندو کہتے ہیں، سکھ کہتے ہیں کہ یہ کیا انکوائری ہے جس کے اندر ایک آدمی گوالیر سے اٹھا کر ڈال دیا گیا اور تمام کے تمام حکام پولیس اور ایڈمنسٹریشن وہی جما بیٹھا ہوا ہے جو کہ لوگوں کو ہیرپس کر رہا ہے اور مسلمانوں کو دھمکاتا ہے کہ تمہارے اوپر مقدمہ چلا دیں گے اور تمہارا یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے آخر اس طرح سے کیسے انصاف ملے گا اور کیسے صحیح گواہ لائے جا سکتے ہیں۔ اس کا انتظام نہیں ہوا تو کیسے کام ہوگا۔

سنتری تیاگی :۔ آج بھی وہ کام کرتے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن :۔ وہی لوگ ہیں۔

شری ایس ایم بنرجی (کانپور) :۔ کسی کا تبادلہ نہیں ہوا ہے ؟

مولانا حفظ الرحمٰن ۔ سب اسی طریقے سے قائم ہیں۔ جب تک جبلپور سے وہ نہیں ہٹیں گے تب تک کسی طرح کا انصاف ملنا ناممکن ہے اگر میں اس چیز کو یہاں نہ کہوں ہاؤس میں نہ کہوں، اپنے ہوم منسٹر سے نہ کہوں جن کا ہم احترام کرتے ہیں جو ہمارے معاملات کو صحیح کرنے میں کوشش کرتے ہیں۔ تو کس سے کہوں۔ ہم ان سے ضرور کہیں گے میں اس موجودہ پوزیشن سے مطمئن نہیں ہوں میں ہاؤس کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہی طریقہ جاری رہے گا تو اس طرح سے اطمینان نہیں مل سکتا۔ بھلے ہی آپ اپنا ڈھنڈورا پیٹتے رہیں کہ ہم سیکولر اسٹیٹ ہیں کوئی عقلمند اس بارے میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔

ہم جان دینے کیلئے تیار ہیں اگر ہندوستان سے باہر کا کوئی ملک آنکھ بدل کر ہندوستان کو دیکھے۔ گولیوں کے سامنے بھی ہم سینہ تانے رہیں گے لیکن اسکے برعکس ہم اس طریقہ سے مسلمان اقلیت کو برباد اور تباہ نہیں دیکھ سکتے یہ طریقہ آپ کو بدلنا ہوگا، انصاف دینا ہوگا صحیح طور پر انتظام کرنا ہوگا اور مجھ جیسے بولنے والے کو یہ کہکر چپ نہیں کیا جا سکتا کہ ایسی باتیں کرنا فرقہ پرستی ہے۔ اگر مجھ پر ہزاروں فرقہ پرستیوں کا لیبل بھی لگا دیا جائے تو وہ میری قوم پرستی کو خاک میں نہیں ملا سکتی بلکہ میری قوم پرستی کی آگ میں خود ہی

ہندوستان کا باشندہ ہونے کے باوجود کسی کو جائیداد سے محروم کردینا ناانصافی کی بات ہے

لوک سبھا میں وزارت بحالیات سے متعلق مطالبات زر کی بحث کے دوران مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی تقریر۔ مؤ

۱۱ اپریل ۵۰ء کو لوک سبھا میں وزارت بحالیات سے متعلق مطالبات زر کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ان مسلمانوں کے معاملہ کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جنھیں وزارت بحالیات نے نکاسی ایکٹ کی دفعہ ۱۶ کے استفادہ سے محروم کر دیا ہے۔ آپ نے اسے ناانصافی قرار دیا اور وزیر بحالیات سے اپیل کی کہ اس سوال پر غور کریں اور دیکھیں کہ محض اصطلاحی بنا پر کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔ حضرت مولانا نے ان مسلمانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے جو اپنے ہی وطن میں بے گھر ہو کر رہ گئے ہیں۔ دہرہ دون اور گنگا نگر (راجستھان) کے مسلمانوں کے معاملہ پر توجہ دینے کی اپیل کی۔ حضرت مولانا نے یہ بھی کہا کہ کسٹوڈین جنرل کا دفتر مصوری منتقل نہ کیا جائے۔ اگر منتقل کیا ہی جاتا ہے تو اسے لکھنؤ میں منتقل کیا جانا چاہیے۔ حضرت مولانا نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا پراپرٹی ایکٹ دفعہ ۱۶ کا مفاد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جائداد کے متعلق جس کو کسٹوڈین نے گزٹ کر دیا ہو کسٹوڈین اور چیف کسٹوڈین کے یہاں ناکام ہو جائے اور منسٹری میں شکایت کرے کہ جائداد میری ہے تو وہ کیس قابل سماعت ہوتا تھا اور منسٹری اس پر غور کرتی تھی۔ اس طرح اگرچہ ناانصافی بھی ہو جائے تو اطمینان رہتا تھا کہ ہمارے کیس پر پھر سے غور کیا جا سکتا ہے لیکن گزشتہ آٹھ دس ماہ سے اس دفعہ کی نئی تعبیر منسٹری کی جانب سے کر دی گئی ہے۔ جس سے میں حیران ہوں اور اس پر سخت احتجاج کرتا ہوں کہ اب بغیر سماعت کے منسٹری سے یہ کہہ کر درخواست مسترد کر دی جاتی ہے کہ تم نے چوں کہ تمھاری جائیداد گزٹ نہیں کی ہے۔ بلکہ پاکستان جانے والے کی جائیداد گزٹ کی ہے اس لئے تمھیں اس کی شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے

محترم اسپیکر صاحب غور فرمایئے کہ یہ کتنی ناانصافی کی بات ہے کہ ایک شخص ہندوستان ہی کا باشندہ ہے۔ کبھی پاکستان نہیں گیا۔ اس کے باوجود کسٹوڈین نے اس کی جائیداد کو اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اور اگر یہ شخص ہندوستانی شہری کی حیثیت سے اپنی فریاد کرتا ہے تو دادرسی کے بجائے یہ جواب ملتا ہے کہ تم کو دفعہ ۱۶ کے تحت درخواست دینے کا حق نہیں ہے۔ میں نے تحریری اور زبانی بھی محترم وزیر بحالیات کو اس ناانصافی کی طرف توجہ دلائی تھی اور وزیر موصوف نے ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک سیکڑوں درخواستیں مسترد کی جا چکی ہیں اور دفعہ ۱۶ کے تحت متذکرہ کارروائی کرنے کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔

محترم اسپیکر صاحب! آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنے ہی ملک میں بے گھر ہو گئے ہیں لیکن ان کی بدقسمتی ہے کہ نکاسی ایکٹ کے پیش نظر وہ پناہ گزینوں کی طرح گھروں میں نہیں آ سکے۔ اب اس بارے میں کوئی بحث کرنا بے کار ہے۔ جب کہ یہ مسئلہ ہی قریب الختم ہے۔ لیکن کیا یہ انصاف کا تقاضہ نہیں ہے کہ اگر اسی ہندوستان میں چند سو مسلمان ایسے موجود ہوں جو اس قابل نہیں کہ کیمپوں کی فیس دے کر اپنی جگہ سے دلی میں دوڑ کر اور آ آ کر مقدمے کر سکیں تو ایک استثنائی طور پر ان کے ساتھ بھی رفیوجیوں جیسا معاملہ کیا جائے اور ان کو بسانے کا انتظام کیا جائے۔ لیکن سخت افسوس ہے کہ اس طرف توجہ نہیں دی گئی

جولائی ۱۹۴۹ء میں

دہلی میں فرقہ پرستوں کی سرگرمیوں پر ایک بصیرت افروز بیان

کیا میں پوچھنے کا حق رکھتا ہوں کہ جب انڈین نیشنل کانگریس اور حکومت ہند نے کسی پس و پیش کے بغیر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ انڈین یونین کی حکومت ایک سیکولر (غیر مذہبی) اسٹیٹ ہوگی تو اگر میں سچا کانگریسی ہوں اور قوم پرور خادم ہوں تو کیا میرا یہ فرض نہیں ہے کہ میں اس کو عملی شکل دینے میں حکومت اور قومی جماعت کا پورا پورا ساتھ دوں۔ اگر حکومت ہند اور کانگریس کے اس صاف فیصلہ کے بعد کسی فرقہ کے فرقہ پرست افراد اپنی عددی اکثریت کے بل بوتے پر دوسرے کسی فرقہ کو مرعوب خوف زدہ اور پامال کرنے کے لئے ایک ہی قسم کے حیلے بہانے تراش کر اس ملک میں ظلم کا رواج کرنا چاہیں تو کیا مجھ کو اس لئے خاموش ہو جانا چاہئے کہ یہ زیادتی ایک ایسے فرقہ پر ہو رہی ہے جو میرا ہم مذہب ہے۔

ایک اور پتہ کی بات

میں تو ہندوستان میں اس ہندو راج کو بھی خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہوں جو ہندو دھرم کے صحیح اصولوں کے مطابق قائم کیا جائے۔ اس لئے کہ میرا یقین ہے کہ ہندو دھرم کے صحیح اصول کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ محض اس بنا پر کہ

مسلمان اقلیت میں ہیں، دوسرا مذہب رکھتے ہیں یا ان کے ہم مذہبوں نے دوسرے ملک میں ہندو سکھوں پر زیادتی کی ہے۔ اس لئے ہندو سکھ یہاں کے بے قصور مسلمانوں پر طرح طرح کی زیادتیاں کر کے ان میں خوف و ہراس پیدا کریں۔ ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کریں اور جھوٹے الزامات کا بہانہ بنا کر ان کی عزت و آبرو کو مٹائیں اور اس پر فخر کریں۔

قومی زبان کے مسئلہ پر
کانگریس کانسٹی ٹیوٹ پارٹی میٹنگ میں ایک احتجاجی تقریر

یکم ستمبر ۴۹ء کو دستور ساز اسمبلی کی کانگریس پارٹی میں قومی زبان کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا جس میں ہر دو فریق نے پوری سرگرمی سے حصہ لیا۔ اس وقت ڈاکٹر امبیدکر کا مسودہ تجویز زیر بحث تھا۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس ڈرافٹ پر زبردست تنقید کی اور اسے قطعی طور پر غیر منصفانہ قرار دیا آپ نے کہا کہ اس کے باوجود کہ ہم ہر موقع پر مہاتما گاندھی کا نام استعمال کرتے ہیں اس مسودہ میں گاندھی جی کے طے کردہ اصول کی قطعاً خلاف ورزی کی گئی ہے۔

یہ وہ اصول تھے جنھیں گاندھی جی آخر دم تک سچ سمجھتے رہے اور انھیں کا پرچار کرتے رہے۔ یونین کی زبان ہندی ہوگی اور رسم الخط دیوناگری ہوگا۔ یہ نہ صرف گاندھی جی کے اصول کو چیلنج ہے بلکہ کانگریس کی اس تیس سالہ تاریخ کو بھی چیلنج ہے جس میں کانگریس بار بار یہ یقین دلاتی رہی ہے کہ ملک کی قومی زبان ہندوستانی ہوگی جو دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس ڈرافٹ میں زبان کے مسئلہ کو زبان کی حیثیت میں نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ پولیٹیکل نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور وہ بھی کچھ اس تنگ نظری اور تنگ دلی کے ساتھ کہ ہندوستان کے کروڑوں ہندو، مسلمان باشندوں کی مشکلات کو محض اس لئے نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ وہ رد عمل نمایاں طور پر ظاہر ہو جائے جو پارٹیشن اور تقسیم ہند سے پیدا ہو گیا ہے۔ میرے نزدیک انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں یہ سب سے بڑا حادثہ ہے جو آج پیش آیا ہے۔ سیکولر اسٹیٹ اور ون نیشن کے دعویٰ کے باوجود ہند یونین کے کروڑوں انسانوں کی مادری زبان کو جو بلا تفریق مذہب و ملت اور بلا امتیاز نسل و خاندان ملک کے گوشے گوشے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نفرت اور حقارت سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ اگر ہندوستانی زبان کو ہند یونین کی قومی زبان قرار دیا جاتا تو اس میں بلاشبہ ہندی اردو اور ہند یونین کی دوسری زبانیں بھی آسانی سے سما سکتی تھیں اور جنوبی ہند و شمالی ہند کا تفرقہ بھی بیچ میں سے ہٹ سکتا تھا جو اس وقت ہندوستانی کے ہٹ جانے کے باعث ہندی اور انگریزی کے مقابلہ کی شکل میں نظر آ رہا ہے۔

ہندوستانی زبان کا مطلب گاندھی جی کی نظر میں بھی یہ ہی تھا کہ وہ سادہ سہل زبان جو اتری ہند میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان کو اگر قومی بنا لیا جائے گا تو اس سے ہند یونین کے تمام باشندوں کے درمیان یکجہتی اور کچھ یکسانیت پیدا ہوگی جس سے صحیح معنی میں متحدہ قومیت کے نشانات ابھر آئیں گے۔ برخلاف وہ اردو اور وہ ہندی جو اپنی اپنی جگہ ادبی ترقیاں کر رہی ہیں ان میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ قومی زبان کی جگہ لے سکیں۔

مگر افسوس یہ ڈرافٹ جس کی پشت پر اکثریت کی جذباتی سیاست کار فرما ہے ایسے انتقامی جذبات کا آئینہ ہے جو معقولیت اور سنجیدگی کے تمام پہلوؤں کو چھپا چکے ہیں۔ اس لئے میں زبان کے مسئلہ پر مزید تقریر کے بجائے اس ڈرافٹ کے خلاف سخت پروٹسٹ کرتا ہوں اور اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

مجاہدِ ملّت نمبر

ماضی و حال کے مضراب کا اک ساز ہے
لوحِ تاریخ پہ لکھا ہوا اک راز ہے
مُلک و ملّت کے مجاہد کی ہے رُوداد عزیز
قلبِ بے چین سے نکلی ہوئی آواز ہے

عزیز حسین پوری (ضلع بجنور)

وزیر بحالیات حکومتِ ہند کے جواب میں

مجاہد ملت کا ایک تاریخی مکتوب

وزیر بحالیات مسٹر کھنہ نے مسلم کنونشن میں بحالیات سے متعلق قرارداد کے جواب میں کنونشن کے صدر ڈاکٹر سید محمود کے نام دو مراسلات ارسال کئے تھے جن میں ان حقائق سے انکار تھا جن کا اظہار متذکرہ قرارداد میں کیا گیا تھا حضرت مولانا نے ۴ ستمبر ۱۹۶۱ء کو کھنہ جی کے پہلے مراسلہ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ کھلی ہوئی حقیقتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور نہ کسٹوڈین کے مظالم کی پردہ پوشی ہو سکتی ہے۔ ناجائز طور پر چھینی ہوئی املاک اور جائیدادیں سینکڑوں اور ہزاروں کی نہیں بلکہ کروڑوں روپے کی مالیت کی ہیں۔ یہ ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہیں، مذہبی اوقاف، امام باڑے، قبرستان اور درگاہیں سب ہی ان کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ حضرت مولانا کا پورا بیان مندرجہ ذیل تھا۔

انڈین مسلم کنونشن کی تجاویز میں ایک تجویز وزارت بحالیات سے تعلق رکھتی تھی، جس میں کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کے ہاتھوں ہندوستان کے مسلم شہریوں کے ساتھ کی گئی مسلسل چیرہ دستیوں، زیادتیوں اور سخت گیرانہ پالیسیوں پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا۔ یقیناً اس ڈپارٹمنٹ کی سخت گیری اور منتقمانہ کارروائیوں کے نتیجہ میں مسلمانانِ ہند کو بے اندازہ پریشانیوں اور مسلسل مصیبتوں کا سامنا رہا ہے۔ نیک مقصد اور انصاف کے حصول کے لئے کنونشن نے جان بوجھ کر تلخ تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے اجمال و اختصار سے کام لیا تھا تاکہ وزارت بحالیات اس ڈپارٹمنٹ کی مسلسل چیرہ دستیوں اور زیادتیوں پر غور کر کے از خود نہیں تو کم از کم توجہ دلانے کے بعد منصفانہ رویہ اختیار کرے اور وزارت کے با اختیار اصحاب ہمدردی اور انصاف پسندی کے ساتھ ان غلط کاریوں کی تلافی کی کوئی راہ نکالیں جو کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے پچھلے چودہ برس میں وسیع پیمانہ پر مسلمانانِ ہند کے ساتھ روا رکھی ہیں۔

بہت افسوس ہوا یہ دیکھ کر کہ وزیر بحالیات شری مہر چند کھنہ جی نے کنونشن کی اس تجویز کا ہمدردانہ مطالعہ نہیں فرمایا۔ بلکہ اس کے برعکس ڈپارٹمنٹ کی غلط کاریوں دست درازیوں اور تلخ حقیقتوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور پھر یہ ہی نہیں بلکہ الٹا ان کو صحیح حق بجانب اور مبنی بر انصاف قرار دینے کا بے محل اقدام کیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں انھوں نے ایک طویل بیان جاری کیا ہے جس کی کافی اشاعت کی گئی ہے۔

شری کھنہ جی کے اس بیان نے نہ صرف یہ کہ اصلاحِ حال کی امیدوں کو پامال کیا ہے بلکہ ان ہزاروں زخمی دلوں پر نمک پاشی کی ہے جو کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی بے لگام چیرہ دستیوں سے پہلے ہی دکھے ہوئے تھے۔

بلاشبہ اس بیان نے ملک کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دی۔ کیونکہ نہ اس طرح کھلی ہوئی حقیقتوں کو جھٹلایا جا سکتا ہے اور نہ کسٹوڈین کے مظالم کی پردہ پوشی کی جا سکتی ہے خصوصاً جب کہ ان بے پناہ زیادتیوں کی عمر چند روزہ نہیں ہے بلکہ ان کا سلسلہ چودہ برس سے جاری ہے اور ان کی زد میں چند افراد ہی نہیں ہیں بلکہ ہزاروں مظلوموں تک ان کا دامن پھیلا ہوا ہے جو ملک کے کسی ایک آدھ مقام پر نہیں بلکہ جہاں تہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ ناجائز طور پر ان سے چھینی ہوئی املاک اور جائیدادیں سینکڑوں اور ہزاروں نہیں بلکہ کروڑوں روپے کی مالیت کی ہیں پھر یہ سب رستہ کشی مکانوں، شخصی جائیدادوں، زمینوں، باغوں اور کھیتوں ہی کی داستان نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہیں، مذہبی اوقاف اور امام باڑے، قبرستان اور درگاہیں سب ہی ان کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔

منتقمانہ سلوک

اس طویل مدت میں کھلے بندوں کسٹوڈین کے منتقمانہ سلوک نے جس وسیع پیمانہ پر مسلمانانِ ہند کو برباد کیا ہے۔ آج اس کا نتیجہ نہ صرف اُن کی اقتصادی اور معاشی بحران اور خستہ حالی کی شکل میں ان پر مسلط ہے۔ بلکہ وہ اپنے وطنِ عزیز میں رہتے ہوئے غریب الوطنی اور بے پناہی کے احساسات اور خطرات میں خود کو گھرا ہوا بھی پاتے ہیں۔

آج بھی سینکڑوں مسلمان ایسے موجود ہیں جو اپنے افلاس و غربت کی وجہ سے یا برسوں تک کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ میں کھنچتے رہنے کے بعد مایوس ہو کر خود ہی اپنی جائیدادیں چھوڑ بیٹھے اور بہت سے وہ ہیں جو آٹھ آٹھ برس دس دس برس تک کسٹوڈین کے دفتروں کے چکر لگانے اور روپیہ اور وقت ضائع کرنے کے بعد تھک کر بیٹھ گئے ہیں۔ اور جو سخت جان اس راہ میں ڈٹے بھی رہے تو ان کو بھی انتہائی جدوجہد اور صبر آزما محنت کشی کے بعد کہیں نجات مل سکی ہے۔

عرض کہ اس محکمہ کی ایذا رسانیوں کی داستان اتنی دراز اتنی طویل اتنی وسیع اور اتنی واضح اور روشن ہے کہ آج کھنہ جی کے بیان کی بلند بانگی کسی طرح بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکتی اور حد تو یہ ہے کہ کسٹوڈین محکمہ کی رہی سہی کمی کمپٹمنٹ افسران نے پوری کر دی ہے کہ جو مسلمان کسٹوڈین کی زد سے بچ نکلا آخر کار کامپیٹنٹ آفیسر کے فیصلوں کا شکار ہو کر رہ گیا۔

لیپا پوتی

بہتر یہ تھا کہ کھنہ جی اپنے اس بیان میں کسٹوڈین کی لیپا پوتی کرتے ہوئے اور اپنے ڈپارٹمنٹ کی شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے میرا نام نہ لیتے کہ مجھ جیسا باخبر انسان جو الف سے یا تک اس طلسم ہوشربا کا عینی شاہد رہا ہے اگر اس کی نقاب کشائی کرنے لگے تو تلخ نوائی کا ایک مجلّہ تیار ہو سکتا ہے۔

کیا میں شری کھنہ جی کو یاد دلاؤں کہ آج انھوں نے وزارت بحالیات کی جن ہمدردیوں اور بخششوں کو شد و مد کے ساتھ اپنے مضمون میں ابھارا ہے وہ خود ہی کسٹوڈین کی کارگذاریوں پر ایک لازوال شہادت ہیں۔ اس لئے کہ جب محکمہ مذکور کی منتقمانہ ذہنیت اپنی حد سے گذر گئی اور مسلم اقلیت کے لئے اس طرح وبال جان بن گئی کہ بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک شریف اور سنجیدہ انسان نے بلکہ ممبران پارلیمنٹ اور سرکاری ذمہ داران نے بھی ان سخت گیریوں کو محسوس کیا اور ملک کے کونے کونے سے عوام و خواص اور مسلم و غیر مسلم ممبران کے احتجاجات، وفود اور جمعیۃ علماء ہند کی مسلسل اپیلوں اور انتھک کوششوں کی بدولت بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ محترم وزیر اعظم کی شخصی مداخلت کے نتیجہ میں کسٹوڈین کی اس مطلق العنانی کو روکتے ہوئے ان ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انصاف اور ہمدردی کی کچھ تدبیریں کی گئیں۔ جو کسٹوڈین کی سخت گیری کا بدترین شکار رہتے۔ اگرچہ ان ہمدردانہ تدبیروں کا سلسلہ بھی کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی مہربانیوں سے کچھ زیادہ دیر نہیں چل سکا اور اکثر و بیشتر محکمہ کی معاندانہ ذہنیت کی بھینٹ چڑھتا رہا ہے۔

یہی وہ ہمدردانہ تدبیریں تھیں جن کا نام لے کر آج شری کھنہ جی اپنے ڈپارٹمنٹ کی عنایات اور بخششوں کے لمبے چوڑے دعوے کر رہے ہیں مگر ساتھ ہی ان تلخ حقیقتوں کو فراموش کر رہے ہیں جن کے پس منظر میں یہ صورت حال کچھ دنوں کے لئے پیدا کی جاتی رہی ہے۔

ان ہی تدبیروں میں سے ایک اقدام وہ بھی تھا جو ہماری جانب سے پیہم شکایتوں کے بعد محترم وزیر اعظم ہند کی ہدایت پر عمل میں لایا گیا تھا۔ یعنی سرکاری و غیر سرکاری نمائندوں پر مشتمل ایک ذمہ دار کمیٹی بنائی گئی تھی جو کسٹوڈین جنرل تک کے فیصلوں کے بعد انفرادی کیسوں کو انصاف کے نقطۂ نظر سے جانچتی تھی اور ہندوستان کے شہری مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو چیک کرتی تھی۔ اس لئے جتنے کیس چیک کئے اور غلط فیصلوں کی اصلاح کی اگر آج اس کا ریکارڈ دیکھا جائے تو بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس ڈپارٹمنٹ کے ذمہ دار اصحاب باستثنائے چند نیچے سے اوپر تک کس ذہنیت اور کن جذبات کے ساتھ کھلی ہوئی زیادتیاں کرتے رہے ہیں اور کس کس طرح غیر نکاسی مسلمانوں کو نکاسی بناتے رہے۔ مگر افسوس کہ آخر کار وزارت بحالیات کی تنگ نظری اس کمیٹی کو زیادہ عرصہ برداشت نہ کر سکی اور چھ سات ماہ سے زیادہ اس کی عمر نہ ہوئی۔

ہولناک ذہنیت

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ حکومت ہند کے انصاف پسند ارباب اختیار نے یہ دیکھتے ہوئے کہ کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے آٹھ نو سال کے عرصہ میں پوری تیزی کے ساتھ تخلیہ کنندگان کی جائیدادوں کو سمیٹ لیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے دست درازی فرمائی ہے۔ ایک اہم فیصلہ کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ ۱۹۵۴ء کے بعد قانون تخلیہ کنندگان کے تحت جائیدادوں کو نکاسی قرار دینے کے لئے نوٹس جاری نہیں کئے جائیں گے۔ تاہم اس ڈپارٹمنٹ کی ہولناک ذہنیت نے پھر بھی قانون میں ایک ایسی دفعہ اپنے لئے مخصوص کر لی جس کے تحت یہ سوچا سمجھا ہوا بہترین فیصلہ زخمی ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس مخصوص دفعہ کی بدولت آج تک ہر مسلمان کے سر پر خواہ کتنی ہی مرتبہ انکوائری اور تحقیق و تفتیش کے بعد غیر نکاسی قرار دیا جا چکا ہو۔ از سر نو تحقیق اور انکوائری کا خطرہ قائم اور کسٹوڈین کی جارحانہ گرفت بدستور مسلط ہے۔ میعاد و مدت کا چلتا ہوا ہتھیار اور بعض ٹیکنیکل حربے کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کے لئے اس پوری مدت میں بڑا سہارا بنے رہے۔ کتنے ہی ناواقف سیدھے سادھے اور دور دراز دیہات و قصبات کے رہنے والے مسلمانوں کی جائدادیں پوری چابکدستی کے ساتھ صرف اس لئے ہضم کر لی گئیں کہ یہ یقین حاصل کر لینے کے باوجود کہ یہ مسلمان ہندوستان کے شہری ہیں اور بلاشبہ غیر نکاسی ہیں۔ لیکن ان کی درخواست یا اپیل چونکہ مقررہ میعاد کے بعد پیش ہوئی یا اس میں اور کوئی معمولی اصطلاحی خامی آ گئی ایسے صدہا کیسوں میں وزارت بحالیات نے انصاف کا منشا یہی قرار دیا کہ ان کی جائدادوں کو ہضم کر لیا جائے اور اپنے وطن عزیز ہی میں ان کو ان کے گھروں اور جائدادوں سے محروم کر دیا جائے۔ میں شری کھنہ جی سے کیا یہ دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ جسٹس اور انصاف کا یہی تقاضہ ہے کہ دیدہ و دانستہ شہریوں کی جائداد اور ملکیتوں کو ٹائم بارڈ کہہ کر یا ٹیکنیکل بنیاد بنا کر ہضم کر لیا جائے۔

شہر دہلی کے مسلم علاقوں میں مسلمان کرایہ داروں نے برسوں تک یہ التجائیں کیں کہ چونکہ ہمارے رہنے سہنے کے لئے اپنے مخصوص حلقوں کے سوا کہیں اور جگہ نصیب نہیں ہے۔ اس لئے نکاسی مکانوں کو کسٹوڈین کے پورے تخمینے پر ہمیں خریدنے کی

اجازت دی جائے۔ اور ان کو نیلام نہ کیا جائے۔ لیکن برسوں تک ان کی اس جائز مانگ کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ البتہ دس بارہ برس گذرنے کے بعد جب کہ انکی جائدادوں کا بہت بڑا حصہ دوسرے لوگوں کو الاٹ یا نیلام کر دیا گیا یا کلیمز میں دے دیا گیا تب گنے چنے مکان کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے کرایہ داروں کے حق میں دینے کا فیصلہ کیا۔ مگر چند ہی مسلم کرایہ دار ایسے مکان خرید پائے تھے کہ کچھ ہی دنوں بعد یہ فیصلہ سنا دیا گیا کہ چونکہ یہ مسلم حلقے سلم ایریا کے تحت ہیں۔ اس لئے تمام جائدادوں کو کارپوریشن کو منتقل کر دیا گیا اور اس طرح مسلمان کرایہ داروں کی بڑی تعداد جو آج بھی خریداری پر آمادہ ہے خریداری سے محروم کر دی گئی۔ اور اس طرح دہلی کے باشندوں پر دتی ہی کی سرزمین رہنے سہنے کے لئے تنگ کر دی گئی۔ ان حقائق سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے شہری مسلمانوں کے ساتھ انصاف و ہمدردی کی وہ تمام تدبیریں اور سہولتیں بھی جن کو آج شری کھنہ جی نے مسلم کنونشن کی تجویز کے خلاف شد و مد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اور اس طرح کسٹوڈین کے محکمے کے احسانات کو گنایا ہے۔ درحقیقت وہ وزارت بحالیات کی کوئی عنایت نہیں تھی بلکہ برسوں کی کاوشوں اور پیہم احتجاج اور اپیلوں کے بعد محترم وزیر اعظم ہند کی انصاف پسندی اور مداخلت کا نتیجہ تھیں کہ جو بدقسمتی سے وزارت بحالیات کی معاندانہ روش کی بھینٹ چڑھ گئیں اور عملاً جو بھی سہولت یا ہمدردی ایک ہاتھ سے دی گئی کچھ ہی دنوں بعد وہ دوسرے ہاتھ سے چھین لی گئی۔

جائیدادوں پر قبضہ مخالفانہ

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ پورے ملک میں صدہا مسلمان ایسے ہیں جن کو مسلسل جد و جہد کے بعد کسٹوڈین نے ہندوستان کا شہری تسلیم کر لیا اور ان کے ہاتھوں میں آج بھی کسٹوڈین کے محکمہ کے وہ کاغذات موجود ہیں جن میں ان کو اُن کی جائیدادوں کی واگذاری کے احکامات دیئے گئے ہیں۔ مگر افسوس وہ احکامات شرمندۂ تعمیل نہیں ہو رہے ہیں۔ کسٹوڈین کے دفتر میں جائیدادوں کی واپسی تسلیم ہے مگر جائیدادوں پر قبضہ مخالفانہ بدستور موجود ہے۔ اگر محترم کھنہ جی اجازت دیں تو ایسے ایک دو نہیں دس بیس سینکڑوں مسلمان ان کی خدمت میں پیش کئے جا سکتے ہیں کہ کسٹوڈین کے کاغذات میں بحال ہو گئے ہیں۔ مگر حقیقت میں ابھی تک بے حال ہیں۔ ایک خاص مسئلہ وقف علی الاولاد کا ہے جس کو کھنہ جی نے اپنے بیان میں ابھارا ہے سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ چودہ برس تک وزارت بحالیات کا قبضہ اور مسلسل عمل یہی رہا کہ وقف علی الاولاد ذاتی جائیداد کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس کو وقف نہیں مانا جا سکتا۔ اور اس طرح چودہ برس تک پورے ملک میں تمام وہ جائیدادیں جو وقف علی الاولاد تھیں بے تامل ہضم کر لی گئیں البتہ گذشتہ چند ماہ میں ایک خاص کوشش اور ایک اعلیٰ عدالت کے فیصلہ کی بنا پر وزارت بحالیات نے مجبوراً چند وقف علی الاولاد جائیدادوں کو وقف تسلیم کر کے ان کے متولیوں کو واپس کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم ان میں سے بھی بعض کیس ابھی تک زیر بحث ہیں۔

مساجد اور امام باڑے

کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی زیادتیوں اور چیرہ دستیوں کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مسلمانوں کی شخصی املاک و جائیدادوں کے ساتھ ساتھ ان کی مسجدوں امام باڑوں درگاہوں اور قبرستانوں تک بر دست ستم دراز کیا گیا۔ ان میں سے بہتوں کو نکاسی قرار دے کر ہضم کر لیا گیا یا پاکستان سے آئے ہوئے مظلوم رفیوجیز کے ہاتھوں اس مال غنیمت کا سودا کیا گیا۔ اور ان کو نیلام یا فروخت کر کے ان کی اصل حیثیت کو زائل کر دیا گیا اور اس طرح اس راہ میں عام اخلاقی تقاضوں اور انسانی روایات کو بھی پامال کیا گیا۔ لیکن کس قدر حیرت و افسوس کی بات ہے کہ ہمارے محترم کھنہ جی آج پوری جسارت کے ساتھ یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ ایسا کسی جگہ نہیں ہوا۔

چونکہ محترم کھنہ جی کا یہ جراُت آمیز بیان حقائق کے لئے چیلنج کا انداز لئے ہوئے ہے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے اس بیان کے ساتھ پورے ملک کی مساجد ما مقابر، درگاہوں کی فہرستوں میں سے بطور نمونہ صرف شہر اور دہلی کی چند مساجد کے اسمار پیش کر دوں، جن کو کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ نے نیلام کر دیا ہے یا محکمہ کے ہاتھوں دیدہ دانستہ بعض کی حیثیت عرفی کو زائل کر دیا گیا ہے اور جن کی واپسی و بحالی کے لئے ہماری جد و جہد اب بھی جاری ہے۔

مغربی بنگال کے مسئلہ کو محترم کھنہ جی نے چونکہ اس بیان سے جدا رکھا ہے۔ اور حال ہی میں اس کے متعلق ان کا ایک بیان الگ سے شائع ہوا ہے۔ اس لئے میں بھی یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ مغربی بنگال کے مسئلہ کو سر دست زیر بحث نہ لاتے ہوئے اپنے دوسرے بیان میں اس کی حقیقت حال کو واضح کروں۔

بہرحال کھنہ جی کے حالیہ بیان کے پس منظر اور کسٹوڈین ڈپارٹمنٹ کی چودہ سالہ ستم کوشیوں اور ایذا رسانیوں کے اس مختصر تذکرہ کے ساتھ مجھے برملا اعتراف ہے کہ اس سلسلہ میں پیہم اور مسلسل جد و جہد اور اس کے مقابلہ میں محکمہ کسٹوڈین کے حیلے بہانے اور عذر تراشیوں کے بعد محترم وزیر اعظم ہند کو یہ محسوس کرایا گیا کہ غیر نکاسی مسلمانوں کو ناجائز طور پر نکاسی کہہ کر وزارت بحالیات ان کو اپنا شکار بنا رہی ہے۔ ان کی توجہ اور مداخلت کے نتیجہ میں قانون تخلیہ کنندگان میں بھی اور کسٹوڈین کے طریقہ ہائے کار میں بھی بار بار ایسی ترمیمات اور تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن کی بدولت ایک حد تک کسٹوڈین کی مطلق العنانی کا دائرہ تنگ ہوتا رہا اور انصاف کی بے جان امیدیں سانس لیتی رہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محکمہ متعلقہ نے حقیقت پسندی کے ساتھ عام طور پر وہ پالیسی نہیں اپنائی جس سے وسیع پیمانے پر بے انصافیوں اور زیادتیوں کی

تلافی اور روک تھام ہو سکتی ۔

مجھ کو اس اقرار میں کوئی باک نہیں ہے کہ بعض انفرادی کیسوں میں وزارتِ بحالیات کی ابتدا سے لے کر آج تک کا ہے گا ہے اگر ہم نے پیہم جد و جہد کے ساتھ یہ واضح کیا ہے کہ ان کیسوں میں قانون کے خلاف کھلی ہوئی نا انصافی کی گئی ہے ۔ تو ذمہ دار افسران نے منت و احسان رکھتے ہوئے غریب غیر نکاسی مسلمانوں کو غیر نکاسی باقی رکھنے میں کبھی کبھی عزت افزائی فرمائی ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ہزارہا نا انصافیوں اور زیادتیوں کی تلافی چند آنسو پونچھ دینے سے کبھی نہیں ہو سکتی۔ پس اگر محترم کھنہ جی نے حقیقت پسندی کے پیش نظر اپنے بیان میں یہ جملہ تحریر فرمایا ہے۔

"اگر سہواً کچھ غلطیاں ہوئی ہیں، تو ان کی تلافی کی جا سکتی ہے ۔"

تو ایک بار پھر یہ گذارش ہے کہ معاملہ کا ایماندارانہ اور حقیقت پسندانہ حل وہی ہے جو کنونشن کی تجویزوں میں کہا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ اس ڈپارٹمنٹ کے ہاتھوں جو نا انصافی اور حق تلفی ہوئی ہے اس کا عملاً تدارک کیا جائے ۔ اور کاغذی سطح سے بڑھ کر اس کو عمل کے دائروں تک پہونچایا جائے۔ ان شخصی جائدادوں عبادت گاہوں، امام باڑوں اور قبرستانوں کو حسب تقاضۂ انصاف واپس کیا جائے۔ جو اپنے گھروں سے بے گھر کر دیئے گئے ہوں خواہ مغربی بنگال میں ہوں یا دلی پنجاب اور راجستان میں، ان کو پھر سے بسایا جائے۔ اور اس طرح ان کی پریشانیوں کی تلافی کی جائے ۔

آخر میں بہت ادب سے یہ گذارش کروں گا کہ ان معاملات کو حقیقت پسندانہ طور پر حل کرنے کا ایک اور صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ وزیر بحالیات ایک ایسی کمیٹی سرکاری حیثیت سے بنانے کی تجویز فرمائیں جن میں سرکاری غیر سرکاری دونوں طرح کے افراد شامل ہوں اور اس کمیٹی کو یہ طاقت حاصل ہو کہ وہ گذشتہ نا انصافیوں کو چیک کر کے ان کی تلافی کر سکے اور حکومت اس کے فیصلوں کو تسلیم کرے، ورنہ ظاہر ہے کہ دونوں طرف سے بیانات اور ایک دوسرے کی تردید سے یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہو سکتا ۔

محمد حفظ الرحمٰن

"خط کے آخر میں فہرست بھی درج تھی جس کی اشاعت یہاں ضروری نہیں"

محکمہ کسٹوڈین کی چیرہ دستیوں اور بے انصافیوں پر ہند پارلیمنٹ میں ایک بے لاگ تقریر

دہلی ۲۷ستمبر ۵۴ء لوک سبھا میں مولانا نے اپنی اس تقریر میں جہاں نکاسی جائیداد ایکٹ سے مسلمانوں کو پیش آنے والی مشکلات پر ممبران پارلیمنٹ اور حکومت کو توجہ دلائی اور یہ مطالبہ کیا کہ اب کسی جائیداد کو نکاسی قرار نہ دیا جائے ۔ وہاں یہ بھی اپیل کی کہ جو ...... جائیدادیں ٹیکنیکل وجوہات کی بنا پر نکاسی قرار دی گئی ہیں۔ ان کی بھی واگذاری ضروری ہے ۔ حضرت مولانا نے مخصوص انداز میں اس امر کی وضاحت کی کہ وہ مسلمانوں کو صرف ان کا حق دلانا چاہتے ہیں۔ پرشارتھیوں سے ان کے حقوق چھیننا مقصود نہیں ہے مولانا نے اس بات پر بھی زور دیا کہ پرشارتھیوں سے حکومت نے جو وعدے کر رکھے ہیں۔ ان کو پورا کرے مولانا کی اس مدلل اور پر زور تقریر کے باعث ایوان کی فضا بالکل بدل گئی جو ممبران مسلمانوں سے انصاف کے شاکی تھے ۔ انھیں بھی تسلیم کرنا پڑا کہ مسلمانوں کو ان کے حقوق سے محروم نہ کیا جائے ۔ اور کسی کو نکاسی نہ بنایا جائے ۔

حضرت مولانا کی تقریر جو انہوں نے ۲۵ ستمبر کو کی حسب ذیل ہے۔

صدر صاحب میں وزیر داخلہ کے بل پر تائید کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بل اس ہاؤس میں بروقت لایا گیا ہے ۔ معاوضہ اور نکاسی جائیدادوں کے سلسلہ میں جو دو بل ایک دوسرے کے آگے پیچھے لائے گئے ہیں وہ جیسا کہ ابھی ہمارے منسٹر صاحب نے فرمایا ایک دوسرے کے حصے ہیں ۔ مجھے افسوس ہے کہ پاکستان نے وہ طرز عمل اختیار نہیں کیا جو اس مسئلہ کو حل کرنے کے سلسلہ میں اختیار کرنا چاہئے تھا۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس دو ہی راستے تھے ایک راستہ یہ کہ دونوں حکومتوں کے درمیان کوئی اگریمنٹ ہو کہ .... جو جائیدادیں پاکستان میں ہمارے رفیوجی بھائیوں نے چھوڑی ہیں ان کا اور یہاں کا مقابلہ کر کے ایک انصاف کے ساتھ لین دین ہو جائے ۔ لیکن پاکستان اس بات کے لئے آمادہ نہیں ہے ۔ تب ہمارے

لئے دوسرا امانتر یہ ہے کہ ایک طرف یہاں جتنی جائیدادیں چھوڑی گئی ہیں۔ ان کو ویسٹ کریں اور مالکانہ حیثیت سے اس پر قبضہ کریں تاکہ رفیوجیوں کو جس حد تک ہم معاوضہ دے سکتے ہیں دے سکیں۔ معاوضہ کی بحث پہلے بل میں کافی آچکی ہے۔ اس لئے اسے بار بار دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس بات کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ پاکستان سے آنے والے مصیبت زدوں کو جتنا معاوضہ ملنا چاہئے اس کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ نکاسی بل کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف مرحلوں پر ایسی صورتیں ہمارے سامنے آئی ہیں کہ ہزاروں وہ آدمی جو غیر نکاسی تھے نکاسی بنا دیئے گئے۔

مثلاً ہم نے دیکھا کہ شروع شروع میں یہ بات تھی کہ قانون کے اندر کوئی شخص بھی اگر اپنی جگہ سے ڈسپلیسڈ ہو گیا اور وہ اس کا انتظام نہیں کر سکتا ہے۔ وہ نکاسی بن سکتا ہے حالانکہ وہ ہندوستان میں ہی ہے۔ صرف ایک جگہ سے اکھڑ کر دوسری جگہ چلا گیا۔ لیکن اس وقت قانون کے پیش نظر یہ بات ضروری تھی اس وجہ سے سیکڑوں اور ہزاروں آدمیوں کو نقصان پہنچا اور وہ تمام جائیدادیں کسٹوڈین کے قبضہ میں آگئیں اس طرح ٹیکنیکل گراؤنڈ کی بنا پر دوسری مشکلات پیش آئیں۔ مثلاً یہ ...... کہ اگر کسی شخص نے واجبات ادا نہیں کئے تو صرف نوٹس بورڈ پر یہ لکھنا کافی سمجھا گیا کہ فلاں جائیداد کو ہم ویسٹ اور قبضہ میں کر رہے ہیں۔ ذاتی طور پر کسی نوٹس کی تعمیل کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اس کی بناء پر جاہل ان پڑھے آدمی بلکہ میں تو کہوں گا کہ پڑھے لکھے آدمی جن کو نوٹس بورڈ وغیرہ دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا وہ اس کی لپیٹ میں آگئے۔ اگر انہوں نے اپنے لئے کوئی چارہ بھی تلاش کر لیا تو بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ ان کو یہ پتہ نہیں چلا کہ ہماری جائداد کب ویسٹ کر دی گئی کب نکلی اور کب نکاسی بنا دی گئی۔ میرا ارادہ نہیں ہے پاکستان جانے کا ایک منٹ اور سکینڈ کے لئے بھی لیکن میری جائداد نوٹس بورڈ پر نکاسی بنا دی گئی اور مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں اور دو مہینہ کی مدت گذر گئی اور اس کی اپیل کا وقت بھی نکل گیا۔ ایسی تمام باتوں کو دیکھ کر ایسی سہولتیں بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی کہ کسی طریقہ سے ٹیکنیکل گراؤنڈ پر یا کسٹوڈین کے آرڈر کے مطابق ہزار ہا آدمی جو غیر نکاسی ہیں وہ نکاسی نہ بنا دیئے جائیں یہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ ان کو بھی یہیں رہنا ہے۔ وہ بھی یہاں کے باشندے ہیں۔ جیسا کہ ابھی ایک ممبر نے کہا کہ یہاں کے بسنے والے کسی شخص کو کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہئے اور کوئی اس کے ساتھ ظلم نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن عمل ایسا رہا ہے کہ اس میں ہزاروں آدمی اس ظلم کے نیچے آئے ہیں۔ کس طرح غیر نکاسیوں کو نکاسی بنانے کی کوشش کی گئی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت مولانا احمد سعید صاحب جیسے قومی رہنما پر جو ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے پاکستان بننے کی مخالفت کی۔ نوٹس تعمیل ہوتا ہے کہ آپ کی جائیداد نکاسی بنائی جارہی ہے اس لئے کہ آپ پاکستان جارہے ہیں۔ مجھے اس پر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا ما درا ہیں کے بعد میں نے جاکر کسٹوڈین کے دفتر میں دریافت کیا اور کہا کہ ایک ایسا آدمی جو صبح شام تک حکومت کے تمام معاملات سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پاکستان میں جگہ ملنا دشوار ہے اور جس کا کہ ارادہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ پاکستان جائے۔ آپنے اسکو ادیکوئی بنا دیا تو جواب ملا ہے۔ کہ ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ قانون کے مطابق کیا ہے۔ اور قانون کے مطابق ون ٹو آل ہر مسلمان پاکستان جانے والوں میں شمار ہے۔ اب یہ بوجھ اس مسلمان پر ہے کہ وہ اس بات کا جواب دے کہ وہ پاکستان جانے کے قابل ہے یا نہیں، یا وہ پاکستان جائیگا یا نہیں جائیگا۔

میں پرائم منسٹر کی نولیج میں دیر سے لایا اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ کاش تم اسے وقت پر لاتے۔ ایک اور مثال مسٹر آصف علی کی ہے کہ ان کی جائیداد بھی نکاسی بنا دی گئی ہے۔ روشن آرا گارڈن کی ایک پارٹی میں مرحوم مسٹر آصف علی نے جب اڑیسہ کے گورنر تھے مسٹر اچھرو رام (سابق کسٹوڈین جنرل) سے جو وہاں موجود تھے اور میں بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ہنس کر کہا کہ میری جائیداد بھی نکاسی ہوگئی۔ آپ غور کیجئے کہ کس کس طریقہ سے حالات پیش آئے اور ان حالات کے ہوتے بھی انصاف کا تقاضہ تھا کہ کل کو جب حالات نارمل ہوں گے۔ تو آج جو ہماری جائیدادیں کسٹوڈین نے غلط طور پر لی ہیں وہ واپس کی جائیں۔ "لیکن ہم نے دیکھا کہ منسٹر صاحب ایک پارٹ سامنے لائے جس میں کہا گیا کہ ہم مالکانہ قبضہ کرنے کے بعد کمپنشین پول میں ان تمام جائیدادوں کو دے رہے ہیں۔ تو اس صورت میں قدرتی طور پر ان لوگوں کو جو یہاں کے رہنے والے ہیں اور جو ایک منٹ کو بھی پاکستان جانا نہیں چاہتے ان کا یہ محسوس کرنا قدرتی ہے کہ اب ہم پر پابندی کیوں لگائی جاتی ہے۔ اور اب ہم پر اس قسم کی پابندی کیوں عائد کی جارہی ہے۔ آخر ہمیں بھی تو کبھی نہ کبھی نجات ملنی چاہیئے۔ ساڑھے چار کروڑ کے قریب مسلمان آج اس دیش میں رہ رہے ہیں۔ وہ بھی تو محسوس کریں۔ دستور میں جو ایک برابری کا حق دیا گیا ہے وہ محض ایک کتاب میں لکھی ہوئی چیز ہی نہیں رہ جانی چاہئیے۔ بلکہ چلتے پھرتے روزانہ زندگی میں اور بازار میں وہ ہمارا حق نظر آنا چاہئیے۔ ہم بھی اس طریقہ سے آزاد ہیں جس طرح ہمارے بھائی دیش بانڈے جی آزاد ہیں۔ اپنی جائداد کو بیچنے میں ان پر کوئی پابندی نہیں ہے اسی طرح سے حفظ الرحمٰن کو بھی پوری آزادی ہونی چاہئیے۔ اور دونوں میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئیے۔

۱۹۶۱ء کا ایک بیان

واقعات کی وضاحت

الجمعیۃ ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۱ء

۱۱ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے اپنے ایک مدلل بیان میں وزیر داخلہ یو۔پی مسٹر چرن سنگھ کے ان الزامات کی پُر زور تردید کی کہ جمعیۃ علماء نے علیحدگی پسندی کا رویہ اختیار کیا ہے اور علی گڑھ، میرٹھ وغیرہ کے فساد مسلم کنونشن کے نتیجہ میں ہوئے ہیں۔ آپ نے اس ذہنیت پر اظہار افسوس کیا کہ ظالم گروہ کے ساتھ ساتھ مظلوم طبقہ پر بھی الزامات لگا کر ترازو کے پلڑوں کو برابر کیا جائے۔ بیان کا پورا متن یہ تھا:۔

یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں صاحب اقتدار ہستیوں میں بہت کم ایسے ہیں اور انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہیں کہ جو جرأت اور ہمت کے ساتھ حق و صداقت کی خاطر سچی بات ظاہر کرتے ہیں۔ ورنہ تو عام طور پر یہ ہو رہا ہے کہ اگر کوئی سچی بات کہتا ہے اور جرأت کے ساتھ ظلم کو ظلم کہنے پر آمادہ ہوتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ ترازو کے دونوں پلڑے برابر کرنے کے لئے مظلوم طبقہ پر بھی وہی الزامات عائد کر دیتا ہے جو ظلم کرنے والوں پر عائد ہوتے ہیں۔

کل ہی ہمارے چودھری چرن سنگھ صاحب ہوم منسٹر یو۔پی نے ایک پریس کانفرنس میں موجودہ فسادات کی صحیح صورت حال ظاہر کرتے ہوئے ایک طبقہ کی مظلومیت کا اقرار کرتے ہوئے دو سوالوں کے جواب میں یہ فرمایا کہ ہاں ان فسادات کو مسلم کنونشن کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ جمعیۃ علماء بھی جو کلچرل، سوشل اور مذہبی جماعت ہے مسلمانوں میں علیحدگی پسندی کے رجحانات پیدا کرتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس وقت جب کہ فسادات کے فرو کرنے میں چودھری صاحب سرگرمی سے مصروف عمل ہیں۔ ان کے بیان پر کچھ تبصرہ کروں لیکن مجھے افسوس ہے کہ ایسے نازک موقع سے ناجائز فائدہ اٹھا کر چودھری صاحب نے جو الزام مسلم کنونشن اور جمعیۃ علماء پر لگایا ہے اس کے غلط ہوتے پر حقیقی صورت حال واضح کر دوں۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی الیکشن کا بہانہ بنا کر باہر کے طلباء جگہ جگہ فساد کریں اور فساد زدہ علاقوں کے اکثر و بیشتر حصوں میں اکثریت کی بھی عام پبلک اس میں دلچسپی نہ لے اور ایسی حالت میں اس فساد کو مسلم کنونشن کے ساتھ جوڑ دیا جائے۔

عام طور پر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ فساد سے ہندو مسلم پبلک کوئی دلچسپی نہیں لے رہی ہے بلکہ صرف گمراہ طلباء اور ان کے ساتھ شرپسند عناصر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ کنونشن کا اثر اگر ہوتا تو عام پبلک پر ہوتا اسی طرح جمعیۃ علماء ہند ۱۹۴۷ء سے قبل و بعد اپنے عمل و کردار میں ہمیشہ علیحدگی پسندی کی مخالف رہی۔ اور آج تک ہے اور ہندوستان میں سیکولرزم کی کامیابی اور قومی یک جہتی کی جد و جہد میں نمایاں طور پر سارے ہندوستان میں اپنا کیرکٹر پیش کر رہی ہے اور اس کی شہادت آسانی کے ساتھ شمال و جنوب، مشرق و مغرب کے ہر کونے میں ہندو سکھ بھائیوں سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے جو جماعتی کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ چودھری صاحب یا ان کے دوسرے دوستوں کو یہ بات بھی علیحدگی پسندی نظر آتی ہو کہ مسلمانوں کو امن و زندگی کے تمام شعبوں میں نابرابری سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اس کو دور کرنے کے لئے وہ بیباکی اور جرأت کے ساتھ کیوں جد و جہد کرتی ہے اور خاموش ہو کر اپنے آزاد ملک میں بے کسی و بے بسی کا مظاہرہ کیوں نہیں کرتی! یہ جرم بیشک ایسا ہے جس کے لئے جمعیۃ علماء اقبالی مجرم ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

کاش! کہ آج مہاتما گاندھی زندہ ہوتے تو وہ آپ کو بتاتے کہ جمعیۃ علماء ہند کے کارکنوں نے ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لئے اس کے کارکن کی حیثیت سے کیا کچھ کیا۔ اور ہندوستان میں امن قائم کرنے کے لئے کتنی محنت کی ہے یا ہندوستان کا مسلّمہ لیڈر جواہر لال نہرو ان دونوں باتوں میں فرق سمجھتا ہے اور دونوں کو جدا جدا حقیقتیں جانتا ہے۔ میں پھر ایک بار کہوں گا کہ ایسے موقع پر اقتدار کے زعم میں چودھری صاحب کو ایسی باتیں نہ کہنی چاہئیں جو ان کے لئے موزوں نہیں ہیں اور وقت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرنا چاہئے کہ یہ بڑوں کے لئے پسندیدہ اور سزاوار نہیں ہے۔ جمعیۃ علماء میں سینکڑوں کی تعداد میں وہ لوگ شریک ہیں جن کا کردار و عمل قومی یک جہتی میں سب سے زیادہ نہیں تو ان سے کم بھی نہیں ——!

ضلع بھرائچ میں

سیرت سرکار دوعالم ﷺ پر ایک مبسوط تقریر

سیرت سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کا خاص موضوع تھا۔ مولانا مرحوم نے اس عنوانِ مبارک پر ملک کے چپہ چپہ پر ہزاروں تقریریں فرمائیں۔ اُن کی ایک مبسوط تقریر جو انہوں نے ۲۹ نومبر ۱۹۵۹ء کو نانپارہ ضلع بہرائچ میں تقریباً ڈھائی گھنٹہ مسلسل ارشاد فرمائی ہم ذیل میں شائع کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے حالات میں وہ اُسوہ رسول کریمؐ کے مختلف پہلوؤں کو کس طرح پیش فرمایا کرتے تھے۔ (بشکریہ حاجی مقصود احمد صاحب۔ ساکن نانپارہ۔ ضلع بہرائچ) ....

صدر محترم!

بزرگو اور دوستو! سیرت پاک کے اس مقدس اجتماع میں آپ نے مجھے دوبارہ موقع دیا ہے۔ دوسال پہلے بھی میں آپ کی خدمت میں آچکا ہوں۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ میں نے کہا تھا کہ سیرۃ پاک بیان کرنے کے دو طریقے ہیں عقلی اور ایمانی۔ ذکر پاک سے نور ایمانی کو رونق بخشنے کا مقصد ایک بابرکت مقصد ہے لیکن جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ آپ نے اس اجتماع کو مسجد میں نہیں بلکہ میدان میں کیا ہے جیسے منڈی کی اس سڑک پر آپ دیکھ رہے ہیں آپ نے ہر شخص کو دعوت عام دی ہوگی اس میں مسلمان بھی ہوں گے اور غیر مسلم بھی سوال یہ ہے کہ اگر میں صرف رسولِ پاک کی عقیدت کا ذکر کروں تو غیر مسلم کیا فائدہ حاصل کر سکیں گے غرض یہ ہے کہ حسن عقیدت کے ذریعہ سے نہیں بلکہ عقلی حیثیت سے سیرت پاک کو پیش کروں جو عقل کے ذریعہ دنیا کو سمجھاؤں تاکہ تمام دنیا کے لئے یکساں فائدہ بخش ہو۔

رسول اکرم نے جس کتابِ الٰہی کو دنیا کے سامنے پیش کیا اس کے صفحہ اوّل کا پہلا جملہ الحمد للّٰہ رب العالمین پکار کر آواز دیتا ہے کہ اے دنیا کے لوگو سب تعریفیں اس خدا کے لئے ہیں جو تمام عالم کا رب ہے، وہ تنہا مسلمانوں یا کسی قوم کا رب نہیں ہے بلکہ اس کی ربوبیت ہمہ گیر غیر محدود ہے۔ اس کے دائرۂ ربوبیت سے کوئی باہر نہیں ہے اس کتاب الٰہی کا یہ بھی اعلان ہے کہ رسول پاک کی ذات رحمۃ للعالمین ہے اس کی رحمت کا دائرہ بھی تمام عالم انسانیت کو محیط ہے۔

اس بنا پر مجھے کہنے کا موقع دیجئے کہ اس انداز سے رسول پاک کی سیرت مبارک کو پیش کروں تاکہ غیر مسلم بھی رحمت عالم کی سچائی کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکیں۔

رسول کریم نے دنیا کے اندر جو انقلاب پیدا کیا اُسے نماز اور روزہ ہی میں مخصوص کر کے نہیں چھوڑ دیا بلکہ حیات انسانی اور دنیاوی زندگی کے جتنے بھی شعبے ہیں سبھی میں انقلاب پیدا کیا معاشی اور اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس میں غیر معمولی انقلاب پیدا نہ کیا ہو۔

رسول کریم نے دنیا کے سامنے اعلان کیا "لا الٰہ الا اللّٰہ" خدا کے سوا کوئی قابل پرستش نہیں۔ اس اعلان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ساری دنیا خدا کو ایک ہی مانتی ہے۔ وہ چاہے جس کا نام پکارے نام مختلف ہیں، ذات واحد ہے میرا تو دعویٰ ہے کہ خدا کو ماننے میں صرف مذہب والے ہی نہیں بلکہ منکر خدا بھی خدا کو مانتے ہیں۔ اس بنا پر کہ آپ دیکھیں جب کوئی کہتا ہے کہ "خدا کوئی چیز نہیں ہے" یہ کہنے پر اس کے دل میں کھٹک ضرور پیدا ہوتی ہے

ایک دیوار کو دیکھ کر جب کوئی یہ کہتا ہے کہ دیوار اندھی ہے اور دوسرا برخلاف اس کے کہتا ہے کہ اندھی نہیں ہے۔ پہلا ایک حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا لیکن دوسرا جب ایک بے حقیقت بات بیان کرتا ہے تو اس کے دل میں کھٹک کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح جب کوئی کہتا ہے کہ میں کسی طاقت کو نہیں مانتا تو اس کے دل پر ضرور چوٹ لگتی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے ؎

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا
بس جان گیا میں تیری پہچان یہی ہے

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کلمہ کو پیش کر کے انقلاب عظیم رونما کیا وہ کلمہ صرف مسلمانوں کا کلمہ نہیں بلکہ دنیائے انسانیت کے لئے ایک پیغام حیات ہے سارے عالم کو توجہ دلائی کہ اس کلمہ کا تعلق صرف اس بات سے نہیں ہے کہ اسلام یا ایک مذہب کہتا ہے بلکہ بتقاضائے فطرت انسانی اس خدا کی طرف سے پیش ہونیوالا کلمہ ہے جس خدا کا قانون قدرت دنیا میں مکمل طور پر کارفرما ہے۔ سب اس کے قانون قدرت سے بندھے ہوتے ہیں مادی اور روحانی دونوں زندگی میں اسی کی کارفرمائی ہے دنیا دیکھ سکتی ہے کہ ہر ایک کی فطرت بلندی سے پستی کی طرف مائل ہے۔

ڈھیلا، مٹی، پتھر، اینٹ جن کا تعلق مادیات سے ہے کسی بھی قوت کا سہارا لئے بغیر ایک لمحہ کے لئے بھی بلندی حاصل کرنے سے قاصر ہیں میں صرف ایک ٹھیکری کو اوپر اچھالتا ہوں لیکن وہ اوپر جا کر فوراً نیچے واپس آجائے گی۔ درخت سے لگا ہوا ناریل شاخ سے جب ٹوٹتا ہے تو اسے نیچے ہی آنا پڑتا ہے اوپر نہیں جاتا جس کے بارے میں ساتویں آٹھویں کلاس کا ایک بچہ تک بھی کہے گا کہ زمین کی کشش کے سبب ایسا ہوتا ہے لیکن اس جواب سے خدا کے ماننے والے کو اطمینان نہیں ہوتا کیونکہ یہ امر جبکہ مسلمہ ہے جس کی تصدیق سائنس بھی کرتی ہے کہ لاکھوں ستارے بیشمار سورج اور چاند جو کہ خلاء میں موجود ہیں ان میں کافی کشش ہے پھر یہ چیزیں اوپر کیوں نہیں جاتیں۔ اس کا جواب سائنس کے پاس نہیں ہے بلکہ مذہب جواب دیتا ہے کہ اے انسان دل کی آنکھ سے دیکھ! بلندی صرف خدائے واحد کو حاصل ہے حیوانات، جمادات اور نباتات کی ہر شے کا مشاہدہ کر یہ درخت جس کے پتے پھول اور پھل بلندی پر نظر آتے ہیں اُن سب کی زندگی کا دارومدار صرف اسی جڑ پر ہے جو نیچے ہے ہر پرندے کی جھکی ہوئی خوبصورت چونچ ظاہر کرتی ہے کہ درحقیقت میری فطرت پستی کی طرف مائل ہے۔ اے انسان تو اپنے نفس کو ٹٹول دیکھ تیرے ہاتھ بھی تو پستی کی طرف جھکے ہوتے ہیں کہ جن کے ذریعہ تو اپنی قوت کا مظاہرہ کرتا ہے تو اپنے قلب کو بلندی سے پستی کی طرف لٹکتا ہوا پائے گا کہ جس کی حرکت پر تیری زندگی کا وجود ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو بلندی سے پستی کی طرف مائل نہ ہو۔ اس لئے کہ یہ ہر ایک کی فطرت ہے اور کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے جس میں اپنی فطرت کی خلاف ورزی کرنے کی صلاحیت ہو۔

قدرت نے جو انسان کی پیشانی کو بلند بنایا ہے اُس میں ایک مصلحت ہے جب آپ انانیت کے جذبہ میں آتے ہیں تو کہہ اُٹھتے ہیں کہ شہنشاہوں کے سامنے بھی میری پیشانی نہیں جھکتی۔ قدرت کا اعلان ہے کہ ساری چیزیں تیری خدمتگذار ہیں وہ سب تیرے لئے ہیں مگر تیری پیشانی صرف خدا کے لئے ہے اُسے جو بلندی دی گئی ہے اس لئے نہیں کہ مخلوق کے سامنے جھکے وہ اگر جھکے گی تو صرف خدا کے سامنے ہی جھکے گی۔ لاالہ اللہ کا یہی وہ تصور ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

ہر شخص مانتا ہے کہ چھوٹا ہی بڑے کے سامنے جھکتا ہے بڑا چھوٹے کے سامنے نہیں جھکتا۔ لیکن انسان مخلوق میں سب سے بڑا ہونے کے باوجود درخت، پتھر، چاند، سورج اور نہ جانے کتنے باطل اور خود ساختہ معبودوں کے سامنے جھکتا ہے۔ اے انسان تو کس قدر گراوٹ پر اتر آیا ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ ساری کائنات تیری مٹھی میں ہے تو سائنس کی مدد سے خلاء میں چاند میں اور دوسرے سیاروں میں پہنچ سکتا ہے بلکہ سورج پر بھی فتح حاصل کر سکتا ہے۔ میں نے تیرے ہاتھ میں مخلوق کو مسخر کر رکھا ہے لیکن تو میرے سامنے سجدہ ریز نہیں ہوتا؟

رسول اکرمؐ کی بعثت سے قبل عرب کے لوگ خدا کو مانتے تھے لیکن ان کا کہنا تھا کہ جنگ کی دیوی، صلح کا دیوتا بارش کی دیوی اور رزق کا دیوتا الگ الگ ہے یہ سب مل کر ایک خدا کی قوت بنتے ہیں اور ساری چیزیں اس کے ید قدرت میں مسخر ہیں وہ ہمہ گیر قوت اور طاقت کا مالک ہے۔

بالآخر رسول اکرمؐ نے دنیا کے سامنے جو نقطہ نظر پیش کیا دنیا کو ماننا پڑا۔ روح اس بات کی خواہشمند ہوئی کہ میرے جسم کو تو غذا اور پھلوں سے طاقت دی جاتی ہے لیکن میں ہوں مجھے معرفت کی غذا چاہیئے۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ متمدن ممالک میں ہندوستان۔ ایران اور رومتہ الکبریٰ کا طوطی بول رہا ہے اُن میں دانش ہے اپنی غذا کی تلاش انہیں میں چل کر کرنی چاہیئے۔ اس روح نے ہندوستان پہونچکر اپنی غذا طلب کی۔ ہندوستان نے کہا کہ مختلف دیوی دیوتاؤں کی پوجا کئے بغیر نہ تو ایک خدا کی عبادت کر سکتی ہے اور نہ اس کی معرفت کی غذا حاصل کر سکتی ہے روح نے منہ پھیر لیا اور کہا کہ جب ایک غلام دو مالک کا بیک وقت فرمانبردار نہیں بن سکتا تو میں ان سینکڑوں کی وفادار کیسے بن سکتی ہوں وہ رومتہ الکبریٰ گئی۔ پاپائے روم نے کہا کہ اے روح تو اپنے صحیح مقصد تک پہونچی ہے لیکن یاد رکھ پہلے تجھے باپ بیٹا اور روح القدس ان تینوں پر ایمان لانا ہوگا پھر انہیں میں تجھے خدا اور اس کی معرفت کی غذا ملے گی۔ روح نے انکار کیا اور کہا کہ ایک تین نہیں ہو سکتا۔ وہ ایران گئی فیثا غورث کے شاگرد زرتشت نے کہا کہ اے روح یاد رکھ یہاں خدا کی دو طاقتیں ہیں نیکی کا خدا یزدان اور بدی کا خدا اہرمن ان کے بغیر تجھے خدا کی معرفت کی غذا نہیں مل سکتی۔ روح

کو یہاں سے بھی ناامید ہونا پڑا۔ اس نے سوچا کہ جب دنیا کے متمدن ممالک میں جہاں عقل و دانش کے چراغ جل رہے ہیں وہاں ہم کو اپنی غذا نہیں مل سکتی اور کہاں ملے گی۔ ایک پہاڑ کی بلند چوٹی پر گئی اور طے کیا کہ گر کر مرجانا چاہیئے۔ گرنا ہی چاہتی تھی کہ ایک کمبل پوش نے جھلستے ہوتے ریت کے تودوں سے نکل کر ایک تپتی ہوئی پہاڑ کی چٹان سے پکار کر کہا کہ اے روح خودکشی نہ کر آ تیری غذا میرے پاس ہے۔ میری سن روح نے کہا متمدن ممالک سے تو خدا کی معرفت کی غذا ملی نہیں یہاں کہاں ملے گی کملی والے نے کہا: - قل ھو اللہ احد اللہ الصمد لم یلد و لم یولد ولم یکن لہ کفواً احد۔ ہندوستان کی دیوی دیوتاؤں کا محتاج میرا خدا نہیں ہے کیونکہ ھو اللہ احد اللہ اکیلا ہے روم تہ الکبریٰ کے باپ بیٹا اور روح القدس کی تثلیث توحید کے منافی ہے اس لئے "لم یلد ولم یولد" نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ ایران کے زرتشت نے بھی یزدان اور اہرمن دو متضاد صفات کے حامل اور اور برابر کی طاقت رکھنے والی خداؤں کی تصویر ری غلط پیش کی۔ "ولم یکن لہ کفواً احد" میرے خدا تے واحد کی طاقت کے برابر کوئی خدا نہیں ہے وہ قادر مطلق ہے یہ نہ دیکھ کہ کہاں کا رہنے والا کہہ رہا ہے۔ یہ دیکھ کہ کیا کہہ رہا ہے۔ روح نے اس کملی والے کی بات کو سنتے ہی اطمینان کا سانس لیا اور پکار اٹھی کہ بے شک میری غذا تیرے ہی پاس ہے۔

قدرت نے اس ریگستانی پہاڑی اور غیر متمدن ملک میں رسول اکرم صلعم کو اس لئے بھیجا تاکہ دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ عقل و دانش کے چراغوں سے علم کی روشنی حاصل کر کے ضابطۂ حیات انسانی پیش کیا ہے۔ خدا کو بیچ میں ڈال کر اعلان نبوت جو کیا ہے فرضی ہے۔ ساری دنیا متحیر ہے اور جانتی ہے کہ یہ وہ ہستی ہے جس نے کسی کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا لیکن پھر بھی دنیا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا۔

رسول اکرم صلعم نے عرب کی جاہل اور اجڈ قوم میں جب یہ اعلان کیا تھا کہ "ساری مخلوق صرف ایک کی ہے تو قوم نے زبردست بغاوت کا مظاہرہ کیا سارا عرب دشمن بن گیا۔ بقول کارلائل کے کہ "جب تک اعلان نبوت نہیں کیا تھا سب دوست تھے اور اعلان نبوت پر سب دشمن ہو گئے۔ رسول اکرم صلعم نے طائف کے میدان میں تین باتیں پیش کی تھیں ایک خدا کی پرستش (۲) بیواؤں اور یتیموں کی سرپرستی (۳) اور عفت و عصمت کی حفاظت" لیکن طائف والوں نے زخمی کیا۔ شکاری کتے پیچھے لگا دیئے۔ گالیاں سنائیں۔ پتھروں کی بارش کی مگر زبان مبارک سے احد احد کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ مؤرخ کہتا ہے کہ پتھراؤ کے سبب جب آپ بیٹھ گئے تو حضرت زیدؓ ابن حارثہ پروردۂ آغوش رحمت و پروانۂ شمع رسالت اس حالت کو دیکھ کر بے قرار ہو گئے اور کہا کہ آپ ان کو جہنم سے جنت میں لانا چاہتے ہیں اور وہ آپ پر ایسا ظلم ڈھاتے ہیں بددعا کیجئے کہ یہ سب برباد ہو جائیں۔ ایک پادری کا کہنا ہے کہ ایک جیتے چہرہ بدل گیا اور فرمایا اے زید تو نے کیا کہا کہ یہ لوگ مارتے ہیں تو میں بددعا دوں مجھے تو اللہ نے رحمت عالم بنا کر بھیجا ہے ہاتھ اٹھاتے ہیں اور فرماتے ہیں اے میرے پروردگار میری قوم کو ہدایت دے یہ مجھے نہیں جانتے اور پہچانتے۔ اے میرے خدا تو ان کو سمجھا اور ان کو ہلاکت میں نہ ڈال ممکن ہے کہ ان میں یا ان کی اولاد میں کوئی سعید روح پیدا ہو جو تیرا کلام سنے اور قبول کرے میرے مولا تیرے ہی پاک چہرہ میں پناہ لینا چاہتا ہوں اگر تو میرے ساتھ ہے تو مجھے کچھ خطرہ نہیں"

دنیا کہتی تھی کیا رسول کیا پیغمبر ہماری عقل کافی ہے ہم رات دن روشنی اور تاریکی کی پہچان خود کر سکتے ہیں تو نبی کی ضرورت نہیں۔

فطرت کی طرف سے جواب ملا کہ عقل و دانش مجبور کرے تب تو ماننا ہی ہوگا۔ آنکھ میں روشنی موجود ہے لیکن بلب گل کر دیتے جائیں تو آنکھ کی روشنی جواب دیدے گی۔ انتہائی تاریکی میں جب ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اگر کوئی کہے کہ آنکھ تو موجود ہے کیوں سجھائی نہیں دیتا اس کا جواب یہی تو ہوگا کہ قانون قدرت کا یہی اصول ہے کہ روشنی ہی سے آنکھ کو روشنی حاصل ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مادی زندگی کے لئے جب یہ اصول ہے تو کیا روحانی زندگی کے لئے باہر کی روشنی کی ضرورت نہیں؟ ماننا ہوگا کہ نبی کی روشنی کے بغیر یہ زندگی نہیں بن سکتی اور نہ ہی خدا کی سچی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔

انسان کا عجیب عالم ہے گراوٹ پر آجاتے تو دنیا کی ہر چیز کو سجدہ کرنے لگے اور انانیت پر آجاتے تو انا ربکم الاعلیٰ کا دعویٰ کرنے لگے لیکن رسول پاک نے جو دعوت پیش کی اور جو انقلاب رونما کیا وہ انقلاب انسان کو اس کے صحیح مقام پر پہنچانا تھا تعلیم دی کہ اے انسان نہ اتنا گھٹ کہ ہر چیز کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے اور نہ اتنا بڑھ کہ خدا بن جائے۔ اے انسان تو ساری دنیا کا سردار اور تیرا سردار ساری دنیا کا خالق ہے۔ محمد خدا کے پیغمبر اور بندے ہیں یاد رکھو یہ نہ کہنا کہ رسول کی ضرورت نہیں ہے یہ بھی نہ کہنا کہ رسول خدا کا بیٹا ہے۔

نبی اور رسول کے لئے معصوم ہونا ضروری ہے اس لئے کہ جب دو متضاد چیزیں ہوتی ہیں تو ان میں درمیانی رابطہ پیدا کرنے والی تیسری چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہڈی اور گوشت دو متضاد چیزیں ہیں ان کے تعلق کو پٹھے اور رگوں کے بغیر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح روحانی قانون قدرت بھی یہ ہے

کہ ایک طرف خدا کی ذات ہے اور دوسری طرف انسان درمیانی رشتہ کو قائم کرنے کے لئے کسی واسطے کی ضرورت ہے اسکی سبیل یہ ہے کہ ایک انسان تمہاری طرح کا جو کہ تمہارے ساتھ کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہو جس سے کہ تم مانوس ہو لیکن معصوم ہونے کی حیثیت سے امتیازی شان بھی رکھتا ہو وہی اس ربط کو قائم رکھ سکتا ہے چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معصوم ہستی خدا اور انسان کے درمیان رشتہ قائم کرنے والی ایک مضبوط کڑی ہے جسے ہم رسول، نبی یا پیغمبر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ دنیا قانون قدرت کی اس بات کو تسلیم کئے بغیر خدا سے کوئی رشتہ قائم نہیں کر سکتی۔

دنیا کی کوئی چیز تین حالتوں سے خالی نہیں ہے (۱) آغاز۔ (۲) بتدریج ترقی کرنا (۳) درجہ کمال۔ بچہ پیدا ہوتا ہے یہ اس کا آغاز ہے پرورش پاتا ہے اور بڑھتا رہتا ہے یہ اس کے بتدریج ترقی کرنے کی حالت ہے۔ بچپنے میں اس کے لباس چھوٹے بنتے ہیں اس کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ لباس بھی بتدریج بڑے بنتے رہتے ہیں۔ جب جوانی پر پہنچتا ہے تو باپ کہتا ہے کہ اب تو صاحبزادے کے جسم پر میرے کپڑے بالکل ٹھیک ہوتے ہیں درجۂ کمال تک پہونچنے کے بعد میں کا بڑھنا رک جاتا ہے ایسا نہیں ہوتا کہ بڑھتا ہی رہے اس لئے کہ یہی قانون قدرت ہے تاریکی کو دور کرنے کے لئے پہلے چراغ وجود میں آیا پھر شمع کافوری اور موم بتیاں ایجاد ہوئیں۔ گیس آئی آخر میں بجلی نے آکر اپنی روشنی کا ایسا سکہ جمایا کہ کوئی نہ ٹھہر سکا ستارے چمکتے ہیں۔ ہلال چاند کی پہلی رات کو نمودار ہو کر بتدریج ترقی کرتے کرتے چودھویں کی شب میں بدر کامل بنکر تمام عالم کو روشن کر دیتا ہے مگر دنیا کہتی ہے کہ ابھی رات ہے ان میں سے کسی نے رات کو ختم کر دینے والا انقلاب پیدا نہیں کیا۔ لیکن سورج کے نکلتے ہی دنیا یوں اٹھتی ہے انقلاب ہو گیا دن نکل آیا۔ یہ تو مادی دنیا کا انقلاب ہے لیکن یاد رہے کہ روحانیت میں بھی یہی قانون قدرت کارفرما ہے۔ انسانوں کی رہنمائی کے لئے آدم کا دیا جگمگایا نوح کی شمع کافوری روشن ہوئی۔ ابراہیمؑ۔ موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بتدریج ترقی کرتے کرتے بدر کامل بنکر چمکے۔ لیکن انسان کہتا رہا ابھی تو رات ہے یہ کب ختم ہو گی روحانیت کا آفتاب کب نمودار ہوگا۔ قدرت آواز دیتی ہے دیکھ ذات محمدیؐ عالم وجود میں آگئی آفتاب رسالت نکل آیا۔ انقلاب رونما ہو گیا اب نہ کہنا کہ رات ہے اس آفتاب رسالت کے بعد اب کوئی ماہتاب یا آفتاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہی قانون قدرت ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ آفتاب عالم تاب کی تمازت سے بچنے کے لئے مئی جون کے مہینوں میں گھر میں چھپکر بیٹھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

لیکن آفتاب رسالت کو ہم نے سراج منیر بنایا ہے یہ آفتاب نور ہے آفتاب نار نہیں اس میں کوئی ایسی تمازت نہ ہو گی کہ جس سے تجھے بچنے کی ضرورت ہو اس سے جتنا بھی کسب کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

رسول اکرمؐ جب دنیا میں تشریف لائے۔ تین قسم کی غلامی کارفرما تھی۔ (۱) خرید و فروخت کی (۲) ذات و نسل کی (۳) اور اقتصادی زندگی کی۔ آپؐ نے ہندوستان روم سلطنت الکبریٰ اور ایران کو دیکھا اعلان کیا کوئی غلام نہیں ہے۔ آقا سوائے خدا کے کوئی نہیں ہے۔ غلاموں کو برابری کے درجہ پر لانے کے لئے ہدایت کی کہ جو تم کھاؤ ان کو کھلاؤ۔ جو تم پیو وہ انہیں بھی پلاؤ۔ جو تم پہنو وہ انہیں بھی پہناؤ۔ غلامی کو ختم کرنے کے لئے یہ طریقہ ایجاد کیا کہ جب کوئی گناہ سرزد ہو تو غلام آزاد کر دو۔

دوسرے قسم کی غلامی ذات و نسل کے لحاظ سے تھی جیسے اونچ اور نیچ کے نام سے ہم اور آپ ہندوستان میں دیکھ رہے ہیں۔ پیشہ ور نسلی طور پر ذلیل سمجھے جاتے وہ چاہے جیسا نیک کام کریں مگر اونچے خاندان میں جو پیدا ہوا ہے حالانکہ بدکاری بھی کرتا ہے لیکن اونچا ہے۔ مگر رسول اکرمؐ نے کہا کوئی اونچ نیچ نسلی اعتبار سے نہیں ہے برادریاں صرف جان پہچان کے لئے ہیں یہ امتیازی گھمنڈ کا اظہار کرنے کے لئے نہیں ہے۔ اللہ کے نزدیک وہی بندہ اونچا ہے جو پاکباز ہے وہ چاہے جس نسل اور خاندان سے ہو۔ چودہ سو برس گزر گئے آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ریفارمر اس اونچ نیچ کو ختم کرنے کے لئے قانون بناتے ہیں۔

گویا اتنے عرصہ کے بعد آج دنیا کو ماننا پڑ رہا ہے کہ رسول اکرمؐ نے اونچ نیچ کے بارے میں جو بات پیش کی تھی وہ صحیح تھی۔ یورپ میں چرچ کے اندر انجیل کی تعلیم اگر کوئی کالا حاصل کرنا چاہے نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن مسلمان ہو کر اگر کوئی مہتر بھی مسجد کی اگلی صف میں آکر بیٹھ جاتا ہے تو کسی سید کی بھی یہ مجال نہیں کہ اُسے وہاں سے اُٹھا سکے۔ آج اس امتیاز کو دور کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں کوئی قانون بنتا ہے تو میں کہوں گا کہ ماننا ہوگا۔ رسول اکرمؐ کو جنہوں نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ " اے لوگو گواہ رہو کہ ساری دنیا کے انسان بھائی بھائی ہیں۔ یہ درس ہمارے رسول نے دیا۔ دنیا میں انقلاب پیدا کیا اور غلامی کی نسل سے چھٹکارا دیا۔ ہر زمانے میں ہر دولت مند کو غریب آدمی کے مار ڈالنے کا حق تھا۔ رسول اکرمؐ نے قیصر روم ہرکلیوس (ہرقل اعظم) کو خط لکھا کہ سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت قبول کرے۔ اے بادشاہ اسلام قبول کرے تو محفوظ رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھ کو دگنا اجر دے گا ورنہ تیری رعایا کا گناہ بھی تیرے ذمے پڑے گا۔ اسی طرح ملک شام میں منذر بن حارث غسانی ایران کے بادشاہ خسرو

یرویز مصر کے والی مقوقس حبش کے نجاشی اور فرماں روائے بحرین منذر بن ساوی الغرض بیشمار ممالک کے بادشاہوں تک اپنے خطوط بھیجے اور جہاں تک پیغام رسانی کا تعلق تھا اپنا فرض یوں انجام دیا تاکہ دنیا پیغام الٰہی سے آگاہ ہوکر اونچ نیچ اور طبقاتی جنگ کو ختم کر دے۔

عورتوں کی جو حالت تھی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں "کارلائل" کا کہنا ہے کہ بعثت کے قریب پادریوں میں بحث تھی کہ عورت انسان ہے کہ نہیں کئی دن کی بحث کے بعد انسان تو مانا لیکن یہ فیصلہ کیا کہ یہ مردوں کا کھلونا ہے۔ ایران میں زردشت کی تعلیم ختم ہو چکی تھی جب آپ کی بعثت ہوئی تو وہاں عورت نہ کسی کی ماں تھی نہ کسی کی بیٹی۔ صرف عورت مانی جاتی تھی گویا کوئی امتیاز نہیں تھا عورت کی عرب میں کوئی عزت نہ تھی۔ لڑکی پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دی جاتی تھی۔ ہندوستان میں عورتوں کو اپنے مردہ شوہر کے ساتھ خواہ دو دن کی بیاہی کیوں نہ ہوتی ہو جانا پڑتا تھا عورت کی جگہ جگہ ذلت تھی لیکن رسول اکرمؐ نے وراثت میں سب کو شریک کیا مرد کا دوہرا اور عورت کا اکہرا حصہ اس لئے رکھا کہ باپ لڑکے کو پڑھاتا لکھاتا ہے تاکہ وہ خوشگوار زندگی گذار سکے اور رہبری خدمت بھی کر سکے کوئی باپ بیٹے کو مصیبت میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ بیٹا باپ کی قوت بازو ہوتا ہے۔

لڑکا اپنے۔ اپنے والدین اور اپنے بیوی بچوں کی کفالت کرتا ہے اس لئے اس کا دوہرا حصہ رکھا اور لڑکی صرف اپنی ہی کفیل ہے اور شادی کر کے دوسرے کی کفالت میں جا سکتی ہے اس لئے از روئے انصاف اس کا اکہرا حصہ رکھا عورت اور مرد میں منصفانہ حقوق قائم کرنے کے ساتھ رسول اکرمؐ نے ہدایت فرمائی کہ عورت گھر کی زینت ہے وہ ضرورت پر پردہ حیا کے ساتھ باہر بھی نکل سکتی ہے لیکن کلب کی رونق نہیں بن سکتی اسی کا نام اعتدال کی راہ اور صراط مستقیم ہے پہلے بیوہ کو نکاح کی اجازت نہ تھی۔ مرد کو دس گیارہ شادیاں کرنے کا حق ہوتا تھا رسول پاک نے فرمایا یہ فطرت انسانی کے بالکل خلاف ہے کہ مرد تو عورت کے مرنے پر شادی کرے اور عورت مرد کے مرنے پر نہ کر سکے۔ ہر مرتبہ بیوہ ہو جانے پر عورت کو نکاح کرنے کا حق ہے اور مرد بیک وقت اگر انصاف قائم نہیں رکھ سکتا ہے تو چار کا حق رکھتے ہوئے بھی ایک سے زائد شادی نہیں کر سکتا۔ طلاق کے مسئلہ میں رسول اکرمؐ نے فرمایا۔ اگر آپس میں جھگڑا ہو جائے تو درگذر سے کام نہ چلنے پر عزیز داروں کے فیصلہ کو تسلیم کرو۔ اگر پھر بھی مسئلہ حل ہوتے نظر نہ آئے تو طلاق دیدو مگر جو کچھ دے چکے ہو واپس نہ لو۔ بشرطیکہ وہ خوشی سے واپس نہ کر دے۔

دنیا نے طلاق کا مذاق اڑایا۔ لیکن سترھویں صدی میں یورپ نے وراثت اور اٹھارویں صدی میں طلاق کو قانونی حیثیت دے کر رسول اکرمؐ کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ آج بیسوی صدی میں ہندوستان بھی ہندو کوڈ بل پیش کر کے وراثت اور طلاق کو تسلیم کر چکا ہے۔ رسول اکرمؐ کے چودہ سو برس پہلے کا دیا ہوا درس آج دنیا کو دہرانا پڑ رہا ہے۔ درحقیقت رسول اکرمؐ نے منصفانہ انقلاب پیدا کیا۔ دنیا رفتہ رفتہ آپ ہی کے بتائے ہوئے راستہ پر آ رہی ہے۔

چاروں طرف بڑی بڑی حکومتیں ہیں۔ سرمایہ دار اور غریب دو طبقہ میں تقسیم ہے۔ سرمایہ دار عیش کر رہا ہے اور غریب نان شبینہ کو محتاج ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا اے سرمایہ دار تجھے اپنی رقم کا چالیسواں اور کاشت کا دسواں حصہ غریب کو بلا کسی جھجک کے دینا پڑے گا اگر کوئی غریب نہیں ملتا ہے خلیفہ کے پاس جمع کرنا ہوگا تاکہ غریب بھی جیتا رہے اور وراثت کے ذریعہ دولت قائم نہ رہ کر تقسیم ہوتی رہے۔ . . . . رسول اکرمؐ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ پریشان کو قرض اگر دو تو احسان کر کے نہ دو اس کی بیکسی سے فائدہ نہ اٹھاؤ۔ جو سود کھاتا ہے وہ خدا کو چیلنج کرتا ہے جوے کو بھی حرام قرار دیا جس کے نتائج سے دنیا واقف ہے۔

رسول اکرمؐ کو اپنا محبوب شہر مکہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر جانا پڑا وہاں پہونچکر تین قسم کے مخالفین کا مقابلہ کرنا پڑا۔ (۱) یہود (۲) قریش۔ (۳) اور مشرکہ فتنہ و فساد ظلم و بے انصافی۔ بدامنی اور بدی کو مٹانے کے لئے متعدد جنگیں لڑنی پڑیں ایک بار ایسی شرطوں پر بھی معاہدہ صلح کر لیا جو کھلے طور پر کمزوری کے مترادف تھیں مگر آپ کے ہم وطن ان شرطوں پر بھی قائم نہ رہے اور صلح کے برخلاف رسول اکرمؐ کی پناہ میں آتے ہوتے لوگوں کو قتل کر دیا گیا۔ خدا کے پیغمبر کو ان کے خلاف اقدام کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ دس ہزار کی فوج کے ساتھ مکہ پر چڑھائی ہوتی ہے ابوسفیان نے صلح کرنی چاہی آپ نے فرمایا اگر ایک ایک مسلمان کو قتل کر دیتے پھر بھی شاید انتقام نہ لیتا لیکن محمدؐ نے جن کو پناہ دی ان کو قتل کر دیا اسے برداشت نہیں کر سکتے حضرت سعد بن عبادہ انصار کی فوج کے علمبردار تھے ابوسفیان کو دیکھ کر کہا کہ آج گھمسان کا دن ہے حق و باطل کا فیصلہ ہوگا آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا ابوسفیان نے رسول اکرمؐ کو توجہ دلائی تو جھنڈا لے کر ان کے بیٹے کو دیدیا اور کہا جاؤ ابن عبادہ جاؤ کہو آج جنگ کا دن نہیں ہے آج رحمت عالم کی رحمت کا دن ہے آج کعبہ میں جنگ نہ ہوگی آج کعبہ کو غلاف چڑھایا جائے گا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے رسول اکرمؐ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوتے قلب مبارک اپنے خدا کے فضل و

احسان کے بار سے جھک گیا یہاں تک کہ سر اقدس اونٹ کے کجاوے سے جا لگا اہل مکہ گرفتار ہو کر سامنے پیش ہوتے ہیں پوچھا تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے جواب دیا کہ ہم بہادر ہیں۔۔۔۔ آپ کے ساتھی اگر ہماری گرفت میں آتے تو ہم سب کو قتل کر ڈالتے اور یہی آپ کو بھی حق ہے آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں قتل کر دوں؟ خدا نے تو اتنی بھی اجازت نہیں دی کہ تمہیں ملامت کر دوں۔

"آج تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ تم ہر جرم و خطا سے بری ہو" مشکیں کھول دی گئیں اور سب آزاد کر دیتے گئے یہ تھی رحمت عالم کی شفقت لا انتہا۔

مورخ کہتا ہے کہ تین دن کے بعد اہل مکہ داخل ہوتے اور کہا کہ ہاتھ بڑھایئے تاکہ ہم اسلام لے آئیں۔ ارشاد ہوا کہ تین دن کے بعد کیوں آتے جواب دیا کہ مشکیں کھولنے کے فوراً بعد ہی اسلام لے آتے تو دنیا کہتی مرعوب ہو کر ایسا کیا اور ہمیں یہ بھی دیکھنا تھا کہ دنیا کے دکھانے کے لئے تو درگذر نہیں کیا گیا ہے مبادا دھوکا ہی دیا گیا ہو۔ بعد میں پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔ لیکن آج ہم مطمئن ہو کر آئے ہیں اور خوشی کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں۔

حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ نے بادشاہی اور حضرت موسیٰؑ نے فرعونی طاقت کے سامنے استقلال اور مردانگی کا مظاہرہ کیا اور حضرت عیسیٰؑ نے کہا (کہ ایک گال پر اگر کوئی طمانچہ مارے تو دوسرا بھی پیش کر دو۔) رسول اکرمؐ نے دونوں چیزیں پیش کیں کہ بدلہ برابر کا لو۔ اگر معاف کر دو تو اللہ کے نزدیک سب سے محبوب کام ہے لیکن زیادتی کسی حالت میں نہ کی جائے۔

آپ نے فرمایا کہ رہبانیت اور جوگی بننے کی اسلام میں ضرورت نہیں ہے پہاڑ کی کھوہ میں عبادت کرنے والے سے وہ بہتر ہے جو بچوں میں رہ کر دنیاداری کے ساتھ خدا کو نہ بھولے انسان کی تخلیق فطرت الٰہی پر ہوتی ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ اسلام نے جماعتی زندگی بخشی ہے۔ جماعت کے ساتھ نماز، ایک ہی مہینہ میں روزوں کی اجتماعی طور پر تکمیل ایک ہی مہینہ میں فریضہ زکوٰۃ ادائیگی اور اُسے اجتماعی طور پر بیت المال میں جمع کرنا ایک ہی وقت میں اجتماعی طور پر حج کی ادائیگی۔ یہ سب اسلام کی بخشی ہوئی اجتماعی زندگی کے مظاہرے ہیں۔ میدان عرفات میں دنیا کے گوشہ گوشہ سے ہزاروں زبانیں بولنے والے آتے ہیں لیکن وہاں ایک ہی زبان میں نماز پڑھتے ہیں جس سے عالمگیر اجتماعیت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

اگر ہم جماعتی زندگی بنالیں تو عزت ورنہ رسوائی۔" اللہ کی رسی ایک ساتھ مل کر پکڑنے سے یہی مراد ہے کہ جماعتی زندگی بناؤ۔

کاش ہم سب رسول پاک کی سیرۃ سے سبق لیں اور خدائے پاک ہم کو اور آپ کو اس کی توفیق مرحمت فرمائے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

حضرت مجاہد الملتؒ

کے تصور سے مخاطب ہوکر

۶۲ ۱۹ ء

نتیجۂ فکرِ خداداد ــــ بندۂ احقر سلطان احمد شہباز صدیقی امروہوی

۱۳۸۲ھ ۱۳۷۰ ف

حفظِ رحماں! اے زعیم کشورِ ہندوستاں　　کاروانِ حریت کا تو ہے میرِ کارواں
لب پہ ہے ہر عامی و عالم کے تیری داستاں　　اک زمانہ ہے تری توصیف میں رطب اللساں

ذاتِ پاکِ تست در آفاق فخرِ روزگار
ہستیت قوم و وطن را مایۂ صد افتخار

ہے وجودِ پاک تیرا پیکرِ علم و عمل　　راہِ عزمِ راسخ میں گام ہے تیرا اٹل
جوش میں ہے بحرِ ذاخر استقامت میں جبل　　درحقیقت تو شیخ الہند کا نعم البدل

فیضِ روحانی ملا ہے تجھ کو ہر استاد سے
انورؒ و اشرفؒ رشیدؒ و قاسمؒ و امدادؒ سے

علم و فن کے مختلف شعبوں کا تو ہے حکمراں　　تو محدث، تو مفسر، تو فقیہ نکتہ داں
واقفِ سرِّ معانی، ماہرِ علمِ بیاں　　تجھ سے حکمت میں ارسطو کی فراست ہے عیاں

فکر فی الکفراں میں مستغنی ہے تیری ذاتِ پاک
ذہن پر واضح ہیں تیرے معنیِ آیاتِ پاک

تو ہے اپنے عہد کا علامۂ عالی مقام　　فاضلِ پاکیزہ سیرت حاجیِ بیت الحرام
محرمِ رازِ تصوف، عالمِ علمِ کلام　　فنِ تاریخ و تمدن میں ہے فہّام و امام

ایک جانب ہے الٰہیات پر تیری نظر
ایک جانب ہے سیاسیات پر تیری نظر

بحث میں بر آئے تجھ سے کب کسی کی ہو مجال　　منطق و حکمت میں حاصل ہے تجھے عینِ کمال
روبرو تیرے زبانِ خصم ہو جاتی ہے لال　　ہو کے قائل بھول جاتا ہے سب اپنی قیل و قال

کیا تری حجت کو رد کرنا کوئی آسان ہے
تیری ہر برہانِ قاطع، قاطعِ برہان ہے

تیری ہر تقریر سے شانِ خطابت ہے عیاں — ہے فصاحت پر تری سحبانِ وائل کا گماں
اعلیٰ و ارفع مضامیں، شستہ و رفتہ زباں — لفظ شیریں، نطق دلکش، صاف اندازِ بیاں

حسبِ موقع اُس میں ہے اطناب بھی ایجاز بھی
سحر کا ہے سحر بھی، اعجاز کا اعجاز بھی

جوش میں دیتا ہے تو جب کوئی پبلک میں بیاں — کوندنے لگتی ہے ہر سو بزم میں برقِ تپاں
اس طرح برّش دکھاتی ہے تری تیغِ زباں — تیغِ جوہردار ہو جاتی ہے محتاجِ فساں

زور ہو جاتا ہے پیدا یوں تری گفتار میں
اُٹھتا ہے طوفان جیسے قلزمِ ذخار میں

تیری ہر تحریر بھی ہے بے ہماں و لاعدیل — ہے رواں تیری عبارت مثلِ موجِ سلسبیل
تیری ہر ترکیب پختہ، تیرا ہر جملہ جمیل — طرزِ انشا کی ترے کشتہ ہے انشائے قتیل

اپنے رنگِ خاص میں یکتا ہے تیری ہر کتاب
ضو فشاں چرخِ ادب پر ہے جو مثلِ آفتاب

درس سے اپنے نہ پایا تھا ابھی تو نے فراغ — مل گیا جو تجھ کو آزادی کی صہبا کا ایاغ
جل اُٹھا دل میں ترے حبِّ وطن کا وہ چراغ — جس کی تابانی نے روشن کر دیا تیرا دماغ

یک بیک تو راہِ آزادی کا راہی بن گیا
فوجِ احرارِ وطن کا اک سپاہی بن گیا

ملک میں ہونے لگے جوہر ترے جب آشکار — قوم میں بڑھنے لگا ہر سو ترا عزّ و وقار
جم گیا قلبِ اکابر پر بھی نقشِ اعتبار — بن گیا مجلس کا اُن کی تو مشیر و مستشار

ہو گیا قائل تری حکمت کا ہر اعلیٰ دماغ
رفتہ رفتہ بن گیا تو قوم کا چشم و چراغ

بڑھ کے مارا تو نے میدانِ سیاست میں قدم — اُٹھا رکھ کر دوش پر اپنے خلافت کا علم
مرحبا یہ تیری شوکت حبذا تیرا حشم — سیف ایک اِس ہاتھ میں اُس ہاتھ میں تھا قلم

کی حمایت قوم کی تحریر سے تقریر سے
خوف کچھ کھایا نہ تو نے طوق سے زنجیر سے

ہاتھ میں جب تیرے جمعیت کا آیا انتظام — کر دیا تو نے مذاقِ حریت پبلک میں عام
یعنی پہنچایا یہ گوشِ ہر مسلماں تک پیام — "بندگیِ غیر" ہے مردِ مسلماں پر حرام

دب کے رہنا غیر سے شانِ مسلمانی نہیں
اس روش میں امتثالِ امرِ قرآنی نہیں

ہو گیا جب تو شریکِ رہبرانِ کانگریس — بادِ صرصر بن کے اُٹھا کاروانِ کانگریس
تیری طاقت سے بڑھی تاب و توانِ کانگریس — تیری ہستی بن گئی روحِ روانِ کانگریس

حریت کا ملک میں ہر شخص شیدا ہو گیا
زور اک تحریکِ آزادی میں پیدا ہو گیا

تو نے کی انگریز سے میدانِ آزادی میں جنگ — کر دیا حربوں سے اپنے قافیہ دشمن کا تنگ
منہ کی کھا کر معرکہ سے اُڑ گئے اہلِ فرنگ — آ گیا میدان تیرے ہاتھ بے تیغ و تفنگ

سربلند آخر وطن کا تو نے جھنڈا کر دیا
تاجرِ افرنگ کا بازار ٹھنڈا کر دیا

تو نے قید و بند کی شدت اُٹھائی بار بار — طوقِ فولادی ہوئے اکثر تری گردن کا ہار
اپنی راہِ راست پر لیکن رہا تو پائیدار — خوف کچھ دار و رسن سے بھی نہ کھایا زینہار

حوصلہ ہر آن تیرے دل کا بڑھتا ہی گیا
جذبۂ حبِ وطن پروان چڑھتا ہی گیا

خندہ پیشانی سے غیروں کے مظالم بھی سہے | حلم عثمانی سے اپنوں کے مطاعن بھی سُنے
مال کے نقصان بھی برداشت ہنس ہنس کر کئے | جان پر بھی آ بنی کچھ وقت ایسے بھی پڑے
جو بھی سختی پیش آئی اُس سے منھ موڑا نہیں
ساتھ مُلک و قوم کا تونے کبھی چھوڑا نہیں

بعد آزادی بھی تو سیماب فطرت ہی رہا | روز و شب شغل مسلسل تیری عادت ہی رہا
جیل کیا مسند پہ بھی محرومِ راحت ہی رہا | قوم کے مخدوم! تیرا کام خدمت ہی رہا
مرتے دم تک قوم کی تنظیم تو کرتا رہا
اپنی دُھن میں منہمک جیتا رہا مرتا رہا

ہو رہا تھا جب مسلمانوں کا ہر سو قتلِ عام | ہاتھ میں فرقہ پرستوں کے تھی تیغِ بے نیام
درہم و برہم تھا امن و آشتی کا ہر نظام | خوف سے غنڈوں کے خواب خور تھا پبلک پہ حرام
ہو گیا دل تیرا مضطر قتل و غارت دیکھ کر
دَور میں تہذیب کے یہ بربریت دیکھ کر

آگیا میدان میں تو چھوڑ کر اپنا مکاں | قلب تیرا نوحہ خواں تھا چشم خونابہ فشاں
جوش کے عالم میں ہو کر بے نیازِ ہر زیاں | شیر کی صورت در آیا بھیڑیوں کے درمیاں
آگ کے شعلوں میں ظاہر جرأتِ پروانہ کی
جان اوروں کی بچائی اپنی کچھ پروا نہ کی

قلب مسلم سے مٹایا تو نے ہر خوف و خطر | گھر کئے آباد اُن کے لُٹ گئے تھے جن کے گھر
جل رہے تھے ظلم کے جو بے گناہوں پر شرر | بن گیا اُن کی حفاظت کے لئے تو اک سپر
ترک کر کے عیش و عشرت جھیل کر رنج و محن
ہر طرف پھرتا رہا تو باندھ کر سر سے کفن

کمتری کا قوم سے تو نے کیا احساس دُور | بخشا اطمینان اُن کو قلب تھے جو ناصبور
یاس کے ظلمات میں اُمید کا پھیلا کے نور | کر دیا دار المحن کو غیرتِ بیت السرور
ولولہ بھر کر دلوں میں رفعتِ پرواز کا
حوصلہ تو نے ممولوں کو دیا شہباز کا

درس تو نے قوم کو خود اعتمادی کا دیا | اپنے پاؤں پر کھڑا ہونیکا عہد اس سے لیا
بارہا للکار کر لوگوں پہ یہ واضح کیا | جو جیا اوروں کے برتے خاک دنیا میں جیا
مَرد وہ ہے اپنے بل بوتے پہ جو زندہ رہے
راہ میں سیل حوادث کی بھی پائندہ رہے

مجلس آئین کا جس دن سے تو ممبر بنا | قوم کے حق کی حفاظت مشغلہ تیرا رہا
جب بھی مذہب کے مخالف پیش کوئی بل ہوا | تو نے کی ایوان میں تردید اُس کی برملا
ہمہمہ پیدا کیا وہ جرأت بے باک سے
جا کے ٹکرایا جو سقفِ گنبدِ افلاک سے

جب قیادت مجلس اوقاف کی تجھ کو ملی | ہو رہی تھی وقف کے املاک کی حالت ردی
منتظم اُن کے محاصل کو سمجھتے تھے نجی | کوئی بھی پروا انھیں واقف کے منشا کی نہ تھی
کر کے مالِ وقف کا ہر طرح تونے احتساب
کر دیا مسدود غبن و غصب کا ہر ایک باب

جب حکومت کے مدارس میں تجھے آیا نظر | مذہبی تعلیم سے بیگانہ ہر مومن پسر
جمع کر کے بمبئی میں عالمانِ نامور | دے دیا ترتیب فوراً اک نصاب معتبر
دے کے ہر سو ملک میں تعلیم دینی کا رواج
رکھ لی تو نے مذہب اسلام کی بھارت میں لاج

وصف کیا ہوں ترے اخلاق حمیدہ کے رقم — مالکِ مہر و مروت صاحبِ لطف و کرم
پیکرِ اجلال، والا مرتبت، عالی ہمم — عدل پرور، رحم دل، فرخندہ خو، نیکو شیم

دردِ ملت سے ہمیشہ چشم تیری اشکبار
مفلسوں کے دکھ کا ساتھی بیکسوں کا غمگسار

کذب سے بیزار ہے تو صدق ہے تیرا شعار — نقضِ نقضِ عہد کو تو جانتا ہے ننگ و عار
صاف گوئی پر تری ہر گفتگو کا ہے مدار — تیرا قلبِ پاک ہے شفاف و صاف آئینہ وار

بات ہے تیری زباں پر بھی وہی جو دل میں ہے
رنگ ہے خلوت میں جو تیرا وہی محفل میں ہے

ہر سخن سے ہے ترے ایمان کی جرأت عیاں — سر نہیں ہوتا گریباں میں کبھی تیرا نہاں
بولتا ہے تو کڑک کر پیشِ ہر خاقان و خاں — چل کے رکتی ہی نہیں ہرگز تری سیفِ زباں

بحث سے بچتا نہیں تو گفتگو کو ٹال کر
گونجتا ہے شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

آستانہ ہے ترا امیدگاہِ خاص و عام — اہلِ حاجت کا جہاں رہتا ہے ہر وقت اژدہام
بات تو سنتا ہے سب کی سب سے کرتا ہے کلام — ہو کے جاتے ہیں تری سرکار سے وہ شاد کام

دیتا ہے انجام تو خوش ہو کے اُنکے کام کو
کام پر قربان کر دیتا ہے ہر آرام کو

ایک دم فرصت نہیں تجھ کو مسلسل کام سے — بیر ہے فطرت کو تیری راحت و آرام سے
تو کبھی پبلک سے ملتا ہے کبھی حکام سے — گردشِ پیہم ہے وابستہ ترے اقدام سے

ہوتا ہے ظاہر یہ تیرے پیکرِ بیتاب سے
ہے خمیر اس کا مخمّر جوہرِ سیماب سے

اب کسی قائد میں تیری شانِ انسانی نہیں — تیری دانش تیری عصمت تیری قربانی نہیں
عزمِ طارقؓ جوشِ خالدؓ حلمِ عثمانی نہیں — یعنی اے آزادؒ کے ثانی ترا ثانی نہیں

عمرہا باید کہ مردے پختہ کار آید چنیں
در دیارِ ہند فخرِ روزگار آید چنیں

ہست قائم از جلالت رونقِ ایوانِ عشق — نیست در اقطاعِ عالم ہمچو تو سلطانِ عشق
حبذا ایں شان زیبائے تو در میدانِ عشق — "در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق

کارِ دشوار است در راہِ تو آساں تاختن
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سنداں باختن"

جا کے تو معمورۂ امکاں سے آسکتا نہیں — کھو کے یہ ظالم زمانہ تجھ کو پا سکتا نہیں
مدتوں ہندوستاں تجھ کو بھلا سکتا نہیں — داغ تیرا اپنی چھاتی سے ہٹا سکتا نہیں

کون تجھ جیسا ہے اب ہر دلعزیز آفاق میں
تیری منزل ہے دلِ جمہور کے اعماق میں

رو رہا ہے آج تیرے غم میں ہر پیر و جواں — اٹھ رہا ہے ہر دلِ سوزاں میں آہوں کا دھواں
ملک میں ہے چار جانب شورِ فریاد و فغاں — بن گیا ہے بیتِ احزاں کا نمونہ ہر مکاں

یک بیک دنیا کی دنیا وقفِ ماتم ہوگئی
مرگِ عالم در حقیقت مرگِ عالم ہوگئی

فکر میں تاریخ کی تھا محو شہبازِ حزیں — اشک آنکھوں سے رواں تھے قلب تھا اندوہگیں
اُڑ کے جب فریاد پہنچی تا سرِ عرشِ بریں — بولے رقت خیز لہجے میں یہ جبریلِ امیں

شمعِ محفل کارواں سالارِ آزادی بمرد
حفظِ رحماں مطلعِ انوارِ آزادی بمرد

۱۳۸۲ھ

۶۲ ۶۱۹

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

حضرت مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کی تابناک زندگی پر ایک عالمگیر شہادت

اُردو صحافت کا خراج تحسین

"حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ کے وصال پر اگرچہ ہندوستان اور پاکستان میں اُردو ہندی۔ انگریزی اور دوسری زبانوں کے تمام ہی اخبارات و رسائل نے اپنے مقالات کے ذریعہ اظہار رنج و ملال کیا تھا، بلکہ بیرونِ ہند میں بھی خاص طور عالم اسلام میں جگہ بہ جگہ روزانہ۔ سہ روزہ۔ ہفتہ وار۔ ماہوار معزز و مشہور اخبارات اور رسائل نے اپنے مقالات کے ذریعہ حضرت موصوف کی عظیم خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا جن میں قاہرہ کا مشہور روزنامہ الاہرام اور ماہنامہ المسلم مکہ مکرمہ کا ماہنامہ الحج۔ رنگون کا روزنامہ استقلال قابل ذکر ہیں — تاہم طوالت سے بچتے ہوئے ہم نے صرف برصغیر ہند و پاکستان کے اُردو جرائد ہی پر اکتفا کیا ہے۔ اور ان کے مقالات اگلے صفحات میں ھدیہ ناظرین کئے جا رہے ہیں۔ اس لئے کہ حضرت مولانا مرحوم خود بھی اُردو کے ایک فاضل مصنف۔ محقق اور ادیب تھے اور اُردو زبان کی بقا و ترقی کے لئے انھوں نے اپنی مصروف زندگی میں بہت کچھ کام کیا اور اس کو اپنے مہماتِ مشاغل کا ہمیشہ ایک جز بنائے رکھا۔

ادارہ

روزنامہ الجمعیۃ دہلی — ۳؍۸؍۱۹۶۲ —

یہ اندوہناک خبر سن کر کس کو غم اور ملال نہ ہوگا؛ کہ حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء ہند وممبر پارلیمنٹ کینسر (سرطان) کے موذی مرض میں طویل عرصہ تک مبتلا رہ کر آج دو ۲؍اگست ۱۹۶۲ء کو صبح ۴ بجے نئی دہلی میں انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، القلب یحزن والعین تدمع وانا بفراقک یا مولانا لمحزونون!

جو ہونا تھا وہی ہوا۔ اور آپ کینسر کے موذی مرض سے نجات نہ پا سکے، جہاں تک ظاہری اسباب اور تدابیر کا تعلق ہے۔ اُن سے پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ دہلی سے بمبئی اور بمبئی سے امریکہ تک مشہور ہسپتالوں میں علاج ہوا اور ماہر طبیبوں اور ڈاکٹروں کے مشورہ پر عمل کیا گیا۔ مگر مرض اس قدر حاوی ہو چکا تھا کہ کوئی علاج کارگر نہ ہو سکا۔ جب مولانا امریکہ تشریف لے گئے تو حالت قدرے بہتر تھی، جب واپس آئے تو نقاہت اور کمزوری سے نڈھال ہو چکے تھے۔ دیکھنے والوں نے اندازہ لگایا تھا کہ اگر مولانا ملت کی قسمت سے بچ گئے تو آپ کی زندگی ایک معجزہ ہوگی۔ ورنہ بظاہر تو مایوسی ہے۔ لیکن انتقال کے دن تک جن لوگوں نے آپ سے ملاقات کی انھیں تصور بھی نہ تھا کہ مولانا چند گھنٹوں کے بعد اپنے پروردگار سے جا ملیں گے۔ عام خیال یہ تھا کہ شاید رشتہ حیات ایک ماہ تک منقطع نہ ہو۔ رات کے دس بجے تک لوگوں سے باتیں کیں اور صبح چار بجے روح مبارک قفس عنصری سے آزاد ہو گئی۔

مولانا کی طویل خدمات کی فہرست پیش کرنا مقصود نہیں، سب جانتے ہیں کہ زندگی بھر اس مرد مجاہد کا رول کیا رہا ہے اور آپ کی قیمتی زندگی کن مشاغل میں گزری، لیکن فی الحال جو احساس دماغوں پر غالب ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا کوئی بدل نہیں یہ صحیح ہے کہ دنیا کا کاروبار عظیم اور جلیل ہستیوں کے اٹھ جانے کے بعد بھی چلتا رہتا ہے۔ آفتاب کے طلوع وغروب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ماہتاب اپنے وقت پر چمکتا ہے ستارے حسب معمول رواں دواں رہتے ہیں۔ سمندر کو اپنی طغیانیوں سے کام رہتا ہے۔ اس کی بلا سے اگر کسی کی کشتی حیات غرق ہوتی ہے غرض کسی کے مرنے سے کائنات کے نظام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کہ اس قحط الرجال کے زمانہ میں مسلمانوں میں سے جو بھی ہستی رخصت ہوئی اس کا جانشین پیدا نہ ہو سکا۔ جمعیۃ علماء کے اکابر میں حضرت شیخ الہند، حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ حضرت مولانا محمد سجاد۔ حضرت مولانا احمد سعید، حضرت مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسرے بزرگ اور قائدین ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ مگر ان کی جگہ لینے والا پیدا نہ ہو سکا۔ اب حضرت مجاہد ملت نے رخت سفر باندھا ہے۔ اور چاروں طرف نظر دوڑانے کے باوجود ان کا بدل نظر نہیں آتا۔ خدا ہزار بار غریق رحمت کرے، عجیب انقلابی زندگی پائی تھی۔ سیماب فطرت اگر کسی کو دیکھا ہے تو وہ مولانا ہی کی زندگی تھی۔ مرکزی دفتر میں ہیں تو طلوع آفتاب سے کر نصف شب تک قوم وملت کے کاموں میں مصروف ہیں، ابھی فون یا تار آیا، فوراً چل کھڑے ہوئے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ دور دراز کے سفر سے واپس تشریف لائے اور دفتر میں قدم ہی رکھا تھا کہ فون پر بلاوا آیا یا خدمت عالی میں تار پہنچا، فوراً اٹھ کھڑے ہوتے اور ہوائی اڈہ یا ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ مزاج میں تحقیق اور تنقید تھی اور بحث ومذاکرہ کے بغیر کسی بات کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ نرم گرم گفتگو کے بعد کیا مجال کہ مخالف کی طرف سے دل پر غبار آ جائے قلب آئینہ کی طرح صاف تھا۔ دماغ میں بلا کی ذکاوت تھی۔ ذہن کی رسائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے سینے میں مظلوموں کی ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری تھی مسلم کش ہنگاموں پر لقائی ہوش وحواس بڑے مغموم ہوتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے۔ کہ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کی خدمت کرنا ہمارا کام ہے۔ مگر کیا کریں، اتفاق سے آزادی کے بعد مسلمان ہی تختۂ ستم بنائے گئے اس لئے قدرتی طور پر جمعیۃ علماء کی خدمات زیادہ تر مسلمانوں تک محدود رہیں۔ خدمت میں حاضر ہونے والے اور ضرورت مند ہندو بھی ہوتے تھے اور سکھ بھی اور آپ خندہ پیشانی کے بعد سب کی خدمت کرتے اور ہر شخص کے کام آتے۔

آزادی سے پہلے آپ نے قوم وملت کی جو خدمات انجام دیں، وہ شاید قوم کو یاد نہ ہوں مگر ملت ان خدمات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی جو آپ نے آزادی کے بعد انجام دیں قدرت نے آپ کے سینہ کو دل دردمند سے معمور کیا تھا ۱۹۴۷ء کے قتل عام میں آپ نے جان تک کی پرواہ نہ کی اور آگ اور خون میں بے تحاشہ کود پڑے۔ اس کے بعد اب تک آپ نے زندگی کا جو رول ادا کیا۔ اس سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے آپ کی زندگی کا نمایاں وصف بے باکی، جرأت، ہمت اور صاف گوئی تھی۔ منافقت کی دنیا میں آپ نے خلوص کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ مرد حق آگاہ کی طرح ہر میدان میں کودے اور کٹھن سے کٹھن منزل کو طے کیا۔ رعب اور دباؤ سے کبھی متاثر نہیں ہوئے، جہاں گئے انتہائی بے باکی کے ساتھ حق کی نمائندگی۔ اور ترجمانی کی مختلف الخیال لوگوں سے توازن کے ساتھ پیش آنا اور اپنے نقطۂ نظر کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنا آپ کی عادت ثانیہ بن چکا تھا۔

آپ نے بیماری کی حالت اور شدت میں بھی ملک کے اہم ترین مسائل کو نظر انداز نہیں کیا ان پر ملک کے رہنماؤں سے برابر گفت گو کرتے رہے۔ امریکہ سے علاج کے دوران اردو کے بارے میں وزیر اعلیٰ اتر پردیش کو خط لکھا اور اس کی ایک نقل پنڈت جواہر لال نہرو کے نام بھیجی واپسی کے بعد بھی آپ مختلف مسائل پر غور وفکر کرتے رہے۔ دراصل آپ کی داستان زندگی انقلاب کی ایک پوری

تاریخ ہے آپ نے بے شمار واقعات تاریخ کے حوالے کئے ہیں اور امت کے لئے علم وعمل کا بہت کچھ اثاثہ چھوڑا ہے۔

دعا ہے کہ رب اکبر مرحوم کی روح کو نشاط اور تسکین بخشے اور اس پر اپنی بیکراں رحمتوں کی بارش فرمائے، ہم اس جانکاہ حادثہ پر ان کے فرزند، ان کی صاحبزادیوں، ان کے بھائی اور جملہ متعلقین واعزہ کے غم میں برابر کے شریک ہیں اللہ تعالیٰ ان سب پر اپنی جناب سے صبر جمیل کا القا فرمائے اور انھیں اپنی حمایت اور نصرت سے نوازے۔

مدینہ بجنور

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

"سفر دو ہیں، ایک شخص کا، ایک مقصد کا، اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کئے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کردیں۔ جب انھوں نے اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کر دیا تو ان کا سفر منزل مقصود تک پہونچ گیا اور کامیاب ہوگئے، اب ان کے لئے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں، اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے اور اس لئے جس مسافر نے اس مقصود کو پالیا اُس نے اپنا کام پورا کردیا۔ یہاں راہ اور منزل دو نہیں ایک ہی ہیں ؎

رہ رواں راخستگی راہ نیست!
عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

باقی رہا مقصد کا سفر تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہوجائے لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے جو بیج بوتا ہے، خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا ہے اور بدلیاں بھیجتا ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر راہ رواں مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا سفر کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔

اسی طرح ایک جگہ امام الہند نے کہا ہے کہ

"سچا مجاہد وہی راست باز انسان ہے جو انسان کی قوتوں کی ہیبت اور سطوت کے مقابلہ میں کھڑا ہوجاتا اور خدا کی عدالت وصداقت کی محبت اس پر اس درجہ چھا جائے کہ وہ اُس کے بندوں کی ہیبت کی کچھ پروا نہ کرے۔"

چنانچہ جب ہم مندرجہ بالا اقوال کی روشنی میں اُس ذات گرامی کو دیکھتے ہیں جسے ہم کل تک مجاہد ملت کہتے تھے تو ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بلاشبہ قوم نے اُسے جس نام سے پکارا تھا اور جس خطاب سے نوازا تھا۔ وہ پوری طرح اس کا اہل ثابت ہوا۔ اُس نے ایک سچے مجاہد کی طرح زندگی گذاری اور بالآخر اپنے آپ کو مقصد کی راہ میں قربان کردیا۔ پس بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ اس دنیا میں ایک کامیاب انسان کی طرح جیا اور ایک کامیاب انسان کی طرح یہاں سے اپنے مالک حقیقی کے پاس چلا گیا۔

اُس نے جس بانکپن، جس رکھ رکھاؤ، اور جس انداز سے زندگی گذاری۔ خدا کی قسم اُس میں بھی وہ منفرد تھا اور بیماری وعلالت کی شدت نے بھی اُس بانکپن کی مسکراہٹ کو کم نہ کیا تھا۔ اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ملک وملت کے اس عظیم مجاہد کو وہ درجہ دیا جو جہاد فی سبیل اللہ کا سب سے بہتر انعام ہے۔

شہید ملت

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے۔

ومن یطع اللہ والرسول	اور جس کسی نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی
فاولٰئک مع الذین انعم اللہ	تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کا ساتھی ہوا جن پر
علیہم من النبیین والصدیقین	اللہ نے انعام کیا ہے یہ انعام یافتہ جماعت
والشہداء والصالحین	نبیوں کی ہے صدیقوں کی ہے شہداء کی ہے
وحسن اولٰئک رفیقا	نیک عمل انسانوں کی ہے اور جس کے ساتھی ایسے
(۴-۶۹)	لوگ ہوں تو کیا ہی اچھی اُس کی رفاقت ہے

(ترجمان القرآن)

امام الہند رقمطراز ہیں کہ "شہید کے معنی گواہ کے ہیں۔ یعنی ایسے انسان جو اپنے قول وفعل سے حق وصداقت کی شہادت بلند کرنے والے ہوں۔

مندرجہ بالا روشنی میں اگر مجاہد ملت کی حیات دنیوی کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف اور واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے تمام اعمال واقوال کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے سانچے میں ڈھالنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اپنے قول وفعل سے آخر دم تک حق وصداقت کی شہادت بلند کی۔ اور اسی راہ میں اپنی جان عزیز کو بھی قربان کردیا۔ اور پھر خداوند تعالیٰ کا یہ کتنا بڑا انعام ہے دنیا میں ہی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ شہداء وصالحین کے قافلہ سالار حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندانی قبرستان میں جسے ایک بہت بڑے عالم دین کی زبان میں "ہندوستان کا جنت البقیع" کہا جاسکتا ہے، بہترین رفیقوں کے مابین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جا سوئے۔

علالت کا دور!

یہ بات اب راز نہیں رہی ہے کہ مجاہد ملت کی بیماری کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ سب سے پہلے ستمبر ۱۹۶۱ء میں مولانا کا ایکسرے لیا گیا تو ڈاکٹروں نے کینسر کے شبہ کا اظہار کیا۔ لیکن قومی خدمت کی لگن ایسی تھی کہ احباب کے جبر سے دو چار روز دوا تو پی لیتے تھے مگر کسی صورت آرام کے لئے تیار نہ ہوتے تھے چنانچہ ۱۹۶۱ء سے

لیکر ۱۹ر جنوری ۱۹۶۲ء تک مولانا مسلسل دور دراز علاقوں میں سفر کرتے رہے اسی عرصہ میں بمبئی، مالابار اور حیدرآباد کا دورہ کیا۔ مغربی یوپی کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ تو اس حال میں شروع کیا کہ ڈبل نمونیہ کا اثر تھا، سردی کا موسم تھا، لیکن ابھی یہاں ہیں تو ابھی وہاں پھر الیکشنی دورہ شروع کردیا آخر ۲۲ر جنوری ۱۹۶۲ء کو اس حال میں دہلی پہونچے کہ گاڑی سے اترنا یا اپنے مکان کی سیڑھیوں پر چڑھنا دشوار تھا پھر بھی عزم و ہمت کا یہ عالم تھا کہ اسی روز رات کو بذریعہ ہوائی جہاز بمبئی جانے پر مصر تھے، بہرحال وہ غصے ہوتے رہے۔ اپنا سامان لیکر مکان سے باہر نکل آئے۔ بار بار کہتے تھے "میں موت سے نہیں ڈرتا سیٹ بک ہوچکی ہے مجھے جانا چاہیئے" لیکن مخلصین مولانا کی سیٹ کینسل کراچکے تھے۔ اس لئے مولانا کو رکنا ہی پڑا۔ اس کے بعد علاج کا جو سلسلہ چلا اس کا علم سب کو ہے ہی۔ پھر اس علالت میں بھی مولانا تمام مسائل سے باخبر رہے اور کام کراتے رہے۔ حتی کہ امریکہ سے مسٹر سی پی گپتا کو جو خط بھیجا وہ سب کو معلوم ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مولانا کے لاشعور میں مستقبل کی پرچھائیاں پڑنے لگی تھیں اور مولانا چاہتے تھے کہ زندگی کی جو فرصت باقی رہ گئی ہے اس کا ایک لمحہ بھی کسی طرح رائگاں نہ ہونے پائے۔ اور الحمد للہ کہ مولانا اس جدوجہد میں کامیاب رہے اس لئے مولانا سے عمر میں ۲ سال کم، اور ۴۰ سال تک قومی جدوجہد میں ساتھ رہنے والے مولانا محمد میاں صاحب کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ:

"مجاہد ملت کی ساری زندگی قومی خدمت میں گذری، ان کی علالت بھی قومی خدمت انجام دیتے ہوئے شروع ہوئی۔ اور اسی بیماری نے ان کی جان لی، اس لئے یہ کہنا درست ہے کہ ان کی وفات قوم کی مسلسل خدمات کے سلسلہ میں شہادت ہے"

بہترین رہبر

مولانا میں قیادت کی فطری صلاحیت تھی اور مولانا نے ابتدائے عمر سے ہی اس کا ثبوت دینا شروع کردیا تھا۔ لیڈرشپ کی صلاحیت تو بہت سے لوگوں میں ہوتی ہے۔ ماہرین نفسیات نے اس سلسلہ میں بڑی بڑی کاوشیں بھی کی ہیں۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس "فطری صلاحیت" کی تربیت کس طرح ہوتی ہے اور پھر وہ شخص خود اس سلسلہ میں کیا کاوش کرتا ہے۔ مولانا کو خدا کے فضل و کرم سے تربیت گاہ بھی بہترین نصیب ہوئی یعنی شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور پھر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شفقت، محبت اور لگاؤ سے مولانا کی تربیت کی شیخ الہندؒ کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے تربیت دادہ بہت سے حضرات ہیں۔ جو آج ہماری قومی و ملی زندگی میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وہ اس دور کے بہترین استاد تھے۔ ہمارے موجودہ نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب پر بھی انہی کی نگاہ کرم پڑی تھی اور اس جوہر میں جو آب و تاب اس وقت سے پیدا ہوئی وہ محتاج ثبوت نہیں۔

مولانا نے بھی شروع سے تادم واپسیں اس بات کی کوشش جاری رکھی کہ اپنی زندگی کو قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھالیں اور اپنے آپ کو ملت اسلامیہ ہند کی قیادت کی ذمہ داریوں کا اہل بنائیں۔ ان کی اس جدوجہد کا پتہ ہمیں ان کے مطالعہ سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ مولانا نے سب سے پہلے سیرت پر ایک کتاب لکھی۔ پھر "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "قصص القرآن" ہمارے سامنے آئیں۔ اگر ہم بہ نظر غور دیکھیں تو ہمیں پتہ لگ جائیگا کہ مولانا میں تصنیف و تالیف کے لئے بھی ایک فطری رجحان تھا لیکن وہ رجحان بھی مولانا کی لیڈرشپ کی صلاحیت کے تابع ہو کر رہ گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ مولانا نے اپنے مطالعہ اور تصنیف و تالیف کے ذوق کو پورا کرنے کے لئے "سیرت" "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "قصص القرآن" کے موضوعات ہی کا انتخاب کیوں کیا اس سلسلہ میں راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ (ہو سکتا ہے کہ اہل علم حضرات اس سے اتفاق نہ کریں) کہ مولانا کا یہ مطالعہ اور اس کے نتائج کا قلم بند کرنا دراصل اپنی تربیت کے لئے تھا۔ اور پھر جن خطوط پر وہ اپنے نفس اور اپنی صلاحیتوں کی تربیت کر رہے تھے۔ ان کا ملت اسلامیہ کے سامنے آنا بھی ضروری تھا، اس لئے ان کے اس مطالعہ نے تصانیف کی شکل اختیار کرلی۔

بہرحال صورت حال کچھ بھی ہو۔ یہ تصانیف اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ مولانا کی "لیڈرشپ" "قرآن و سنت" کے مخلصانہ اتباع کی ایک کوشش تھی۔ چنانچہ مولانا کی پوری زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ وہ اپنی کوششوں میں خدا کے فضل و کرم سے کامیاب و کامران رہے۔

مولانا کی زندگی کچھ ایسی ہنگامی، اور شور و شغب سے معمور تھی کہ اس کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ نہ کیا جاسکا، اور اسی لئے اس سے وہ فائدہ نہ اٹھایا جاسکا جو آسانی سے اٹھایا جا سکتا تھا۔

علامہ اقبال نے میر کارواں کے بارے میں کہا تھا کہ

نگاہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

حقیقت یہ ہے کہ مولانا ان تینوں صفات عالیہ کا مظہر تھے۔

عظیم نقصان

بس اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ مولانا کی وفات سے ملک و ملت کو عظیم نقصان پہنچا ہے، جو ناقابل تلافی ہے مولانا کے سب سے قریب اور سب سے زیادہ ساتھ رہنے والی شخصیت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی تھی اور انھوں نے بجا اور درست فرمایا ہے کہ مولانا کی وفات سے "جہاں تک جمعیۃ علماء ہند کا تعلق ہے اس کے تسلیم ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے

روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ

ایک چراغ اور بجھا ــــ! ایک ستون اور گرا ــــ! ایک سپاہی اور مرا ــــ! تاریکی اور بڑھی ــــ محفل اور سونی ہوئی ــــ!!!

مولانا حفظ الرحمٰن چل بسے ــــ مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات، ملک و قوم کا زبردست نقصان ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے سانحہ عظیم۔ ملک، جنگ آزادی کے ایک نڈر سپاہی سے محروم ہوگیا اور مسلمانوں کا ایک غم خوار اور خدمت گار اٹھ گیا۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی پوری زندگی قومی خدمت میں گذری۔ جنگ آزادی میں انھوں نے قید وبند کی سخت تکلیفیں برداشت کیں۔ جان تک جوکھوں میں ڈالی۔ وہ ایک سرفروش سپاہی کی طرح ہر آزمائش میں ثابت قدم اترے۔ آزادی کے بعد بھی انھیں چین نصیب نہ ہوا۔ ان کی لڑائی مرتے دم تک جاری رہی غلامی کے دور میں وہ انگریزوں سے لڑتے رہے اور آزادی کے بعد فرقہ پرستی کے مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ یہ راہ بھی پہلی راہ کی طرح بہت کٹھن اور صبر آزما تھی۔ ۱۹۴۷ء دہلی کے مسلمانوں کے لئے ۱۸۵۷ء سے کچھ کم ہولناک نہیں تھا۔ اس ہولناکی میں تنہا حفظ الرحمٰن کی ذات تھی جو مسلمانوں کے لئے ڈھال کا کام دے رہی تھی۔ اس زمانہ میں انھوں نے دہلی کے مسلمانوں کی ایسی خدمت کی ہے جس کا صحیح اندازہ مستقبل کے مورخ ہی لگا سکتے ہیں مولانا کی خدمت کا دائرہ دہلی ہی تک محدود نہیں تھا۔ وہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے کام آتے تھے اور جہاں بھی بن پڑتا تھا اپنے اثر رسوخ اور دوڑ دھوپ سے مسلمانوں کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس بیماری میں بھی مولانا کو سکون نہیں تھا۔ امریکہ سے انھوں نے اترپردیش کے وزیر اعلیٰ کے نام جو خط ــــ لسانی فارمولا کے متعلق لکھا تھا، اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کے دل میں اپنی قوم کا درد کس درجہ تھا کہ اس کے سامنے انھیں اپنی جان لیوا بیماری کینسر کی ناقابل برداشت تکلیف بھی یاد نہیں رہتی تھی۔

پچھلے سال جون میں مولانا نے دہلی میں "مسلم کنونشن" بلایا تھا۔ اس کنونشن کی وجہ سے مولانا کو کانگریس اور سرکاری حلقوں کے علاوہ مسلمانوں کے بعض حلقوں کی شدید مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ مسلم کنونشن کے لئے مولانا نے ملک کا جو دورہ کیا تھا۔ اس میں جا بجا اپنی تقریروں میں وہ کنونشن کے اغراض و مقاصد کی وضاحت کے ساتھ مستقبل کے لائحہ عمل کا خاکہ بھی پیش کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ان پر کینسر کا حملہ ہوگیا۔ اور وہ مسلمانوں کے لئے آئندہ جو کام کرنا چاہتے تھے، اس سے معذور ہوگئے۔

عجیب اتفاق ہے کہ کل رات پچھلے پہر ہم نے خواب میں دیکھا کہ حافظ ابراہیم صاحب ایک جگہ بیٹھے ہیں اور ہم ان سے مولانا حفظ الرحمٰن کی خیریت دریافت کررہے ہیں۔ حافظ جی نے کیا جواب دیا، اس کے الفاظ تو یاد نہیں رہے لیکن جواب بہت مایوس کن تھا۔ یا شاید موت کی خبر تھی کہ اس پر ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلی تو اس وقت تک آنسو بہہ رہے تھے۔ طبیعت بہت مکدر ہوگئی اور مولانا کی صحت کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ مگر جب صبح کی خبریں سننے کے لئے ریڈیو کھولا۔ تو مولانا کی وفات کی خبر سنی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

مولانا سے بعض موقعوں پر ہمیں بھی اصولی اختلاف رائے ہوا۔ ان پر تنقید بھی کی لیکن مولانا کی عزت سے دل ہمیشہ لبریز رہا۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مولانا کی جتنی عزت تھی، اسی قدر ان سے محبت بھی تھی۔ مولانا بھی عزیزداروں جیسا سلوک کرتے تھے۔ پچھلے مارچ میں عیادت کے لئے جب ہم دہلی گئے تو مولانا بمبئی سے علاج کے بعد واپس آچکے تھے اور نئی دہلی میں حافظ ابراہیم صاحب کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ اس کوٹھی میں مولانا ابوالکلام آزاد صاحب بھی صاحب فراش رہ چکے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا تھا۔ مولانا جس کمرے میں لیٹے ہوئے تھے وہ اس کمرے سے ملا ہوا تھا جس میں مولانا آزاد نے وفات پائی تھی۔ ملاقات کے وقت بے اختیار آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ مولانا نے دیکھ لیا تو خود بھی بہت متاثر ہوئے۔ اور آبدیدہ ہوگئے یہ آخری ملاقات تھی اور دل نے کہہ دیا تھا کہ اب یہ چہرہ پھر دیکھنا نصیب نہ ہوگا چلتے وقت دروازے تک مولانا کی نگاہیں پیچھا کرتی رہیں۔ اور جب ہم نے پلٹ کر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں الوداع کہنے کی ایسی کیفیت تھی کہ ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔"

مولانا کے پھیپھڑے میں کینسر ہوا تھا۔ پہلے تجویز تھی کہ مولانا کو علاج کے لئے ماسکو بھیجا جائے۔ ہم نے بھی مولانا پر بہت زور ڈالا اور وہ راضی ہوگئے تھے لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ روسی ڈاکٹروں نے مولانا کے مرض کا مطالعہ کرنے کے بعد صاف جواب دیدیا تھا اور ماسکو لانے سے منع کردیا۔ امریکہ کے ڈاکٹروں نے امید دلائی تھی اور اسی امید پر مولانا کو امریکہ لے جایا گیا۔ ڈر تھا کہ پردیس میں مولانا جدا ہوجائیں گے۔ مگر مٹی وطن کی لکھی تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن جہاں جنگ آزادی کے ایک سپاہی قومی لیڈر اور ممبر پارلیمنٹ تھے وہیں جید عالم دین بھی تھے۔ انہوں نے کئی مشہور کتابیں

لکھیں۔ مولانا کی وفات سے مسلم قیادت میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کے جلد پر ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ مولانا پر مسلم قیادت کا ایک دور ختم ہو گیا۔ اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ مولانا کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ (آمین)

روزنامہ آبشار کلکتہ

کسی آدمی میں بیک وقت ساری خوبیاں اکٹھی نہیں ہوجاتیں، کوئی تحریر کے میدان کا مرد ہوتا ہے، تو کوئی تقریر کے میدان کا، کوئی سیاست میں اپنا عدیل ونظیر نہیں رکھتا تو کوئی علم وحکمت کے میدان میں اپنا مدمقابل کسی کو نہیں پاتا لیکن جو ہستیاں بیک وقت بہت سے اوصاف سے متصف ہوتی ہیں، وہ جینس یعنی "فطین" کہلاتی ہیں۔ ایسے لوگ بہت دنوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ یاد رکھے جاتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ایسے ہی جینیس لوگوں میں تھے جو خطابت، سیاست اور انشا پردازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ اور اگر اسی زمرے میں جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری مولانا حفظ الرحمٰن کو بھی رکھا جائے تو ہمارے خیال میں یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہوگی وہ بیک وقت اعلیٰ پایہ کے مقرر بھی تھے، اور مصنف بھی سیاست میں بھی درک رکھتے تھے اور علم وحکمت میں بھی قصص القرآن، اسلام کا اقتصادی نظام، تہذیب الاخلاق اور بہت سی دوسری کتابیں لکھ کر انہوں نے تحریر کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا تھا۔ اور جن لوگوں نے ان کی تقریریں سنی ہیں وہ اطمینان اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس میدان میں بھی وہ انفرادی حیثیت رکھتے تھے؛

مگر مولانا کی یہ ذاتی خوبیاں ہی انہیں مسلمانوں میں اس قدر ہر دل عزیز اور مقبول بنائے رکھنے کا باعث نہیں تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی ایسی خدمات انجام دی تھیں جنھیں کوئی بھلا نہیں سکتا۔ یہ خدمات انہوں نے ایسے وقت میں انجام دیں جب ہندوستان کے مسلمان نفسی نفسی کے عالم میں مبتلا تھے۔ کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔ کوئی ان کے زخموں پر پھاہا رکھنے والا نہیں تھا۔ کوئی انہیں یہ بتانے والا نہیں تھا کہ ایسے وقت میں جبکہ ہندوستان کی سرزمین ان کے لئے تنگ ہو رہی تھی۔ اور تقسیم ملک کے نتیجہ میں فرقہ پرست ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ انہیں کیا کرنا چاہئیے، مولانا نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ان کی حفاظت کا سامان مہیا کرایا۔ ان کے ذہنوں کی تاریکی دور کرنے کے لئے امید کی کرن ہم پہونچائی۔ انہیں تسلی دی جھنجھوڑا، ان کی حالت زار کی طرف توجہ دلائی، اور حکومت کو اپنے فرض کا احساس کرنے پر مجبور کر دیا۔

اور پھر جب جبل پور اور ساگر کے مسلمانوں پر قیامت صغریٰ ٹوٹی، تو اس مرد مجاہد نے فرقہ پرستوں کی طرف سے فرقہ پرست کا خطاب پانے اور اپنی حب الوطنی پر سینکڑوں چوٹیں کھانے کے باوجود "مسلم کنونشن" منعقد کرایا اور اپنے خطبۂ استقبالیہ میں بے باکی اور بے خوفی کے ساتھ یہ آواز بلند کی۔

"مسلم اقلیت کے خلاف یہ جارحانہ فرقہ واریت اور معاندانہ جذبات صرف عوامی زندگی ہی میں اثر انداز نہیں بلکہ زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت کے دائروں میں بھی اس کی چھاپ بہت گہری ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ جا بجا مسلم اقلیت آئے دن ایک شر پسند گروہ کے ہاتھوں جان ومال اور عزت وآبرو کی یکطرفہ بربادیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے"

یہ مولانا حفظ الرحمٰن ہی کا جگر تھا جو لوک سبھا ہو یا جلسۂ عام بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل پر بولنے سے نہیں چوکتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ایک ممتاز ممبر پارلیمنٹ شری اندرجیت گپتا نے ایک دفعہ کہا تھا کہ لوک سبھا میں واحد شخص جو مسلمانان ہند کے مسائل پر بے خوفی کے ساتھ بولتا ہے، وہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات ہے۔ افسوس کہ آج یہ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی، مسلمانان ہند کا ایک بہت بڑا مخلص خادم آج ان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا"

"انا للہ وانا الیہ راجعون"

روزنامہ "اخوت" کلکتہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے انتقال پر آج پورے ملک میں اظہار افسوس کیا جا رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مسلم اقلیتوں کو ایک زبردست دھکا لگا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے اٹھ جانے سے ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بڑا ستون گر گیا ہے۔ وہ چراغ بجھ گیا ہے جس نے ہندوستان کو بدترین مایوسیوں کی تاریک گھڑیوں میں امید اعتماد اور یقین کی روشنی عطا کی تھی"

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو بجا طور پر مجاہد ملت کا خطاب دیا گیا آپ ہر لحاظ سے اس خطاب کے مستحق تھے آزادی کے بعد قوم پرورانہ مفاد کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مسلمانوں کی بہترین خدمات سر انجام دی ہیں اور ایک نڈر اور بے باک مجاہد کی حیثیت سے ان کی رہنمائی کی"

آزادی اور تقسیم ملک کے موقعہ پر ہندوستان میں فرقہ پرستی کی بھیانک آندھیاں چل پڑی تھیں۔ لاکھوں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے ان کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا تھا۔ اس نازک گھڑی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنے عزم و استقلال سے مسلمانوں کے گرتے ہوئے حوصلوں کو سہارا دیا۔ ان کے تذبذب کو یقین عطا کیا۔ ان کی مایوسیوں کو امیدوں میں بدل دیا افسوس کہ وہ سالار قافلہ ہم میں نہیں رہا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے نہ صرف کانگریس کے باہر بلکہ کانگریس کے اندر بھی فرقہ پرستی کے خلاف زبردست جنگ کی جس طرح آپ نے جن سنگھی اور مہاسبھائی فرقہ پرستی کا مقابلہ کیا۔ اسی طرح آپ نے کانگریس میں کانگریسیوں کی فرقہ پرستی کا بھی دلیری سے مقابلہ کیا۔ اس کی بہترین مثال گذشتہ سال مسلم کنونشن کے موقعہ پر دیکھنے میں آئی۔ فسادات مدھیہ پردیش سے متاثر ہوکر مجاہد ملت نے جب مسلم کنونشن کی تحریک کی تاکہ ہر مکتب خیال کے سربرآوردہ مسلم زعماء ایک جگہ سر جوڑ کر مسلمانان ہند کے مسائل کا حل دریافت کریں تو غیروں نے مولانا حفظ الرحمٰن کے خلاف اور ان کی نام نہاد فرقہ پرستی کے خلاف جو شور و غل مچایا تھا وہ اپنی جگہ پر تھا۔ اپنوں نے بھی ان کے خلاف ایک طوفان اٹھایا اور کانگریس ہائی کمانڈ کو مولانا کے خلاف گمراہ اور متاثر کرنے کی کوشش کی یہ ایک کھلا راز ہے کہ کانگریس ہائی کمانڈ مسلم کنونشن کے خلاف تھی لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے وزیر اعظم جواہر لال جی اور صدر کانگریس شری سنجیو ریڈی سے مل کر ان کی بدگمانیوں کو دور کردیا اور تمام مخالفتوں کو ہموار کرکے کنونشن کو کامیاب کیا۔ اسی موقعہ پر مولانا حفظ الرحمٰن نے یہ ثابت کردیا کہ وہ ان نیشنلسٹ مسلمانوں میں سے نہیں ہیں جنھوں نے عام مسلمانوں کی غلط نمائندگی کرکے کانگریس کی خوشامد اور چاپلوسی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے اور جو مظلوموں کے حق میں جائز آواز اٹھاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ ان کو کوئی فرقہ پرست نہ کہہ دے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا انتقال ادارہ اُخوت کے لئے اور زیادہ سانحہ ہے۔ کیونکہ اخوت کے سرپرست جناب شیخ اکبر علی قریشی سے مرحوم کے مراسم تھے۔ مرحوم وقتاً فوقتاً اپنے قیمتی مشوروں سے اخوت کی رہنمائی فرماتے تھے۔ ہم صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں کہ خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)

صداقت پٹنہ

۲۰ اگست کی صبح مسلمانان ہند کے لئے کتنی منحوس تھی جب کہ ان کا واحد لیڈر جو زبردست عالم دین بھی تھا موت کے ظالم و بے پناہ ہاتھوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان سے چھن گیا۔ مشار الیہ لیڈر مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند کی ذات گرامی تھی۔ مولانا جب امریکہ سے علاج کراکر مراجعت فرماتے ہند آئے ہوئے تھے تو آپ کی ظاہری حالت اور نیز ماہر فن ڈاکٹروں کی رائے کے پیش نظر ہر شخص آپ کی صحت کی طرف سے مطمئن تھا اور امید تھی کہ بحمد اللہ مولانائے مرحوم بہت جلد قومی کاموں کی باگ اپنے دست مبارک میں بدستور لے لینے کے قابل بن جائیں گے۔ لیکن یہ عارضی افاقہ مرض اور بحالی صحت محض سنبھالا ثابت ہوا چنانچہ ۲۰ اگست کو جب اس سانحہ ہوشربا کی خبر شائع ہوئی تو ہر شخص اپنی اپنی جگہ حیران و مبہوت ہوکر رہ گیا حضرت مولانا کی ظاہری علامت ایسی نہ تھی کہ دست اجل اتنا جلدی انہیں اپنی گرفت میں لے سکتا پھر سن بھی کچھ زیادہ نہ تھا زیادہ سے زیادہ ۶۲ سال کی عمر تھی جو عقل و تجربہ کے لحاظ سے سیاسی زندگیوں کا شباب ہوتا ہے۔ اس بناء پر حضرت کی موت کو بجا طور پر قبل از وقت قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ جوانا مرگی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

مجاہد ملت نے قوم و ملک کی جو بیش بہا اور انتھک خدمات جنگ آزادی کے دوران میں اور اس کے بعد بھی انجام دی ہیں اس نے انہیں ملک و ملت کا صحیح رہنما، قائد، زعیم بنا دیا تھا۔ آپ میں جو سب سے بڑی خوبی ہے جس کا آجکل کے مسلم لیڈروں میں بڑی حد تک فقدان ہے۔ آپ کا ظلم و بے انصافی کو چاہے وہ حکومت کی جانب سے ہو یا عوام کے واسطے سے برداشت نہ کرنا اور شدید احتجاج کرنا تھا۔ آپ دین اسلام کے سب سے بڑے خدمت گذار اور عامۃ المسلمین خصوصاً مسلمانان ہند کے مخلص ہمدرد اور جاں نثار دوست تھے۔ آپ کی سیاسی بصیرت اس وقت بھی اتنی ہی انجام بین تھی جتنی آج مشاہدہ کی بناء پر کوئی شخص نتیجہ نکال سکتا ہے۔ مولانا کی اصابت رائے کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ آپ نے تحریک قیام پاکستان کے طوفانی دور میں محض اس بناء پر اس کی مخالفت کی تھی کہ پاکستان جس مقدس و متبرک جذبہ کے ماتحت قائم کرنے کی جد و جہد کی جارہی ہے وہ قیام کے بعد بروئے کار نہیں آسکتا اور مسلمانان ہند کے لئے تو بیکار محض ہی نہیں بلکہ ضرر رساں بھی ہوگا۔ آج ہر شخص اس نظریہ کی صداقت پندرہ سالہ تجربہ کے بعد تسلیم کرنے پر مجبور ہے۔ پھر ان کی اسلام دوستی کا ثبوت بھی اس سے بدرجہ اتم فراہم ہوتا ہے کہ جب ان کے منشاء کے علی الرغم وہ قائم ہی ہوگیا تو انہوں نے اس کی مخالفت ترک کردی اور کبھی اس کی مخالفت اور مذمت میں کوئی کلمہ تمام عمر منہ سے نہ نکالا۔

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مسلمانان ہند کے سیاسی قائد ہی نہ تھے بلکہ ایک زبردست اہل علم اور فصیح البیان ادیب بھی تھے جس کا بدرجہ اتم ثبوت ان کی گرانبہا تصنیفات سے ملتا ہے۔ جو ان کے قلم سے اب تک نکل چکی ہیں خصوصاً قصص القرآن سے جو کئی جلدوں میں شائع ہوئی ہے اس میں قرآنی قصص و بیانات کی جو نادر تحقیقات کی گئی ہیں وہ اتنی جامع و یکجائی صورت میں کہیں اور کسی زبان میں دستیاب نہیں ہو سکتی ان مجلدات میں حضرت مولانا نے جو زبردست داد تحقیق مختلف اقوام اور ان کی معاشرت و معتقدات کے متعلق دی ہے اس نے انہیں محققین و مورخین عالم کے صف اول میں کھڑا کر دیا ہے۔ مولانا نے اپنے دعاوی کو مدلل و مستند بنانے کے لئے قدم قدم پر محققین آثار قدیمہ کے بیانات کے حوالے دیئے ہیں۔ اس سے ان کی غایت وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے یہی وہ وسعت نظر ہے جس نے انہیں اپنے بعض جلیل القدر معاصرین کے بیانات سے اختلاف کرنے پر مجبور کر دیا ہے بغرض یہ تصنیف مولانا کو محققین عالم کے زمرہ میں زندہ جاوید بنا چھوڑے گی۔

سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

اردو زبان سے بھی مولانا کو جتنی دلی ہمدردی تھی اس کی مثال بہت کم ہوگی اس زبان اور رسم الخط سے ان کی والہانہ شیفتگی اس سے عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے اس کی مدافعت میں جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ پارلیمنٹ میں جب کبھی مخالفین نے اردو پر حملہ کیا تو مولانا کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی تھی اور شیرانہ گرج سے مخالفین کو اتنا مرعوب کر دیتے تھے کہ وہ دوبارہ اتنی بے باکی سے اردو زبان پر حملہ کرنے کی جرأت نا نہیں کرتے تھے۔ دلائل وہ اتنے زبردست پیش کرتے تھے کہ انصاف پسند اراکین پارلیمنٹ ان کی حمایت میں اپنی آواز بلند کر دیتے تھے۔ مولانا کی اردو زبان سے غایت محبت اور والہانہ شیفتگی کا اندازہ اس خط سے بھی کیا جا سکتا ہے جو دوران علالت انہوں نے امریکہ کے شفا خانے سے یوپی کے چیف منسٹر مسٹر سی بی گپتا کو ان کی اس تجویز کے جواب میں ارسال کیا تھا کہ یوپی کے مدارس میں راشٹر بھاشا کے ماسوا جتنی زبانوں کے پڑھائے جانے کا مشورہ تھا اس میں اردو کا نام شامل فہرست نہ تھا مولانا نے اپنی تحریر میں اس خامی کی طرف سختی کے ساتھ توجہ مبذول کرائی تھی۔

مولانا کو بہار سے بھی خاصی محبت تھی جب کبھی بہار پر کوئی مصیبت نازل ہوئی مولانا بے چین ہو گئے اور فوراً یہاں پہونچنے کے لئے وقت نکالا یا اس طرح مولانا رحمۃ اللہ علیہ بہار میں اتنی بار تشریف فرما ہوئے کہ یہاں کے اکثر افراد آپ سے مانوس ہو گئے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل بہار کو ان کی موت کی خبر سن کر اتنا ہی گہرا صدمہ ہوا جتنا کہ ان کو اپنے کسی چہیتے عزیز کی موت پر ہو سکتا ہے بہر حال دعا ہے کہ خداوند کریم مولانا کو ان کی دین و ملت کی بے نظیر خدمات کے صلہ میں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ہم غمزدہ پسماندوں کو صبر جمیل اور نعم البدل عطا فرمائے

(آمین)

خلافت بمبئی

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کے بعد اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی نظر کسی طرف اٹھتی تھی تو وہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن ہی کی ذات تھی لیکن یہ تحریر کرتے ہوئے قلم کانپتا ہے کہ وہ بھی اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ موت نے ان کو ہم سے اتنی دور پہونچا دیا ہے کہ ہماری آہ و زاری اور نالۂ فریاد بھی ان کو واپس نہیں لا سکتے۔ مولانا کی وفات کے اندوہناک سانحے پر نہ تو آسمان کانپ اٹھا نہ زمین تھرائی مگر کروروں مسلمانوں کے دل ضرور پاش پاش ہو گئے اب اردو کے نام پر پنڈت پنت راج رشی ٹنڈن اور سردار پٹیل سے اسی بے جگری کے ساتھ کوئی مقابلہ نہ کریگا۔ جیسا کہ مجاہد ملت نے کیا جبل پور کے فسادات پر اب کوئی اس جرأت اور بے خوفی کے ساتھ تقریریں نہ کر سکے گا جیسی مولانا نے کی تھیں مسلمانوں کے لئے وہ قربانیاں آنے والی صدی میں بھی کوئی نہ دے سکے گا۔ جو ایک سچے مسلمان مولانا حفظ الرحمٰن نے دیں۔

مسلمان ایک عرصے سے لیڈر شپ کے معاملہ میں بڑے بدقسمت ہیں۔ سالہا سال سے ان کو کوئی ایسی شخصیت نہ مل سکی ہے جو ان کی نمائندگی کر سکے جن کے دل میں قوم کا درد ہوتا ہے۔ انھیں قبول عام نہیں ملتا۔ اور جو جی حضوری ہیں ان سے امید ہی کیا کی جا سکتی ہے۔ لے دے کے ایک مولانا مرحوم ہی تھے جو برے یا بھلے تھے تو سہی — مگر اب کون ہے؟

فرقہ واریت آج بھی باقی ہے اردو آج بھی اسی طرح ستم کی شکار ہے۔ مسلمانوں کی عام بدحالی کا وہی عالم ہے مگر ایسا کوئی نہیں جو ان تمام باتوں کو دیکھکر تڑپ اٹھے جس کی آنکھوں میں آنسو آجائیں اور جو زخم کے مرہم کے لئے خود ہی زخمی ہو جائے۔ لکھنے والے بہت کچھ لکھیں گے مگر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا لکھیں سوائے اس کے کہ — الٰہی تو مسلمانوں میں کچھ اور محمد علی کچھ اور شوکت علی کچھ ابوالکلام آزاد اور کچھ حفظ الرحمٰن پیدا کر تا کہ یہ ٹوٹی ہوئی کشتی جو صرف نیت کے رحم و کرم پر چل رہی ہے۔ ساحل سے لگ جائے۔

(ابح رص)

حقیقت لکھنؤ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے!
بڑی مشکل سے ہوتا ہے جہاں میں دیدہ ور پیدا

آخر ہوکر ہی رہا جس کے تصور سے روح لرز رہی تھی۔ اور وہ منحوس ساعت بالآخر آکر ہی رہی جس کا آنا اسی دن سے یقینی سمجھ لیا گیا تھا جب اب سے چار ماہ قبل ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر کہہ دیا تھا کہ مریض کو کینسر کا مہلک مرض ہوگیا ہے جس سے جانبر ہونا قطعی ناممکن ہے۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات ایک ایسا سانحہ عظیم ہے جس نے دل ودماغ کو اتنا متزلزل کردیا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں اس سانحہ پرغم والم کا اظہار کیا جائے۔ اور کیا کہہ کر اس غم رسیدہ قوم کو تسکین وتسلی دی جائے جس کو اب آئندہ پچاس سال میں بھی حفظ الرحمٰن کا نعم البدل نہیں مل سکتا۔ گذشتہ پندرہ سولہ سال کے اندر اور جتنے بھی مسلم قائد ورہنما دنیا سے رخصت ہوگئے ان میں سے ہر بزرگ کی موت کم وبیش ایک بڑا ناقابل تلافی نقصان تھا۔ لیکن یہ حادثۂ عظیم تو ایسا ہے کہ اس کے مقابلہ میں اور تمام سابق سانحے بھول جاتے ہیں۔ اور کسی بزرگ قوم کی رحلت پر یہ کہنا کہ اس حادثہ سے جو نقصان ہوا وہ ناقابل تلافی ہے یہ تو ایک حد تک رسمی بات بھی ہوسکتی ہے جس میں مبالغہ کی گنجائش بھی ہے لیکن مجاہد ملت کی موت درحقیقت ایسی ہے گویا روشنی کا ایک عظیم الشان مینارہ تھا جو ایک دم منہدم ہوگیا۔ اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی چھاگئی واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی رحلت سے جو دھچکا ملک وملت کو پہونچا تھا اس سے کہیں زیادہ شدید اور ناقابل تلافی نقصان مولانا حفظ الرحمٰن کی مرگ بے ہنگام سے ہوا جس موذی مرض نے اس بیش قیمت زندگی کو اس کی عمر طبعی سے بہت پہلے خاک میں ملادیا اس نے فی الحقیقت ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کو ایسا یتیم اور بے سہارا و بےکس بنادیا ہے کہ اب اس بے سری قوم کی صحیح رہنمائی کرنے والا کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا۔

یوں تو مولانا مرحوم کی وفات ایک ایسا مشترکہ حادثہ ہے جس کے غم میں ہر فرقہ کے لوگ کم وبیش شریک ہیں لیکن مسلمانوں پر تو اس سانحہ سے ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے کہ عرصہ دراز تک یہ بوجھ ہلکا نہیں ہوسکے گا۔ حضرت جگر مرادآبادی شاید اسی سانحہ کے لئے یہ شعر کہہ گئے ہیں:

جان کر منجملۂ خاصان میخانہ تجھے
مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ تجھے

مجاہد ملت کی دائمی جدائی سے جو گھاؤ ان کے لاکھوں عقیدت مندوں کے دلوں کو لگا ہے۔ وہ ایسا زخم ہے جو موجودہ نسل کی زندگی میں مندمل ہونے والا نہیں ہے۔ ایسے بلند کردار، بے نظیر مدبر...... ایسے سلجھے ہوئے دماغ اور ایسے دلیر اور نڈر دل گردہ کے انسان صدیوں میں ہی پیدا ہوا کرتے ہیں۔ دوسرا حفظ الرحمان تو اب سو برس میں بھی میسر آنا بہت مشکل ہے۔ ہمالیہ کی چوٹیوں سے راس کماری تک اور بحیرہ عرب کے ساحل سے بحیرہ ہند کے ساحل تک ایک خاص فرقہ وملت کے آٹھ کروڑ انسانوں کی بستی میں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اسلامی زندگی کے کسی ایک شعبہ میں بھی اس قائد اعظم کی جانشینی کرسکے جس کے جسد خاکی کو لاکھوں سوگواروں نے جمعرات ۲ اگست کی شام کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پہلو میں بہ ہزاروں حسرت ویاس سپرد خاک کردیا۔

بناکردند خوش رسمے بہ خاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی قومی ووطنی خدمات اتنی روشن ہیں کہ ان کے متعلق کچھ لکھنا عبث ہے۔ مرحوم کی خدمات ملی ووطنی نے ان کو اتنا محبوب اور ہر دلعزیز بنادیا تھا کہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مسٹر رفیع احمد قدوائی کی اچانک وفات کے بعد سے آج تک کوئی ایسی موت نہیں ہوئی کہ جس کو ہر شخص یہ سمجھا ہو کہ گویا خود اس کا کوئی عزیز قریب یا مربی وسرپرست دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ملک وقوم کو جو زخم مسٹر قدوائی کی موت سے پہنچا تھا وہ گھاؤ مولانا کی رحلت سے تازہ ہوگیا ہے۔ رفیع صاحب کے بعد تو مولانا آزاد، مولانا مدنی اور خود مولانا حفظ الرحمٰن موجود تھے جو کسی حد تک اس کمی کو پورا کرسکتے تھے لیکن جو خلا مولانا کی رحلت سے پیدا ہوگیا ہے اس کو پورا کرنے والا تو مسلمانوں میں ایک شخص بھی نظر نہیں آتا۔

جس طرح آج رفیع صاحب مرحوم کو آٹھ سال گزرنے کے بعد بھی لوگ رو رہے ہیں، اسی طرح مولانا حفظ الرحمٰن کی دائمی جدائی بھی ہمیشہ غم کے آنسو رلاتی رہے گی، اتنے بلند کردار ایسے مخلص خادم ملت اور اس قدر سلجھے ہوئے دماغ کا کوئی فرد آج قوم میں نظر نہیں آتا۔ قومی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ایسا نہیں تھا جس کو مولانا مرحوم نے اپنی مخلصانہ اور انتھک خدمات سے فیض نہ پہونچایا ہو۔ افسوس۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

یوں تو مجاہد ملت کی وفات کے دردناک سانحہ میں پوری قوم تعزیت اور پرسہ کی مستحق ہے۔ کیونکہ موت کے اس بے پناہ وار نے لاکھوں انسانوں کے قلب کو مجروح اور غم زدہ کردیا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ مولانا مرحوم کے متعلقین اور ان کے پسماندگان پر جو پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اس بوجھ کو صرف تلقین صبر ہی سے کچھ ہلکا کیا جاسکتا ہے اور یہی بالآخر ایسے سانحہ عظیم کا انجام ہوتا ہے۔ خدائی مرضی پوری ہوکر رہی انسان کے بس میں جو کچھ تھا اس آفت ناگہانی سے بچنے کے لئے وہ تمام

تدابیر اختیار کی گئیں مگر ؎

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے
آشیاں اجڑا کیا اور ہم ناتواں دیکھا کئے

اللہ تعالےٰ حضرت مولانا کی روح پاک کو اپنے دیار رحمت میں درجات عالی عطا فرمائے۔ عزیزوں کو صبر و استقامت کرامت کرے اور ہماری آئندہ نسلوں کو مجاہد ملت مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے (آمین)

امروز کلکتہ

کچھ لوگ اپنی تاریخ آپ بناتے ہیں ۔ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک ہیں ورنہ آج سے باسٹھ برس پہلے جب وہ بجنور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تو کسے معلوم تھا کہ ایک مولوی گھرانے کا چشم و چراغ ایک دن ہندوستان کا ایک عظیم سپوت اور مسلمانان ہند کا سالار کارواں ہوگا ۔ مولانا جب دیوبند میں داخل ہوئے اس وقت بھی ایسی کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی تھی ۔ کیونکہ دیوبند اگرچہ انقلابی پروگراموں کا مرکز تھا ۔ اگرچہ یہاں کے ہر بچے کی یہ خواہش تھی کہ انگریزوں کا نحس قدم ہندوستان سے نکل جائے مگر ہر بچہ اتنا بہادر بھی نہیں تھا ۔ اور ہر طالب علم اس جذبے سے سرشار نہیں تھا کہ وہ آگے بڑھ کر آسمان سے آفتاب اور ماہتاب چھیننے کی کوشش کرتا ۔ جو آفتاب کو منع کر دیتا کہ تو اپنی روشنی ہر وقت تاج برطانیہ کے زیر نگیں ملکوں پر بکھیرتا رہ ۔ یہ کیا مذاق ہے کہ دور دیس کے رہنے والے اتنے بڑے خطۂ زمین پر قابض ہوں کہ وہاں سورج ہی غروب نہ ہو ۔ ہر شخص کا یہ حوصلہ نہیں تھا کہ وہ انگریزوں کو للکارتا اور انگریزی فوج اور انگریزی پولیس اس کے سامنے کوئی وقعت اور کوئی حیثیت نہ رکھتی ۔

مگر مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن ان معدودے چند خواص میں تھے جنھوں نے ہمیشہ تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت کی ۔ جنھوں نے ہندوستان سے انگریزی حکومت کے نکال باہر کرنے میں قدم قدم پر اور زندگی کے ہر لمحہ میں برادران وطن کا ساتھ دیا ۔ اور انگریزی فوج ، انگریزی پولیس اور انگریزی سنگینیں ان کے حوصلے کا مقابلہ نہیں کر سکیں انقلاب کا نعرہ لگاتے رہے جیل جاتے رہے تکلیفیں برداشت کرتے رہے اور مسکراتے رہے ۔

گوپی ناتھ امن نے درست کہا ہے کہ " جو لوگ سمجھتے ہیں کہ سیاست اور مذہب ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے ہیں وہ غلطی پر ہیں مولانا حفظ الرحمٰن پکے مذہبی آدمی اور مسلمان تھے ۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ زبردست قوم پرور بھی ؛ وہ ہر طرح کی مشکلات کے باوجود اپنے راستے سے ہٹیں نہیں ہٹے ، نہ کبھی اپنی زبان سے یہ کہا کہ آزادی کی خاطر انھوں نے کیسی مصیبتیں جھیلی ہیں وہ جب بات کرتے تھے تو ان کی زبان نہیں ان کا دل بولتا تھا ۔"

مولانا ایک زبردست مقرر تھے ۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے آپ کی تقریر نہ سنی ہو ۔ مگر کبھی آپ نے شکوہ نہ کیا ۔ یہ نہیں کہا کہ ہم نے بھی آزادی کی راہ میں تکلیف اٹھائی اور ہمیں بھی آزادی کے بعد حق ملنا چاہئے ۔ بلکہ آپ نے ہمیشہ یہ کہا کہ اس ہندوستان کے ایک شہری ہم بھی ہیں اور ہندوستان پر ہمارا بھی وہی حق ہے جو دوسروں کا ۔ آپ عالم تھے اور مستحکم مسلمان ۔ کبھی سیاست نے آپ کا راستہ نہیں روکا ایک طرف ملک اور وطن کا کام ہوتا تھا ۔ دوسری طرف ارکان اسلام ادا ہوتے تھے تیسری طرف وطن والوں کا کام بھی کرتے تھے ۔ نماز کا وقت ہوا بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہوئے ۔ کوئی ملکی مسئلہ ہوا تو اس میں شریک رہے اور کسی یتیم ، کسی بے کس اور کسی بیوہ کی فریاد کانوں میں پہونچی تو اس طرف بھی لبیک لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے ۔ غرضیکہ کسی فرض سے غافل نہیں رہے ۔ خواہ وہ انسانی فرائض ہوں خواہ پروردگار عالم کا فرض ۔

یوں تو آزادی سے پہلے بھی کروڑوں مسلمان آپ سے اور جمعیۃ علماء ہند سے عقیدت رکھتے تھے مگر آزادی کے بعد تو آپ ہی تنہا سہارا رہ گئے ۔ آپ ہر جگہ پہنچتے تھے اور ہر آواز پر لبیک کہتے تھے ۔ نہ تو آپ یہ دیکھ سکتے تھے کہ کوئی ہندو کسی مسلمان پر ہاتھ اٹھائے اور یہی مقصد ہوتا ہے ایک سچے مسلمان کا کیونکہ اسلام دنیا میں عدل کے لئے آیا ہے ۔ انصاف کے لئے آیا ظلم اور استبداد کو ختم کرنے کے لئے آیا ۔ مولانا کو لوگوں نے دہلی کے فساد کے وقت بھی دیکھا ۔ مولانا کو لوگوں نے جبل پور کے فساد کے وقت بھی دیکھا ۔ مولانا علی گڑھ ، میرٹھ وغیرہ کے فساد کے موقعہ پر بھی پہونچے ۔ مگر کوئی سچا ہندو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مولانا کسی فرقہ کی حمایت کے لئے پہونچتے تھے بلکہ مقصد تھا مصیبت زدوں کی امداد اور بے گناہوں کو قتل عام سے محفوظ رکھنا ۔ ظالموں کو ظلم سے روکنے کی کوشش اور مظلوموں کا تحفظ ______ اس وسیع مقصد کے تحت نہ تو آپ کے سامنے ہندو کا سوال تھا اور نہ مسلمان کا بلکہ عام انسانیت کی خدمت تھی ۔ اور یہ خدمت نہایت سچائی سے آپ انجام دیتے رہے ۔

نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے آل انڈیا ریڈیو پر مولانا موصوف کی تعریف میں جو پیغام نشر کیا اس میں انہوں نے کہا کہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ مہلک مرض میں مبتلا تھے اور محنت و کاوش کے باوجود سب دیکھ رہے تھے کہ وہ جانے کی تیاری کر رہے ہیں یہ خیال بھی تھا کہ شاید وہ

سفر ملتوی کر دیں۔ اور راہ بدل دیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک ان کے دل کی
گرمی اور روح کی حرارت ان کو دیکھنے کے لئے جانے والوں کو بھی روشنی بخشتی
تھی لیکن کیا وہ واقعی چلے گئے جبکہ ان کی محبت ہزاروں ساتھیوں کے
سینوں، ان کی محبت بے شمار لوگوں کے دلوں اور ان کی ہمدردی کی یاد ہزاروں
بیواؤں اور یتیموں کے دلوں کے اندر زندہ ہے۔ جن کے لئے وہ بے سروسامانی
میں بھی ہمت کا سرچشمہ تھے۔

مولانا واقعی بے سروسامان تھے۔ انہوں نے عمارتیں نہیں تعمیر کیں۔
انھوں نے اپنے گھر کو مال اور دولت سے نہیں بھر دیا۔ مگر آج ہندوستان میں
ہزاروں آدمی ایسے ہیں جنھیں محض مولانا کی نظر التفات نے کہیں سے کہیں پہونچا
دیا۔ ہزاروں ہی نہیں بلکہ لاکھوں اجڑے ہوتے مسلمان آباد ہو گئے نہیں
معلوم کتنے زمانے کے ٹھکرائے ہوئے انسان آج مولانا کی کوشش سے
دوسروں کا سہارا بنے ہوئے ہیں۔ مولانا میں ایک کشش تھی اور وہ کشش دوست
اور دشمن سب کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ہم اسے حقیقت کہیں گے سچائی
کہیں گے اور یہ مولانا کا خلوص اور ان کا اظہار حق تھا جس کی طرف لوگ
خود کھنچے آتے تھے۔

رہنمائے دکن حیدرآباد

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم
اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند ایک طویل علالت کے بعد جب کہ ان کے صحت مند ہونے کی
توقع پیدا ہو گئی تھی کل صبح اپنی قیام گاہ واقع دہلی میں انتقال کر گئے
تقسیم ہند کے بعد جب حالات نہایت خطرناک ہو گئے تھے اور مسلمانوں
پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اور اس پریشانی میں مسلمان تقریباً مخبوط الحواس
ہو چکے تھے مولانا مرحوم جمعیۃ علمائے ہند کو لیکر آگے بڑھے اور پریشان حال
مسلمانوں کی ہر طرح ڈھارس بندھائی اور انھیں ہمت و ثابت قدمی سے
اپنے مصائب کا مقابلہ کرنے اور اپنے مسائل حل کرنے کی تلقین کی۔ جہاں
تک حکومت میں اپنا اثر و رسوخ تھا اس سے کام لے کر کسی بھی موقع پر مسلمانوں کے
ساتھ ناانصافی اور ظلم و زیادتی ہوتی وہ حکومت سے اس معاملہ میں دادخواہ
ہوتے اور انصاف کا مطالبہ کرتے جس میں اکثر انھیں کامیابی ہوتی
وہ ہر معاملہ میں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینے کا مشورہ دیتے اور خود
بھی اس پر پوری طرح کاربند تھے۔ پارلیمان کے رکن کی حیثیت سے جب بھی
موقع آتا مسلمانوں کی نمائندگی اور ترجمانی کرتے اور یہ سب حکومت کی بہی خواہی
میں کرتے اکثریتی فرقہ پرست جماعتیں اور بعض متعصب اور تنگ نظر افراد مسلمانوں
پر کوئی الزام لگاتے اور انھیں مطعون کرتے تو وہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے اور
انھیں پاس ہموطنی کا درس دیتے وہ اپنی تقریروں میں ہمیشہ مسلمانوں کو احساس
کمتری دور کرنے اور اکثریت سے مرعوب نہ ہونے پر متوجہ کرتے اس میں کوئی
شک نہیں کہ آخر وقت تک ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ ملک و قوم کی خدمت میں گزرا
ہو۔ مولانائے مرحوم کے اٹھ جانے سے مسلمان ایک مخلص رہنما اور ایک جری ترجمان
سے محروم ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد آزادی کے بعد حکومت میں داخل ہو گئے
تو مسلمانوں کے مسائل سے زیادہ ان کی توجہ حکومت کی ذمہ داریاں پوری کرنے
کی طرف لگی رہتی تھی اور مسلمانوں کی نظریں تمامتر مولانا حفظ الرحمٰن پر رہتی تھیں
مولانائے مرحوم کی زیادہ تر توجہ مسلمانوں کی دینی تعلیم کے مسئلہ کو حل کرنے پر مبذول
تھی۔ انھوں نے جمعیۃ العلماء کے زیر اہتمام دینی تعلیم کانفرنس منعقد کر کے
پہلی مرتبہ مسلمانوں .... دینی تعلیم کا
مسئلہ حل کرنے کی دعوت دی اور اس بارہ میں جمعیۃ علماء کی ہر امکانی امداد کا
سامان کیا۔ غرضکہ وہ ہر محاذ پر قوم وملک کے ایک جانباز سپاہی کی طرح جمے رہے
مولانائے مرحوم ایک عالم دین ہی نہ تھے وہ ایک اچھے سنجیدہ مقرر اور بلند پایہ
مصنف تھے۔ مولانا کی تالیف میں قصص القرآن ایک ضخیم اور تحقیقی
تصنیف ہے۔ سیرت پاک میں ایک مختصر لیکن جامع تصنیف کی تھی۔ مولانا نے
قومی خدمت اور ملک کی سیاست کو خدمت علم میں حارج ہونے نہ دیا جس کے
نتیجہ میں ان کی قوم ان کی تصانیف سے مستفید ہوتی رہے گی۔ مسلمانوں کی یہ بدبختی
ہے کہ ان کی صف ایسے قائدین سے خالی ہوتی جا رہی ہے اور ان کا نعم البدل تو
کجا کوئی بدل نہیں پایا جاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانائے مرحوم نے بڑے نازک
زمانہ میں مسلمانان ہندوستان کی رہنمائی کی بہر حال آج مسلمانوں کی
ایک بڑی شخصیت ان سے جدا ہو گئی جس کا جتنا غم کیا جائے کم ہے۔

سیاست حیدرآباد

ہندوستان کے علماء نے جدوجہد آزادی میں جو اہم اور نمایاں حصہ لیا
تھا اس کی آخری یادگار مولانا حفظ الرحمٰن اس دنیا سے اٹھ گئے۔ مولانا نے
پچھلے چند سالوں میں مسلمانوں کے مفادات و مسائل کو سلجھانے کے لئے اپنے کو
وقف کر دیا تھا۔ لیکن کسی میں بھی یہ جرأت نہ تھی کہ انہیں فرقہ پرست کہے چونکہ

ان کی ساری زندگی قوم پرست تحریکات سے وابستہ رہی ہمارے ملک کی تحریک آزادی میں یوں تو تمام طبقات نے حصہ لیا ہے لیکن علماء کا حصہ لینا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ اور مولانا اس طبقہ کی آخری شمع تھے یہ شمع بجھ گئی۔ قوم پرست مسلمان قائدین کی صف میں خلاء پیدا ہو گیا جس کے پُر ہونے کی بظاہر کوئی امید نہیں۔

جمعیۃ علماء ہند نے آزادی کے بعد اقلیتی طبقہ کو قومی زندگی اور عوامی سیاسی تحریکات سے قریب تر کرنے میں اہم حصہ لیا۔ مولانا موصوف کی واحد شخصیت میں پوری .... جمعیۃ العلماء سمٹ کر آ گئی تھی تنظیم کو جو کام انجام دینا چاہیے اور تنظیم سے عوام کو جو توقعات وابستہ ہیں۔ مولانا ان سب کا مجموعہ بنے ہوئے تھے۔ مولانا کو صحیح خراج عقیدت یہی ہو سکتا ہے کہ جمعیۃ علماء ٹھیک طور پر کام کرے۔ مولانا اپنی عمر اور علالت کے باوجود، جمعیۃ علماء کے مقاصد اور مشن کو جس طریقے سے پیش کرتے تھے وہ انہی کا حصہ تھا۔ مولانا نے آخری دم تک اپنی بساط کے مطابق ملک و قوم کی جو خدمت کی وہ انہیں ہماری سیاسی تاریخ میں ایک اہم مقام دیتی ہے۔

خدا بخشے، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

"افکار" بھوپال

مسلم اقلیت کو جہاں آئے دن صبر آزما حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہیں اس کے لئے یہ حقیقت سوہان روح ہے کہ اس کی وہ عظیم ہستیاں ایک ایک کر کے رخصت ہوتی جا رہی ہیں۔ جنھوں نے نہ صرف یہ کہ جنگ آزادی میں اپنی فکری صلاحیتوں سے قائدانہ رول ادا کیا بلکہ آزادی کے بعد ہمیشہ اس کے لئے کوشاں رہے کہ ہندوستان کے مسلمان احساس کمتری اور شکست خوردگی سے نجات حاصل کر کے اپنے وطن کی تہذیبی، سماجی اور اقتصادی ترقی میں برابر کے شریک ہوں اور اس طرح سے جو ان کا حق ہے وہ انھیں ملے۔

ملک کی آزادی کو ۱۵ سال نہیں گزرے کہ قیادت کی پہلی صف سے رفیع احمد قدوائی، مولانا آزاد، مولانا حسین احمد مدنی جیسے بزرگ اٹھ گئے گویا ابھی یہ داستان غم مکمل نہیں ہوئی تھی کہ مشیت ایزدی نے ہمارے درمیان سے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی عظیم المرتبت شخصیت کو بھی اٹھا لیا اس قحط الرجال اور شدید کرائسس کے دور میں مجاہد ملت کا ہی دل تھا کہ تمام خطرات اور اندیشوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ نے ملت کو فروعی مسائل سے ہٹا کر بنیادی امور کی طرف اسے متوجہ کیا اور جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے اس کی نہایت اعلیٰ سوجھ بوجھ اور دانشمندی کے ساتھ رہنمائی کی،

مجاہد ملت ایک عرصہ سے علیل تھے لیکن برادر کشی کی وارداتوں کو روکنے بدامنی اور فرقہ وارانہ ہنگاموں کو فرو کرنے اور مسلم اقلیت کے حقوق کا تحفظ کرنے میں آپ کی توانائی صرف ہو رہی تھی، فسادات کا نہ ختم ہونے والا تسلسل آپ کے تدبر کو آزمائش میں ڈالے ہوا تھا، پارلیمنٹ کے اندر اور اس کے باہر مجاہد ملت کی وہ آواز گونجتی تھی جس میں ساری قوم کے لئے ایک چیلنج ہوتا تھا جس میں احتجاج ہوتا تھا کہ سالہا سال تک اجنبی راج کے خلاف جہاد کر کے بے مثال قربانی پیش کر کے جس آزادی کا خواب دیکھا گیا تھا یہ خانہ جنگی اس کی تعبیر نہیں یہ وحشیانہ جھگڑے اس کا ثمرہ نہیں۔

یہ حق بھی ہر کسی کو نہیں پہونچتا کہ وہ با اقتدار اصحاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کوئی چبھتا ہوا سوال کرے، قوم پرستی کی بھٹی میں مجاہد ملت کی طرح جو کندن بن کر نکلے تھے اور جنھوں نے جواہر لال نہرو سے کچھ کم قربانیاں وطن کے لئے نہیں دی تھیں وہی ظلم و ستم کے ہاتھ کو روکنے کے لئے نہرو کے ضمیر کو جھنجھوڑ سکتے تھے یہ حق انھیں کو پہونچتا تھا کہ وہ وطن کے مستقبل کو سنوارنے کے لئے حکومت پر اپنی پرچھائیں ڈالیں۔ مجاہد ملت نے یہ حق کس حد تک ادا کیا اس پر موجودہ حالات کا تنقیدی جائزہ لینے والا مورخ اچھی طرح روشنی ڈال سکتا ہے۔ آج مسلمانان ہند کے لئے ایک روز سیاہ ہے

آج ہمیں ایسی ہستی کے لئے رونا پڑ رہا ہے جس کی ہم نے اس کی زندگی میں پوری قدر نہیں کی۔ آج پیچیدہ مسائل ہمیں پریشان کر رہے ہیں لیکن وہ بزرگ رہنما جاتا رہا۔ جس کا دل ہر لحظہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے مضطرب رہا کرتا تھا۔

۳ سال پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف مجاہد ملت کا نیاز حاصل کرنے دلی گیا تو آپ صبح کے وقت جمعیۃ کے دفتر میں سراپا غم بنے بیٹھے تھے۔ مزاج پرسی کی تو فرمایا "بظاہر اچھا ہوں لیکن اندر سے کھوکھلا ہوتا جا رہا ہوں" جب تفصیل چاہی تو فرمایا "یہ ایک حفظ الرحمٰن کی قسمت ہے کہ چاہے جبلپور ہو یا ساگر، بھوپال، ستیہ مڑھی، آختہ یا مبارک پور ہو ہر جگہ اسے مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا نقشہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں بھی انسان ہوں میرا دل بھی متاثر ہوتا ہے اور اعصاب مضمحل ہوتے ہیں"

آج ۳ سال کے بعد موت کے ہاتھوں نے ان اجزاء کو منتشر کر دیا۔ جسے ہم مجاہد ملت کا دل کہتے تھے اور جس کی دھڑکنوں کے ساتھ لاکھوں دل دھڑکنے لگتے تھے خدا سے دعا ہے کہ وہ ملت کو اس صدمہ عظیم کو برداشت کرنے کی توفیق دے۔

اردو ٹائمز بمبئی

مولانا ابوالکلام آزاد اور جناب رفیع احمد قدوائی کی جدائی کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات مسلمانان ہند کے لئے سانحہ عظیم ہے۔ ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی دشوار ہے، جب ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں سے کیا چھن گیا ہے تو ذہن کانپ اٹھتا ہے اور دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد سہمے ہوئے اور گھبرائے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی آسان کام نہ تھا مسلمان ہر طرف معتوب تھے۔ مشکوک نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ ان کی وفاداریوں پر شبہ کیا جا رہا تھا۔ ان کی ترجمانی اور ان کی رہنمائی ایک ایسا بار گراں تھا۔ جسے شاید ناتواں بازو برداشت نہ کر سکتے لیکن وہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات تھی جس نے یہ بوجھ سنبھال لیا اور اس طرح سنبھالا کہ اسے زندگی کا مقصد واحد بنا لیا۔ ان کی زندگی کی آخری گھڑی گواہ کہ انھیں نہ اپنی صحت کی فکر تھی۔ نہ علالت کی، نہ زندگی کی پرواہ تھی نہ موت کی ۔ وہ اپنا سرمایہ حیات ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت کے لئے وقف کر چکے تھے اور اس خزانے کی ایک ایک پائی انھوں نے اس مقصد کے لئے لٹا دی۔

گذشتہ آٹھ دس سال سے مولانا نے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر کام کا اس قدر زیادہ بوجھ اٹھایا کہ ان کی صحت جواب دے گئی۔ ڈاکٹروں نے روکا۔ ہمدردوں نے منع کیا، معتقدین نے اس محنت شاقہ سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی زندگی کے مشن سے باز نہ آئے بلکہ اسمیں زیادہ سے زیادہ تیزی اور شدت پیدا کرتے گئے۔

ہندوستانی پارلیمنٹ کا ایوان گواہ ہے۔ اس کے در و دیوار گواہ ہیں کہ مولانا کی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو کوئی آتش بیان ترجمان ملنا دشوار ہے۔ جب وہ حقائق اور دلائل کو سامنے رکھ کر بولتے تھے تو مخالفین کی زبانیں بند ہو جاتی تھیں، معاندین پہلو بدلنے لگتے لیکن کسی میں اتنی طاقت نہیں ہوتی تھی کہ اٹھ کر الفاظ کے بہتے ہوئے سیلاب کو روک سکے اپنی اس حق گوئی کے باعث آخری عمر میں مولانا نے ہر مکتب خیال کے مسلمان رہنماؤں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ چند ماہ قبل پارلیمنٹ میں مسلم لیگی صدر اسمٰعیل صاحب اور ایک عمدہ مقرر بدرالدجےٰ کی تقریریں ہوئیں جو صرف مسلمانوں کے مسائل سے متعلق تھیں ۔ لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمان گذشتہ سال ہوم منسٹر اور دیگر ارکان کی مداخلتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جو کچھ کہہ گئے تھے اس میں اسمٰعیل صاحب اور بدرالدجےٰ صاحب کوئی خاص اضافہ نہ کر سکے۔

پارلیمنٹ کے باہر مولانا کے لئے عمل کا میدان بہت وسیع تھا کسی اور مسلمان رہنما میں یہ جرأت نہ تھی یا کسی کا یہ مقام نہ تھا کہ وہ جا کر جواہر لال کا ہاتھ پکڑتا اور ان سے کہتا کہ آپ کو غلط اطلاعات دی جا رہی ہیں اور واقعات کو چھپایا جا رہا ہے۔ جب علیگڑھ میں گھوٹے، جلسے برباد ہوئے، جبلپور پر قیامت ٹوٹی، چندوسی پر آفت آئی تو ہر جگہ سینہ سپر ہو جانے والا یہی مرد مجاہد تھا، مولانا حفظ الرحمٰن ہی تھے جو چشم گریاں اور قلب مضطرب کے ساتھ ہر جگہ سینہ سپر ہر جگہ پہونچے اور زخمی دلوں پر مرہم رکھتے رہتے۔ چند دن قبل جب مولانا بستر علالت بلکہ بستر مرگ پر دراز تھے۔ وہاں سے انھوں نے جواہر لال کو خط لکھا تو وہ بھی یو۔ پی میں اردو پر کی جانے والی نئی زیادتی کے بارے میں۔ یہ واقعہ اپنی مثال آپ ہے اور ظاہر کر دیتا ہے کہ ہم سے کیسی عظیم ہستی بچھڑ گئی خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور مسلمانان ہند کو اس عظیم صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین)

روزنامہ "ناظم" رام پور

زمانے والو دنیا کی بے ثباتی کا شکوہ کرتے آئے ہو آؤ ایک بار اور زمانہ کی ستم ظریفی کا ماتم کر لو تم سے ایک ایسا عظیم انسان چھین لیا گیا جس نے تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کے گیسوؤں کو سنوارا اس کی زلفوں کے پیچ و خم کو درست کیا بے شک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات حسرت آیات ایسا قومی نقصان ہے جس پر مدتوں آنسو بہائے جائیں گے۔ اگر آج آنکھیں اشک بار ہیں تو صحیح ہے آہ و نالے کا شور ہے تو درست ہے ہندوستان کے ماتھے پر شکن ہے تو بجا نہیں ہے۔ اس لئے کہ اشک شوئی کرنے والا رخصت ہو چکا ہے زخموں پر مرہم رکھنے والا خود اپنی زندگی سے روٹھ گیا ہے۔ اور زلفوں کے بل نکالنے والے ہاتھ بے جان ہو چکے ہیں۔ ماتم اسی بات کا نہیں ہے کہ ہندوستان ایک نڈر بے باک سچے، مخلص وطن پرست اور جانباز سپاہی سے محروم ہو گیا بلکہ اس بات کا بھی ہے کہ اب کس کی گرج فرقہ پرستوں کے دل دہلایا کرے گی اور کون عصائے موسوی بن کر فرقہ پرستی کے اژدہوں کو نگلا کرے گا۔

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان عظیم ملک ہے جس میں رہنما پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے لیکن کیا اب ایسا دل بھی پیدا ہوگا جس میں ہر کس و ناکس کا درد پنہاں ہو جو ظلم پر مچل جائے اور ناانصافی کا مقابلہ کرنے کے لئے

دیوانہ وار ڈٹ جانے میدان کارزار میں اگر تنہا ہوتو ہر اس تریب نہ پھٹکے ظلمت اور تاریکیوں کے گہرے سایوں کو انوار صبح سے پاش پاش کرتا آگے بڑھتا رہے مولانا حفظ الرحمٰن نے آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کیا نہیں کیا ہمیں یقین ہے کہ جو بھی اس دنیا میں آیا ہے وہ ایک نہ ایک دن ضرور جائے گا۔ لیکن یہ گمان تک نہیں تھا کہ موت کے ظالم ہاتھ مولانا حفظ الرحمٰن کو عین اس وقت چھین لیں گے۔ جبکہ قوم کی نیا ڈول رہی ہے اور ناؤ کنارے لگانے کے لئے ایک پختہ کار ناخدا کی ضرورت ہے اسی لئے آج دلّی ہی نہیں سارا ہندوستان اداس ہے۔ ہندوستان کے طول وعرض میں بے بسی چھائی ہوئی ہے یہ اداسی اور بے بسی بے سبب نہیں ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان تیزی سے صف اول کے رہنماؤں سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ وہ عظیم لیڈر جنھوں نے ہندوستان کی بیڑیاں کاٹ کر اس کو آزادی بخشی ہے۔ پے در پے رخصت ہوتے رہے ہیں اگر دل بیٹھنے لگتا ہے تو صبر کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کروڑوں سوگواروں کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے انھوں نے ہندوستان کو کیا دیا ہندوستان کی کھیتی کو کس طرح سرسبز و شاداب رکھا کس طرح ہندوستان کی سرزمین کو اپنے خون دل سے سینچا یہ ایک طویل کہانی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی کے گذشتہ پچاس برس قوم کے لئے تھے۔

ہندوستان پر کوئی بھی آفت آئی مولانا سینہ سپر ہو گئے۔ ہندوستان کی طرف کسی نے ترچھی نگاہ سے دیکھا مولانا کے ماتھے پر بل پڑ گئے قوم پرستی ان کے رگ وپے میں رچ بس گئی تھی وہ ہر اس فرعونی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے جو ہندوستان کے فرقہ وارانہ اتحاد کو نقصان پہونچا کر اقلیتوں میں خوف وہراس پیدا کر دے مولانا حفظ الرحمٰن کا پختہ عقیدہ تھا کہ اکثریت اور اقلیت شیر و شکر ہو کر ہی ہندوستان کو ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتی ہیں۔ ان کا قول تھا کہ جسم کا کوئی بھی حصہ لاغر رہا یا اسے مفلوج کر دیا گیا تو پورے جسم کو تندرست نہیں کہا جا سکتا۔ بیگانے تو بیگانے بعض اپنے ہی تنگ نظر ...... ان پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے لگے لیکن مولانا نے فرقہ پرستوں کے حوصلہ شکن الزامات کی پرواہ نہیں کی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی کا جو فیضان انہیں حاصل ہوا تھا اسے وہ قوم کے سامنے پیش کرتے رہے اور آخرکار نقارخانہ میں طوطی کی صدا سنی گئی۔ آج پورے ملک میں قومی یکجہتی اور قومی اتحاد کے جو نعرے بلند کئے جا رہے ہیں وہ کس کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ انصاف سے دلوں کو ٹٹولئے تو ان نعروں میں آپ کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا سوز نہاں نظر آئے گا جبل پور ساگر گنج کے فسادات کے بعد مسلم کنونشن کے پلیٹ فارم سے انھوں نے قوم کو جو درس دیا یہ اسی کی تاثیر ہے کہ تمام سیاسی پارٹیوں کے سربراہ فرقہ پرستی کے استیصال کے لئے میدان کارزار میں آ گئے ہیں۔

اقبال نے صحیح کہا ہے کہ ہزاروں سال نرگس کے رونے کے بعد کہیں چمن میں دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔ بلاشبہ مولانا حفظ الرحمٰن دیدہ ور تھے ان کی چشم حقیقت نگر نے ہندوستانی قوم کے دکھوں کو دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ آخر دم تک اس کا مداوا کرتے رہے یہ ایسی ہی بات نہیں ہے کہ صرف تحریر کر دی گئی ہے۔ بستر علالت سے انھوں نے سہ لسانی فارمولے میں اردو کو نظر انداز کرنے پر پنڈت نہرو اور وزیر اعلیٰ اتر پردیش شریمتی سی بی گپتا سے جو شکوہ کیا اس پر دوست تو دوست مخالف بھی عش عش کر اٹھے اور بیساختہ زبانوں سے نکلا اللہ رے قومی خدمت کا اتنا خیال۔

مولانا حفظ الرحمٰن جنگ آزادی کے مضبوط سپاہی نڈر اور بے باک ترجمان تو تھے ہی ان کی عالمانہ شخصیت بھی حد درجہ بلند تھی وہ سادگی شرافت اخلاص و محبت آزادی دوراندیشی اور عرفان جہاں کی تمام خوبیوں کا بے مثال مرقع تھے عقیدت ومحبت کی زبان نے انہیں مجاہد ملت کہا تھا لیکن ان کی عظیم شخصیت ان حدود میں بھی محدود نہیں تھی وادی خیال اور میدان عمل دونوں سے ان کا تعلق والہانہ رہا اور بہادر سپاہی کی طرح زندگی بھر انہوں نے اس وضعداری کی عزت رکھی مذہبی عقائد کی شدت کے باوجود زمانہ کے اقتصادی اور معاشی تقاضوں سے ان کی شخصیت ہم آہنگ اور ہم خیال تھی۔ گو مغربی علوم پر مولانا کو کماحقہ دسترس نہیں تھی پھر بھی ان کا ناخن تدبیر پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا سیاست کی باریکیاں اور پیچیدگیاں ان سے کبھی اوجھل نہیں رہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن کا رخصت ہو جانا یقیناً ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اور اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے لیکن مشیت ایزدی کے سامنے کیا چارہ ہم خدا کے حکم کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ آج مولانا ظاہراً اس آب وگل کی دنیا سے دور جا چکے ہیں لیکن ان کا فیضان ہماری رگ رگ میں سما چکا ہے اس لئے آج ہم اپنے کروڑوں ہم وطنوں کے ساتھ ایک عظیم شخصیت اور اپنے نڈر وبے باک ترجمان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان سوگواروں کو صبر جمیل عطا فرمائے جن کی آنکھیں اپنے سچے اور مخلص ہمدرد کے غم میں اشکبار ہیں۔ اور قوم کو ان راستوں پر چلنے کی توفیق دے جن کے نکھانے میں مولانا نے خون دل سے آبیاری کی ہے۔

قومی آواز لکھنؤ

مولانا حفظ الرحمٰن کے جنازے کے ساتھ جانے والوں کو شاید اس بات کا پوری طرح احساس نہ ہو کہ آج اس عظیم شخصیت کو پہنچانے دو سو سال کی تاریخ آئی ہے، جس کے ساتھ گہری غور و فکر ہے بھاری قربانیاں ہیں۔ دور رس قومی حوصلے ہیں اور جان ہار حق پرستیاں ہیں۔ یہ وہ تاریخ ہے جو شاہ ولی اللہ کے زمانے سے چلتی ہے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے ہوتی ہوئی بائیکاٹ کی تحریک اور متعدد ستیہ گرہوں سے گزرتی ہوئی تقسیم ہند کی اور دو نیشن کے نظریہ کی مخالفت کرتی ہوئی موجودہ دور تک آتی ہے اور آج قومی یک جہتی کی علمبردار ہے یہ جانے والا اس عظیم تاریخ کے صف اول کے سالاروں میں سے تھا۔ وہ تو جا رہا ہے لیکن ایک دل نشین سبق، ایک روشن مثال اور اُفق تک رہنمائی کرنے والے نقش قوم پر چھوڑے جا رہا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی اس اصول کا پکا نمونہ تھی کہ " در کفِ جامِ شریعت در کفِ سندانِ عشق "۔ ایک طرف انھوں نے مہاتما گاندھی اور جواہر لال جی کے ساتھ آزادی کی جدوجہد میں پورا حصہ لیا۔ ستیہ گرہ کی، جیل گئے۔ سوشلسٹ طرز کے سماج کی داغ بیل ڈالی۔ ملکی ترقیات کے منصوبوں کی تعمیر میں حصہ لیا۔ الیکشن میں حصہ لیا۔ غیر مفید اور مضر سیاسی پارٹیوں کا کھل کر مقابلہ کیا۔ آزادی سے پہلے کانگریس کی خارجہ پالیسی کی تعمیر میں حصہ لیا سیکولرازم کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد میں معقول لوگوں کا ہاتھ بٹایا اور دوسری طرف انھوں نے مسلمانوں کے مدرسوں، خانقاہوں، قبرستانوں، مزاروں، مسجدوں کے بچانے اور بازیابی کے لئے یہ جدوجہد کی۔ دینی تعلیم کی تحریک کی داغ بیل ڈالی اور اس کے لئے ریڈرس تیار کرائیں اور پھر اس اسکیم کو چلانے کے لئے ہندوستان بھر میں گھومتے پھرے۔ انھوں نے خود بھی کئی قابلِ قدر دینی کتابیں لکھیں۔ سیرت کے موضوع پر ان کی تقریر بہت اعلیٰ ہوتی تھی دینی کتابوں کی نشر و اشاعت کے لئے مولانا نے ندوۃ المصنفین قائم کیا۔ اس طرح مولانا حفظ الرحمٰن پورے سیاسی لیڈر بھی تھے اور پکے باعمل عالم دینی بھی۔

ہندوستان میں آزادی کی جو جدوجہد چلی وہ طرح طرح کے عنصروں سے مرکب تھی۔ اس میں مذہبی قسم کی عقیدت بھی تھی، سیاسی سوجھ بوجھ بھی۔ جوانی سے بھرپور جوش و خروش بھی۔ فلسفہ و فکر بھی۔ تاریخی اور بین الاقوامی نظر بھی۔ تعمیری صلاحیتیں بھی۔ اور اس طرح کے اور بھی بہت سے عناصر۔ اگر یہ جدوجہد اتنے عناصر کا گلدستہ نہ ہوتی تو اس کی کامیابی ممکن نہ ہوتی۔ اس تحریک نے ایسے ایسے لیڈر پیدا کئے جنھوں نے اس جدوجہد کے بعض محاذوں کی سالاری کی ذمے داری اٹھائی تھی۔ اس بوجھ کے اٹھانے میں مسلمانوں نے بھی اپنے تناسب بھر حصہ لیا۔ ان کی صف سے جو عظیم لیڈر پیدا ہوئے جنھوں نے اس گلدستے کا ایک عنصر بن کر میدان سنبھال لیا ان میں سے ایک بہت بڑے سالار مولانا حفظ الرحمٰنؒ تھے۔ اگر آزادی کی تاریخ کا ان کی شخصیت کو بھلا کر مطالعہ کیا جائے تو اس میں بہت سی کڑیاں چھوٹی ہوئی محسوس ہوں گی اور ایسا محسوس ہوگا جیسے کسی نے ایک درخت کی تصویر سے ایک بڑی سی شاخ نکال دی ہو جس کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اس کے پتے اور پھل کس چیز سے اٹکے ہوئے ہیں۔

مسلم لیگ نے مذہب خطرے میں ہونے کے نعرے کی بنا پر دو نیشن کا نظریہ چلایا تھا اس وقت اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس نعرے نے سیاسی زندگی ہی کو نہیں قومی اور انفرادی زندگی کو بھی کیا شکل دے دی تھی۔ لیگی مسلمانوں نے غیر لیگی مسلمانوں کے خلاف فتنے اٹھائے تھے۔ ان کا سماجی بائیکاٹ کیا تھا ان پر چھرے چلائے تھے ان کو ذلیل کیا تھا اور گندگیاں اچھالی تھیں، اور یہ فضا پیدا کر دی تھی کہ جو مسلمان لیگی نہیں ہے وہ غدار ہے۔ اس فضا کا سامنا کرنا اپنی عزت، نیک نامی، سیاسی کردار اور جان کو خطرے میں ڈالنا آسان نہیں تھا۔ یہ حالات دیکھ کر بہت سے قوم پرور گوشہ نشین ہو گئے تھے لیکن اس زمانہ میں بھی مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جس نے خطروں کو گوشہ نشینی پر ترجیح دی۔ اور لیگ کی غلط تحریک کا سر ہتھیلی پر رکھ کر مقابلہ کیا۔ اس جماعت میں ایک گروہ علمائے دین کا بھی تھا۔ ان چند چوٹی کے سالاروں میں سے ایک مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ وہ نہ کبھی جھجکے اور نہ گھبرائے۔ ان کا سیاسی شعور، ان کا نکتہ داں اسلوب اور ان کی آتش بیان تقریر۔ یہ چیزیں تھیں جنھوں نے لیگ کی آہنی صفوں میں رخنے ڈال دیئے اور جگہ جگہ الیکشن میں اس کے نمایندوں کو شکست دی۔

مولانا حفظ الرحمٰن مسلم لیگ کے سخت ترین مخالفوں میں سے تھے اور انھوں نے اس تحریک کا دس سال پوری پامردی سے مقابلہ کیا۔ لیکن جب ہندوستان کی تقسیم کے بعد لیگ کی تحریک کا دوسری طرح کا ردعمل ہوا اور فسادوں کی لہر چلی تو انھوں نے کہا کہ آج سے میرے لئے لیگی اور غیر لیگی دونوں یکساں ہیں اور پھر وہ اس اصول پر قائم رہے۔

جب دہلی میں فسادات نے قدرتی سیلاب کی شکل اختیار کر لی جس کے

سامنے سوائے گنتی کے چند لیڈروں کے سب کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ اس زمانے میں مولانا حفظ الرحمن شہر میں گھومتے پھرتے تھے اور جو بھی ممکن تھا وہ کرتے تھے۔ لیکن حالات بے حد خراب تھے۔ خود ان کا وجود اور ان کا گھرانا خطرے میں تھا۔ ایسے وقت میں مولانا کے بعض قریبی غیر مسلم دوستوں نے مشورہ دیا کہ آپ اپنے کو خطرہ میں نہ ڈالئے۔ آپ یا تو پاکستان چلے جائیں یا کسی اور جگہ۔ باقی مسلمانوں کی حفاظت کے لئے جو کچھ ہم سے ہوسکتا ہے وہ ہم کریں گے۔ مولانا نے اس پر جواب دیا کہ جس زندگی کو میں اس طرح بھاگ کر بچانے جاؤں گا وہ کس مصرف کی ہوگی۔ آپ کیا باتیں کرتے ہیں۔ یہ موقع جان دینے کا ہے یا جان بچانے کا۔

اس زمانے میں مولانا حفظ الرحمن اکیلے ذریعہ اطلاع تھے، مہاتما گاندھی کے لئے، یہ روزانہ وہاں جاتے تھے اور بتلاتے تھے کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے گاندھی جی سرکاری اطلاعوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے وہ صرف مولانا کی اطلاعوں پر بھروسہ کرتے تھے۔ یعنی ان ہی کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان ہی کے کانوں سے سنتے تھے۔ اور اسی دیکھنے اور سننے کا نتیجہ تھا کہ گاندھی جی نے دہلی والا مرن برت رکھا۔

جب گاندھی جی نے مسلمانوں کے لئے دہلی میں مرن برت رکھا تو انھوں نے مولانا حفظ الرحمن سے کہا کہ مولانا صاحب جب آپ روزانہ آکر مجھے مسلمانوں کا حال بتلاتے تھے تو میں دل میں شرمندہ ہوتا تھا کہ میں کچھ کر نہیں پارہا ہوں، اور میں آپ سے آنکھیں نہیں چار کر پاتا ہوں۔ لیکن آج میں شرمندہ نہیں ہوں۔ کیونکہ جو کچھ میں کرسکتا تھا وہ کرچکا۔ اب معاملہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس زمانے میں جو لوگ گاندھی جی سے قریب تھے وہ کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی اس زمانے میں جو لوگ سب سے زیادہ نمائندگی کرتے تھے وہ تھے مولانا آزادؒ اور مولانا حفظ الرحمنؒ۔ ان دونوں میں سے مولانا حفظ الرحمن کی پوزیشن میدان جنگ کے سالار کی تھی جو ہر چیز اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

۴۷ء آزادی لے آیا۔ لیکن آزادی کے ساتھ بہت سے مسائل بھی آئے۔ ان میں سے بعض مسائل ایسے تھے جن کا تعلق مسلمانوں سے تھا سوال یہ تھا کہ ان کو کون حل کرے، ہندو فرقہ داریت، لیگ کے رد عمل میں بہت زور پکڑ چکی تھی اور اس نے قوم پروروں کے دلوں میں بھی بہت سی نظریاتی الجھنیں پیدا کردی تھیں۔ یہاں تک کہ یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کے معاملات میں پڑنا بھی فرقہ داریت ہے۔ لیکن مولانا حفظ الرحمن نے ان

تنگ نظریوں کا خیال کیا اور نہ اس بات کا کہ کس طرح ان کی سیاسی پوزیشن خطرے میں پڑ جائے گی اور وہ بے خطر میدان میں آگئے۔

عام مسلمانوں کا کیا حال تھا اس زمانے میں؟ انھوں نے دو نیشن کے نظریئے کو اسلام کا اہم جزو سمجھ کر اختیار کیا تھا اور یہ نعرہ لگایا تھا کہ مسلمان چونکہ ایک الگ قوم ہیں اس لئے ان کو الگ وطن چاہئے۔ اس لئے ہندوستان کو تقسیم کرو۔ لیکن جب تقسیم ہوگئی اور لیگ جیت گئی، تو یہ جیت ہی اس کے لئے سب سے بڑی ہار ثابت ہوئی۔ پاکستان میں مسٹر جناح نے جو دو نیشن نظریئے کے بانی تھے یہ کہہ کر اس نظریہ کو ختم کردیا پاکستان کے ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور ہندوستان میں یہ نظریہ یوں ختم ہوگیا کہ خود یہاں کے مسلمان محسوس کرنے لگے کہ یہ بات محال ہے کہ ہندوستان کے ۴ کروڑ مسلمان پاکستان چلے جائیں یا وطن تو سمجھیں پاکستان کو اور رہیں ہندوستان میں۔ ایسی صورت میں ہندوستان کے مسلمان کیا کریں۔

دو نیشن کا نظریہ ایک ایسی چیز تھی جس کو لیگی مسلمانوں نے ایک حق سمجھ کر اختیار کیا تھا اب وہ مضحکہ بن گیا۔ اس چیز نے ان کے اعتماد کو پارہ پارہ کردیا اور وہ سخت پستی اور ذلت کا احساس کرنے لگے۔ اس موقع پر مولانا حفظ الرحمن نے ان کا اعتماد بحال کرنے کے لئے ہندوستان کا دورہ کیا۔ کانفرنسیں کرائیں۔ عام جلسے کرائے اور ہر نازک موقع پر پہنچ گئے اور اس کا سلسلہ انھوں نے اپنی بیماری کے وقت تک جاری رکھا۔

۴۷ء کے فسادوں نے پنجاب کے مسلمانوں کے لئے عجیب وغریب حالات پیدا کردیئے تھے۔ یہ صرف مولانا حفظ الرحمن کی کوشش تھی کہ ان میں پھر یہ یقین پیدا ہوگیا کہ یہ بات ممکن ہے کہ ہندوستان میں اچھے مسلمان بن کر آزادی سے رہو اور غیر مسلموں ہی کی طرح جمہوریت سے فائدہ اٹھاؤ۔

مولانا نے ہمیشہ بہادری اور جرأت سے حکومت پر تنقید کی۔ اس تنقید نے جہاں حکومت کو اس کی غلطیوں کی طرف متوجہ کیا، وہاں مسلمانوں کو بھی اس بات کا یقین دلایا کہ ہندوستان کی جمہوریت سچی جمہوریت ہے۔ جہاں حکومت پر ہر قسم کی تنقید کی جاسکتی ہے اور جہاں غیر مسلموں کو بھی دادرسی میں اپنا ساتھی بنایا جاسکتا ہے۔

مولانا حفظ الرحمن کے بڑے کارناموں میں سے ایک یہ ہے کہ انھوں نے جمعیۃ علماء ہند کو، جو آزادی کے زمانے میں ایک احتجاجی اور جارحانہ جماعت تھی تعمیری اور تنظیمی جماعت بنادیا۔ جو لوگ عوامی زندگی سے واقف ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان بھر میں صرف

بھی ایک جماعت ہے جو اس انقلابی تبدیلی کو سہہ کر زندہ رہ گئی اور آج دوسرے قسم کے خاموشی سے چلنے والے اور برسوں میں سرسبز ہونے والے پروگراموں میں لگی ہوئی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کو عام طور سے ایسا لیڈر سمجھا جاتا ہے جو مسلمانوں ہی کے معاملات سے دلچسپی لیتے تھے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ان کا نقطۂ نظر ہمیشہ قومی رہتا تھا۔ لیکن یہ خیال اس حد تک صحیح نہیں ہے جہاں تک سمجھا جاتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے بہت سے قومی مسائل کے حل کرنے میں حصہ لیا۔ اور ملک کے بہت سے غیر مسلم لیڈروں کی نظروں میں ان کا درجہ قومی لیڈر کا تھا۔ ان کے سامنے شرنارتھی اور مختلف ریاستوں کے ہندو، سکھ اور عیسائی بھی اپنے مسئلوں کو لے کر آتے تھے۔ مولانا کو ایسے معاملوں میں بھی پورا ادراک حاصل تھا وہ ان کو بھی سمجھ لیتے تھے اور حل کرتے تھے۔ اس طرح کانگریسیوں اور غیر کانگریسیوں کے ایک بہت بڑے طبقہ کے نزدیک تقسیم کے بعد والے غلط نظریئے کے مطابق اب وہ فرقہ پرست قطعی نہیں تھے بلکہ ان کی حیثیت گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد رفیع صاحب اور جواہر لال کی طرح قومی لیڈر کی سی تھی۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی اور وفا کرتی تو چند برسوں میں سارا ہندوستان ان کو اسی نظر سے دیکھنے لگتا کیونکہ لوگ یہ تو محسوس ہی کرنے لگے تھے کہ مولانا ملک کی گاڑی کا پہیہ تھا پہیا ہیں جس کے بغیر گاڑی اگر چلے گی تو بہت سے خطروں کا سامنا ہوگا۔

مولانا کا ذاتی کردار لیڈر کا نہیں، بلکہ بوریہ نشین درویش کا تھا جس کے دروازے پر کوئی دربان نہیں ہوتا ہے۔ وہاں ہر شخص آسکتا تھا اور ہر وقت آسکتا تھا۔ صرف آ ہی نہیں سکتا تھا پیام بھی کر سکتا تھا اور مولانا سے اپنے گھریلو اور بے حد نجی معاملوں سے لے کر سیاسی معاملوں تک میں مدد کی درخواست کر سکتا تھا۔ اور حد یہ ہے کہ جو لوگ مولانا کی ہر وقت مخالفت کرتے رہتے تھے وہ بھی مدد کی درخواست لے کر آتے تھے اور مدد حاصل بھی کر لیتے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی آخری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ ایک انگریزی روزنامہ کو بڑے پیمانہ پر قائم کیا جائے۔ جو نیشنل طرز فکر پر اس طرح چلے کہ مسلمانوں کے معاملوں پر خاص توجہ رہے۔ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو اس پہاڑ کو بھی وہ اٹھا لیتے۔ لیکن اب ان کے بعد ان تمام لوگوں کا۔ جو چاہے مسلم ہوں چاہے غیر مسلم یہ فرض ہے کہ مولانا کی اس تمنا کو جیتی جاگتی شکل دے دیں اور یہ سمجھ کر یہ شکل دیں کہ مولانا کی زندگی کے پیام اور ان کی جدوجہد کو حیات تازہ اسی طرح مل سکتی ہے

ہم مولانا حفظ الرحمٰن کی اہلیہ محترمہ، بچوں اور عزیزوں کے غم میں پوری طرح شریک ہیں اور ان کو یقین دلاتے ہیں کہ مولانا کی شخصیت ان کے خاندانی حدود کی منزلوں آگے جا چکی ہے۔ آج ہزاروں ایسے افراد موجود ہیں جن کو مولانا کے اٹھ جانے کا اتنا ہی غم ہے جتنا ان کی خاص اولاد کو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر یہ مقولہ بالکل صحیح ہے۔

موت العالِم موت العالَم

روزنامہ انقلاب بمبئی

مولانا حفظ الرحمٰن کا انتقال ایک ایسے ادارے کا انتقال ہے جو بہت سے اوصاف کا مجموعہ تھا۔ وہ صرف مسلمانوں کے یا قومی رہنما ہی نہیں تھے اور نہ ہی ان کی شخصیت جمعیۃ العلماء کے ادارے تک محدود تھی۔ وہ صرف ممتاز عالم، بے باک مقرر، جری سیاست داں اور جنگ آزادی کے دلیر سپاہی ہی نہیں تھے۔ بلکہ ان سب سے بہت کچھ زیادہ اور بہت کچھ اعلیٰ تھے۔ وہ قوم پرست ہندوستانی کے دل کی دھڑکن اور اس کی روح تھے اور اسی لئے آج جب ان کا نحیف جسم سرد ہو چکا ہے اور وہ وطن عزیز کی مٹی کی آغوش میں پہنچ چکے ہیں ہم میں سے ہر شخص کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ہم کوئی بہت قیمتی کوئی بالکل دل سے لگی ہوئی چیز کھو بیٹھے ہیں۔ یہ احساس ہمیں ہر رہنما کی وفات پر نہیں ہوتا ہے۔ یہ احساس ہمیں اس وقت ہوا تھا جب مولانا آزاد ہم سے جدا ہوئے تھے اور آج ہو رہا ہے جب ان کے دیرینہ رفیق اور ساتھی رخصت ہو گئے ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن ہندوستان کی جدید تاریخ کے معماروں میں سے تھے ایسے مجاہدوں میں جن کی زندگی آخری سانس تک قوم و ملک کے کام آئی ہے۔ جنگ آزادی کی تحریک کو انھوں نے اپنی جوانی کا لمحہ ہی نہیں اس کی ساری امنگیں، جوش اور ولولے نذر کئے اور ایسے وقت میں جب قوم پرستی جرم تھی اس کے پرچم کو بلند رکھا۔

ملک کی آزادی سے قبل مولانا حفظ الرحمٰن ہمارے ملک کے عالموں کے ایک گروہ کے ساتھ قومی تحریک کی لڑائی لڑتے رہے۔ لیکن آزادی کے حصول کے بعد بھی انھیں چین اور سکون نصیب نہیں ہوا۔ وطن کی آزادی اپنے ساتھ خون ریزی بھی لائی اور نفرت انگیزیاں بھی اور ان سب کے خلاف جدوجہد میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی صحت نے بارہا ان کا ساتھ چھوڑ دیا لیکن مولانا ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو ہار مان لیتے۔ ان کے بظاہر نحیف جسم میں عمل اور جذبے کی ایسی بے پناہ چنگاریاں موجود تھیں جو جدوجہد کی لگن کو اکساتی رہتیں۔

مُلاپؔ دہلی

اگر کہوں کہ محترم مولانا حفظ الرحمان کے دیہانت کی خبر سنتے ہی میرا دل رو اٹھا تو من کی بھاونا بیان نہیں ہوتی۔ رونا معمولی سی بات ہے۔ کبھی کبھی اس سے من کو سکون بھی ملتا ہے لیکن یہ سوچتے ہی کہ مولانا حفظ الرحمان اب اس دنیا میں نہیں، دل سے ایک ہوک اٹھتی ہے، ایک چیخ۔ جس میں سکون نہیں، شانتی نہیں۔ آج سے چند برس پہلے میں انہیں ذاتی طور پر جانتا نہیں تھا۔ تب جانا تو ایسے محسوس ہوا کہ اس آدمی کے سینے میں نہ صرف اپنے دیش کے لئے عظیم محبت ہے۔ سچی وطن پرستی کے اصولوں کے لئے ایک لا پناہ جذبۂ عقیدت، بلکہ ایسی انسانیت بھی جو ہر نزدیک آنے والے کو پیار کی زنجیر میں باندھ لیتی ہے۔ ایک بار جو ان کے نزدیک آجائے اس کے لئے پھر دور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وہ نہ صرف اس جمعیۃ العلمائے ہند کے پردھان تھے جس نے سخت ترین آزمائش کے دنوں میں بھی دو قوموں کی تھیوری کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ بلکہ ملک کے ایسے رہنما بھی جن کے مدبر پر جن کی قابلیت پر اور جن کی درست روی پر اس ملک کا ہر وطن پرست ناز کرتا تھا میں جانتا ہوں کہ کئی لوگ جو اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھ نہیں پاتے، وہ جمعیت العلماء ہند پر کئی طرح کے غلط اعتراض بھی کرتے ہیں — لیکن اس کے باوجود اصلیت یہ ہے کہ مسلم دودانوں کی اس جماعت نے اس وقت بھی ہندوستانی مسلمانوں کو وطن پرستی کے راستہ پر چلانے کی کوشش کی۔ جب فرقہ وارانہ نفرت و حقارت کی آگ شعلہ زن ہو رہی تھی۔ اور جب انگریز کے ایجنٹ کہیں "ہندو دھرم" اور کہیں "اسلام" کا نام لیکر عوام کو گمراہ کر رہے تھے۔ میں نہیں کہتا کہ جمعیت العلماء کو اس معاملہ میں کوئی بہت بڑی سپھلتا ملی۔ اگر ملتی تو یہ ملک تقسیم نہ ہوتا۔ مذہب کے نام پر حیوانیت نہ جاگتی لاکھوں بے گناہوں کا خون نہ ہوتا۔ قریباً ڈیڑھ کروڑ آدمی گھر سے بے گھر نہ ہوتے۔ یقیناً اس بہادر جماعت کو سپھلتا نہیں ملی۔ لیکن جس جرأت اور جوانمردی کے ساتھ اس کے نیتا اور ورکر ملک دشمن طاقتوں سے لڑے۔ اُن کے پے در پے حملوں کے باوجود اپنے عزم صمیم پر چٹان کی طرح قائم رہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن ان نیتاؤں میں سے نہ صرف ایک تھے۔ بلکہ سب سے قابل احترام بھی۔ فرقہ پرستی کے علمبرداروں نے اور نفرت و حقارت کے پرستاروں نے انہیں گالیاں دیں، انہیں طعنے دیئے، اُن پر جسمانی حملے بھی کئے لیکن کسی کی چنتا کئے بغیر یہ بہادر مہا پرش وطن پرستی کے راستہ پر لگے او آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے۔ آج جب وہ نہیں ہیں تو ایسے لگتا ہے کہ وہ سامنے بیٹھے ہیں۔ اُن کی وہ پیار بھری آنکھیں ایک عجیب مدبرانہ انداز میں مسکراتی ہوئی دیکھتی ہیں اور اُن کی پیار بھری آواز کہتی ہے — وطن پرستی کی اس شمع کو بجھنے نہ دینا۔ اس کے لئے کوئی بھی قربانی بڑی نہیں" — اور اصلیت یہ ہے کہ واقعی وہ اس شمع پر قربان ہوئے۔ پچھلے عام چناؤ سے کافی دیر پہلے کچھ گمراہ شدہ اور گمراہ کن لوگوں نے فرقہ پرستی کی آگ کو از سر نو بھڑکانے کی کوشش کی تو وہ دیش میں جگہ جگہ پہنچے تاکہ اس نئے فتنہ کا مقابلہ کر سکیں۔ لگاتار سفر اور لگاتار تقریریں کرنے سے وہ بیمار ہو گئے۔ اتنے بیمار ہوئے کہ عام چناؤ کے دوران اپنے حلقہ میں بھی جا نہیں سکے عوام نے ان کو کامیاب بنایا تو اس لئے نہیں کہ مولانا اُن کے پاس ووٹ مانگنے گئے بلکہ اس لئے کہ اُن کے دل میں مولانا کے لئے پیار تھا، عزت تھی۔ چناؤ کے بعد وہ صحتیاب نہیں ہوئے۔ بیماری کی حالت میں ہی کام کرتے رہے لیکن انہیں بیماری تھی ایسی جس کا کوئی علاج نہیں۔ اُن کے گلے کے نچلے حصہ میں کینسر تھا۔ اس کے علاج کے لئے وہ امریکہ گئے۔ لیکن امریکہ میں بھی اس بیماری کا علاج تو ہے نہیں وہ واپس آئے تو اور زیادہ کمزور و نحیف ہو کر اور آخر . . . جانا سب کو ہے دکھ ہوتا ہے اس وقت جب کوئی مہا پرش چلا جاتا ہے ایسا آدمی چلا جاتا ہے جو اپنے لئے نہیں ملک کے لئے زندہ تھا۔ تب دل میں ایک ہوک اٹھتی ہے ایک ٹیس جاگتی ہے۔ لیکن ایسی حالت میں بھی راستہ تو صرف ایک ہے کہ ہم اس مہا پرش کے پیغام کو اور اس کے مشن کو یاد رکھیں۔ (مرتب)

تیج دہلی

مشہور محب وطن مولانا حفظ الرحمٰن اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کے انتقال کی خبر سے ملک کی راجدھانی میں غم کی گھٹا چھا گئی۔ مولانا حفظ الرحمان صاحب عرصہ سے بیمار تھے۔ علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی لیکن مرض ایسا موذی تھا کہ اس سے نجات مشکل تھی بہترین طبی امداد کے باوجود مولانا حفظ الرحمٰن سرطان کے مہلک مرض سے نہ بچ سکے۔ مولانا کن صفات کے مالک تھے ان میں وہ کونسی خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے ملک بھر میں آپ کا احترام ہوتا تھا۔ ان کا شمار آسان نہیں یہی کہنا کافی ہوگا کہ آپ کی مرنیہ سے ہندوستان کی سیاست میں قومی سماج میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ پر نہ ہو سکے گی۔ آپ کا سادہ جیون سادہ جیون سے پیدا شدہ اعلے کیریکٹر سنجیدگی اور متانت۔ ملک کی بھلائی کی لگن آپ کے جیون کے درخشاں پہلو تھے۔ آپ کا شمار یوں تو ہندوستان کے چوٹی کے قوم پرست مسلمانوں میں ہوتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ فرقہ پرستی سے اتنا دور تھے کہ آپ کے نام کے ساتھ فرقہ یا جماعت کا نام وابستہ کرنا موزوں معلوم نہیں ہوتا شک نہیں کہ آپ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بہت کچھ کیا۔ آپ کی عدم موجودگی کو مسلمانوں ہی میں محسوس کیا جائے گا۔ لیکن مولانا حفظ الرحمان کی ہر سعی میں اعلیٰ جذبہ قوم پرستی کا ہوتا تھا۔ مولانا صاحب کا

طریق کار شروع سے لے کر آخر تک قوم پرستانہ ہی ہوتا تھا فرقہ پرستی کے طوفان آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ بعض اوقات یہ طوفان اتنے مہیب ہوتے تھے۔ کہ تھپیڑے لگتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی معلوم ہوتا تھا کہ فرقہ پرستی کا سیلاب مولانا کو بہائے جائے گا۔ لیکن نہیں مولانا ہر نازک صورت حالات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔ مولانا کی حب الوطنی اور قوم پرستی میں شک و شبہات پیدا بھی ہوئے تو قائم ہرگز نہ رہ سکے مولانا کا دامن بے داغ ہی رہا۔

ہندوستان کی قومی تاریخ میں قوم پرست مسلمانوں کا بھی ایک باب ہے ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ اس باب کا اگر صحیح طور پر مطالعہ کیا جائے تو معلوم بھی ہوگا کہ جنگ آزادی کی ابتدا میں مولانا حفظ الرحمان صاحب نے جو پوزیشن اختیار کی تھی۔ دوران جنگ، جنگ میں کامرانی کے بعد اور خصوصاً حالیہ ملک کی ترقی کے دور میں جب کہ ایک بار پھر رجعت پسندی اور فرقہ پرستی نے سر اٹھایا تھا مولانا نے اختیار کردہ پوزیشن کو خوب نبھایا اور ایک قابل تقلید مثال قائم کر دی۔ مولانا کی سیاسی زندگی سے قطع نظر آپ کی عام زندگی انسانی قدروں سے پر تھی۔ مولانا کی بے وقت موت سے کیسے نقصان ہوا کہہ لیجئے کہ ہر جماعت اپنی اپنی جگہ دکھی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ عظیم نقصان ان اعلیٰ قدروں کو ہوا ہے جن کا عام قومی جیون میں فقدان ہے۔ مولانا کی موت سے انسانی قدروں کا علمبردار اٹھ گیا ماضی اور حال کو وابستہ رکھنے والی زنجیر کی بیشتر کڑیاں پہلے ہی ٹوٹ چکی تھیں۔ مولانا حفظ الرحمان کے چلے جانے سے زنجیر اور بھی کمزور ہو گئی ہے واقعی مولانا کی موت قومی سانحہ ہے۔ دعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا کرے۔

پرتاپ دہلی

ملک بھر نے یہ خبر بڑے رنج سے سنی ہے کہ جمعیت العلماء ہند کے جنرل سکریٹری لوک سبھا کے ممبر اور سرکردہ قوم پرست مسلم لیڈر۔ مولانا حفظ الرحمٰن وفات پا گئے ہیں۔ ان کے پھیپھڑے میں سرطان تھا۔ اس لئے وہ اپنا بچاؤ بھی نہ کر سکے تھے۔ اور علاج کرانے کو امریکہ چلے گئے تھے وہاں جو کچھ کیا جا سکتا تھا کیا گیا۔ مگر مولانا کے دن پورے ہو گئے تھے اس لئے کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ اس سے جمعیت العلماء کو تو نقصان پہونچے گا ہی۔ قوم پرست مسلمانوں میں بھی ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو شاید ہی پر ہو سکے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید کی وفات کے بعد جمعیت العلماء کو چلانے کی ذمہ داری مولانا حفظ الرحمان کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔ اور انہوں نے اسے کمال خوبی سے نبھایا۔ مولانا مسلمان تو تھے ہی، قوم پرست بھی تھے۔ اور اپنے ان دو فرائض کو ٹکر سے بچانے کے لئے انھوں نے یہ تکنیک اپنائی تھی کہ اگر مسلمانوں کو کوئی شکایت پیدا ہوتی تو اس کا اخبارات میں رونا رونے کے بجائے وہ چٹھی کے ذریعے پنڈت نہرو کا دھیان اس طرف دلایا کرتے تھے۔ اور اس شکایت کی فوری تلافی ہو جاتی تھی۔ پچھلے دنوں اترپردیش کے مکھیہ منتری شری چندر بھان گپتا نے کہا کہ اس پردیش میں تین بھاشائیں پڑھائی جائیں گی جن میں انگریزی اور ہندی کے ساتھ دکھشن بھارت کی بھی ایک بھاشا ہوگی اور کوئی طالب علم اردو پڑھنا چاہے گا تو چوتھی زبان کے طور پر ہی پڑھ سکے گا۔ اس پر مولانا نے بستر علالت سے پنڈت نہرو کا دھیان شری گپتا کے اس بیان کی طرف دلایا۔ جنھوں نے شری گپتا کے اس بیان پر فوراً یہ اعلان کر دیا کہ اردو تین زبانوں میں شامل ہوگی۔ مولانا ایک اچھے کوٹی کے عالم تو تھے ہی باعمل بھی تھے۔ بڑی سوجھ بوجھ کے مالک تھے۔ حرارت پیدا نہیں کرتے تھے روشنی دیتے تھے۔ اس لئے ہندو بھی ان کے مداح تھے۔ مسلمانوں نے دیکھ لیا کہ مولانا کا ماتم منانے میں ہندوان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

کوہستان

راولپنڈی، لاہور، ملتان

مسلمانانِ ہند کے مشہور رہنما اور بھارتی پارلیمنٹ کے ممتاز رکن مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی کا انتقال پر ملال صرف بھارتی مسلمانوں ہی کے لئے نہیں ساری دنیائے اسلام کے لئے ایک بہت بڑا قومی اور ملی سانحہ ہے۔ اللہ تعالےٰ مولانا مرحوم کی تربت پر اپنے انوار کی بارش کرے۔

مولانا حفظ الرحمانؒ ایک بے خوف، نڈر صاحب کردار اور ایثار پیشہ رہنما تھے۔ امر واقعہ ہے کہ مختلف اسلامی ملکوں میں اس وقت جو حضرات مسلمانوں کی رہنمائی کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ ان میں جہاں تک حق گوئی اور ایثار پیشگی کا تعلق ہے، شائد کوئی ان کے مرتبے تک پہنچ سکے۔

آزادی کے بعد جب بھارت کی سرزمین فرزندانِ توحید پر تنگ کر دی گئی تو مولانا ان برگزیدہ نفوس میں تھے، جو دشمنانِ اسلام کے خلاف سینہ سپر ہو گئے اور ان کے خلاف بڑی پامردی کے ساتھ جہاد کیا۔ وہ۔ بھارتی پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور کانگریس پارٹی کے رکن ہونے کے باوجود انہوں نے سی۔ پی۔ میں مسلمانوں پر جو قیامت گذری تھی نہ صرف اس کے خلاف آواز اٹھائی بلکہ موقع پر پہنچے اور مقامی حکام اور فرقہ پرستی کو پوری طرح بے نقاب کیا۔

مولانا حفظ الرحمان مجاہد ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ انہوں نے اسلامی موضوعات پر چند نہایت عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں وہ ہماری۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دیں۔

انجام کراچی

افسوس ہے کہ مسلمانانِ ہند کے مشہور رہنما اور جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ جناب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے دارِ فانی سے منہ موڑ کر سفر آخرت اختیار فرمایا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون ط

مولانا مرحوم عرصہ سے مرض سرطان میں مبتلا تھے دہلی اور بمبئی میں جب تجربہ کار ڈاکٹروں کی بہترین کوششیں مرض پر قابو نہ پاسکیں تو مولانا علاج کی غرض سے امریکہ تشریف لے گئے وہاں ایک مشہور ہسپتال میں کئی ماہ تک زیر علاج رہنے کے بعد جب مولانا ہندوستان واپس آئے تو شدید ضعف (نقاہت) کے سوا کوئی علامت مرض ظاہر نہ ہوتی تھی۔ اور عام توقع یہی تھی کہ مولانا کی صحت بہت جلد اگر کلی طور پر نہیں تو بڑی حد تک ضرور بحال ہو جائے گی۔ روزنامہ الجمعیۃ میں مولانا کی رفتار صحت کے متعلق جو اطلاعات شائع ہوئی تھیں وہ بھی امید افزا تھیں۔ چنانچہ الجمعیۃ مورخہ ۳۰ جولائی کا جو پرچہ ہمیں ۲ اگست کو ملا اس کی عبارت حسب ذیل ہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مدظلہ کی طبیعت پہلے کے مقابلے میں آج بھی نسبتاً بہتر رہی صبح کے وقت طبیعت بحال تھی مگر گرمی اور حبس کی شدت کے باعث ٹمپریچر بڑھ گیا۔ شام کو حالت بہتر رہی اور بات چیت کرتے رہے مخلص اور ہمدرد حضرات دعا فرماتے رہیں کہ خداوند پاک حضرت مجاہد ملت کو شفائے کاملہ و عاجلہ عطا فرمائیں۔ (آمین) افسوس ہے کہ معاصر "الجمعیۃ" کی یہ اطلاع پڑھ کر ہم ابھی دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے اور حضرت مولانا کے لئے شفائے کاملہ و عاجلہ کے لئے دل سے آمین کہنے ہی والے تھے کہ اے پی پی نے ٹیلی پرنٹر پر یہ المناک خبر سنائی کہ دنیائے اسلام ایک بلند پایہ عالم دین کے سایہ کرم سے محروم ہو گئی وہ ہستی اٹھ گئی جس نے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا احمد سعید کے بعد جمعیۃ علماء ہند کی رونق برقرار رکھی تھی۔ وہ جانباز بہادر سپاہی دنیا سے رخصت ہوا۔ جو ہندوستان کی جنگ آزادی میں گاندھی اور نہرو کے دوش بدوش تھا وہ شکل نورانی پردہ اجل میں پنہاں ہو گئی۔ جو مسلمانوں کے لئے نور امید تھی۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی عالم فانی کی کرشمہ سازیوں کو ٹھکرا کر عازم باغ بہشت ہوئے۔ اور ملت اسلامیہ ہند حقیقی معنے میں یتیم ہو گئی تقسیم سے پیشتر مولانا سے ہمارے شدید سیاسی اختلافات رہے مگر یہ اعتراف نہ کرنا بددیانتی ہے کہ مولانا مرحوم نے تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں کی جو خدمات انجام دیں۔ وہ ناقابل فراموش ہیں چونکہ جنگ آزادی کے سلسلہ میں ان کی بیش بہا قربانیوں کا اعتراف کانگریس کے سبھی ارباب اقتدار کو تھا اور خود وزیر اعظم پنڈت نہرو بھی مسلمان راہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے بعد سب سے زیادہ مولانا حفظ الرحمٰن کی عزت کرتے تھے اس لئے اعلیٰ سرکاری حلقوں میں ان کا اثر و رسوخ بہت کچھ مسلمانوں کے کام آجاتا تھا۔ مولانا حفظ الرحمان کی وفات ایک بہت بڑا سانحہ اور درحقیقت مسلمانانِ ہند کی بدنصیبی کا دوسرا نام ہے جس کا ماتم جتنا بھی کیا جائے کم ہے ہم اس سانحہ عظیم پر تہہ دل سے مغموم ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کو ان کی دینی و ملی خدمات کے صلہ میں باغ فردوس اور مسلمانانِ ہند کو نعم البدل عطا فرمائے (آمین)

"تاجر" راولپنڈی

مشہور عالم دین اور بے بس بھارتی مسلمانوں کے بیباک ترجمان مولانا حفظ الرحمٰن ایک طویل جدوجہد اور علالت کے بعد اس جہان فانی سے رحلت کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ ان کی سیاسی پالیسی سے ہزار اختلاف سہی اور تقسیم سے قبل مرحوم نے جو کچھ بھی کہا اس سے برصغیر کے مسلمانوں نے مکمل طور پر ان سے اختلاف کیا لیکن آزادی کے بعد انہوں نے پر آشوب دور میں مسلمانانِ ہند کی جس بے باکی سے خدمت کی ہے۔ اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے جہاد کیا ہے۔ اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

مولانا کی وفات حسرت آیات سے بھارتی مسلمان اپنے بیباک اور مخلص ترین ترجمان سے محروم ہو گئے ہیں۔ اور اس المناک حادثے پر ہمیں مولانا کے متعلقین کے ساتھ ہی ساتھ بھارتی مسلمانوں سے بھی دلی ہمدردی ہے۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

آفاق لاہور

جمعیۃ علماء ہند کے سکرٹری اور بھارتی مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے علمبردار مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اچانک اپنے لاکھوں مداحوں کو داغ مفارقت دے گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا کی عمر کوئی ایسی زیادہ نہ تھی مرحوم نے حیات مستعار کی صرف باسٹھ بہاریں دیکھی تھیں اور ان کا عزم

ولولہ اور جوش و خروش دیکھ کر کسی کو گمان تک نہ تھا کہ بھارتی مسلمانوں کا یہ محبوب قائد اس قدر جلد انھیں خارزار سیاست میں یکہ و تنہا چھوڑ جائے گا۔ حال ہی میں جب وہ علاج کے بعد امریکہ سے واپس آئے تو خاصے صحت مند معلوم ہوتے تھے لیکن کسے خبر تھی کہ مریض غم کے چہرے کی یہ تابانی چراغ آخر شب کی آخری جھلملاہٹ ثابت ہوگی۔ مولانا، بھارتی مسلمانوں کے سرد و گرم چشیدہ اور آزمودہ رہنما تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۱ء میں میدانِ سیاست میں قدم رکھا اور اپنی مستعدی اور جوش کرداری کی وجہ سے جلد ہی سیاسی حلقوں میں انھیں ایک ممتاز مقام حاصل ہوگیا۔ مولانا نے تحریک خلافت میں بھی سرگرم حصہ لیا اور اس کے بعد سیاست ان کا جزو زندگی بن گئی تھی۔ برصغیر کی آزادی اور بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد ان کی شخصیت مرجع خلائق بن گئی تھی۔ مرحوم نے پارلیمنٹ کے اندر اور پارلیمنٹ کے باہر بھارتی مسلمانوں کی نہایت بے جگری اور دردمندی کی ترجمانی کی اس وقت مسلمانوں کو ایسے مخلص اور بیباک رہنما کی اشد ضرورت تھی۔ ان کی موت بھارتی مسلمانوں کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے اور اس سے ایک ایسا خلاء پیدا ہوگیا ہے جس کے مستقبل قریب میں پُر ہونے کی امید نظر نہیں آتی

(آفاق لاہور)

وفاق لاہور

برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں کے لئے مولانا حفظ الرحمٰن کے انتقال کی خبر بے حد المناک ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن جو ایک طویل مدت سے پیٹ کے سرطان میں مبتلا تھے، جمعرات کو دلی میں انتقال فرماگئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مولانا حفظ الرحمٰن نے تقسیم ملک کے بعد بھارت کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جو جدوجہد کی۔ اسے بھارتی مسلمان کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حفظ الرحمان کا وجود بھارتی مسلمانوں کے حوصلے بڑھاتا تھا۔ اور ان کی ناامیدی اور مایوسی دور کرتا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن کی موت بھارتی مسلمانوں کے لئے بہت صدمہ کا باعث ہوگی انہوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ہم اس صدمہ میں اپنے مسلمان بھائیوں کے شریک غم ہیں اور مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں۔

امروز لاہور

تحریک آزادی کے صف اوّل کے رہنما، ہندوستان کے مسلمانوں کے دردمند خواہ مولانا حفظ الرحمٰن دو اگست کی صبح کو تین بجے کے قریب رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ ہندوستانی پارلیمنٹ کے رکن اور جمعیت علماء ہند کے جنرل سکریٹری تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن ۱۹۰۱ء میں سیوہارہ (بجنور) میں پیدا ہوئے۔ دینی علوم کی تکمیل کی اس زمانے میں برصغیر میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ دوسرے علماء کی طرح آپ نے بھی آزادی وطن میں مقدور بھر حصہ لیا۔ ابھی آپ کی عمر بیس برس کے لگ بھگ ہی تھی کہ تحریکِ خلافت سے منسلک ہوگئے۔ اور پھر آزادی کی راہ میں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں۔ کئی بار گرفتار ہوئے اور قید و بند میں مبتلا ہوئے لیکن کسی مرحلہ پر بھی اُن کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی آپ کا شمار ہندوستان کے سرکردہ کانگرسی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد آپ نے ہندوستانی مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا بیڑہ اٹھایا اور اس سلسلہ میں آخر دم تک اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ گذشتہ برس آپ نے نئی دلی میں مسلمانوں کا ایک کنونشن طلب کیا تھا۔ جس میں مسلمانوں کے مسائل پر غور کیا گیا اور حکومت ہند پر زور دیا گیا کہ مسلمانوں سے جو مسلسل ناانصافی کی جا رہی ہے اور اُن کے حقوق و مفادات کو جس طرح پامال کیا جا رہا ہے۔ اس کا سدباب کیا جائے اور انہیں آزاد شہریوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے مواقع مہیا کئے جائیں۔ مولانا مرحوم کو پھیپھڑوں کا سرطان ہوگیا تھا۔ دلی اور بمبئی کے مشہور ڈاکٹروں کے علاج سے افاقہ نہ ہوا تو احباب کے اصرار پر امریکہ گئے۔ اور وہاں کے ایک بڑے ہسپتال میں کئی ماہ تک زیر علاج رہے۔ جب آپ ہندوستان واپس آئے تو ضعف و نقاہت کے سوا مرض کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی تھی اور عام خیال یہی تھا کہ خدا کو منظور ہوا۔ تو آپ بہت جلد شفایاب ہو جائیں گے۔ "الجمعیۃ" آپ کی بحالیٔ صحت کے بارے میں برابر اطلاعات مہیا کرتا رہا۔ جو امید افزا تھیں لیکن یکایک اُن کی حالت خراب ہوگئی اور آپ اس دار فانی سے کوچ کرگئے آپ کے پسماندگان میں ایک بیوہ، ایک لڑکا اور ۵ لڑکیاں ہیں۔"

قطعۂ تاریخ وفات حضرت مجاہد ملت علیہ الرحمۃ

افتخارِ جماعتِ علماء — حفظِ رحمٰں، گذشت صد افسوس
گفت راغب بمژدہ ہاتف — للہ الحمد رفت در فردوس

۱۳ ھ ۸۲

از جناب حکیم سید نور العین حسن راغب جھتاروی۔ (علیگڈھ)

ہفت روزہ الاعتصام لاہور

یہ خبر ہم نے انتہائی حزن و ملال کے ساتھ سنی کہ ۲ راگست ۱۹۶۲ء کو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ۶۲ سال کی عمر پاکر انتقال کر گئے۔

مولانا حفظ الرحمان جنہیں مرحوم لکھتے وقت قلم کا کلیجہ شق ہوتا ہے۔ جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم اعلیٰ اور ہندوستان کی پارلیمنٹ کے رکن تھے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے نہایت مخلص خادم تھے، اور اپنے ملک کی معروف اور نیک نام شخصیت تھے۔ مرحوم کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کے گذشتہ انتخابات کے موقعہ پر اپنے حلقہ سے سیکڑوں میل دور بمبئی کے ایک ہسپتال میں بیمار پڑے تھے اور ایک دن کے لئے بھی اپنے حلقہ انتخاب میں نہیں جاسکے تھے۔ مگر جب نتیجہ نکلا تو کئی کئی ہزار ووٹ کے فرق سے ان کے حریف شکست کھا چکے تھے۔ اور بعض کی ضمانتیں بھی ضبط ہو گئی تھیں۔ وہ کئی ماہ سے بیمار تھے اور ہر شخص ان کی بیماری سے پریشان اور ان کی صحت کے لئے اللہ کے حضور دست بدعا رہتا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق انھیں پھیپھڑے کے سرطان کا خطرناک مرض لاحق ہو گیا تھا ابتداء میں وہ بمبئی کے ایک ہسپتال میں تجربہ کار اور مشہور ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے، اس کے بعد ان کے احباب اور مخلصین کے اصرار سے انھیں امریکہ بھیجا گیا، اور وہاں کے نامور ڈاکٹر پوری توجہ اور انہماک سے ان کے علاج میں مصروف رہے۔

وہ چند ہفتے قبل امریکہ سے دہلی آئے تھے، ان کی بیماری کے بارہ میں جو خبریں ہندوستان کے اخبارات میں آرہی تھیں، وہ پریشان کن تو تھیں لیکن اتنی تشویشناک نہیں تھیں۔ ان کی خبر وفات ایک طرح سے ہمارے لئے ناگہانی تھی۔ اور اسی بنا پر قلبی و ذہنی طور پر بہت ہی اذیت کا باعث بنی! انا للہ وانا الیہ راجعون

ہندوستان کے مسلمانوں کو آزادی کے بعد ایک تسلسل اور تواتر کے ساتھ جو تکلیفیں پہنچی ہیں ان میں ایک بہت بڑی تکلیف یکے بعد دیگرے مسلمان قائدین کی وفات کی تکلیف ہے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ، مسٹر آصف علی مسٹر رفیع احمد قدوائی، مولانا احمد سعید، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد وہ عظیم شخصیتیں تھیں جو ہندوستان پر اپنا ایک خاص اثر رکھتی تھیں۔ اور جن کے انتقال سے مسلمانوں کو عظیم صدمہ پہنچا، انہیں اونچے درجے کے رہنماؤں میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا نام نامی بھی تھا، بلکہ جہاں تک ہمارا تاثر ہے اس کی رو سے کہنا چاہیے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ممتاز اور عظیم راہنما ایک حیثیت سے صرف مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم ہی تھے۔ اس لئے کہ یہ سرکاری مجبوریوں سے آزاد تھے۔ اور ان کا تعلق بغیر کسی واسطے کے براہ راست عوام سے تھا۔ مسلمانوں کو ہندوستان کے جس مقام پر بھی کوئی تکلیف پہونچی، یہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال کر فوراً وہاں پہونچے اور تمام حالات کا جائزہ خود لیتے اور حکومت اور سیاسی لیڈروں سے مل کر اس کا کوئی مناسب حل تلاش کرتے۔ مرحوم انتہائی محنتی، مستعد، حق گو اور بہادر رہنما تھے اور سیاسی ہونے کے باوجود اللہ نے ان کو اخلاص اور دردمندی کی نعمت سے پوری طرح نوازا تھا۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی جو خدمت جس تگ و دو اور شجاعت کے ساتھ انھوں نے کی اس کی نظیر نہیں ملتی اس قسم کے بے ریا اور بے لوث راہنماؤں کی ہندوستان کو اس دور میں سخت ضرورت تھی۔ یہ اس وقت اللہ کو پیارے ہوتے ہیں جبکہ اس دنیا والوں کو ان کی شدید ضرورت تھی۔

ان کے گوناگوں اوصاف کی وجہ سے حکومت بھی ان سے بہت متاثر تھی، ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے لیڈر بھی ان کا احترام کرتے اور ان کی بات کا وزن محسوس کرتے تھے۔ وہاں کے تمام طبقوں کے عوام بھی ان کی قدر کرتے اور ان کی مخلصانہ خدمات کی وجہ سے ان سے تعلق خاطر رکھتے تھے۔

ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ یہ بہت بڑے عوامی لیڈر اور شعلہ نوا خطیب ہونے کے ساتھ ساتھ عالم دین اور بہترین مصنف بھی تھے۔ متعدد علمی کتابوں کے مصنف تھے۔ قصص القرآن، فلسفۂ اخلاق اور اسلام کا معاشی نظام وغیرہ ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ جو نہایت محنت اور تحقیق سے لکھی گئی ہیں۔

ان سطور کے راقم کو ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا پہلی دفعہ موقع ستمبر ۱۹۴۵ء میں ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی، اور اتحادی طاقتیں فاتح کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ ہندوستان کی آزادی کا وقت قریب آگیا تھا۔ اور ملک کی مختلف سیاسی جماعتیں میدان انتخاب میں اترنے کے لئے کمر بستہ ہو رہی تھیں اس دور میں جمعیۃ علمائے ہند نے نیشنلسٹ مسلمانوں کی ایک میٹنگ بلائی تھی جس کا مقصد گذشتہ واقعات کا جائزہ لینا اور آئندہ کے لئے لائحہ عمل مرتب کرنا تھا۔ نیز اس میں اس مسئلہ کو زیر بحث لانا مقصود تھا، کہ انتخابات میں حریت پسند مسلمانوں کو کیا قدم اٹھانا چاہیئے،

اس میٹنگ میں اپنے علاقہ کے نمائندہ کی حیثیت سے ان سطور کا راقم بھی مدعو تھا۔ یہ میٹنگ جس میں ہندوستان کی تمام آزادی خواہ جماعتوں کے رہنما شریک تھے۔ کئی روز جمعیۃ علماء ہند کے مرکزی دفتر میں جاری رہی۔ اس زمانہ میں مولانا مفتی کفایت اللہ (مرحوم) جمعیۃ علماء کی صدارت سے اور مولانا احمد سعید (مرحوم) نظامت اعلیٰ سے الگ تھے۔ (مگر اس میٹنگ میں شریک تھے، ان کے بجائے مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) صدر، مولانا سید داؤد غزنوی نائب صدر اور مولانا حفظ الرحمان بحیثیت ناظم اعلیٰ کے جو عظیم ذمہ داریاں عائد تھیں ان کو وہ حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے رہے تھے اور اس میٹنگ میں ان کا کردار بہت ہی نمایاں تھا۔ ان کی تقریروں اور تحریروں سے سب لوگ خوش تھے۔ وہ جو بات کرتے تھے، نہایت صفائی اور سلجھاؤ سے کرتے تھے۔

اس کے بعد مارچ ۱۹۴۷ء میں جبکہ عبوری حکومت قائم ہو چکی تھی ہم چند آدمی ریاستی پرجا منڈل کے سلسلے میں ایک ضروری کام سے مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمت میں دہلی گئے۔ اس اثناء میں مولانا حفظ الرحمٰن سے کئی دفعہ ملاقات اور گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ ان سے آخری ملاقات اگست ۱۹۴۷ء میں ہوئی ان دنوں ہندوستان کی ریاستوں کے سرکردہ مسلمانوں کا ایک اجتماع (عربک کالج) دہلی میں مسٹر منظر عالم وغیرہ نے بلایا۔ مسٹر منظر عالم آزادی سے قبل آل انڈیا اسٹیٹس مسلم لیگ کے صدر تھے۔ اس اجتماع میں راقم الحروف کو بھی ریاست فرید کوٹ کے نمائندہ کی حیثیت سے دعوت شرکت تھی۔ راقم کو اس اجتماع سے تو کوئی خاص دلچسپی نہ تھی! کیونکہ سیاسی طور پر راقم کا تعلق آل انڈیا ریاستی پرجا منڈل یا آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس سے تھا۔) لیکن ان دنوں مولانا حفظ الرحمان صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضری اور ان کے خیالات معلوم کرنے کا خاصا موقع ملا۔ وہ بڑا ہی ہنگامی دور تھا۔ مولانا مرحوم مسلمانوں کے بارے میں سخت پریشان تھے۔ بیشمار مسلمان جو آنے والے حالات سے خوف زدہ تھے۔ ان کے پاس آتے اور کام کرتے تھے، جو جہاں جانا چاہتے جاتا۔ وہ ہر ایک کا کام توجہ اور محنت سے انجام دیتے تھے۔ اس دوران میں معلوم ہوا کہ یہ شخص مسلمانوں کا کتنا ہمدرد اور کس قدر محنتی ہے،

مولانا مرحوم بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ جری اور بے خوف راہنما تھے، انگریز کے دور میں انھوں نے ہندوستان کی آزادی کی خاطر جو تکلیفیں برداشت کیں ان سے اتنے پریشان نہیں ہوتے ہوں گے جتنے وہ اب آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات سے مشوش اور پریشان تھے۔ یہی پریشانی اور بھاگ دوڑ ان کی بیماری کا باعث بنی اور ہندوستان کے مسلمانوں کی خدمت کا جذبہ صادق ہی انہیں موت کے آغوش میں لے گیا۔

ان کے انتقال سے ہندوستان کے مسلمان ایک بہت بڑے مخلص حق گو اور سنجیدہ غور و فکر کے مالک راہنما سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان کی موت ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے قلق و اضطراب کا موجب ہوگی لیکن اللہ کی مشیت کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا۔ وہ اپنی مصلحتوں کے مطابق جو کچھ کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پس ماندگان کو (جس میں ان کے اہل خانہ ہی نہیں ہندوستان کے تمام مسلمان شامل ہیں) صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ایشیا، لاہور

مولانا حفظ الرحمٰن سکریٹری جمعیت علماء ہند و رکن پارلیمنٹ (بھارت) کی وفات کا سانحہ المیہ بھارت کے مسلمانوں کے لئے ایک عظیم ترین حادثہ ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے عنفوان شباب ہی میں جب کہ وہ ابھی دارالعلوم دیوبند کے طالب علم تھے اپنے لئے مستقبل کی راہ زندگی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اور وہ جہاد وطن کے بے باک سپاہی بن گئے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت تک وہ زیادہ نمایاں نہ ہوئے۔ وہ مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ کے دست راست اور وفادار اسسٹنٹ تھے لیکن تقسیم کے بعد ان کی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ وہ ایک طرف کانگریس کے معتمد علیہ تھے دوسری طرف جمعیۃ علمائے ہند کے جنرل سکریٹری تھے اور تیسری طرف وہ بھارت کے مسلمانوں کی مشکلات و مصائب میں سینہ سپر، بھارت کے کسی مقام پر مسلمانوں کے کانٹا بھی چبھتا تو وہ بے چین ہو جاتے اور ان کے حقوق اور عافیت کی حفاظت کے لئے اپنے کانگریسی ساتھیوں سے بھی لڑ جاتے۔ یہاں تک کہ ان کو فرقہ پرستی کا طعنہ بھی سننا پڑتا۔ تاہم کانگریس ہائی کمان ان کے خلوص حب وطن اور ملت پروری کی معترف تھی اور ان کے مشوروں کو بسا اوقات قبول کر لیتی تھی۔ ان کی بیماری میں بھارت کے مسلمانوں کے ہر طبقے نے جس طرح درد دل سے ان کے لئے دعائیں کی ہیں وہ ان کی ہمہ گیر محبوبیت کا نشان ہے۔ کئی برس سے وہ علیل رہنے لگے تھے۔ پچھلے سال ان کے پھیپھڑوں میں کینسر کا شبہ کیا گیا وہ بمبئی علاج کے لئے گئے ان کی عدم موجودگی میں ہی

انتخابات عام ہوئے اور ان کے مسلمان مخالفوں کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں۔
اس کے بعد وہ امریکہ گئے کینسر کا علاج کرائیں اور پچھلے دنوں ہی واپس آئے تھے
تاکہ اپنے وطن میں داعی اجل کو لبیک کہیں اور خاک وطن ہی میں دفن ہوں
انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس حادثہ المیہ میں بھارت کی پوری
ملت اسلامیہ سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ مولانا کی موت علم عمل
حب وطن عشق آزادی اور دلسوزی ملت کی موت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان
کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ملت اسلامیہ بھارت کو صبر جمیل عطاء
فرماکر ان کی خالی جگہ کو پُر کرنے کا سامان کرے۔ (آمین)

ندائے ملت لکھنؤ

آل انڈیا ریڈیو کے ایک نشریہ سے معلوم ہوا کہ مجاہد ملت حضرت مولانا
حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا آج صبح ۹ بجے طویل علالت کے بعد اپنے مکان پر انتقال
ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا جنگ آزادی کی ان منفرد شخصیتوں میں سے ایک تھے جن پر ہندوستان
کی آزادی کو بجا طور پر ناز رہے گا۔ مولانا حفظ الرحمٰن ہندوستان کے ان رہنماؤں
میں تھے جو بے تکان اور مسلسل کام کرنے میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے جن لوگوں
کو ان کی قربت حاصل رہی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ مولانا کا کھانا پینا۔
اوڑھنا، بچھونا صرف خدمت ہو کر رہ گیا تھا۔

تقسیم ہند کے وقت جب دہلی سلگ رہا تھا۔ مولانا اپنی جان کی
بازی لگائے ہوئے ان محلوں اور گلیوں میں ایک نڈر مجاہد کی طرح ادھر سے
ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ اور مسلمانوں کو خوفزدہ علاقوں سے نکال کر محفوظ
مقامات پر پہونچانے کے انتظامات میں مصروف تھے۔

وہ اس سلسلہ میں کبھی گاندھی جی سے ملتے کبھی پنڈت نہرو سے کبھی مولانا
آزاد سے ملتے کبھی سردار پٹیل سے امن وامان کی فضا کو قائم ہو جانے کے بعد
بھی مولانا کا کام ختم نہیں ہوا۔ اور وہ ہمہ تن مکانات کی واگذاشت مساجد
کے تخلیہ جائدادوں کی واپسی میں ستم رسیدہ مسلمانوں کے اہم مسائل اور
ہزاروں مسئلوں میں منہمک ہوگئے۔ مولانا کی علمی خدمات میں ان کی کتابیں
قصص القرآن اسلام کا اقتصادی نظام اور فلسفۂ اخلاق خاص
طور پر یاد کی جاتی رہیں گی۔

حضرت مولانا کافی عرصہ سے کینسر جیسے مہلک مرض میں مبتلا
تھے اور اپنے الیکشن کے ایام میں بھی صاحب فراش رہے۔ دوران علالت
حضرت مولانا نے ایک خواب دیکھا جس کا مفہوم یہ سمجھا گیا کہ اب مرض دواعلاج
کی گرفت سے باہر ہو چکا ہے۔ اور مولانا صرف دعاؤں کے سہارے زندہ
ہیں۔ اس خواب کا اکثر اخبارات میں ذکر آچکا ہے۔ مولانا کو دہلی کے مصاحبین
نے باصرار امریکہ بغرض علاج بھیجا جہاں سے کیفیت مزاج کی اطلاع آتی
رہی اور مولانا کی صحت کی خبروں سے قلب میں ایک سکون محسوس ہونے لگا

امریکی معالجین نے اپنا کورس پورا کرنے کے بعد حضرت مولانا کو
وطن واپسی کی اجازت دیدی اور حضرت مولانا ۲۱ر جولائی بروز جمعرات
صبح ساڑھے پانچ بجے دہلی تشریف لے آئے۔

واضح رہے کہ یوپی میں سہ لسانی فارمولے کے اجراء کی خبر مولانا
کو امریکہ میں ہی ملی۔ آپ نے وہیں سے وزیر اعلیٰ سی بی گپتا کو ایک خط لکھ کر
اس فارمولے سے اردو اور مسلمان بچوں پر پڑنے والے مضر اثرات
کی نشاندہی فرماتے ہوئے لکھا کہ آپ تیسری زبان اردو کو ہی قرار دیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے
کسی بھی مسئلے سے آخر تک بھی غافل نہیں رہے۔ مولانا نے اپنے پسماندگان
میں اہلیہ محترمہ ایک صاحبزادے اور ۵ صاحبزادیاں چھوڑی ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ غفور الرحیم حضرت مجاہد ملت کو کروٹ کروٹ
جنت نصیب فرمائے اور درجات بلند فرمائے۔ نیز پسماندگان کو صبر
جمیل اور امت مسلمہ کو مولانا کا نعم البدل عطاء فرمائے۔ (آمین)

صدق جدید لکھنؤ

پرچہ پریس میں جا رہا تھا۔ اور سب نوٹ لکھے جا چکے تھے کہ دہلی سے اس
حادثہ کی خبر آگئی جو حادثہ عظیم کسی ایک خاندان یا ایک برادری کے لئے
نہیں بلکہ ہندوستان کی ساری ملت اسلامی کے لئے ہے اور خود ملک ہندوستان
کے لئے ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم ایک ہی وقت میں پختہ مسلمان بھی تھے اور پرجوش
نیشنلسٹ بھی، وطن کی خدمت میں پورے انہماک کے باوجود کسی طرح اپنی
ملت اور اپنے عقائد پر زد آنے کے وہ روادار نہ تھے۔ اردو کے مقدمہ
اور چھوٹے بڑے بیسیوں پچاسوں معاملوں کو جس جرأت وہمت اور ساتھ
ہی خوش تدبیری اور سوجھ بوجھ کے ساتھ انھوں نے پیش کیا وہ انھیں
کا حصہ تھا اور تنظیم وفعالیت کے تو گویا بادشاہ تھے۔ مسلمانوں کے
عام قومی مزاج کے برخلاف وہ باتیں کم کرتے اور کام زیادہ اور ہر وقت

مشغول عمل ہی رہا کرتے۔ ایک زمانہ میں صاحب قلم تھے اور علمی دینی رنگ کی
تصنیف و تالیف میں لگے رہتے۔ لیکن اب عملی کاموں کی اہمیت نے برسوں سے
ان مشغلوں کو چھڑا رکھا تھا۔ اب وہ "مجاہد ملت" رہنما نہیں۔ واقعہ کے
لحاظ سے تھے ۔ ہر ایک کے ہمدرد و خدمت گذار تھے۔ اور بڑے منکسر
متواضع اور مہمان نواز۔ اللہ بڑے بڑے درجات سے سرفراز فرمائے
تدفین کے لئے بابرکت شب جمعہ ملی۔

ہفت روزہ پیام مشرق دہلی

قدرت کی ان بوجھی مصلحتوں کے آگے سر جھکانا ہمارا ایمان ہے اور
ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تخریب سے تعمیر ہوتی ہے۔ لیکن سراپا عجز و نیاز بن کر مولا
کی جناب میں یہ کہنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چھ کروڑ ہندی مسلمانوں
اور کروڑوں ہندوستانیوں کی روحیں قبض کر لی ہوتیں لیکن ایک روح ان
کے عوض بخش دی جاتی جو روح اعظم تھی اور جس کا نام حفظ الرحمٰن تھا۔
مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی جناب رفیع احمد قدوائی
کی موتوں پر ہم نے صبر کیا۔ لیکن آج مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی موت
پر صبر کہاں سے لائیں ملت لٹ گئی ہندوستان کی قومی مجلسیں سونی ہو گئیں۔
اور رزم و بزم کا وہ شبیر جس کی گرج نے کم و بیش چالیس سال تک باطل کو
لرزایا ہم سے چھن گیا۔ آج اس کی اور اس کے کارناموں کی یاد باقی ہے۔

اک تیر ایسا سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

جس "پیام مشرق" کی یہ عادت ہو گئی تھی کہ مولانا حفظ الرحمٰن زندہ
باد کا نعرہ دل کی گہرائیوں سے بلند کیا کرتا تھا، آج اس کا حفظ الرحمٰن ابدی
نیند سو رہا ہے۔ اس کے سیاسی خیالوں اور خوابوں کا سرو دماغ مفارقت
دے چکا ہے۔ ہم کہاں اور وہ کہاں؟

آج اس درد کی دوا کیا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کا پیام مشرق اور پیام مشرق والوں سے تعلق
اغراض کی بنا پر نہیں تھا، عالم آب و گل کا واسطہ نہیں تھا، بلکہ معنویات
کی دنیا کا رابطہ استوار تھا۔ فکر کا ایک موضوع چھن گیا، قلم کار کا ایک
جلی عنوان مٹ گیا، بات یہ نہیں تھی کہ مجاہد ملت نے ہم پر انعام و اکرام کی
کوئی بے پناہ بارش کی ہو بلکہ بات فقط اتنی تھی کہ ان کا کردار، ان کا غصہ
ان کی برہمی، ان کی تندی، ان کی نرمی، غرضیکہ ان کی ہر ادا ہمیں پیاری
لگتی تھی، اس پیار میں اخلاص کارفرما تھا، بے ریا تھا، موت کی رات
کو مولانا نے جب اشارہ سے اپنے پاس بلایا، تو یہ اشارہ ہی دل میں بس گیا، ہر
وقت محسوس ہوتا ہے کہ عالم ارواح سے کوئی سعید روح اشارہ کر رہی ہے۔
ان کے جو ساتھی تھے ان کا تو کہنا ہی کیا، انہیں مولانا کن کن موقعوں پر یاد
آئیں گے لیکن جن لوگوں نے مولانا کی بزم آرائیاں دیکھی ہیں ان کے تیور یاد آئیں
گے۔ مولانا حفظ الرحمٰن کو یوں تو ہم بہت دنوں سے جانتے ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ
۱۹۴۷ء کے بعد انہیں پہچاننے کا موقع ملا۔ امیر و غریب کا ان کے یہاں کوئی
امتیاز نہ تھا۔ پارٹی اور جماعت کا کبھی کوئی فرق نہ تھا۔ بلا امتیاز مذہب و ملت
مدد کریں گے بے دھڑک اور بے تحاشا مدد کریں گے۔ کبھی معتبر کارکنوں کو
ارباب اقتدار کے یہاں بھیج رہے ہیں، کبھی جیپ میں کبھی تانگے پر کبھی پیدل،
مدد ضرور ہوگی، چاہے جس حال میں ہو اور جس حیثیت پر ہو لاکھوں آنکھیں آج
بے سبب اشکبار نہیں ہیں کہ ان کا غمگسار نہیں رہا۔ مولانا حفظ الرحمٰن کا بدل
پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ ہمدردیاں، وہ محبت، وہ اخلاص، نازک موقعوں
پر آڑے آنے کی ادا شاید پیدا نہیں ہوگی۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

لوگوں نے مولانا کو شاید کانگرسی حکومتوں کا نیاز مند ازلی سمجھا ہو لیکن ہم نے
اپنے کئی سال کے صحافتی تجربوں میں ایسا حق گو، ایسا بیباک، ایسا نڈر لیڈر
نہیں دیکھا۔ جو علانیہ تو بہت محتاط تھا لیکن تخلیوں میں اتنا ہی غیر محتاط تھا
الفاظ بھی تند ہیں، تیور بھی بگڑے ہوئے ہیں، ہونٹ بھی تھرتھرا رہے ہیں،
آواز بھرائی ہوئی ہے لیکن کہیں گے وہی جو انہیں کہنا ہے اور کمال یہ کہ جب گفتگو
ختم ہوئی تو تلخی نام کو نہیں، قلب آئینہ تھا۔ جیسے مومن کا قلب آئینہ ہو جاتا ہے
پیارے نبیؐ کے نام لیوا جو تھے۔ اسلامی روایات کی آغوش میں جو پلے تھے۔
مجاہد اور مومن کی شان اس بیسویں صدی میں مجاہد ملت، مجاہد وطن مولانا حفظ الرحمٰن
کی تھی ۱۹۴۷ء کے بعد ٹنڈن جی کے سیاسی معتقدات کا زہر پھیلا، لیکن کوئی
بتا دے کہ ہندی مسلمانوں کی تمام محرومیوں، مجبوریوں کے باوجود مولانا حفظ الرحمٰن
نے کبھی کوئی زہریلی بات کہی ہو۔ انتہائی غصہ کی حالت میں بھی کسی فرقہ کی دلآزاری
کی ہو، اس کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگائی ہو۔ مولانا حفظ الرحمٰن آغاز کار سے
ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے، اور آخری سانس تک علمبردار رہے ان کی
روح پاک ان کا شعور بالغ ان کی نظر پاک، ان کا کردار بلند، کوئی ہے۔ مولانا
کی ہمسری کا دعویٰ کرنے والا۔

"پچھلے دنوں ایک صاحب نے فرمایا کہ میوات کے ایک جلسہ میں ہزار

پٹیل آنجہانی نے مسلمانوں کے متعلق کچھ نامناسب باتیں کہیں اور مولانا جلسہ میں موجود تھے خاموش رہے۔ ہم نے گذارش کی کہ مولانا کی سیاست دفاعی تھی اقدامی نہ تھی اور جب اقدام کا وقت آیا تو وہ مولا کو پیارے ہوگئے۔ لیکن اس سلسلہ کی جو بات کہنے کی تھی وہ یہ تھی کہ سردار پٹیل کی اصلاح میں اور ان کے انداز سیاست کی تردید میں مولانا نے جو رول ادا کیا وہ کسی لیڈر نے نہیں ادا کیا۔

ہم ایک بار پھر کہیں گے کہ ایک عوامی لیڈر کا رول مولانا نے پچھلے چودہ برسوں میں جو ادا کیا وہ کسی سے ادا نہ ہوسکا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مفکر اور مدبر تھے مولانا حفظ الرحمٰن مجاہد اور مدبر تھے۔ ان میں مولانا جمال الدین افغانی کی فراست تھی، مولانا محمد علی مرحوم کا جوش و خروش تھے، حکیم اجمل خاں کی مٹھاس تھی۔ ڈاکٹر انصاری کا وہ سلیقہ تھا جو اچھے کاموں کے لئے ذرائع و وسائل فراہم کرلیتا تھا پنڈت نہرو اگر انقلاب پسند ہیں تو ان کی انقلاب پسندی کے لئے ماحول سازگار تھا۔ مولانا اگر انقلاب پسند تھے تو ان کی انقلاب پسندی حالات کی نامساعدت کے باوجود تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد مولانا جس حد تک انقلاب پسند رہے۔ پنڈت نہرو بھی نہ رہ سکے یہ قطعاً احسان ناشناسی ہے کہ مسٹر سنجیوا ریڈی اور مسٹر سنجیویا تو آل انڈیا کانگریس کے صدر ہوں اور مولانا حفظ الرحمٰن صدر نہ ہوں مذہب و ملت کی تمیزیں انہی موقعوں پر دلوں کو برماتی ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ سیکولر ہندوستان کی نشوونما صحیح نہیں ہو رہی ہے۔

آہ مولانا حفظ الرحمٰن! آسمان آپ کی یاد میں خون کے آنسو بہائے گا۔ موجودہ اور آئندہ نسلیں آپ کی یاد میں روئیں گی۔ قوم قیامت تک آپ کو یاد کرے گی۔ ہندی مسلمان آپ کی جدائی پر سدا سوگوار رہیں گے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی موت کا ایک دنیا نے غم منایا لیکن ہمارا سرمایہ تسکین یہ تھا کہ مولانا حفظ الرحمٰن زندہ ہیں اور ان کے دم سے قیادت کو چار چاند لگیں گے لیکن آج آپ کی وفات حسرت آیات کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی مفارقت کا زخم ہرا ہوگیا ہے۔ ماتم یہ ہے کہ چالیس سال تک جو رول مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن نے ادا کیا وہ اب کون ادا کرے گا۔ کہاں سے لائیں گے ہم اس حفظ الرحمٰن کو جو یتیموں کا وارث، بیواؤں کا سہارا، غریبوں کا غمگسار، اپنے رفیقوں کا ہمدرد تھا۔ جمعیۃ علماء ہند کی پناہ گاہ ٹوٹ گئی۔ "دیوبندیت" اگر کسی مجاہدہ اور مقصد کا نام تھی، تو وہ آج بے بس ہے۔ دفتر کے ایک معمولی سے معمولی چپراسی کا دل بڑھانے والا نہ رہا، مسلمانوں کی اکھڑی ہوئی عوامی زندگی کو توانائی بخشنے والا نہ رہا۔ دنیا اس نام کو رو دے گی جو عظمت و جلال کا جلی عنوان تھا۔ جس نے شبانہ روز کی محنت شاقہ سے ویرانوں میں آبادی کی شان پیدا کی تھی، تخریب میں تعمیر کا انداز پیدا کیا تھا، جو بیسویں صدی کا بہت بڑا مجاہد وطن اور مجاہد ملت تھا۔

اک حسرت تعمیر ابھی باقی ہے

اور ان حسرتوں کی داد آج کون دے گا، جو کام مولانا حفظ الرحمٰن یکا و تنہا کرلیتے تھے وہ بڑی بڑی فوجیں بھی نہیں کرسکتی تھیں۔

عالم باعمل ایسے کہ قومی زندگی میں شرعی مسائل کی بال کی کھال نہیں نکالی لیکن کیا وہی جو ایک عالم دین ایک مفکر اسلام، ایک ہندوستانی کو کرنا چاہئے تھا نوجوانی میں ایک رنگ اختیار کرنا اور چالیس پیالیس سال تک اس رنگ کو کبھی بے رنگ نہ ہونے دینا مولانا حفظ الرحمٰن ہی کا مخصوص حصہ تھا۔ خطابت نے زور دکھایا تو آسمانوں سے چاند تارے نوچ لائے، پانی میں آگ لگائی۔ بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی ڈالا اور مُردوں میں جان ڈال دی، پارلیمنٹ میں تقریر کی تو ایسی کہ سند بن کر رہ گئی۔

ہم اسے روتے ہیں جس نے قوم کو اپنا شباب دیا، اپنی پوری زندگی دی۔ کسی کی موت کے بارے میں اگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ عوامی زندگی کے مجاہدوں نے اس کی زندگی مختصر کردی، تو وہ مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی ہے جو عافیت کدوں سے بیزار تھی۔ میدانوں میں منزلیں طے کرتی تھی۔ بگولا ان کے اڑاتی تھی اور دنیا پر چھا جاتی تھی۔ طوفان کا مقابلہ کرنے والے ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن مولانا حفظ الرحمان نے طوفانوں کا مقابلہ جس عزم و استقلال سے کیا، وہ ایک تاریخ ہے اور اس تاریخ میں شرارے ہیں، انگارے ہیں، بے قراریاں ہیں تب و تاب جاودانہ ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے قوم کے لئے جو لازوال جائداد چھوڑی ہے وہ یہی تاریخ ہے

اللہ ان کا درجہ بلند کرے، ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی فرمائے اور اس قوم کا حوصلہ بڑھائے جو فریادی ہے کہ ؎

دے داد اے فلک دل حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافی مافات چاہئے

نقیب دہلی

نقیب کا یہ پرچہ مرتب ہوچکا تھا اور کاپی پریس کو جانے والی تھی کہ ابھی ابھی ڈیڑھ بجے دلی ریڈیو نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ امت کو جس مصیبت عظمیٰ کا کھٹکا تھا وہ ٹل نہ سکا اور موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس قیمتی متاع کو اس سے چھین لیا جسے ہم مجاہد ملت کہتے تھے جس کا نام حفظ الرحمٰن تھا۔ جو تھا جمعیۃ علماء ہند کا ناظم

اور پارلیمنٹ کا ممبر لیکن اس کا اصل کام گزشتہ پندرہ برسوں سے یہ ہوگیا تھا کہ وہ امت کی مظلومی کو دنیا پر ظاہر کر دے اور ظالموں سے بھرپور لڑائی کرے اعصابی جنگ کے اس دور میں امریکہ اور روس گولوں اور مشینوں کو حرکت نہیں دے سکتے بے چارا حفظ الرحمٰن یہ کیسے سوچ سکتا تھا لیکن اس ایٹمی دور میں اعصابی طریقہ جنگ جو رائج ہوگیا ہے اس کا کوئی داؤ اور کوئی پیچ اس نے نہیں چھوڑا جو اس نے ظالموں کے خلاف استعمال نہیں کیا ہو لیکن اس کی نوج بہت تھوڑی تھی اور شکستہ حال بھی وہ سال بسال نہ ہوا وہ غم کھاتا رہا اور چلاتا رہا۔ ظلم کی ناؤ ڈوب کر رہے گی، مظلوموں کی آہ سے بچو، جس ملک کو اونچا کرنے کے لئے ہم نے گولیوں کے سامنے سینہ تان دیا۔ جیل کی کوٹھری میں زندگی گزاری، اس ملک کو دنیا کے سامنے روسیاہ نہ کرو۔ وہ چیختا رہا چیختا رہا کسی نے نہیں سنا۔ آہ! اس کے پھیپھڑے میں کینسر ہوگیا۔ وہ تڑپتا رہا، معالج ناکام رہے یہاں تک کہ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ وہ بہادر تھا۔ وہ مخلص تھا وہ خدمت پر یقین رکھتا تھا۔ وہ حق بات کہنے سے کبھی نہیں جھجکا، اس کے دل میں کسی کے خلاف نفرت نہیں رہی اس نے کبھی آرام نہیں کیا۔ اب قوم مدتوں ماتم کرے گی، کف افسوس ملے گی، تلاش کرے گی حفظ الرحمٰن نہیں تو حفظ الرحمٰن کی طرح کوئی مل جائے۔ لیکن وہ اس کا سایہ بھی نہیں پائے گی حفظ الرحمٰن بارگاہ رب العزت میں پہنچ چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مغفرت فرمادی ہے۔ وہ کہہ رہے ہیں یلیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین۔ ترجمہ:۔ اے کاش میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھ کو بخشا اور مجھ کو عزت والوں میں بنایا۔ سورہ یٰسین۔

مولانا سے ایڈیٹر "نقیب" کے تعلقات ۱۹۳۵ء سے تھے جبکہ مولانا کا قیام کلکتہ ہی میں تھا۔ مولانا کو وہ ایک رہنما، ایک استاد، ایک سرپرست ایک دوست سمجھتا تھا۔ مولانا سے اتفاق خیال بھی ہوا اور اختلاف خیال بھی لیکن ان کی یہ حیثیتیں اس کی نظروں میں نہیں بدلیں۔ کتنوں کا سہارا ٹوٹ گیا، ایک اس کا سہارا ٹوٹا تو کیا ٹوٹا۔ اللہ تعالیٰ نعم البدل عطا فرمائے (آمین)

ہماری زبان علی گڑھ

نئی دہلی ۲؍ اگست۔ جنگ آزادی کے زبردست مجاہد، ملک کے مقتدر لیڈر اور اردو کے پرجوش حامی مولانا حفظ الرحمٰن کا آج صبح فجر کے وقت نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔ ۵ بجے شام کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے جوار میں ان کو سپرد خاک کیا گیا۔

ہر آمد روزگار ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید نہ آید

گزشتہ کئی مہینے سے مولانا کینسر کے مرض میں مبتلا تھے جس کا علاج کرانے وہ امریکہ بھی گئے تھے۔ اور حال ہی میں واپس آئے تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۲ سال تھی۔

مولانا حفظ الرحمٰن ایک مخلص رہنما بلند پایہ عالم زبردست مقرر اور اردو کے اچھے مصنف بھی تھے۔ ملک کے علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں سے عموماً اور انجمن ترقی اردو ہند سے خصوصاً ان کو گہرا تعلق تھا۔

مولانا کے انتقال کی خبر سنتے ہی انجمن کے کارکنوں کا ایک فوری تعزیتی جلسہ ہوا۔ جمعیۃ علماء اور مولانا کے پسماندگان کے نام تعزیتی تار بھیجا گیا اور ان کے سوگ میں انجمن کا دفتر بند رہا۔

مختصر حالات زندگی

مولانا حفظ الرحمٰن ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۱ء کو قصبہ سیوہارا ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ اردو کے مشہور جوانا مرگ ادیب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے وہ قریبی عزیز تھے۔ ابتدائی تعلیم سیوہارے ہی میں حاصل کی۔ پھر ملک کی مشہور انگریز دشمن دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ اور وہیں سے فضیلت کی سند لی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد دارالعلوم دیوبند ہی میں مدرس ہوگئے۔ مدرسہ ڈابھیل (گجرات) اور مدرسہ عالیہ (کلکتہ) میں بھی کچھ عرصے تک استاد کے فرائض انجام دیتے رہے۔

ملک کو غلامی سے نجات دلانے کی تڑپ مولانا حفظ الرحمٰن کو ورثتاً ملی تھی دیوبند کی تعلیم نے ان کے پاک جذبے کو تیز کر دیا۔ چنانچہ کم عمری ہی سے انھوں نے ملک کے سیاسی معاملات میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ خلافت کی تحریک سے ان کی عملی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اسی تحریک کی راہ میں وہ کانگریس میں داخل ہوئے۔ گاندھی جی کی تمام تحریکوں میں پرجوش حصہ لیا۔ اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ۱۹۳۵ء سے پہلے ہی وہ یوپی کی صوبائی کانگریس کے ممبر منتخب ہوئے اور مختلف عہدوں پر فائز رہے ۱۹۳۶ء سے اس وقت تک یوپی ہی سے وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر منتخب ہوتے رہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے ابتدائی دور ہی سے مولانا حفظ الرحمٰن کو اس ادارے سے گہرا تعلق رہا تھا۔

۱۹۳۲ء میں وہ جمعیۃ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر اور ۱۹۴۲ء میں جنرل سکریٹری

منتخب ہوئے۔ زندگی کے آخری لمحے تک تن دہی و سرگرمی سے وہ اس عہدے کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۱۹۴۶ء میں مولانا حفظ الرحمٰن یوپی اسمبلی کے ممبر، اور حصولِ آزادی کے بعد دستور ساز اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ دستور کے نفاذ کے بعد وہ امروہہ (ضلع مرادآباد) کے حلقۂ انتخاب سے ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ کے ممبر چنے گئے اور آخری وقت تک اسی حلقۂ انتخاب کی نمائندگی کرتے رہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کو سیاست کے ساتھ ساتھ ملک کے علمی، ادبی، تعلیمی اور ثقافتی مسائل سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ وہ ندوۃ المصنفین کے بانیوں میں سے تھے جو آج ملک کا مقتدر علمی ادارہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند اور مختلف دینی مدارس کے علاوہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ اور ایگزیکٹیو کونسل کے بھی وہ ممبر تھے۔

اردو سے مولانا حفظ الرحمٰن کو قدرتی طور پر گہرا لگاؤ تھا۔ متعدد قابلِ قدر اردو کتابوں کے وہ مصنف بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں اسلام کا اقتصادی نظام، قصص القرآن اور سیرۃ رسول قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرکزی انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ اور اس کی مختلف کمیٹیوں کے سرگرم رکن تھے۔ اردو ہی کے سلسلہ میں انھوں نے بسترِ مرگ سے یوپی کے وزیر اعلیٰ کو سہ لسانی فارمولا کے متعلق ایک پر درد خط لکھا تھا انھوں نے اس خط کی ایک نقل وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی بھیجی تھی۔ وزیر اعظم نے مولانا کو جو جواب لکھا ہے وہ سہ لسانی فارمولا کے سلسلہ کی ایک اہم دستاویز اور مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے آخری لمحوں تک اردو کے ساتھ اپنی علمی دلچسپی جاری رکھی تھی۔

ایشیا ویکلی دہلی

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن مجاہدِ آزادی رہنمائے ملک و ملت آخر طویل علالت کے بعد ہم سب کو داغِ مفارقت دے گئے۔ خدا نے اپنی امانت ہم سے لے لی ہم اس امانت کے قابل نہ تھے۔ دوائیں دعائیں سب بے اثر گئیں ابھی تو اس کارواں کو سالار کی ضرورت تھی مگر اللہ کی مشیت کے سامنے کون زبان کھولے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

افسوس اتحاد و یگانگت کا وہ ستون خاموش ہوگیا جس کی صداؤں نے حق و صداقت کو ہوش مندی کے ساتھ بلند کیا۔

آہ! وہ جو متحدہ اور مشترکہ ہندوستان کی تعمیر میں ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ اب نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ جس کے پائے ہمت نے کبھی لغزش نہ کھائی جس کے دل میں ہندوستان اور انسانی ہمدردی اور محبت کا جذبہ ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ آج وہ رخصت ہوگیا۔ افسوس متاعِ کارواں جاتا رہا۔ اسلام کی پاکیزہ تعلیم اور پیام کا علمبردار اور رہنما اٹھ گیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ترجمان علی گڑھ

دہلی ۲۔ اگست ۱۹۶۲ء رات ۳ بجے حضرت مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون مجاہدِ ملت ہندوستان کے ایک جلیل القدر فرزند جنگ آزادی کے نڈر سپاہی ایک سچے محب وطن پرستار دین فدائے ملت اور سیاسی رہنما ہونے کے باوجود باایمان مرد مسلمان تھے۔

مولانا کی زندگی بڑے بڑے خطرات سے گذری جبکہ بڑے سے بڑے لیڈر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں لیکن مولانا نے ہر نازک موقعہ پر اپنے تدبر اور فکر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ان کی زندگی ۱۹۴۷ء سے قبل ایک طرف انگریز سے دست و پیکار تھی، تو دوسری طرف تقسیم وطن کے غداروں سے نبرد آزما تھی ۱۹۴۷ء کے بعد جب دہلی کی سرزمین مظلوموں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی تھی۔ اور ملک کے کچھ رہنما اپنے ہوش و حواس کھو کر در پردہ شیطانی طاقت کے معاون تھے۔ اس وقت بھی مولانا نے کلمۂ حق کے اظہار میں مصلحت کا سہارا تلاش نہیں کیا۔ اور ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک ملک میں جس قدر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اس کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا مولانا کی آواز حکومت کے ایوان میں گونجی وہاں کھل کر ظالموں کی نشاندہی کی ایوان کے باہر بھی اقلیتوں کے تحفظ کے لئے ہر جگہ ببانگ دھل مجرموں کو مجرم کہا مظلوموں کو مظلوم کہا وہ سچائی جرأت اور کردار کے علمبردار تھے۔

مولانا کی تمام زندگی قوم اور وطن کی خدمت کرنے میں بسر ہوئی وہ بلا امتیاز ہر ایک کے کام آنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اور بالخصوص تقسیم وطن کے بعد مسلمانانِ ہند کی تکالیف اور زخموں کا وہ مرہم تھے۔ ملک کے کسی بھی حصہ میں مسلمانوں کے جیب جان و مال سے کھیلا جاتا وہ تڑپ جاتے

اور کسی بھی حالت میں ہوتے مظلوموں کی دادرسی کے لئے پہنچ جاتے تھے۔ آہ اب کون ایسا مخلص ہے کانگریسی مسلمانوں میں ایسا جو مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھے گا۔ کون ہے جو عصر حاضر کی بساطِ سیاست کے مہروں کی چالوں کو سمجھ سکےگا آہ کون ہے اب جو بسترِ مرگ پر بھی اُردو کے تحفظ کے لئے کروٹیں بدلیگا کون ہے اب جو ایوانِ حکومت میں دلیری اور جرأت سے مسلمانوں کی تکالیف کو بیان کرے گا۔ کس کی نظر ہے جو اب مسلمانوں کے دینی اور اقتصادی گہرائیوں کو دیکھ سکےگی کس کی زبان ہے جو مسلمانوں کو آنے والے اسلام کش دور سے آگاہ کر سکے گی۔ کس کی آواز ہے جو ملت اسلامیہ کے اتحاد اور عظمت ناموس رسول کے تحفظ کے لئے گونجے گی۔

آہ! مجاہد ملت خدا تیری روح کو اپنی لامحدود رحمتوں سے نوازے۔ بار بتعالیٰ تیری جرأت تیری حق گوئی تیرا العم البدل ہندی مسلمانوں کو دے خدا تیرے متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطاء فرمائے (آمین)

بھوپال پنچ بھوپال

غالباً ایک سال پہلے کی بات ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بھوپال تشریف لائے اور جمعیۃ علماء بھوپال کی طرف سے آپ کو نسترن بانو کی مسجد میں ظہرانہ دیا گیا۔ اس ظہرانہ میں ہم لوگ شریک تھے۔

مدیر پنچ تو ٹھہرا منھ پھٹ آدمی۔ دسترخوان پر بیٹھتے ہی اس نے منتظمین سے دریافت کیا کہ یہ کھانا قوم یتیم کی ملکیت ہے یا آپ لوگوں نے اپنی جیب سے اس کا انتظام کیا ہے۔

یقین جانئے کہ میرے اس جملے پر ہنسنے والے تو بہت سے تھے لیکن چونک جانے والا شاید مولانا حفظ الرحمٰن کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا"

مولانا حفظ الرحمٰن ہی جاگتا ہوا ذہن اور ٹیس محسوس کرتا ہوا دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔

ہمیں یاد نہیں پڑتا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک مسلمانانِ ہند کا کوئی مسئلہ ابھرا ہو اور اس پر مولانا کی پرچھائیں نہ پڑی ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جگر نے یہ مشہور عالم اشعار اگر کسی مخصوص شخصیت کو سامنے رکھکر کہے تھے۔ تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آرہے ہیں وہ جا رہے ہیں

اور

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر کبھی گلشن و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر

مرحوم مسٹروں کے بھی ممدوح تھے اور مولاناؤں کے بھی۔ وہ شری اور کامریڈوں کی نظر میں بھی لائق عزت تھے اور اچاریوں اور پنڈتوں کی نگاہ میں بھی۔ اور یہ سب عزت و توقیر اس وجہ سے تھی کہ خدا نے انھیں تڑپنے والا دل اور سرگرم رہنے والا وجود عطا کیا تھا۔

دارالعلوم دیوبند اپنے آغاز سے لیکر اب تک بلا مبالغہ کوئی بیس ہزار فاضل پیدا کر چکا ہوگا۔ لیکن اس میں شیخ الہند مولانا مدنی اور مولانا حفظ الرحمٰن بس گنتی ہی کے پیدا ہوئے یہ ایسے "کوہ نور" تھے کہ جہاں کی ٹوپی میں بھی لگ گئے اسے تاجدار بنا دیا۔ انھوں نے سب سے اپنی شخصیت کا لوہا منوایا اور جب گئے تو سب ہی کی محفلیں سونی ہوگئیں۔ انھیں نہ تو ندوہ نے غیر سمجھا اور نہ ہی علی گڈھ نے۔ وہ دیوبند میں جتنے مقبول تھے بریلی اور اجمیر میں بھی اتنے ہی مقبول ہوتے۔

آج مولانا ہم سے جدا ہو چکے ہیں اور وہاں جا چکے ہیں جہاں ہم سب کو جانا ہے لیکن ان کی یاد عرصہ تک باقی رہے گی۔

راہِ فانی کی پہلی منزل سے گزر جانے والے اس مسافر کو ہمارا سلام پہنچے کہ اس نے سلامتی کے ساتھ یہ کٹھن منزل گزار دی۔

یہ دنیا آنی جانی ہے یہاں جو بھی پیدا ہوا اسے دیر سویر ایک نہ ایک دن جانا ہی ہے۔ دنیا کے اس چمن کا مالی اپنے وقت پر پودوں کو اگاتا اور اکھیڑتا رہتا ہے۔ اس کے اس منصوبے کے سلسلہ میں یہ کہنا تو شاید شکوہ سنجی اور گستاخی ہوگی۔ کہ کسی کی موت قبل از وقت ہوئی ہر واقعہ اپنے وقت ہی پر ہوتا ہے خواہ وہ ہم کم فہموں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ اللہ اپنی محفل کو سونا ہوتے دیکھکر جی چاہتا ہے یہی کہنے کو۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

خدا مولانا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اُن کی غلطیوں سے درگذر فرمائے اور ان کی حسنات کو ان کی کمزوریوں پر غالب فرما کر اپنے دامنِ رحمت میں لپیٹ لے کہ اس کی مغفرت اور رحمت کے دامن میں پناہ پا جانا ایک مومن کی حقیقی کامیابی ہے۔

بیباک سہارنپور

ایک فرد کی ذات میں جماعتیں محفوظ تھیں ایک ذات جو صداقت و امانت جرأت اور عزیمت، محبت و اخلاص، سخاوت و مروت، ہمت و استقلال، شجاعت و اولوالعزمی، جلال و جمال اور انسانیت کے بہترین اوصاف کے لئے قدرت خداوندی کے خزانۂ بخشش و عطا کا نمونہ اور اسوۂ رسول اور صحابۂ کرامؓ کی مجاہدانہ زندگی کی ترجمان تھی۔ ایک وجود جس میں زندگی ہی زندگی۔ عمل ہی عمل اور مسلسل جد و جہد کی بے پناہ قوتیں اور حیرت انگیز صلاحیتیں ودیعت کردی گئی تھیں اور جس کے اندر ہمہ وقت یہ احساس زندہ و متحرک رہتا تھا کہ انسان اس کائنات کا سربراہ ہے اسے بہرحال و بہر صورت ممتاز و معزز رہنا چاہیے آسمان و زمین کے درمیان جو کچھ ہے وہ اسی کی خدمت و تابعداری کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور کسی انسان کو اپنے ہی جیسے انسان کی غلامی و محکومی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ سب انسان خدا کے بندے اور اسکی عیال ہیں۔ اور ان کی گردنیں اسی لئے ہیں کہ وہ صرف اس کی بارگاہ جلالت و عظمت میں جھکی رہیں اور کسی کمزور سے کمزور انسان کو یہ تصور بھی برداشت نہ کرنا چاہیے کہ اس کی گردن اطاعت کسی بڑے سے بڑے انسان کے آگے خم ہو خواہ وہ دنیوی بڑائی کی اصطلاح میں وقت کا فرعون و شداد ہی کیوں نہ ہو۔

آہ ! وہ ذات اور وہ وجود — جسے ۶۲ سال تک دنیا نے محمد حفظ الرحمٰن کے پیارے نام سے پکارا اور جس نے عالم شعور میں قدم رکھتے ہی انسانی مجد و شرف اور اس کے حقیقی تقاضوں کی تکمیل کے لئے خود کو حوادث و آلام کے طوفانوں کے حوالہ کردیا۔ اس نے جب ہوش کی آنکھیں کھول کر دیکھا کہ اس کا عظیم ملک اور اس کی عظیم آبادی اپنے ہی جیسے مٹھی بھر انسانوں کی محکومی اور غلامی پر مجبور ہے

اور غیر ملکی اقتدار ہندوستان کی تاریخی غیرت و حمیت کے احساسات کو کچلتے کچلتے فرعونیت کے آخری مرحلہ تک پہنچ گیا ہے تو شباب جوانی اور جوانی کی ساری عیش طلبیاں اس کے جذبۂ غیرت و حمیت کے آگے اعتراف شکست کرچکی تھیں اور وہ مرد مجاہد اپنے ان اکابر کے سامنے جانبازی و سرفروشی کا حلف لے رہا تھا۔ جو حریت و انقلاب کی خاموش بجلیاں ملک کے گوشے گوشے میں پھیلانے میں مصروف تھے اور جنہوں نے صرف خدا کی رضا کے لئے اپنی جانوں کو حریت و آزادی کے مقصد کے لئے وقف کردیا تھا۔

حفظ الرحمٰن نے دارالعلوم کی چٹائیوں پر بیٹھ کر اپنے بزرگ اور مجاہد اکابر سے جو کچھ پڑھا اور سیکھا، اس کا ایک مختصر سا خلاصہ انہوں نے خود ہی اخذ کرلیا اور وہ صرف اتنا تھا کہ انسان صرف خدا کی بندگی اور محکومیت کے لئے ہے اس کے بعد وہ ساری کائنات کا تاجدار اور مخدوم ہے یہ سمجھ لینے کے بعد انہوں نے اپنی اس زندگی کا آغاز کردیا جو شجاعت و جوانمردی کی زندگی تھی جس میں انسانی عظمت و جلالت کے زندہ متحرک اور مکمل احساسات تھے۔ اور جو دنیا کی بڑی بڑی مادی اور فرعونی قوت کا ہمہ وقت مقابلہ کرسکتی تھی۔ شباب و جوانی کا وہ سرمایہ جو عیش کوشیوں اور راحت طلبیوں کے لئے بھی وقف ہوسکتا تھا۔ اور جسے جوانی کا تقاضا بھی کہا جاسکتا تھا محض جہاد حریت کی سرگرمیوں کے لئے مخصوص ہوکر رہ گیا اور اس کے بعد دنیا نے دیکھا کہ ایک فرد واحد زندگی کے کس کس شعبے میں سرگرم عمل ہے۔ اگر وہ تصنیف تالیف کے منصب پر متمکن ہے تو اس کی عظمت کا اظہار "اخلاق و فلسفہ و اخلاق" "اسلام کا اقتصادی نظام" اور "قصص القرآن" جیسی تاریخی تالیف سے ہوتا ہے۔ اور اگر اس کی اسلامی فراست سیاسیات میں کارفرما نظر آتی ہے تو وہ ہندوستان کی تقسیم کی ہلاکت خیزیوں کا اس وقت تک اعلان کرتا رہتا ہے۔ جب اسے کانگریس کے بڑے بڑے رہنما حتیٰ کہ پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی جیسے اکابر بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔

حفظ الرحمٰن نے جس آزادی کے لئے اپنی زندگی کا پورا سرمایہ لگایا جس کے لئے قید و بند کی طویل صعوبتیں برداشت کیں اور جس کی تلاش و جستجو میں بڑے بڑے اذیت دہ خارزاروں سے گذرنا پڑا جب وہ آزادی سامنے آئی تو اس کی شکل و صورت کس قدر بھیانک اور کتنی ڈراونی تھی اس کا تخت کتنی انسانی لاشوں اور انسانی ناموس کی کیسی کیسی بربادیوں پر بچھا ہوا تھا۔ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں پر اور ہندوستان میں مسلمانوں پر کیسی کیسی قیامتیں ٹوٹ رہی تھیں، اور وہ قوم جو پوری ایک صدی تک آزادی کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیتی رہی، آزادی حاصل کرنے کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دیتی رہی، آزادی حاصل کرنے کے بعد کس قدر

.. آزاد ہوگئی تھی ؟ ہر طرف موت اور ہلاکت کا دور دورہ تھا۔ انسانیت کے لئے کسی گوشہ میں پناہ نہ تھی۔ اور رہنما تک گھروں کے سب سے محفوظ خانوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ اس وقت جب دلی کے گلی کوچوں میں اور بازاروں میں قتل و غارتگری کا ایک ہمہ گیر ہنگامہ بپا تھا۔ جب سرکاری قوتیں بھی ارادی یا غیر ارادی طور پر ہر قسم کی جرأتوں سے محروم ہوچکی تھیں۔ سڑکوں اور گلیوں میں دھڑا دھڑ انسانی لاشیں گر رہی تھیں۔ اور فائرنگ کا سلسلہ موسلا دھار بارش کی طرح جاری تھا۔ اس وقت کون تھا جو موت کے تصور سے بے نیاز بغیر کسی خوف کے گولیوں اور حملہ آوروں کے ہجوم میں کچھ انسانوں کو بچاتا اور بے شمار انسانی لاشوں کو سمیٹتا پھرتا تھا؟ کس کے دل کا اضطراب ایک طرف پنجاب سے آنے والے ہندوؤں اور سکھوں کے لئے وقف تھا۔ اور دوسری طرف دلی کے مظلوم مسلمانوں کی جانوں

مالوں اور عزت و ناموس کو بچانے کے لئے صرف ہو رہا تھا۔؟

اور اس کے بعد سے آزاد ہندوستان میں ہندوستان کے وقار، اس کے سکولرزم اور اس کے عدل و انصاف کی عظمت کو جس جس طرح برباد کیا جاتا رہا۔ اس کے خلاف سب سے زیادہ اور انتہائی جرأت و جوانمردی کے ساتھ کون آوازۂ حق بلند کرتا رہا؟ کس کی صدائیں ملک کے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں حق کی نمائندگی کرتی رہیں اور کس نے "اپنوں" کی قہرمانیوں کے مقابلہ میں ڈٹ کر سچائی اور صداقت کے تقاضوں کو کماحقہٗ پورا کیا؟ یہ تھے مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن خدا ان کی قبر کو اپنے انوار و برکات سے معمور فرمائے۔ اور ہندوستان میں اُن کے جذبۂ ایمانی کو عام کردے!

عوامی دوَر دہلی

ابھی مولانا حفظ الرحمٰن کے مرنے کے دن نہ تھے اور جو بھی اُن سے اُن کی زندگی کے ان آخری دنوں میں ملا تھا، جب کینسر جیسا مہلک مرض ان کے پھیپھڑوں کو کھائے جا رہا تھا، وہ محسوس کرتا تھا کہ جسمانی نقاہت اور ضعف کے باوجود مولانا کا ذہن اور اُن کی روح تابناک اور شفاف ہیں اور ان کی نرم مسکراہٹ اور میٹھی ہنسی کے پیچھے وہی آہنی ارادے اور سنگین عزم چھپے ہوئے ہیں، جن کا انھوں نے اس وقت اظہار کیا تھا جب وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں وطن کی آزادی کی لڑائی میں ایک نڈر، صاف دل اور جری سپاہی کی طرح بے محابا کود پڑے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن ہندوستان کے مسلمانوں کے ایک سیاسی اور سماجی رجحان کے بہترین ترجمان اور رہنما تھے۔ جس کے نزدیک ہندوستانی مسلمان ایک واحد ہندوستانی قومیت کا جزو لاینفک ہیں اور یہ کہ اُن کا وجود اور ان کی ہستی پوری ہندوستانی قوم کی آزادی، ملک میں جمہوریت انصاف اور رواداری کے فروغ اور جدید طریقوں پر ملک کی صنعتی معاشی ترقی کے ساتھ وابستہ اور پیوستہ ہے

اس طرح اگر ایک طرف برطانوی سامراج کی مخالفت اور دشمنی اور وطن کو بیرونی حکمرانوں سے آزاد کروانے کی لگن ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اور یہ جذبہ اور احساس اُن کو علماءِ ہند کی اس درخشاں روایات سے ورثہ میں ملا تھا جس نے انگریزی شہنشاہیت کی انیسویں صدی کے شروع سے ہی مجاہدانہ اور سرفروشانہ مخالفت کی تھی اور بار بار اپنا خون بہا کر وطن کی سرزمین میں آزادی کے بیج بوئے تھے، تو دوسری طرف مولانا مرحوم میں اس کی صلاحیت اور لیاقت بھی تھی کہ جب وطن کی تعمیر نو کا مسئلہ سامنے آئے تو وہ جدید جمہوری، سائنسی اور سوشلزم کے نظریوں کو ہمدردی کی نظر سے دیکھیں اور خود اسلام کی ابتدائی معاشی جمہوریت اور اس کے اخوت اور مساوات کے نظریات کی روشنی میں ان کا جواز ڈھونڈیں۔ اس تفتیش اور جستجو کی جھلک مولانا مرحوم کی مشہور کتاب "اسلام کا معاشی نظام" میں ملتی ہے اور اس بات میں کہ کانگریس کے ایک معزز رکن اور رہنما کی حیثیت سے انھوں نے جواہر لال نہرو کے پیش کئے ہوئے سوشلزم کے نظریئے اور نصب العین کو بطیب خاطر اور سمجھ بوجھ کر ایمانداری اور یقین کے ساتھ قبول کیا تھا؟

برخلاف اُن گندم نما جو فروش کانگریسیوں کے جن کے ہونٹوں پر سوشلزم کا نعرہ ہوتا ہے لیکن جو دن رات اس سرزمین پر سرمایہ داری کو قائم کرنے اور سرمایہ داری کی ہوا خواہی میں مشغول ہیں۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۴۸ء تک آزادی کی جدوجہد کے معرکوں میں میں مولانا مرحوم کے بہت قریب رہا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور یوپی کی کانگریس میں کانگریسی مسلمانوں کا جو بہت بڑا گروہ تھا مولانا اس کے ممتاز ترین افراد میں سے تھے، مولانا حسین احمد صاحب مدنی مولانا ابوالکلام آزاد، ہم پر شفقت اور عنایت کی نظر رکھتے تھے لیکن وہ ہم سے بہت اونچے تھے۔ رفیع احمد قدوائی مرحوم ہمارے قریب تھے لیکن کانگریس کی سیاسی بساط پر مہرے سنبھالنے اور اٹھانے اور وزارت کے کاموں میں پھنسے رہتے تھے۔ اس لئے اکثر اوقات کانگریس اور اس کی کمیٹیوں کے جلسوں میں سے مولانا حفظ الرحمٰن ڈاکٹر اشرف اور میں وقت نکال کر دنیا بھر کے مسائل، سیاست فلسفے، مذہب، مارکسزم پر بحثیں کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر اشرف میرے مقابلے میں مولانا سے بہت زیادہ قریب تھے دونوں ایک دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اور . . . ان دونوں میں بڑے پیار اور محبت کے ساتھ نوک جھونک ہوتی تھی۔ اشرف مولویوں کا مذاق اڑاتے تھے اور مولانا کمیونسٹوں پر پھبتیاں کستے تھے، اس لئے کہ دونوں ہستیاں مقرر تو تھی ہی گفتگو کا فن بھی خوب جانتے تھے۔ تب بہت ہی لطف آتا تھا۔ ایک مرتبہ شاید فیض پور میں کانگریس کا سشن تھا۔ کافی سردی تھی۔ اشرف اور میں مولانا کے کیمپ میں رات کو بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ چارپائیوں پر کمبل اوڑھے ہم تینوں بیٹھے تھے اور مولانا کوئی بہت ہی سنجیدہ بات کہہ رہے تھے۔ ہم دونوں سر جھکائے سن رہے تھے۔ کہ اشرف کسمسانے لگے انھوں نے اپنی گھڑی دیکھی اور بات کاٹ کر بولے "اٹھو بھئی حفظ الرحمٰن تمہارا وقت ہو گیا"! مولانا چپ ہو گئے اور تعجب سے اشرف کی طرف دیکھنے لگے "وقت ہو گیا کس چیز کا ہو گیا؟ مجھے تو اب کہیں نہیں جانا ہے۔" انھوں نے کہا اشرف کے لہجے میں تندی تو تھی ہی بہت سنجیدہ ہو کر "لوٹا سنبھالو، وضو کرو، عشا کا وقت ہو گیا اور کس کا؟ اب ہم کمیونسٹ تم کو یہ بھی یاد دلائیں؟ مولانا بے ساختہ ہنس پڑے۔ کمبل الگ پھینک

کر اٹھ کھڑے ہوئے اشرف کو گلے سے لگالیا اور بولے "اللہ تمہیں راہ راست پر لائے اشرف!

مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی ایک بے مثال زندگی ہے۔ اس کا ایک ایک نقش ایسا ہے جسے یاد رکھنا چاہیئے اور جس سے سبق لینا چاہیئے۔

انھوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد اور اپنی قوم کے مظلوم ترین انسانوں کی خدمت کے لئے لگادیا۔ وہ سب کے مددگار تھے۔ صرف ظالموں کے مخالف تھے۔ ان کے وعظ، پند نصائح سے زیادہ اُن کا اعلا کردار، مظلوم کی پکار پر ہمیشہ لبیک کہہ کر اس کی مدد کے لئے کمربستہ ہوجانے کی اُن کی ریت، انکسار، ایثار نفس، علم و تقدس اور تقوی کے باوجود ان کی انکساری اور اُن کی گہری انسانیت ایسی چیزیں ہیں جو ہم کو اُن کے بدنصیب پسماندگان اور ان کی ساری قوم کو بہتر ہندستانی اور بہتر انسان بننے کی دعوت دیتے رہیں گے۔

سجاد ظہیر　　۶ راگست ۱۹۶۲ء

دہ روزہ "جمہور" علیگڈھ

مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن کی وفات ملک وملت کے لئے ایک ایسا عظیم حادثہ ہے جس کی تلافی طویل زمانے تک محال نظر آتی ہے وہ دل و دماغ کے بہت سے اوصاف کے حامل اور بہت سی خوبیوں کے جامع تھے۔ انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی تھی اور اسی وقت سے ملک وملت کے مسائل میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ تحریک خلافت اور عدم تعاون میں انھوں نے اپنی نوجوانی ہی میں پورے جوش اور انہماک سے حصہ لیا اور بار بار قید و بند کے مصائب برداشت کئے۔ جمعیۃ العلماء (ہند) سے ان کا تعلق بہت قدیم تھا۔ وہ ۱۹۴۲ء سے اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس کے ناظم اعلیٰ رہے اور ادھر کئی سال سے تو گویا اس کے روح رواں اور اس کا سب سے مضبوط اور سب سے اہم ستون تھے۔ کانگریس میں بھی ان کا مقام بہت اونچا تھا۔ وہ مسلسل ۱۶ سال سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن اور ۱۰ سال سے اس کے ٹکٹ پر لوک سبھا کے ممبر تھے۔ کافی عرصہ تک یوپی کانگریس کے نائب صدر، یوپی اسمبلی کے ممبر اور دستور ساز اسمبلی کے رکن رہے تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فرقہ پرستی کے بہت بڑے دشمن اور قومی ایکتا اور یک جہتی کے بہت بڑے مبلغ تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء سے پہلے مسلم فرقہ پرستی اور ۱۹۴۷ء کے بعد ہندو فرقہ پرستی کا مقابلہ جس بے جگری، پامردی اور ہمت و استقلال سے کیا وہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ بات تاریخ کے صفحات میں محفوظ رہنی چاہیئے۔ کہ تجویز تقسیم پیش ہوئی تو جو دو آوازیں اس کی مخالفت میں سب سے زیادہ بلند آہنگی سے اٹھیں وہ مولانا حفظ الرحمٰن اور شری پرشوتم داس ٹنڈن کی آوازیں تھیں لیکن فرق یہ تھا کہ جب ملک کی تقسیم عمل میں آگئی تو ٹنڈن جی اس راستے پر چل کھڑے ہوئے جو مسلم لیگ کا منشا اور موقف تھا اور مولانا حفظ الرحمٰن نے اپنا ذہنی توازن قائم رکھا اور وہی کیا جو ایک سچے دیش بھگت کو کرنا چاہئے تھا۔ ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ جنون کے دور میں دہلی میں مہاتما گاندھی کو جن چند لوگوں سے اپنے کام میں مدد ملی ان میں مولانا حفظ الرحمٰن کا نام نامی پیش پیش تھا اس کے بعد بھی قوم پروری کے ہر محاذ پر مولانا نے فرقہ پرستی کے خلاف زبردست مورچہ لگایا۔ اور اس پر پوری ہمت اور مردانگی سے جمے رہے۔ چاہے فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ ہو چاہے مساجد و مقابر کی واگزاشت کا، خواہ نکاسی جائداد کے معاملات ہوں، خواہ لسانی، ثقافتی اور تعلیمی بدعنوانیوں کے الجھاوے، ان کے ناخن تدبیر نے ہر گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی اور کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی کامیابیاں ناکامیوں پر حاوی نہیں رہیں؟

مولانا حفظ الرحمٰن کی سیاسی حیثیت ان کی دوسری حیثیتوں پر حاوی ہوگئی تھی، ورنہ وہ ایک فاضل مصنف ایک زبردست مقرر اور ایک جید عالم بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں اسلام کا اقتصادی نظام، "سیرت" اور قصص القرآن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ جن کی وجہ سے وہ علمی حلقوں میں بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سیرت پاک پر ان کی عالمانہ تقریریں بے نظیر ہوتی تھیں اور اگر ان کا کوئی مجموعہ تیار ہوسکتا تو وہ اس صنف ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہوتا۔ مسلمانوں کے تعلیمی مسائل میں انھیں گہری دلچسپی تھی اور اس معاملے میں وہ قدیم و جدید کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ علاوہ اور تعلیمی اداروں کے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے ان کا تعلق بہت قریبی اور گہرا تھا۔ وہ اس کے کورٹ اور اگزیکٹیو کونسل کے رکن اور ادارہ علوم اسلامیہ کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے۔ یونیورسٹی کے علمی اور انتظامی حلقوں میں ان کی رائے کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔ اور اُسے بہت اہمیت دی جاتی تھی بعض نازک مرحلوں پر انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی بڑی قابل قدر خدمت نہایت خاموشی اور متانت سے انجام دی۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی سب سے اہم خصوصیات ان کی جرأت وحق گوئی، بے تعصبی رواداری خلوص و جذبۂ خدمت اور ایثار و بے نفسی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک و قوم کے ہر طبقے نے ان کی موت کا اس قدر ماتم کیا ہے اور انھیں ملتے

شاندار الفاظ میں خراج عقیدت ادا کیا ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق سب سے اعلیٰ جہاد سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے کلمۂ حق کہنے میں نہ کبھی غیر ملکی استبداد کی پرواہ کی، نہ اپنے ہم مذہبوں کے فرقہ وارانہ تعصب کی اور نہ برادران وطن کی تنگ نظر اور بے راہ روی کی، اس لحاظ سے وہ بلاشبہ "مجاہد ملت" تھے۔ اللہ تعالیٰ انھیں ان کے حسنات کا زیادہ سے زیادہ اجر عطا فرمائے اور درجات بلند کرے۔

مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ

صد افسوس حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ایم پی نے ۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو صبح ۳ بجے اپنی رہائش گاہ کیننگ لین نمبر ا نیو دہلی میں طویل علالت کے بعد انتقال فرمایا۔ تکفین کے بعد صبح ۸ بجے مرحوم کی میت کو مکان کے ایک کھلے کمرہ میں رکھ دیا گیا تھا جہاں شام تک کم و بیش ایک لاکھ مسلم و غیر مسلم عوام و خواص نے آپ کا آخری دیدار کیا۔ ان میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو مرکزی وزیر داخلہ مسٹر لال بہادر شاستری وزیر خزانہ مسٹر مرارجی ڈیسائی، حافظ محمد ابراہیم صاحب جنرل شاہنواز صاحب اور دیگر معزز ارکان کابینہ کے علاوہ ممبران پارلیمنٹ سفراء ممالک مقیم دہلی نیز ہندوستان کی وہ مشہور ہستیاں بھی شامل ہیں جو مرحوم کی خبر وفات سن کر بروقت دہلی پہونچ گئیں تھیں۔

شام کو ۵ بجے مکان سے مرحوم کا جنازہ روانہ ہوا جو دہلی کی مختلف شاہراہوں سے گزرتا ہوا فیروز شاہ کوٹلا گراؤنڈ ہجوم غفیر کے ساتھ پہونچا۔ ساڑھے چھ بجے شام دار العلوم دیوبند کے مہتمم مولانا قاری محمد طیب صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبل مغرب آپ کو درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی مرحوم کے احاطہ (بیرون دہلی دروازہ) میں سپرد خاک کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

۲ر اگست کی صبح ہی کو مولانا کے انتقال پر ملال کی خبر علی گڑھ اور تمام یونیورسٹی میں مشہور ہوگئی۔ کرنل بشیر حسین زیدی صاحب وائس چانسلر نے اسی وقت ایک تعزیتی پیغام جاری کیا۔ یونیورسٹی میں عام تعطیل کا اعلان کیا۔ اور بغرض آخری دیدار و شرکت نماز جنازہ آپ فوراً بذریعہ کار دہلی روانہ ہوگئے۔

مرحوم کا یونیورسٹی سے دیرینہ اور خصوصی تعلق ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی ایریا میں مرحوم کا انتہائی افسوس کے ساتھ غم منایا گیا۔ مختلف شعبہ جات میں تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔ بعض مساجد میں جماعت کے ساتھ غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی! اور تمام یونیورسٹی کھیل کود اور تفریحی پروگرام بند رہے۔ ۳ر اگست کو ۵ بجے شام مقامی ممبران کورٹ وا گزیکیٹو کونسل اسٹاف اور طلباء یونیورسٹی کی جانب سے ایک تعزیتی جلسہ زیر صدارت جناب سعید الملک نواب صاحب چھتاری پرو چانسلر منعقد ہوا جس میں مقامی ممبران کورٹ وائس چانسلر پرو وائس چانسلر آنریری ٹریزرر رجسٹرار ممبران اسٹاف اور طلباء یونیورسٹی نے کثرت سے شرکت فرمائی۔

جلسہ میں پہلے مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنس یونین کے آنریری سکریٹری مسٹر بصیر احمد نے مولانا مرحوم کی دیرینہ قومی ملکی اور سیاسی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے وفات پر غم و افسوس کا اظہار کیا۔ آپ کے بعد جناب عبد المجید خواجہ صاحب بیرسٹر نے مرحوم کی ان خصوصی خدمات کا افسوس کے ساتھ ذکر کیا جن پر آج ملک و قوم فخر محسوس کر رہا ہے بعدہٗ جناب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب وائس چانسلر نے مرحوم کی دیرینہ وابستگی اور تعلقات و انہماک کا احترام کیا تھا اعتراف کرتے ہوئے مندرجہ ذیل تعزیتی تجویز پیش کی جو بالاتفاق دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر پاس کی گئی۔

"مسلم یونیورسٹی کے طلباء۔ اساتذہ ممبران کورٹ اور عملہ کارکنان کا یہ جلسہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات پر انتہائی غم و الم اور ان کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ مولانا جنگ آزادی کے عظیم مجاہد۔ روشن خیال عالم اور بلند پایہ خطیب تھے۔ انھوں نے جنگ آزادی کے راستہ میں قید و بند کی ہر تکلیف کو بے نیازی کے ساتھ برداشت ہی نہیں کیا بلکہ انھیں جرأت اور پامردی کے ساتھ دعوت بھی دی۔ وہ بجنور کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو علم و فضل میں ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ خلافت اور کانگریس کی تحریک کے سلسلہ میں مولانا کی قربانیاں اتر پردیش اور ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہیں۔ وہ ہندوستانی قومیت کے زبردست حامی تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد انہوں نے جس طرح ہندوستانی قومیت اور جمہوریت کے تصور کو اس ملک میں قائم کرنے کی جدوجہد کی وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔ ۱۹۲۳ء سے لیکر آخری لمحوں تک مولانا نے ان مقاصد کے لئے صحیح معنوں میں جہاد جاری رکھا۔ مولانا کی علمی خدمات نہایت گراں قدر ہیں۔ علمی اداروں کی خدمات اور اساتذہ کی بہبودی کے لئے انہوں نے اپنی ذات سے جو کچھ کیا وہ انجمن اور جماعت نہ کر سکتی۔ وہ ایک بڑے روشن خیال بزرگ تھے جس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے دیوبند کے تصور کو علی گڑھ پر اور علی گڑھ کے تصور کو دیوبند پر کبھی مسلط نہیں کیا وہ جہاں پرانے علوم کا احترام کرتے تھے وہاں مغربی علوم کی ضرورت اور اہمیت کے معترف اور ان کے ماہرین کے سچے قدر داں تھے۔ ان کی رواداری اور وسیع النظری میں چھوٹے بڑے کا سوال نہیں تھا۔ وہ امیر اور غریب عالم اور جاہل سب کے غم خوار

تھے۔ البتہ وہ ہر قسم کی غلامی اور ہر قسم کے استبداد کے دشمن تھے۔ اور ان کے خلاف جہاد کرنے میں اپنی جان و مال کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔

مولانا مسلم یونیورسٹی کے ساتھ کئی حیثیتوں سے وابستہ تھے وہ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر اور ایگزیکیٹو کونسل کے رکن تھے۔ انہوں نے اس ادارہ کی زبردست خدمات انجام دیں۔ مولانا کی وفات ہندوستان کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اور علمی ادبی اور سیاسی جماعتوں کے لئے ایک عظیم سانحہ ہے۔

خدائے عز وجل سے دعا ہے کہ وہ حضرت مولانا کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کے پس ماندگان اور اقربا کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نیا سنسار مراد آباد

یہ خبر بڑے رنج سے سنی ہے کہ ضلع مراد آباد کے ممبر پارلیمنٹ، قوم پرست رہنما اور جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وفات پاگئے ہیں۔ ان کے پھیپھڑوں میں سرطان تھا کافی وقت سے بستر علالت پر تھے۔ اسی وجہ سے امروہہ سے چناؤ میں بھی بذات خود حاضر نہ تھے۔ آپ کی عدم حاضری ہی میں چناؤ لڑا گیا۔ جس میں آپ کامیاب ہوئے۔ آپ علاج کرانے کے لئے امریکہ چلے گئے تھے۔ وہاں جو کچھ کیا جاسکتا تھا کیا گیا مگر مولانا کے دن پورے ہوگئے تھے اس لئے یہ علاج کارگر نہ ہوا۔ اس سے جمعیۃ علماء کو تو نقصان پہونچے گا ہی قوم پرست مسلمانوں میں بھی ایک ایسا خلاء پیدا ہوگیا ہے جو شاید ہی پر ہوسکے۔

مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کی وفات کے بعد جمعیۃ علماء کو چلانے کی ذمہ داری مولانا حفظ الرحمٰن کے کندھوں پر آن پڑی تھی اور انہوں نے اسے کمال خوبی سے نبھایا۔

یہ ایک رنجدہ یاد ہے کہ جب مولانا امروہہ ضلع مراد آباد کے حلقہ سے لوک سبھا کے حلقہ سے کھڑے ہوئے تو ان کے مقابلہ پر ان کا ایک مسلمان حاسد حریف کھڑا ہوگیا اور اسے منھ کی کھانی پڑی۔ امروہہ کے ہندو مولانا کے ساتھ تھے۔ اس حریف نے مسلمانوں کو بھڑکا کر ان کے ووٹ بانٹنے چاہے مگر بُری طرح ناکام رہا۔

مولانا ایک بے باک قوم پرست لیڈر تھے ان کے شاندار کارنامے مسلمانوں کے لئے شمع مشعل راہ ہیں۔ وہ ان مدبر مسلم سیاست دانوں میں تھے جنہوں نے گاندھی جی کی قیادت میں لڑی جانے والی آزادی کی تمام جنگوں میں پورا پورا حصہ لیا۔ اور بار بار جیل گئے۔

مولانا اپنے خیالات کے بڑے پکے تھے اور ہندو مسلم اتحاد اور ملک کی آزادی کے لئے انہوں نے بڑی قربانیاں دیں۔ اور ملک کو ان حالات سے بچانے کی زبردست کوشش کی، جو ملک کی تقسیم کا سبب ہوئے تھے۔ مولانا نے اس زمانہ میں جناح صاحب کی پالیسی کی مخالفت کی جب مسلمانوں میں جناح صاحب کی آواز زیادہ سنی جاتی تھی۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ پانچ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک رہے اور ان پریشانیوں کو جو اس زمانہ میں مسلمانوں کو لاحق ہوگئی تھیں انہوں نے رفع کرنے کی کوشش کی۔ وہ اُردو کے پریمی تھے اور انہوں نے اُردو کی تعلیم کے سلسلہ میں مسلمانوں کی شکایت دور کرنے میں جد وجہد کی۔ کبھی کبھی مولانا ایسے انداز میں بات کرتے تھے جو ملک کی فضا کے موافق نہیں معلوم ہوتی تھی مگر وہ اپنے خیالات کو بیباکی سے پیش کرتے اور ملک میں اتحاد و اتفاق کی روح کو زندہ کرنے کا مقصد ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے۔

ادارہ نیا سنسار اپنے مہربان مولانا کے انتقال پر نہایت ہی رنج و غم کا اظہار کرکے خداوند تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ساتھ ہی پانچ کروڑ مسلمان بھائی ان کی تقلید کرکے ان کے قوم پرست مشن کو کامیاب بنائیں۔

قومی دنیا دہلی

وقتیکہ تو زادی ہمہ خنداں بودند تو گریاں!
چناں بزی کہ وقت مردن تو ہمہ گریاں تو خنداں

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی زندگی اس مقولہ کی تفسیر تھی ۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو جب ان کے سفر آخرت اور دائمی جدائی کی خبر ریڈیو اور اخبارات کے ذریعہ نشر ہوئی تو کونسی آنکھ تھی جس میں آنسو نہ ہوں اور کونسی چشم تھی جو گریاں نہ ہو۔ کون ایسا ذی روح تھا جس کے دل کو دھکا نہ لگا ہو اور کون ایسا شخص تھا جس کے لب پر بے ساختہ آہ و افسوس کے کلمات نہ ہوں۔ دنیا ادھر مولانا کی دائمی جدائی پر رو رہی تھی۔ اور ادھر مجاہد ملت کفن میں خاموش پڑے تھے۔ اور ابدی نیند سو رہے تھے۔ چہرہ پر نور تھا لبوں پر مسکراہٹ تھی جو کسی عظیم امتحان میں کامیابی پر اور کسی سخت آزمائش میں پورا اترنے پر پیدا ہوتی ہے۔

مجاہد ملت ہر امتحان میں پورے اترے اس میں مطلق شبہ نہیں۔ ان کی زندگی جو سیوہارہ کے قصبہ سے شروع ہوکر دلی میں ختم ہوئی ہندوستان کی اس صدی

کی تاریخ ہے۔ سیوہارہ، دیوبند اور ڈابھیل کی علمی اور تعلیمی زندگی۔ تحریک آزادی میں بے خوف و خطر کود پڑنا۔ مدارس امروہہ تک کا سینہ گرہ قید و بند کی صعوبتیں مسلم فرقہ پرستی کے خلاف ان تھک جد و جہد۔ پھر آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرستی کا مقابلہ۔ اس سیلاب کے مقابلہ پر چٹان کی طرح ڈٹے رہنا اس کے ساتھ مسلمانوں کو گمشدہ فضا میں بحال کرنے کی کامیاب جد و جہد ان کی کتاب زندگی کے چند باب ہیں، مجاہد ملت کے کارنامے اتنے ہیں کہ صفحات میں ان کی شمار ممکن نہیں۔ مولانا مرحوم نے ہندوستان کی تاریخ پر جو گہرا اثر ڈالا ہے اس کی تفصیل بھی یہاں ان چند صفحات میں ممکن نہیں لیکن بلا خوف تردید اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل کو جتنا انھوں نے متاثر کیا کوئی اور شاید نہیں کر سکتا۔

کم و بیش ۴۲ سال تک مجاہدانہ زندگی گذارنے اور علم و عمل کی دنیا میں سر بلندی حاصل کرنے کے بعد مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے ۲ اگست کو ۳ بجے قبل فجر ابدی اور دائمی راحت حاصل کر لی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

موت العالم موت العالم کے مصداق جیسے ہی اس المناک حادثہ کی اطلاع راجدھانی کے کوچہ و بازار میں پھیلی، رنج و غم کی گھٹائیں چھا گئیں۔ دکانیں بند ہونے لگیں اسکول اور دوسرے تعلیمی اداروں میں تعطیل کر دی گئی۔ حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز جہاد ہی سے کیا تھا اور وہ آخر دم تک ہمیشہ جہاد ہی میں مصروف رہے۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ کہ ایک نوخیز اور نوجوان رضاکار کی حیثیت سے مردانہ وار تحریکات میں شریک ہو گئے، اور تمام مصائب برداشت کرتے

رہے جو کہ برطانوی دور وحشت میں بڑے بڑے لیڈروں نے برداشت کیں آپ نے علوم دین کی تکمیل دیوبند میں کی۔ اسی کے ساتھ ساتھ عملی جہاد بھی جاری رکھا دارالعلوم سے فارغ ہوئے تو جس طرح علم میں فاضل و کامل تھے۔ ......

..... اسی طرح عمل کے لحاظ سے بھی آپ نے جلد ہی ہندوستان کی سیاست سیاسی رہنماؤں اور سربراہوں میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا اور ہندوستان و ملت اسلامیہ کے صحیح معنوں میں رہنما ہو گئے۔ جمعیۃ علما ہند کی مجلس عاملہ میں کوئی رکن اس قدر کم سن نہ ہوگا۔ اور عجیب بات یہ ہوئی کہ اس کم سنی کے ساتھ جمعیۃ علما کے اکابر کے مشیر رہتے تھے۔ اور اکابر آپ کے مشوروں پر عمل کرتے تھے، جہاد آزادی کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ اور اب اس کے مقصد کے ظہور کا وقت آیا جس کے لئے جہاد کیا گیا تھا یہ وقت جو بہت مبارک ہونا چاہیے تھا ایک قیامت خیز دور ثابت ہوا۔ اس کی ہولناکی اس درجہ بڑھی کہ بڑے بڑے بہادروں کے قدم ڈگمگا گئے،

اور وہ سوچنے لگے کہ ہندوستان میں رہیں یا ترک وطن کریں، اس وقت بہت سے حضرات ثابت قدم رہے لیکن وہ شخص جس نے ثابت قدم رہنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے باعزت رہنے کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا، وہ مولانا حفظ الرحمٰن تھے جن کو آج ہم رحمۃ اللہ علیہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب آزادی کے بعد ہی سے پارلیمنٹ کے ممبر رہتے چلے آ رہے تھے۔ ایک عرصہ تک آپ یوپی کانگریس کمیٹی کے صدر رہے۔ قومی دنیا مجاہد ملت کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور ان کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کرتا ہے۔

ہفتہ روزہ للکار دہلی

اس ہفتہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا انتقال ہو گیا وہ کینسر کے منحوس مرض کا شکار تھے۔ بدقسمتی سے اس وقت کینسر کا کوئی علاج موجود نہیں ہے چنانچہ مولانا بھی اس مرض سے نہ بچ سکے۔ مولانا مسلمانوں کے مقبول لیڈر تو تھے ہی لیکن وہ ہندو اور سکھوں میں بھی مقبول شخصیت کے مالک تھے ساری زندگی قوم پرست رہے کوئی مصلحت اور کوئی لالچ اُن کو خرید نہ سکا۔ اور کسی دھمکی سے وہ مرعوب نہ ہو سکے۔ انہوں نے ساری زندگی مخالفتوں کا مقابلہ کیا اور مخالفین کا مقابلہ کرتے رہے۔ اُن کی خدمات اور قربانیوں کا سب سے زیادہ شاندار زمانہ وہ ہے جب ۱۹۴۷ء میں وہ مہاتما گاندھی کے ساتھ ان کی سرکردگی میں دورہ کرتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے دلیری اور جرأت کے ساتھ فساد زدہ علاقہ میں امن اور سچائی کا پیغام پہونچایا اور عوام کی خدمات کیں۔ مذہب

سے بالاتر ہو کر انہوں نے سیکولر تحریک کو فروغ دیا۔ اور اس کے لئے قربانیاں دیں انھوں نے بہت کم عمری کے زمانہ میں تحریک آزادی کی جد و جہد میں حصہ لیا، کانگریس کے ساتھ رہے تو ان کو دو مکھی جنگ لڑنی پڑی۔ ایک طرف انگریزوں سے مقابلہ تھا اور دوسری طرف مسلم لیگ کی فرقہ پرست پالیسی سے ٹکر لی ان کو بدنام کرنے کی سازشیں کی گئیں لیکن وہ اپنے ارادہ اور عزم میں ایک مضبوط چٹان کی طرح قائم رہے

وہ ۱۹۴۲ء میں جمعیۃ علما کے جنرل سکریٹری چنے گئے تھے اور مرتے دم تک وہ اس عہدے پر قائم رہے۔ درحقیقت ان کی موت سے دیش اور اس کی ایکتا کا کام کرنے والوں میں ایک اہم جگہ خالی ہو گئی ہے اب اس جگہ کو پُر کرنا مشکل ہے۔

پندرہ روزہ ہمدرد دہلی

انسانی زندگی میں موت ایک ایسا فطری عمل ہے جسے ہر شخص صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر لینے کا عادی ہو چکا ہے۔ وہ اپنے قریب ترین عزیز کے انتقال پر بھی اسے دھیرے دھیرے بھلا کر تسکین حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ تلاش کر لیتا ہے لیکن اس دنیائے فانی سے مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی رحلت تو ملک و قوم کے لئے ایک ایسا صدمۂ عظیم ہے جو عرصۂ دراز تک لوگوں کے ذہن سے محو نہیں ہو سکے گا۔ اور سب کی نگاہیں اپنے اس مذہبی اور سیاسی رہنما کو بار بار تلاش کریں گی جس نے کبھی کسی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکایا اور جو اپنی زندگی کے آخری لمحات میں بھی قوم کی خدمت کرتا رہا اور موت کا مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا۔

کس کا دل ہے جو خاموشی سے قوم کے ایک ایسے محسن کی جدائی برداشت کر لیگا جس نے اپنی زندگی میں دوست اور دشمن سبھی کی یکساں رہنمائی کی، جو سب کو اپنا اور اپنے کو سب کا سمجھتا تھا۔ یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا کہ مولانا مرحوم اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ قوم کے درد سے بے چین ہو کر چند روز کے لئے دہلی سے کہیں باہر گئے ہوں اور عنقریب واپس آ جائیں گے کیونکہ ان کا یہ معمول تھا، آرام کو وہ واقعی حرام سمجھتے تھے، ملک کے کسی بھی گوشہ سے کسی وقت بھی بلاوا آئے۔ مرحوم ہر حال میں سفر کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ آج کون نہیں جانتا کہ مجاہد ملت کی وفات کا ایک سبب ان کا یہی جذبہ تھا۔ اگر وہ عام لیڈروں کی طرح اپنے معالجوں کے مشورہ پر مرض کے شروع میں تھوڑی احتیاط سے بھی کام لیتے تو ممکن تھا کہ وہ ابھی اور جیتے، لیکن وہ تو حقیقی معنوں میں مجاہد تھے۔ وہ بیماری کو آرام کرنے کا عذر بنانے کو انسان کی سب سے بڑی کمزوری سمجھتے تھے۔ وہ زندگی کے قدیم اور جدید نظریات کا ایک دلکش امتزاج تھے، ان کی فکر میں اتنی گہرائی اور نظر میں ایسی وسعت تھی کہ وہ ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کو اپنا ہم خیال معلوم ہوتی تھی۔

ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے تو مولانا مرحوم کا ایک خاص تعلق تھا ہمدرد وقف کی مجلس اعزاز میں وہ نہ صرف ایک رکن کی حیثیت سے شامل تھے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم اس وقف کے سچے ہمدرد اور سرپرست تھے وہ ہمارے لئے بہت کچھ تھے۔ وہ تو بے شبہ سب کے لئے تھے اور سب کو انھیں اپنا سمجھنے کا فخر حاصل تھا۔ ان کی رحلت سے ملک کے کروڑوں انسان ایک ایسے سرپرست سے محروم ہو گئے ہیں جو اپنے یا اپنے گھر والوں کے لئے بلکہ دوسروں اور صرف دوسروں کے لئے زندہ تھا۔

خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کے درجات وہاں بھی بلند فرمائے اور ان کی بیگم اور صاحبزادہ اور صاحبزادیوں کو صبر عطا فرمائے اور سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے، (آمین)

نوائے ہند امروہہ پندرہ روزہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ناوقت موت نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ بحالات موجودہ پورے ملک کے لئے ایک بڑے المیہ کی حیثیت رکھتی ہے یوں تو موصوف کی وہ سیاسی اور علمی خدمات بھی کچھ کم نہیں جو آزادی ہند سے قبل موصوف نے انجام دیں، بلند پایہ تصانیف اور جنگ آزادی کا مجاہدانہ کردار بجائے خود ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن آزادی کے بعد مرحوم نے انتہائی صبر آزما اور ہمت شکن حالات میں اپنی اصابت رائے، استقلال مزاج جوش کار اور حب الوطنی کا جو شاندار مظاہرہ کیا اس نے ان کی شخصیت کو کم از کم مسلم رہنماؤں کی صف میں ضرور منفرد بنا دیا تھا، موصوف کی وطن دوستی اگرچہ ایک امر مسلم تھی، لیکن تقسیم کے بعد چونکہ وہ طبقہ جس سے خود مرحوم متعلق تھے انتہائی نازک حالات سے دوچار تھا، اس لئے موصوف نے اپنی زندگی کا بنیادی مقصد ہی مظلوم اقلیت کا تحفظ قرار دیدیا تھا اور اس راہ میں کوئی مخالفت کوئی تنقید، کوئی اندیشہ ان کا راستہ نہ روک سکا۔ وہ جو کچھ اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے اس پر عمل کرنے سے کبھی نہ جھجکتے تھے، اکثر انتہائی پر خطر حالات میں مرحوم نے سر ہتھیلی پر رکھ کر اصلاح حال کی کوشش کی۔ واقعہ یہ ہے کہ فسادات کے مواقع پر جب اسمبلی اور پارلیمنٹ کے مسلم ممبران تحفظاتی تدابیر کا انتظام تو درکنار زبانی ہمدردی کی جرأت بھی نہ دکھلا سکے اکیلے مولانا موصوف تھے جو سربکف آگ اور خون کی بارش میں کود پڑتے تھے اور کم از کم جتنا ان کے بس میں تھا اتنا کر گزرتے تھے اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد کو ان سے ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ وہ ایک پختہ کار کانگریسی ہونے کی بنا پر انتہائی برے حالات میں بھی مسلمانوں کی دلجوئی کرنے اور مقامی طور پر فسادات کو فرد کرنے کی تدبیر تو کرتے ہیں لیکن اعلیٰ سطح پر مسلمانوں کی اجتماعی ناراضگی کے اظہار احتجاج اور اہل اقتدار پر سیاسی دباؤ ڈالنے کی جرأت نہیں کرتے لیکن اگر اس دلیل میں کچھ وزن بھی ہو تب بھی مولانا کی نیت میں شک نہیں کیا جا سکتا ان کے نزدیک جو صحیح ترین طریق کار تھا وہ انہوں نے بلا خوف لومۃ لائم اختیار کیا اور کردار کی یہی مضبوطی تھی جس نے ان کی شخصیت کو اتنا بلند

اور ارفع بنایا موصوف کا طریق کار ایک خاص سنجیدگی کا حامل تھا۔ وہ حالات کی نامساعدت سے مشتعل ہوکر غیر متوازن طریق کار اختیار نہ کرتے تھے اور حالات کی ناخوشگواری کو ہنگامی اور وقتی خیال کرتے تھے مستقبل کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر امید پسندانہ تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ انتقام و اشتعال کی پالیسی ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں ایک ایسا سنگِ گراں بن سکتی ہے جس کا ہٹنا شاید دیر تک ممکن نہ ہو۔ اس لئے اکثر دل ہلا دینے والے حادثات پر بھی وہ ایک ذمہ دار قائد کی طرح توازنِ دماغ برقرار رکھتے تھے تقسیم کے بعد اتنے لاتعداد مسائل ان کے سامنے تھے کہ وہ اُن کا احصار تہ کر پاتے تھے ہر وقت پا در رکاب رہتے تھے۔ اور بڑھاپے میں یہ حد سے بڑھی ہوئی محنت ہی اُن کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی۔ بدقسمتی سے مرض اس حد تک ترقی کر گیا کہ امریکی معالجین کی آخری تدابیر بھی ان کی جان لیوا ہی ثابت ہوئیں۔ مشیت کا فیصلہ بہر حال اٹل ہے۔

آج مولانا ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کا مسلک اُن کا طرزِ فکر اُن کا اندازِ کار اور اُن کا مطمحِ نظر ہمارے سامنے ہے۔ دلوں میں اخلاص حوصلہ مندی اور جرأت کا دم ہو تو ہر شخص حفظ الرحمٰن بننے کی کوشش کر سکتا ہے کام بھی بہت ہے۔ اور کام کرنے کی راہیں بھی متعین ہیں، سب سے بڑا خراجِ عقیدت جو اُن کی قیمتی خدمات کے لئے پیش کیا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ لوگ مرحوم کی بلند پایہ روایات کو اپنے لئے شمع راہ بنائیں۔ ادارۂ نوائے ہند مرحوم کی پسماندگان اور جمعیۃ علماء ہند کے تمام وابستگان کے ساتھ اس صدمہ میں شریک ہے۔ اور بارگاہِ رب العزت میں دست بدعا ہے کہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

پندرہ روزہ مسیحا بمبئی

جنگ آزادی کا ایک بہادر نڈر سپاہی ملک و ملت کی بے بہا خدمات انجام دیتے ہوئے بالآخر ۲ اگست کی ۳ بجے صبح کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی موت کا سبب کینسر یا اسی طرح کی بیماری بتایا جاتا ہے لیکن جو لوگ مولانا سے قریب سے واقف ہیں وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آزادی کے بعد اہلِ وطن کا جو طرزِ عمل رہا وہ ان کے سینہ میں ناسور بن کر رستا رہا۔

ملک کی جس آزادی کے لئے انھوں نے ہر قسم کی تکلیفیں اٹھائی تھیں اس کے حاصل ہونے کے بعد ملک پر جو قیامت ٹوٹی اور خاص کر انھیں کی دلی میں ان کی آنکھوں کے سامنے جس درندگی اور سفاکیت کا مظاہرہ کیا گیا وہ انھیں زندگی بھر خون کے آنسو رلاتا رہا۔

اس طرح کے موضوع پر جب کبھی بھی مولانا سے گفتگو کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے ہمیشہ ایک آہ سرد کھینچی اور یہ آہ ان کے دل کے ایک گہرے گھاؤ کی برابر غمازی کرتی رہی۔"

طب کے سلسلے میں جو مسلسل ناانصافیاں برتی جا رہی ہیں۔ میں نے مولانا کی توجہ کئی بار منعطف کرائی ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا کہ ملک کی اس بدقسمتی کو کیا کہئے کہ حکیم اجمل خاں مرحوم سے جو لوگ بہت قریب رہے ہیں اور ان کے مشن سے بڑی حد تک واقف ہیں۔ وہ لوگ بھی طب دشمنی میں آج پیش پیش ہیں۔ ناواقفوں کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ غصہ و انتقام سے بدحواس ہو کر اپنا دماغی توازن کھو چکے ہوں ان کو کون سمجھا سکتا ہے۔؟

آخری مرتبہ علاج کے سلسلہ میں جب وہ بمبئی تشریف لے آئے اور ٹاٹا میموریل ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ تو ایک دن دوران گفتگو فرمانے لگے، نہ مایوس ہونے کی ضرورت ہے اور نہ بددل ہونے کی اپنی تنظیم کو اور مضبوط کیجئے۔ اور پوری تندہی کے ساتھ اپنی جد و جہد کو جاری رکھئے انشاء اللّٰہ ایک نہ ایک دن ضرور کامیابی ہوگی اس کو یقین رکھئے کہ غلط جذبات کے تحت آج طب کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے لیکن اس کی خوبیوں کی وجہ سے اس کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ اطباء عوام کو ساتھ لے کر اگر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں تو مستقبل سے ناامید ہونے کی ضرورت نہیں۔ مسیحا کے اجراء کے وقت بھی اسی طرح کا ایک پر امید بیان مولانا نے دہلی سے بھیجا تھا۔

آج مولانا ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن انھوں نے اخلاص و ایثار سے بھرپور جو مثالی زندگی ہمارے سامنے رکھی ہے اس سے آج بھی ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں"

اللّٰہ تعالےٰ انھیں اپنی خوشنودی کی جنت نصیب فرمائے اور ملک و ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ (آمین)

ہمدرد صحت دہلی

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن کی وفات نہ صرف قوم اور ملک کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے بلکہ ادارہ ہمدرد کے لئے بھی ایک ایسا اندوہناک واقعہ ہے جسے نہ صرف برسوں تک بلکہ شاید آنے والی نسلوں تک نہ بھلایا جا سکے

مولانا مرحوم ایک متبحر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ وطن کے بے لوث خادم اور تمام ہندو مسلمانوں کے مخلص رہنما اور سچے بہی خواہ تھے اور اس حیثیت سے نہ صرف ملک کی اجتماعی خدمت کرتے رہے، بلکہ انفرادی طور پر بھی بلا امتیاز ہندو مسلمان سب کے کام آتے رہے، وسیع النظری اور ملک کی مجموعی فلاح و بہبود ان کی زندگی کا سب سے پیارا نصب العین تھا۔ جس کے لئے انھوں نے ہر طرح کی قربانی کی۔

ادارہ ہمدرد سے مولانا مرحوم کو ایک خصوصی تعلق تھا۔ اور ۱۹۴۸ء میں ہمدرد دواخانہ کے وقف ہوجانے کے بعد ان کا یہ تعلق اور بھی مستحکم ہوتا گیا۔ مرحوم نہ صرف ہمدرد وقف کی مجلس اعوان کے رکن اور عملاً سچے ہمدرد اور سرپرست تھے۔ بلکہ ہمدرد دواخانہ ملک کی جو صحتی، طبی اور فنی خدمات انجام دے رہا ہے ان کے ایک پرخلوص مداح بھی تھے۔ مولانا مرحوم جناب حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد کے خصوصی اور نجی احباب میں تھے۔ اور موصوف کے جذبۂ خدمت کو بہ نظر تحسین دیکھتے تھے۔ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن سے مولانا کو دلی لگاؤ اور گہری دلچسپی تھی، جو نہ صرف ادارہ ہمدرد، بلکہ فن طب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ ادارہ ہمدرد کو اس کا ناقابل اظہار رنج و ملال ہے کہ مولانا مرحوم کی وفات سے موصوف کے ساتھ ادارہ کے یہ رشتے منقطع ہوگئے اور ہندوستان ایک ایسے سچے ایماندار اور مخلص خادم وطن سے محروم ہوگیا۔ جس نے زندگی بھر فرقہ واریت کے خلاف جہاد کیا اور ملک کی سیکولر طاقتوں کو مضبوط بنانے کی ان تھک جدوجہد کی یوں تو مولانا مرحوم کی خوبیاں بے شمار تھیں مگر کردار کی یہ بلندی کسی کسی میں ہی دیکھنے میں آتی ہے کہ مولانا مرحوم اپنے بیگانے، دوست اور دشمن اور ادنیٰ اور اعلیٰ سب کے بہی خواہ تھے اور سب سے بلا امتیاز یکساں طور پر ملتے تھے۔ اور سب کے کام آتے تھے۔ مولانا مرحوم صحیح معنوں میں ایک عوامی رہنما تھے جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ہر فرد بے روک ٹوک کسی بھی موقع پر ان کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اور وہ اس کی حتی الامکان مدد کرتے تھے۔

مولانا مرحوم عرصہ سے کینسر کے مریض تھے اور بہ غرض علاج متحدہ امریکہ گئے تھے جہاں سے حال ہی میں واپس آئے تھے۔

مولانا مرحوم کی وفات سے ملکی قومی اور علمی زندگی میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے، شاید ہی وہ پُر ہوسکے۔ دعا ہے کہ حق تعالیٰ آخرت میں آں مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

(۱۲/۲/۸)

ماہنامہ برہان دہلی

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۔ آہ! کیونکر کہئے! جس کا کھٹکا شروع سے لگا ہوا تھا آخر وہی ہوکر رہا آٹھ نو مہینہ کی اس درمیانی مدت میں وہ کونسا اعلیٰ سے اعلیٰ علاج تھا جس میں کوئی دقیقہ اٹھا کے رکھا گیا ہو۔ سیکڑوں ختم بخاری شریف کے ہوئے، ہزاروں لاکھوں اللہ کے نیک بندوں نے دعا ہائے شبانہ کیں اکابر و بزرگان ملت نے غلاف کعبہ پکڑ کر منتیں مانیں مگر جو مشیت کا فیصلہ تھا وہ ہوکر رہا اور ۲ راگست کو آخری شب میں ملت اسلامیہ کے ترکش کا خدنگِ آخری، علم و فضل کے خزانے کا گوہر شب چراغ، درجِ شرف و مجد کا دُرِ تابندۂ اخلاق و فضائل کا پیکر، ملک اور قوم کی وسادر کا متاع گرانمایہ اس عالم ناسوت کو خیر آباد کہہ کر ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا اور دنیا کو ایک ماتم سرا بنا گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عربی کے مشہور شعر میں قیس کی جگہ "حفظ" رکھ دیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ شعر عرصہ پہلے کسی نے اسی موقع کے لئے کہا تھا۔

وما كان حفظٌ هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

مولانا حفظ الرحمن یوں ہونے کو تو کیا نہیں تھے۔ علوم و فنون اسلامیہ کے بلند پایہ عالم، نامور مصنف، ولولہ انگیز خطیب اور مقرر، جنگ آزادی کے سپہ سالار اور ہیرو، مخلص اور بے لوث خادم ملک و ملت سبھی کچھ تھے مگر ملک کی آزادی کے بعد انھوں نے جو رول ادا کیا ہے اس کی تاریخ اس قدر شاندار ہے کہ اس میں کوئی ایک شخص بھی ان کا حریف و سہیم نہیں ہوسکتا بے لوث اور رضاکارانہ خدمت کی وجہ سے ان کے قومی کارناموں کا ریکارڈ اس درجہ بے داغ تھا کہ ان کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس پر حرف گیری نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ صاف دماغی اور معاملہ فہمی کا یہ عالم تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اور بلند پایہ ارباب سیاست کے مجمع میں بیٹھتے تھے اور ان سے اپنی بات منوا کر اٹھتے تھے۔ پھر حق گوئی اور جرأت کی یہ شان کہ جس چیز کو حق سمجھا اسے برملا کہا اور ہر جگہ کہا۔ اس راہ میں ان کو نہ اپنوں کی پروا ہوئی اور نہ پرایوں کی۔ فکر کی بلندی و آزادی اور جرأت حق گوئی کے باوجود ان کا ظرف اس درجہ وسیع اور قلب اس قدر فراخ اور کشادہ تھا کہ بغض و عناد کبھی کسی شخص سے نہیں رکھا۔ دشمن سے بھی اسی خندہ پیشانی سے

ملتے تھے۔ جس سے اُن کے دوست بہرہ مند تھے۔ اور وقت پڑتا تھا تو اُن کی جو مدد بھی وہ کرسکتے تھے۔ بے دریغ کرتے تھے۔ خدمت کی راہ میں اپنے اور غیر دوست اور دشمن موافق اور مخالف اُس کا امتیاز انھوں نے کبھی روا نہیں رکھا۔ کام سے نہ کبھی گھبراتے اور نہ اکتاتے تھے۔ اُن کی زندگی ایک مشین کی طرح تھی جو برابر متحرک رہتی تھی۔ کھانا پینا آرام اور راحت، چین اور سکون اس کی کبھی پرواہ نہ کی یہ وہ خاص اوصاف و کمالات تھے جن کے باعث وہ عوام میں اور خواص میں حکومت میں ہندوؤں میں اور مسلمانوں میں ہر طبقہ اور ہر گروہ میں بے حد عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے۔ ان میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے اور اُن کی بات کا ہر ایک پر اثر ہوتا تھا۔ اُن کی زندگی بالکل عوامی زندگی تھی۔ نہ دربان نہ کوئی روک ٹوک۔ ہر شخص میں یکجا نظر آتے تھے اسی وجہ سے اُن کی شخصیت سب سے نمایاں اور برتر اور بڑی حسین و دلکش اور جاذب نظر تھی۔ وہ صرف "مجاہد ملت" نہیں تھے۔ جیسا کہ لوگ عام طور پر انھیں سمجھتے اور لکھتے تھے۔ بلکہ درحقیقت اس خود غرضی کی مادی دنیا میں انسانی شرف و مجد کی آبرو، اعلیٰ اقدار حیات کی عزت اور شرافت و نجابت کی مکمل تصویر تھے۔ اس لئے صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ملک و وطن کے ہر فرد اور ہر شخص کے لئے اُن کی زندگی نمونۂ عمل اور لائق تقلید تھی!

کانگریس اور جمعیۃ علماء کی ہنگامہ آفریں تاریخ میں بارہا ایسے نازک اور پے چیدہ مواقع آتے ہیں۔ جب کہ اُن کے ناخن فہم و تدبر نے عقدۂ لاینحل کی گرہ کشائی کرکے ان دونوں اداروں کو عظیم خطرات سے بچالیا ہے۔ چنانچہ ۳ر اگست کی شام کو دلی کے دربار ہال میں تعزیتی تقریر کرتے ہوئے موجودہ صدر کانگریس شری سنجیوا ریڈی اور مرحوم مسٹر لال بہادر شاستری جی نے اور اس کے بعد ایک اور جلسہ میں پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے زعماء نے صاف لفظوں میں اس کا اعتراف کیا ہے وہ جمعیۃ علماء ہند کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے تو آخر تک رہے پارلیمنٹ کے ممبر چنے گئے تو اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ وجہ یہی ہے کہ جس کام کو ہاتھ میں لیتے تھے اسے خوبی، تندہی اور خلوص و قابلیت سے انجام دیتے تھے۔ کہ پھر اُن کی قائم مقامی کرنے کے لئے کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد یہ دوسرے شخص تھے جنھوں نے مدرسہ کے بوریوں پر بیٹھ کر قدیم تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عام ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی اپنی ذہانت و ذکاوت، معاملہ فہمی و دوراندیشی اور قوتِ عمل سے اس درجہ غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تعلیم قدیم و جدید کا فرق کوئی فرق نہیں ہے۔ دماغ روشن اور دل بیدار ہو تو انسان ہر مجلس میں ممتاز اور فائق ہو کر رہ سکتا ہے۔

یہ تو مولانا کے وہ اوصاف و کمالات ہیں جو اُن کی پبلک زندگی سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا اور محسوس کرتا ہے ان کے علاوہ ہم لیس رہروانِ کاروانِ عدم نے رفقائے کار کی حیثیت سے خلوت میں جلوت میں گھر میں اور دفتر میں، غرض کہ زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ میں کم و بیش مسلسل چالیس برس تک مرحوم میں کیرکٹر کی بلندی، کردار کی پختگی، خوبی اور قلب و نظر کی پاکبازی و پاک طینتی کے جو حسین و دلکش اور گوناگوں مناظر دیکھے ہیں انہیں قلم بند کرنے کے لئے فرصت اور ایک دفتر درکار ہے۔ صحیح معنی میں ہر بڑے انسان کی پبلک زندگی میں اُس کا جو کردار نظر آتا ہے۔ وہ دراصل صرف ایک پرتو ہوتا ہے اُس کے جوہر فطرت و طبیعت کا جس کے سورج کا مطلع خود اس کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ آہ! اب اُن کی کس کس بات کو یاد کرکے روئیے اور کس کس خوبی کا تذکرہ کرکے دامانِ دل کو خونابہ جگر کے قطروں سے لالہ زار بنایئے۔ ان سطور کی تحریر کے وقت جب کہ قلب و دماغ پر حسرت کے ساتھ گمشدگی و حیرت کی جو کیفیت طاری ہے قلم آخر لکھے تو کیا لکھے۔

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

اللہ اکبر! آپ کا شوق تیز رفتاری بھیا! اور ہر چیز میں یہاں تک کہ کھانے پینے، چلنے بولنے اور تقریر کرنے میں بھی اپنے ساتھیوں پر سبقت لے جانے کا جذبہ! آخر یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک کی دعوت پر لبیک کہنے میں بھی وہی جذبہ کار فرما رہا نا۔ اور اس منزل میں بھی اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہنا طبع غیور کو گوارا نہ ہوا۔ اچھا خیر! یہی سہی۔ مگر پھر یہ طعنۂ پسماندگی کیا؟ آپ عقلمندوں کے عقلمند اور فرزانوں کے فرزانہ تھے! مگر آج عمر میں پہلی بار اور آخری بار بھی غالب کے لفظوں میں آپ کو نادان کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر چند کہ اس گستاخی پر طبیعت شرمندہ اور منفعل ہی ہے۔"

نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

معارف اعظم گڈھ

جس حادثہ کا دھڑکا عرصہ سے لگا ہوا تھا بالآخر وہ پیش آہی گیا۔ اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو صبح صادق کے وقت اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوگئے۔ موت کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہر وقت اس کا بازار گرم رہتا ہے، روزانہ ہزاروں لاکھوں انسان مرتے رہتے ہیں، مگر کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بعض موتیں وہ ہوتی ہیں جن سے ایک قوم اور ایک ملت کی پوری عمارت متزلزل ہو جاتی ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات بھی انہی میں سے ہے۔

فما کان قیس هلکه هلك واحد
ولکنه بنیان قوم تهدما

ان کی موت سے ہماری قومی وملی عمارت کا بہت بڑا ستون گر گیا۔ مولانا کی پوری زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ملک وملت کی خدمت میں گذرا۔ حتیٰ کہ مرض الموت میں بھی اس سے غافل نہ رہے اور اپنی ان تھک محنت سے اس راہ میں جان تک دیدی، اس لئے اگر زندگی میں وہ مجاہد ملت تھے تو موت کے بعد شہید ملت ہیں۔

ان کی پوری زندگی ایک سعی پیہم اور جہد مسلسل تھی جس سے ان کو ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی نجات نہیں ملی۔ آزادی نے جنگ آزادی سے بھی زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے تھے، ایک طرف فرقہ پروری کا سیلاب تھا جو آزادی کے اصل مقصد ہی کو خس وخاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہا تھا، دوسری طرف مسلمانوں کے سنگین مسائل تھے۔ تیسری جانب ملکی ووطنی مصالح اور صحیح جمہوری اور سیکولر بنیادوں پر آزاد ہندوستان کی تعمیر تھی۔ اس بحرانی دور میں ان سب سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا۔ فرقہ پروری نے بڑے بڑے قوم پروروں کے قدم اکھاڑ دیئے تھے۔ مگر اس وقت بھی مولانا صحیح قومی اصولوں پر قائم رہے اور ان سارے فرائض کو اس خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے کہ ان کا کوئی مخالف بھی حرف گیری نہیں کر سکتا۔

مسلمانوں کی اس بے بسی کے دور میں مولانا کی ذات بہت بڑا سہارا تھی اور اس راہ میں ان کے کارنامے بے نظیر ہیں، ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو مسلمانوں کی مظلومیت اور حق تلفی پر اس جرأت و بیباکی کے ساتھ آواز بلند کر سکے اور وہ موثر بھی ہو، یوں تو زبانی شور وغوغا کرنے والے بہت ہیں، لیکن اس کی حیثیت صدا بصحرا سے زیادہ نہیں ہے۔

مولانا ہندوستان کی جنگ آزادی کے ممتاز سپہ سالاروں میں تھے، انہوں نے چوٹی کے لیڈروں کے دوش بدوش کام کیا تھا۔ ان کا دامن فرقہ پرستی کے داغ سے بالکل پاک تھا۔ ان کی پشت پر خدمات اور قربانیوں کی ایک پوری تاریخ تھی۔ اس لئے ان کی آواز میں قوت بھی تھی۔ اور ایک حد تک اثر بھی تھا۔ ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت باقی نہیں ہے۔ ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

ع افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

اس لئے ان کی موت ملک وملت خصوصاً مسلمانوں کا ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی، اللہ تعالےٰ اس مجاہد ملت کی خدمات کو قبول اور عالم آخرت کی سربلندیوں سے سرفراز فرمائے۔ (آمین)

"تجلی" دیوبند

کچھ لوگ مرتے ہیں تو ایک آنکھ بھی ان پر رونے والی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ مرتے ہیں تو احباب وا قربا کا ایک محدود حلقہ ان پر آنسو بہا لیتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ مرتے ہیں تو ادھر سے ادھر تک فضا میں اندوہ ملال کا غبار بکھرتا چلا جاتا ہے اور کوئی نہیں گن سکتا کہ کتنی آنکھیں اشکوں سے نہا گئیں ان کی موت پر روحیں تڑپ اٹھتی ہیں۔ دماغ لو دے جاتے ہیں اور احساس کے ماتھے پر پگھلی ہوئی چنگاریاں پسینہ بن کر چھپ جاتی ہیں۔

کیا شک ہے کہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن قدس اللہ سرہ العزیز ایسی ہی بلند مرتبہ اور ذی شان ہستیوں میں سے تھے۔ جن کی موت نے ہر اس شخص پر غم کا پہاڑ توڑ دیا ہے۔ جسے مرحوم ومغفور کے اوصاف عالیہ اور محاسن ومحامد کا ادراک ہے جس کے سینہ میں دل مر نہیں چکا ہے اور جو اپنے ملک وملت کے مخصوص حالات و مسائل کا شعور رکھتے ہوئے اس حقیقت کو سمجھتا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن طاب اللہ ثراہٗ کا وجود نامساعد حالات کی ماری ہوئی امت مسلمہ کے لئے آج کس قدر اہم تھا۔

کوئی برا مانے یا حیرت کرے ہم تو بلا خوف تردید عرض کریں گے کہ مولانا آزاد علیہ الرحمۃ کی موت کا حادثہ اگرچہ بہت بڑا تھا۔ لیکن اثرات ونتائج کے اعتبار سے مجاہد ملت کی موت امت مسلمہ کے لئے زیادہ کاری زخم ہے مولانا آزاد اپنے اچھے اور برے ہلکے اور بھاری اعمال کا سرمایہ سنبھالے دوسری دنیا میں جا چکے ان کے لئے سوائے حسن ظن سوائے عقیدت ہوائے

دعائے مغفرت کے ہمارے پاس اب کچھ نہیں ہے ان کے علم و فہم، ان کی ذکاوت و جودت انکی تحریر و تقریر ان کی امتیازی آن بان سے صرف نظر تو بھلا کون کم سواد کر سکتا ہے۔ لیکن یہ صداقت بہر حال اپنی جگہ ناقابل تردید ہے کہ انکی رنگا رنگ صلاحیتوں کا پورا شباب، ان کی ساری توانائیاں جنگ آزادی کی نذر ہوئی تھیں اور جب آزادی کا سورج ہم پر طلوع ہوا تو وہ اپنی بیش بہا صلاحیتوں کا دامن سمیٹ کر اعزاز و منصب کی ان بلندیوں پر جا بیٹھے تھے۔ جو اگرچہ بجا طور پر فاتح سورماؤں کا حصہ ہوا کرتی ہیں۔ لیکن تاریخ کے چند منفرد اور خال خال مثالوں کے سوا وہاں تک عوام کے دل کی دھڑکنیں اور جمہور کے احساسات کی آہٹیں کبھی پہنچا نہیں کرتیں

لیکن مولانا حفظ الرحمٰن نوّر اللہ مرقدہٗ تو ان مجاہدوں میں تھے۔ جنھوں نے عین میدان جنگ میں جاندی یہ محض استعارہ نہیں ایک سامنے کی حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد بھی تعصب، تنگ نظری، فرعونیت اور ظلم کی طاقتوں کے ہاتھوں ہمارا وطن امت مسلمہ کے لئے ایک جنگاہ، ایک کارزار بنا ہوا ہے۔ جہاں مسلمان مسلسل مدافعت، فریاد و احتجاج اور کرب و اضطراب کا مجسمہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اور ایک جارحانہ ذہن بے تکان ان پر جبر و جور کے ترکش خالی کر رہا ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن علیہ الرحمۃ ظلم و طغیان کی ان طاقتوں سے برد آزمائی کرنے والوں کی صف اول کے مجاہد تھے۔ وہ جسمانی اعتبار سے نحیف لیکن جرأت و ہمت کے لحاظ سے بڑے شجاع تھے۔ شیر دل تھے۔ جیالے اور نڈر تھے۔ ان کی زندگی کے تقریباً چالیس سال اس جنگ آزما سورما کی طرح گزرے ہیں جو اپنا کفن سر سے باندھے حریف کے آگے مستقل ڈٹا ہوا ہو۔ انھوں نے دوہری ابتلائیں جھیلیں ہیں۔ جو مکھی جنگ لڑی ہے۔ ایک طرف انھیں اپنی ہی ملت کے افراد سے دست و گریباں ہونا پڑا۔ جو ان کی دانست میں غلط فکر و نظر کے علمبردار تھے۔ لیگی عقائد کے حاملوں سے وہ بڑی بے جگری کے ساتھ نبرد آزما رہے ہیں۔ اور دوسری طرف امت مسلمہ کو باطل اور جارحانہ عزائم کے بے تحاشہ برسنے والے تیروں سے بچانے کی انتھک جدوجہد انہوں نے اس وقت تک جاری رکھی جب تک تقدیر الٰہی نے انھیں بستر کا پیوند بن جانے پر مجبور نہیں کر دیا۔ اللہ اللہ کیسے انتھک۔ بیباک، سیماب وش، سرگرم اور جفاکش تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن رحمۃ تعالیٰ ایک شعلۂ جوالا۔ ایک موج رواں۔ ایک جہد مجسم۔ ایک نہ سرد ہونے والی لگن۔ ایک ایسا پیکر امید جس نے انتہائی مایوس کن حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا۔ اور مسلمانوں کو للکارا کہ نادانو! جاگو ہمت، خوف زدہ مت ہو، یہ ملک تمہارا ہے، یہ زمین و آسمان تمہارے ہیں۔ متحد ہو کر ظلم کی طاقتوں کا مقابلہ کرو۔ اور ثابت کرو کہ وطن کی محبت میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں"

ہم اس حقیقت کو چھپانا نہیں چاہتے کہ جمعیۃ العلماء کے سیاسی فکر سے ہمیں کامل اتفاق نہیں اور کبھی نہ ہوا۔ ہمارے پاس اختلاف کے متعدد دلائل تھے اور ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس اعتراف سے بھی ہمیں کوئی روک نہیں سکتا کہ مولانا حفظ الرحمٰن خدا داد صلاحیتوں اور قابل رشک محاسن و محامد کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے۔ ان کے اخلاص اور دردمندی میں بھی دو رائے کی گنجائش نہیں ہے۔

ان کی حیات قوم و ملت کے لئے بڑی قیمتی تھی وہ مضبوط سہارا تھے۔ اور آج جب کہ وہ اپنے اعمال کا دامن سمیٹ کر اپنے رب سے جا ملے ہیں۔ تو یہ ہمارے لئے ایک یاس انگیز ساعت ہے۔ ایک کربناک لمحہ ہے ایک حادثہ عظیم ہے۔ موت کا فرشتہ اگر اللہ جل شانہ کا تابع فرمان نہ ہوتا تو ہم فرط غم میں یہ کہنے سے بھی نہ چوکتے کہ مجاہد ملت کی روح قبض کرنے میں اس نے جلدبازی کی ہے۔ موصوف اگرچہ جواں سال نہیں تھے۔ کہ ہم غالب کی زباں میں کہیں ؂

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

لیکن اتنے عمر رسیدہ بھی نہیں تھے کہ دس سال اور جیئے جاندار جو یہ کہلاتا مگر ہمارے منھ میں خاک ــ کوئی بڑے سے بڑا حادثہ اور عظیم سے عظیم ابتلاء بھی خالق حکیم و دانا کی مصلحتوں سے خالی نہیں ہوا کرتا۔ ہر قیامت جو ہم پر ٹوٹتی ہے اس کا حق ہے کہ ٹوٹے کیونکہ جو کچھ جس وقت ہوتا ہے وہ اسی لائق ہے کہ اسی وقت ہو۔ تقدیر الٰہی میں جہاں انحراف نہیں وہیں خطا بھی نہیں تعالیٰ اللہ عزّ و جلّ۔

حاصل تعزیت یہ ہے کہ جس وقت ہمیں شیر دل اور مخلص مجاہدوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی اس وقت مولانا حفظ الرحمٰن جیسے سخت کوش بلند حوصلہ اور انتھک بزرگ کا اٹھ جانا ایک ایسے ستون کا گر جانا ہے جو ملت مسلمہ کے عزم و ہمت کی گرتی ہوئی دیواروں کا سہارا بنا ہوا تھا جس نے ۱۹۴۷ء کی قیامت صغریٰ میں آگ اور خون کے سیل تند سے گذرتے ہوئے بیشمار انسانوں کو پیام حیات دیا تھا۔ اور اس کے بعد سے مسلسل اب تک وہ ہر محاذ پر اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ملک و ملت ہی کی خدمت اور عدل و صداقت ہی کے گیسو سنوارنے پر کھپا رہا تھا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ ہماری قوم ایک طویل عرصے سے مُردہ پرست ہے!

وہ زندوں کو بہت کم شمار میں لاتی ہے۔ مگر جب وہ مرجاتے ہیں تو ان کی عقیدت و محبت کا پرچم ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے۔

آپ دیکھتے ہی ہیں کہ جب کوئی بزرگ دار فانی سے تشریف لے جاتے ہیں تو کتنے ہی دنوں تک ماتم سرائی کا وہ غلغلہ بلند رہتا ہے کہ گویا سینے پھٹ جائیں گے اور دل و جگر اشک بن کر بہہ جائیں گے۔ جا و بے جا صحیح اور ہر طرح کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے جاتے ہیں۔ نظم و نثر کی ساری استعدادیں ختم کردی جاتی ہیں لیکن مرنے والے کی زندگی میں ان قصیدہ سراؤں نے کس حد تک عقیدت و انقیاد کا ثبوت دیا اور عملاً اس کے کاز کو کتنی تقویت پہونچائی۔ یہ سوال دردناک ہی دردناک ہے خود مولانا حفظ الرحمٰن کو بھی زندگی میں یہی ملال رہا کہ جس محاذ پر انھیں زبانی جمع خرچ کی نہیں عملی تعاون کی ضرورت تھی وہاں وسیع معنوں میں انھیں تعاون نہ مل سکا۔

جو لوگ مولانائے مرحوم کی محبت کے دعویدار ہیں انھیں آہ و شیون اور قصیدہ سرائی سے جلد فراغت حاصل کرلینی چاہیئے۔ اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ جیسے بزرگ کا صدہا سالہ ماتم کسی مریض کا علاج نہیں بن سکا تو اور کسی کی طویل عزاداری کیا ثمر دے گی۔ محبت کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ جس جس مسلک کو مرحوم نے اپنایا تھا آپ بھی اسی کو حرز جان بنایئے۔ آپ اگر نظریاتی پہلو سے ان سے کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں تو جد و جہد، سرگرمی، تہور، تندہی اور ایثار و اخلاص میں تو بہرحال ان کی تقلید امر لازم ہے۔ اگر انیس و دبیر کی طرح مرثیے ہی پڑھنے میں تو سمجھ لیجئے مرحوم کی روح آپ کی طرف سے کبھی مطمئن نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے فضل و رحمت سے نوازے اور ہمیں آپ کو خدمت ملک و ملت کی توفیق دے مولانائے مرحوم کے پس ماندگان سے ہم تہہ دل کے ساتھ اپنی غمگساری اور نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں۔ نیز جمعیۃ علماء کے ارباب حل و عقد سے ملتمس ہیں کہ مایوس و دلگرفتہ نہ ہوجائیں۔ انسان مرنے ہی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ جد و جہد کا میدان بہرحال جوں کا توں ہے۔ مایوسی اور باہمی جنگ کے انتشار سے دامن بچا کر مولانائے مرحوم کے کاز کو تکمیل تک پہنچانا ہی چاہیئے۔ اور اگر طبع نازک پر گراں نہ ہو تو یہ گذارش بھی ہم ادب کے ساتھ کریں گے کہ نظری اور عملی اعتبار سے بعض خامیاں جمعیۃ العلماء میں پائی جاتی ہیں ان پر بھی بے نفسی اور دیانت کے ساتھ توجہ کرنی چاہیئے۔ خود تنقید ترقی کا زینہ ہے۔ اگر جمعیۃ کے ارباب حل و عقد خلوص کی سطح پر آکر غور کریں گے تو انھیں پہلے ہی مرحلے میں اس کی ضرورت محسوس ہوگی۔ کہ بندھے ٹکے خطوط عمل میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ یہ محض اشارہ ہے تفصیل پر غور کرنا ارباب جمعیت کا کام ہے۔

"تذکرہ" دیوبند

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے ہم وطن بھی تھے اور مخصوص تعلقات کی بناء پر مجھے ابتدائے ہوش سے ہی ان کو بہت ہی قریب سے دیکھتے رہنے کا مسلسل موقعہ بھی ملتا رہا ہے چنانچہ اپنی اس دیرینہ واقفیت کی بناء پر میں پورے وثوق کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی وفات حسرت آیات سے نہ صرف یہ کہ ہم ملک و ملت کے ایک عظیم راہنما جلیل القدر مفکر بلند پایہ مصنف اور وسیع النظر عالم نیز بے مثل خطیب اور نامور ادیب سے محروم ہوگئے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک پیکر وفا، مجسمۂ ایثار شخصیت بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔ وللّٰہ ما اخذ ولہ ما اعطی

اس موقعہ پر قلب مضطر کا بے اختیار تقاضہ ہوا کہ ان کی یاد میں سوانح حیات کے حیات افروز واقعات قطرات غم کے طور پر نذر قرطاس کروں۔ پیش نظر یہ غیر مربوط سطور اسی اضطراب دلی کا نتیجہ ہیں۔

حضرت مولانا کا اصلی نام معز الدین تھا۔ آپ کے سب سے بڑے بھائی ڈپٹی فخر الدین صاحب ہیں جو اب بھی بقید حیات ہیں۔ منجھلے بھائی مولوی بدر الدین صاحب وکیل تھے۔ جن کا انتقال ہوچکا۔ ان سے چھوٹے مولانا اور مولانا سے چھوٹے حکیم صلاح الدین صاحب ہیں۔ جو ضلع بجنور کے مشہور اور حاذق اطباء میں سے ہیں "حفظ الرحمٰن" مولانا کا تاریخی نام تھا، جو اصل نام پر غالب ہوچکا تھا مولانا فرمایا کرتے تھے کہ ان کے تاریخی نام میں رحمان کے رسم الخط میں الف شامل ہے، اس طرح مولانا کا سن ولادت ۱۳۱۸ھ ہے آپ کے والد ماجد حاجی شمس الدین صاحب قصبہ سیوہارا کے مشہور زمیندار اور معززین میں سے تھے۔ اور علمائے حق اور اکابر اہل اللہ کیساتھ ہمیشہ وابستہ رہتے تھے حاجی صاحب مرحوم حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی قدس سرہٗ سے بیعت تھے۔ خاندانی اعتبار سے مولانا صدیقی النسل تھے۔ مولانا کا خاندان ہمیشہ سے علمی خاندان رہا اور نامور علماء، ادباء آپ کے خاندان میں ہوتے چلے آئے ہیں۔ مولانا کے والد ماجد حاجی صاحب مرحوم نے مولانا کو ہونہار اور ذہین دیکھکر ارادہ کیا کہ مولانا کو علوم عربیہ کی تعلیم دلائی جائے۔ چنانچہ یہ انتخاب نتیجہ خیز ثابت ہوا، شروع میں اپنے مکان ہی کے مکتب میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد کچھ تعلیم شاہی مسجد مراد آباد میں حاصل کی

ازاں بعد دورہ حدیث تک مدرسہ فیض عام سیوہارہ میں مشغول تعلیم رہے اور دورہ حدیث کی تکمیل حضرت مولانا سید عبد الغفور صاحب سیوہاروی تلمیذ رشید سید العلماء مولانا سید احمد حسن صاحب امروہی قدس اللہ سرہ العزیز سے کی ازاں بعد مولانا مرحوم ازہر ہند دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور بحر العلوم حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ اور حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہم سے دوبارہ دورۂ حدیث وغیرہ کی تکمیل فرمائی۔ اور اپنی مخصوص ذکاوت کی بناء پر ان اکابر کے مخصوص تلامذہ میں آپ کا شمار ہوا۔ مولانا کی ایک خصوصیت جو کم حضرات کو حاصل ہو سکی ہے یہ ہے کہ ابتدائے طالب علمی سے لیکر انتہائے تکمیل تک تمام اساتذہ آپ پر بے حد مہربان رہے ہیں، اور آپ ہر ایک کی خصوصی توجہات کا مرکز بنے رہے ہیں۔ اسی کے ساتھ حضرت مولانا پر حضرت حق جل مجدہ کا یہ بھی خاص انعام تھا کہ وقت کے اہل اللہ کو آپ سے دلی تعلق رہا ہے، اس سلسلے کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ تقریباً دس بارہ سال ہوئے سیوہارہ میں احقر کے غریب خانہ پر، عارف باللہ شیخ اکمل حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائپوری قدس اللہ سرہٗ رونق افروز تھے مجلس میں مولانا کا ذکر آگیا۔ حضرت شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا کہ فسادات کے زمانہ میں دہلی کے اندر مسلمانوں کے بچانے کے سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جو خدمات انجام دی ہیں میں ان کے بدلے میں اپنی پوری عمر کے اذکار و اشغال نثار کرنے کو تیار ہوں الفاظ میں شاید فرق ہو لیکن مفہوم یہی تھا۔ اللہ اکبر ایک عارف باللہ شیخ کامل کا یہ ارشاد حضرت مولانا کی عند اللہ مقبولیت کی کس درجہ اہم سند اور شہادت ہے۔

خوب یاد ہے کہ ایام طالب علمی میں صبح کے وقت مولانا مدرسہ فیض عام میں تشریف لائے اور حضرت الاستاد حافظ احمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو ایک صاحب نسبت بزرگ بھی تھے۔ اپنا تازہ خواب بیان کیا کہ آفتاب آہستہ آہستہ نیچے اتر کر میرے سامنے آگیا ہے۔ اور میں اس کو نگل گیا ہوں، حافظ صاحب نے فیضان علم کی بشارت دی، حضرت مولانا میں ابتداء ہی سے خدمت خلق بالخصوص بے کس و بے بس مخلوق کی خدمت کا بے پناہ جذبہ موجزن رہتا تھا۔ اور جب بھی کسی عام یا خاص پریشانیوں کا زمانہ آتا تھا، مولانا پوری جانبازی و جانثاری کے ساتھ خود کو پیش کردیا کرتے تھے، یہی جذبہ آئندہ چل کر ملکی و ملی تحریکات میں ان کی قیادت اور پیش پیش رہنے کا باعث ہوا غالباً مولانا کے ایام طالب علمی ہی کا یا اس کے کچھ بعد کا واقعہ ہے کہ سیوہارہ میں ایک نومسلم جذامی کے انتقال کی پولیس نے اطلاع دی، مولانا چند اشخاص کو ساتھ لیکر کوڑھی بستی میں پہونچ گئے، مرحوم نومسلم کی یہ دردناک کیفیت دیکھنے میں آئی کہ اعضاء بدن بڑی حد تک جذام سے گل چکے تھے، اور اس قدر بھیانک نقشہ تھا کہ ہر کوئی پاس جاتے ہوئے گھبراتا تھا۔

مولانا نے ایک سقہ کو پانی لانے کے لئے مامور کیا اور کپڑے کے دستانے پہن کر بسم اللہ توکلت باللہ، کہکر بلا تکلف غسل مسنون دینا شروع کردیا، سقہ دور سے پانی کی دھار چھوڑ رہا تھا۔ اور مولانا اور ایک دو شخص ان کے ساتھ پورے اطمینان سے اپنے ہاتھوں سے اس کو غسل دیکر اس کو کفن پہنا کر چارپائی پر لائے اور نماز پڑھکر دفن کیا، اس قسم کے واقعات سے مولانا کی زندگی بھرپور ہے۔

احترام اکابر حضرت مولانا کی زندگی میں ہمیشہ نمایاں رہا ہے اور یہ جذبہ فداکاری و جانثاری کی حد تک پہونچا ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے کا واقعہ ہے کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ مولانا ریل میں تشریف لا رہے تھے، مشرقی پنجاب کے ایک اسٹیشن پر جب ٹرین پہونچی تو ایک مخالف مجمع نے جس کا اختلاف سیاسی نوعیت کا تھا، حضرت شیخ الاسلام" پر سنگباری شروع کردی، مولانا نے حضرت شیخ" کو آڑ میں لے کر خود کو بلا تامل مجمع کے سامنے پیش کردیا۔ اور اب مولانا پر براہ راست پتھر برسنے لگے حتی کہ ایک پتھر نازک موقع پر آکر لگا، فرماتے تھے کہ یہ تہیہ کرچکا تھا کہ جب تک حفظ الرحمٰن کے بدن میں جان موجود ہے، حضرت شیخ پر آنچ نہ دونگا۔ اسی سنگباری کے سلسلے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ جو مجھ سے حضرت اقدس مولانا رائے پوری دامت برکاتہم نے بیان فرمایا کہ پاکستان میں کسی مقام پر ایک شخص ان کو ملا اور بے اختیار رونے لگا۔ دریافت کرنے پر اس نے یہ داستان سنائی کہ وہ مشرقی پنجاب کا رہنے والا ہے اور جس مجمع نے حضرت شیخ پر سنگباری کی تھی بدبختی سے یہ بھی اس میں موجود تھا۔

اس نے بتلایا کہ اس مظاہرہ کے موقع پر اپنی تشفی غیظ کیلئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ برہنہ ہو کر حضرت شیخ رح کے سامنے ناچنے لگا۔ واقعہ رفت و گذشت ہو گیا لیکن لا یضل ربی ولا ینسیٰ کچھ عرصہ بعد جب پنجاب میں ہولناک فسادات ہوئے تو سکھوں نے اس کے

ساتھ یہ طریقہ برتا کہ اس کو ایک ستون سے باندھ دیا گیا اور گھر کی بہو بیٹیوں کو اس پر مجبور کیا کہ وہ برہنہ ہو کر اس کے اور مجمع کے سامنے ناچیں، وہ کہتا ہے کہ اس وقت میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ آج کا یہ ناچ اس برہنہ ناچ کا قدرتی انتقام ہے، جو حضرت شیخ الاسلامؒ کی اہانت کی غرض سے میں نے کیا تھا۔

حضرت مولانا پیکر وفا اور مجسمۂ شرافت وانسانیت تھے۔ انتقام سے آپ کا قلب قطعاً ناآشنا تھا، میری نگاہ میں ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ تحریکات کے زمانہ شباب میں لوگوں نے مولانا کو اذیتیں پہنچائیں اور توہین و تذلیل کے طریقے اختیار کئے، لیکن آزادی ہند کے بعد انہیں اشخاص نے اپنی ضرورتوں میں مولانا سے امداد طلب کی اور بلا دریغ بغیر کسی ادنی تامل کے مولانا نے ان کی مدد کی اور حرف شکایت کا زبان پر لانا تو درکنار کبھی پیشانی کی چتونوں سے بھی اس شکایت کی یاد تازہ نہ ہونے دی، بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے ہمیشہ ان کے ساتھ پیش آتے رہے۔ حتیٰ کہ مولانا کے ان اخلاق کریمانہ سے متاثر ہو کر وہ لوگ مولانا کے گرویدہ اور شیفتہ بن گئے۔

حضرت مولانا نہایت جری انسان تھے، اور اعتماد علی اللہ سے ان کا قلب معمور تھا، آزادی ہند کے بعد بگڑے ہوئے حالات میں یہاں کے مسلمانوں کو بھی وہ جرأت، خودداری اور اعتماد علی اللہ کا درس دیا کرتے تھے۔ اور بھارت کے مسلمانوں کی مشکلات کا ان کے نزدیک یہی واحد علاج تھا، سن سینتالیس ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے ہنگاموں میں۔ حضرت مولانا نے جرأت واستقامت کا جو اعلیٰ کردار پیش کیا ہے وہ ان کی سوانح حیات کا نہایت روشن باب ہے، اور مسلمانان ہندوستان اس سے بخوبی واقف ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں سے متعلق ایک مرتبہ میں نے مولانا سے دریافت کیا کہ دہلی میں گولیوں کی بوچھار اور تلواروں کی جھنکار میں سے آپ کس طرح گذر جایا کرتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں جو کچھ فرمایا، اس سے ان کی انتہائی حوصلہ مندی اور اعتماد علی اللہ کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ ایک خدا رسیدہ بزرگ نے مجھکو (سورۂ اخلاص کا) ایک خاص عمل تلقین فرمایا تھا، اس دور میں وہ عمل میرے ورد میں رہتا تھا۔

مجاہد ملت حضرت مولانا پرانے بزرگوں کی مانند وضع داری میں بہت پختہ تھے، جس کسی جگہ ایک دفعہ بھی تعلق اور رسم پیدا ہو گیا تو ہمیشہ اس کو نبھایا۔ اس ذیل کا ایک واقعہ یہ ہے کہ تقریباً بتیس سال سے بھی زائد عرصہ تک حضرت مولانا کا یہ معمول رہا کہ دن کی ٹرین سے جب بھی سیوہارہ تشریف لاتے، تو اسٹیشن سے اول برادر محترم حاجی حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم کے پاس رونق افروز ہوتے، بھائی صاحب مرحوم مولانا کے مخصوص ترین دوست اور بقول حضرت مولانا کے جگری دوست تھے، پھر صبح نو بجے سے دوپہر تک اور عصر سے تقریباً عشا تک تقریباً روزانہ غریب خانہ ہی پر وقت گذارتے تھے اور یہی معمول بھائی صاحب کی وفات کے بعد رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ کبھی اس معمول میں تخلف ہوا ہو۔

حضرت مولانا کی یاد میں بے شمار انسان مضطرب وبے قرار ہیں اور ان کے اعزہ و احباب نیز متعارفین کی لامتناہی تعداد ان کے لئے آج غمگسار رہے۔ ان متعارفین میں بادشاہ اور امراء اور وزراء بھی ہیں اور علماء و فقراء بھی ہیں اور عام پبلک بھی، لیکن سب سے زیادہ مضطر مظلومین کا وہ طبقہ ہے، جن کے لئے حضرت مولانا پشت پناہ تھے۔ ان میں وہ بے بس و بےکس اور لاوارث بازیافتہ مسلمان خواتین بھی ہیں، جو حضرت مولانا کو اپنا باپ سمجھتی تھیں اور جیسا کہ مجھکو معلوم ہے۔ حضرت مولانا فی الحقیقت ان کے لئے ہر طرح مثل باپ ہی تھے۔ ان بے بسوں اور بےکسوں کے غم و اضطراب کا بجز ان کے اور کون اندازہ کر سکتا ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی زندگی کا آغاز تقریباً سن ۳۸ھ ہجری سے تحریک خلافت میں شمول سے ہوا ہے اس کے بعد جب جمعیۃ علماء ہند قائم ہوئی تو حضرت مولانا ہمیشہ کے لئے اس سے وابستہ ہوگئے اور جمعیۃ کے راستے سے وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے منسلک ہوئے اور افق ہند پر آفتاب بن کر چمکے۔ اس پورے دور کی تاریخ ارتقاء امید ہے کہ ان کے رفقاء کار بیان فرمائیں گے۔

حضرت مولانا کی علمی اور تصنیفی خدمات کا آغاز پیرم پیٹ مدراس سے ہوتا ہے، غالباً حفظ الرحمٰن لمذہب النعمان حضرت مولانا کی سب سے پہلی جلیل القدر تصنیف ہے جس میں دلائل و براہین کے ساتھ حضرت مولانا نے ان الزامات کا دفاع کیا ہے جو حنفیت پر مخالفین کی جانب سے کئے گئے ہیں۔

دل چاہتا تھا کہ حسب عادت حضرت مولانا کی تاریخ وفات کہکر دل کی بھڑاس نکالوں لیکن غمگسار طبیعت نے ساتھ نہ دیا اس لئے ایک مادۂ

تاریخ کو جو دارالعلوم دیوبند سے متعلق ایک بزرگ کے سلسلۂ وفات میں احقر نے لکھا تھا موزوں کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

قطعۂ تاریخ وفات

حفظ رحمٰن مجاہد ملت — عازم خلد ہو گئے واللہ
اس جہانِ قلق سے کر کے سفر — چین کی نیند سو گئے واللہ
بولا رضواں کہ لکھئے سال وفات — داخلِ خلد ہو گئے واللہ

۱۳ ھ ۸۶

آستانہ دہلی

آہ مجاہدِ ملت!

مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی وفات حسرت آیات ہندوستانی مسلمانوں کی تقدیر کا ایک المیہ ہے کہ اس نازک دور میں جبکہ قومی زندگی کی آستین میں "دشنہ" بھی پنہاں ہے اور ہاتھ میں نشتر بھی کھلا ہے۔ وہ عالم اسباب میں مسلمانوں کی ایک سپر تھے۔ ایک سہارا تھے، ایک ڈھارس تھے اور افسوس کہ آج یہ سہارا ٹوٹ گیا ہے۔ اور وہ آفتاب ڈوب گیا ہے جس کی روشنی میں ہندوستانی مسلمان قومی زندگی کی متعین راہوں پر بے جھجک آگے بڑھ رہے تھے۔ بے شک کسی کے بچھڑنے سے زندگی کا کارواں رکتا نہیں، بے شک قافلۂ حیات اپنی رفتار سے چلتا ہی رہتا ہے لیکن حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی جدائی ایک فرد کی جدائی نہیں ہے۔ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ایک تاریخ تھے۔ ایک تاریخ کا۔ ایک دور کا جلی عنوان تھے، ایک انقلاب آفریں شخصیت کے جمال و جلال کا دلآویز مرقع تھے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آج اس مٹی سے نشو و نما کی توانائی چھن گئی ہے شیخ الہند رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پُرجوش اور ہم پسند طبیعت نے حب الوطنی حکمت و دانش، اور ایثار و قربانی کی کشادہ پیشانی سے ٹپکتے ہوئے گرم پسینہ میں گوندھ کر جمعیۃ العلماء ہند کے ضمیر کا خمیر اٹھایا تھا آج صرف مولانا حفظ الرحمٰن رحؒ ہی کی آنکھ بند نہیں ہوئی، تاریخ کا ایک دور ختم ہو گیا اور یہ محسوس ہوا کہ جمعیۃ العلماء کے جسدِ خاکی سے زندگی کی روح پرواز کر گئی ہے۔ بزم علماء کی وہ شمع گل ہو گئی ہے۔ جس کی جوت سے دلوں کے کنول اور دماغوں کے فانوس جگمگا رہے تھے، اور جس کی کرن سے حب الوطنی کی اس وادی میں قوم پرستوں کے آبلہ پا کارواں کی راہیں چمک رہی تھیں جس میں دو قومی نظریہ کے زہریلے اور نوکیلے کانٹوں کا دبیز فرش بچھا ہوا تھا۔ دم لینے کیلئے اور گھڑی بھر کوئی سایہ نہ تھا، کوئی چھاؤں نہ تھی!

مولانا حفظ الرحمٰنؒ کا ماتم ایک شخص کا ماتم نہیں ہے۔ ایک تاریخ ایک دور اور ایک دور کی ان عظیم شخصیتوں کا اجتماعی ماتم ہے۔ جن کی حب الوطنی، قوم پرستی اور سرفروشیوں کا مولانا حفظ الرحمٰنؒ ایک عنوان بن گئے تھے، ان کی اپنی شخصیت بھی انفرادیت اور فکر و عمل کا ایک دمکتا ہوا چراغ تھی۔ لیکن اس چراغ کی لو سے جو نور برس رہا تھا اس کے دامن میں ہفت رنگ شعاعیں تھیں ایک سرخی تھی شاملی کے سرفروش مجاہدینِ حریت کے ابلتے ہوئے گرم اور تازہ خون کی ایک ضو تھی، ضامن اور قاسمؒ کی جرأت و شجاعت کی ایک کرن تھی فراست محمود و قیادت آزادؒ کی ایک شعاع تھی عزم انصاریؒ و حلم اجملؒ کی اور اس طرح یہ ایک چراغ، دانش و حکمت، تدبر و فراست ایثار و قربانی، جرأت و شجاعت، مروت، محبت اور قوم پرستی کی راہ میں عمل پیہم اور یقین محکم کا یادگار چراغ تھا۔ جو یکم اگست کا دن گزار کر رات کو تین بجے ہوا کے اجل سے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا!

اس حقیقت سے انکار نہیں، کہ قومی زندگی کی کچھ راہیں ہیں، جو ملک کے دستور نے متعین کر دی ہیں اور ۴۴ کروڑ انسانوں کا کارواں جس میں ہندوستانی مسلمان بھی شامل ہیں پنڈت نہرو کی قیادت میں آگے بڑھ رہا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خون آلود تلووں میں یاس و قنوطیت کے چبھے ہوئے کانٹے بھی ہیں اور ناامیدی و نامرادی کے پرسوز آبلے بھی ہیں اور یہ مولانا تھے جو اپنی چٹکی سے یہ کانٹے بھی نکال رہے تھے۔ جن میں وہ آگ بھری ہے جو بھڑکتی ہے تو ایک قوم کا ذہن جلتا ہے۔ تن اور من جلتا ہے۔

یہ کہنا کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ کوئی خطرہ نہیں ہے، بالکل ہی درست نہیں ہے، اندیشے بھی ہیں وسوسے اور خطرے بھی ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ اندیشوں سے باخبر کرنے والا اب خاموش ہو چکا ہے۔ روکنے اور ٹوکنے والا چپ ہو گیا ہے، ہاتھ پکڑ کر صحیح راستہ پر لانے والا زمین کی گود میں سو چکا ہے۔ اس لئے قومی زندگی کے رواں دواں قافلہ کے ساتھ قدم اٹھانے میں مسلمانوں کو بڑی احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ اور قدم قدم پر مولانا حفظ الرحمٰن کی احتیاطیں یاد آئیں گی، ان کی سعی و محنت اور قیادت و فراست یاد آئے گی اور اگر ہندوستانی مسلمانوں میں فہم و فراست کا فقدان نہیں ہے تو یہ یاد بھی ایک رہنما کا کام دے سکے گی۔

مولانا حفظ الرحمٰنؒ کیا تھے؟ اور ہم کس بیش قیمت سرمایہ سے محروم ہو گئے اس کا اندازہ آج بھی ہے۔ اور شاید کل اس سے زیادہ ہوگا۔ اس لئے کہ وہ کڑی جس نے حکومت کو مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو حکومت و قیادت سے جوڑ

رکھا تھا اچانک ٹوٹ گئی ہے اور اس کی جگہ لینے والا بظاہر اب کوئی موجود نہیں ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت ایک ویرانہ ہے جس کے سناٹے میں دل دہل رہے ہیں، جس شیر کی آواز سے رن گونجتے تھے آج اس کی آواز بھی ایک سناٹے میں کھو گئی ہے۔

حضرت مولانا کے ذاتی صفات کے بیان میں اگر کچھ کہا جاسکتا ہے تو صرف یہ کہ وہ سچے مسلمان تھے اور سچے مسلمان ہی کا دوسرا نام مومن، مجاہد اور مکمل انسان ہے، یہی وجہ ہے کہ صرف دوست ہی نہیں دشمن بھی اس حقیقت کے اعتراف میں گردنیں جھکاتے ہیں، کہ حضرت مولاناؒ کی کتاب سیرت کا ورق ورق اتنا پاک اور اتنا صاف ہے کہ جسکی مثالیں کم ہی ہوں گی۔

مولانا حفظ الرحمنؒ کی شخصیت کی تعمیر درحقیقت ہندوستانی مسلمانوں ہی کے سیاسی مذاق وسماجی مزاج کا ایک آئینہ تھی، وہ ملتِ اسلامیہ کے پاکیزہ عمل وکردار کی ایک مقدس علامت تھے۔ اور جو لوگ مولانا حفظ الرحمنؒ کو سمجھتے ہیں یا حب الوطنی قوم پرستی کی اس تعریف کو سمجھتے ہیں جو مجسم ہوکر "حفظ الرحمنؒ" بن گئی تھی۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ حب الوطنی میں کس حد تک مسلمان بڑھتے ہیں اور کس شان سے بڑھتے ہیں؟ آج اگر بعض سرپھرے عناصر، جو جارحانہ قوم پرستی میں وہ عقیدہ رکھتے ہیں جس پر فاشیت کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ بزعم اکثریت یہ سوال کریں کہ "ہندوستانی مسلمانوں کی قوم پرستی کیا ہے۔" تو اس کا جواب ہے "حفظ الرحمنؒ" اور بے شک یہ جواب سب سے عناصر کی اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکا دینے کی توانائی رکھتا ہے

۱۹۱۶ء سے ۱۹۴۷ء تک حضرت مولاناؒ کی سیاسی زندگی ایک طوفان تھی ایک آندھی، ایک آندھی، ایک بگولہ اور ایک شعلہ تھی کہ سامراج کا گھر پھونکتا تھا لیکن ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کے برسوں میں، جبکہ خون کی بوچھار ہو چکی تھی، فسادات کی آگ لگ چکی تھی، زمین وطن کے ساتھ اہل وطن کے دل اور تقدیریں بٹ گئی تھیں۔ حضرت مولاناؒ کی سیاسی زندگی، ہرچند کہ ایک درد مسلسل تھی لیکن اس مرد مجاہد نے مایوسیاں جس کے قریب نہ تھیں، جرأت واستقلال پامردی وہمت اور خدا پر بھروسہ جس کے مزاج میں شامل تھا سخت سے سخت حالات میں بھی تخریب ہی سے تعمیر کے وہ عنوان پیدا کئے جسے مستقبل کا مورخ ایک غمزدہ اقلیت کے حوصلہ مند رہنما کے قوم پرور ذہن ودماغ کی قابل تعریف . . . ایجاد کہے گا، اس لئے کہ یہی وہ عنوان ہے جس پر ہندوستان کے سیکولرازم، پنڈت نہرو کی قیادت اور ہندوستان کے بین الاقوامی وقار کی بقا منحصر ہے۔

مسلم کنونشن ان ہی عنوانوں میں سے ایک عنوان تھا جس کی تعمیری آواز نے سیاست وقیادت کے ڈگ محلوں اور حکومت واقتدار کے شیش محلوں میں بھی یہ زندہ احساس پیدا کیا کہ ہمارا ماضی ہمارے حال سے الگ نہیں ہے اور فرقہ پرستی کے رجحانات، لسانی وثقافتی تعصبات کے نئے چولے بدل رہا ہے، اور قومی اتحاد وملکی سالمیت کے لئے علاقائی امتیاز وتفریق کا نیا خطرہ معرض وجود میں آرہا ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمنؒ کا یہ آخری کارنامہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں پورے ملک کے لئے کتنا مفید ثابت ہوا ہے اور مسلم کنونشن کی تعمیری آواز نے پوری قوم کے ذہن پر کس حد تک تعمیری اثر مرتب کیا ہے اس کا اندازہ جذباتی یکجہتی اور قومی اتحاد کے متعلق مرکزی کونسل کے قیام سے کیا جاسکتا ہے جس پر فرقہ پرستی کے استیصال کی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ کاش! حضرت مولاناؒ کچھ دن اور زندہ رہتے اور قومی اتحاد کونسل جس تعمیری نتیجہ کو حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ اس کے آب ورنگ کو اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ان کی پوری سیاسی زندگی کا یہ معنوی خلاصہ ہے جسے "قومی اتحاد کونسل" کہا جاتا ہے۔

آہ! وہ معصوم چہرہ آج آنکھوں میں بسا ہوا ہے جس پر صداقتیں اور شرافتیں نثار ہوتی تھیں، جس پر برستی ہوئی اداسیاں دیکھ کر ہی گاندھی جی نے دلی میں برت رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور جس برت نے ملک کی فضا بدل دی تھی وہ پُر درد آواز آج کانوں میں گونج رہی ہے جو جبلپور کے فساد کے بعد پارلیمنٹ کے ایوان میں بلند ہوئی تھی! اور جس نے پورے ملک کو بیدار کردیا تھا

وہ پاکیزہ ہاتھ جو اٹھتے ہی نہ تھے مگر مظلوموں کی مدد کے لئے جو بڑھتے ہی نہ تھے۔ مگر بیواؤں کے سروں پر ردا ڈالنے کے لئے بچوں کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو سکھانے کے لئے آہ وہ مضبوط قدم جو قوم پرستی کی راہ میں اٹھتے اور قومی تعمیر کے راستے پر بڑھتے آج موت کی آغوش میں سرد ہو چکے ہیں۔ لیکن اپنے نقوش میں وہ داستانیں چھوڑ گئے ہیں، جن کو مدتوں دہرایا جائے گا۔ اور جو دلوں میں نئی زندگی پیدا کریں گی۔ نئی آرزوئیں جگائیں گی! خود مولانا حفظ الرحمن نہ سہی لیکن مولانا حفظ الرحمنؒ کی یاد ہمیشہ ہی زندہ رہے گی۔ اور موت ان نیکیوں کو نہ چھین سکے گی۔ جو قوم ووطن کی آنکھوں میں آنسو بن گئے ہیں،

مولانا حفظ الرحمنؒ اپنی شخصیت کے اعتبار سے یکتا حیثیت رکھتے تھے اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ صرف کہ مجاہدانہ عزم کے ساتھ برطانوی سامراج کے مقابلہ میں فاتحانہ جنگ لڑی۔ بلکہ مسلم فرقہ پرستی اور ہندو فرقہ پرستی کے مقابلہ میں وہ معرکے بھی سر کئے، جس کی آزاد ہندوستان کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

تا سحر تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے باد صبا

یادگار رونق محفل تھی پروانہ کی خاک

خاتونِ مشرق دہلی

تمام مشرقی بہنوں اور بھائیوں کو ہند اور پاکستان کے ریڈیو، اخباروں اور دیگر ذرائع سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ اور ہندوستان کی پارلیمنٹ کے ممبر مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب کا ۲ راگست کو بمقام دہلی میں انتقال ہو گیا ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

مجاہد ملت مرحوم چند ماہ سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ سب سے پہلے دہلی اور بمبئی میں علاج ہوا۔ پھر آپ کو امریکہ لے جایا گیا۔ امریکہ کے مشہور اور تجربہ کار ڈاکٹروں نے علاج کیا۔ اگرچہ وہاں عارضی فائدہ ہو گیا تھا اور کچھ صحت بھی بحال ہو گئی تھی۔ اس لئے امریکہ سے دہلی واپس آ گئے یہاں واپس آکر کینسر پھر بیدار ہو گیا۔ ہر قسم کا علاج کیا گیا۔ مگر موت کا وقت مقرر تھا مرحوم جاں بر نہ ہو سکے۔ آخر کار ۲ راگست کی صبح کو مذہب وسیاست کا درخشندہ ستارہ اور ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا مددگار رخصت ہو گیا جس نے ۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر دہلی کے مسلمانوں کی مدد کی۔ جو فوج اور پولیس اور بلوائیوں کی گولیوں سے نہیں ڈرا۔ اور جس پر اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کھاری باولی۔ چاندنی چوک۔ ریلوے اسٹیشن بارہ کھمبا روڈ۔ کناٹ پلیس پر قاتلانہ حملے ہوئے مگر اس مرد مجاہد نے مسلمانوں کو بچانے کے لئے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ ہم سے جدا ہو گیا ۳ راگست کو شہر دہلی ماتم کدہ بن گیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خانقاہ میں ہزاروں مسلمانوں نے بادیدہ پرنم مجاہد ملت کو خدا کے سپرد کر دیا۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ مشرقی بہنیں اور بھائی تین مرتبہ سورہ فاتحہ پڑھ کر مرحوم کی روح کو ثواب پہنچائیں۔ توفیق

دین دنیا دہلی

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی موت کا حادثہ ہندوستان کے لئے عموماً اور مسلمانوں کے لئے خصوصاً اتنا بڑا حادثہ ہے جسے زمانہ دراز تک فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں جن چند سرفروش مجاہدوں کا نام سرورق پر لکھا جائے گا۔ ان ہی میں سے ایک مولانا حفظ الرحمٰن بھی ہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن جنگ آزادی کے وہ لائق سپہ سالار ہیں جو ہوش سنبھالنے سے لیکر موت تک شیطانی قوتوں سے جنگ کرتے رہے اور آخر اسی جنگ میں شہید ہو گئے۔

مولانا مرحوم کی زندگی کا ابتدائی دور وہ تھا جب آپ گاندھی جی مولانا ابوالکلام آزاد۔ پنڈت نہرو۔ ڈاکٹر انصاری اور دیگر صف اول کے رہنماؤں کے دوش بدوش انگریز کی سامراجی طاقت سے جنگ کرتے رہے اس کے بعد دوسرا دور وہ آیا جب اس ملک میں دو قوموں کی تھیوری نے تفریق کا بیج بویا اور پاکستان کے قیام کا نعرہ بلند ہوا اس دور میں مولانا برابر دو قوموں کے نظریہ کی مذمت کرتے رہے۔ اور بڑی دلیری کے ساتھ اس ہندو فرقہ پرستی اور مسلم فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہے جس نے کہ وطن عزیز کے دو ٹکڑے کر دیئے

پھر تقسیم ہند کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب ہندو فرقہ پرستی نے ملک کے امن وامان کو غارت کر دیا۔ ملک میں جا بجا یکطرفہ ہنگاموں کا دور شروع ہوا۔ اور ملک کا کوئی حصہ ایسا باقی نہ رہا جہاں ہندو فرقہ پرستی نے سر نہ اٹھایا ہو۔ یہ مولانا کے لئے نازک ترین وقت تھا۔ وہ تن تنہا ملک کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک دوڑتے پھرتے تھے۔ ملک میں جہاں بھی کوئی یکطرفہ ہنگامہ ہوتا تھا۔ ایک جانباز سپاہی کی طرح اس کی آگ میں کود پڑتے تھے اور اس وقت تک انہیں چین نہیں آتا تھا۔ جب تک کہ فرقہ پرستی اور باہمی منافرت کی آگ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں بجھا دیتے تھے۔ چنانچہ یہی فیروزآباد میں ہوا۔ اور یہی بھوپال میں ہوا۔ اور اس کے بعد جب جبل پور میں یکطرفہ فسادات کی آگ بھڑکی تو مولانا مرحوم ہی نے اس خطرناک آگ کو بجھایا۔ جو نہ صرف جبلپور میں بلکہ مدھیہ پردیش کے مختلف علاقوں میں پھیل چکی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں جب علیگڑھ۔ چندوسی۔ اور میرٹھ میں فسادات کی آگ بھڑکی تو یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو چکے تھے اور رفتہ رفتہ آپ کی صحت جواب دے رہی تھی لیکن اس کے باوجود مولانا مرحوم کے جوش عمل میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ جان کی بازی لگا کر علیگڑھ گئے اس کے بعد چندوسی پہنچے اور پھر میرٹھ میں اسی وقت تک رہے جب تک وہاں فسادات کی آگ بالکل سرد نہ ہو گئی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کا مرض اسی آخری تگ ودو اور مصروفیت کے دوران میں بڑھ کر ناقابل علاج بن گیا۔ غرضیکہ مولانا مرحوم اس وقت تک ملک کی فرقہ پرستی سے جنگ کرتے رہے۔ جب تک کہ آپ بالکل ہی صاحب فراش نہ ہو گئے اور جب مرض حد سے زیادہ بڑھ گیا تو آپ کو دہلی اور بمبئی کے ہسپتال میں داخل کیا گیا اور بعد میں علاج کے لئے امریکہ لیجایا گیا لیکن مولانا کیسے تندرست ہو سکتے تھے۔ ان کی قسمت میں تو شہادت کا بلند درجہ لکھا ہوا تھا۔ چنانچہ امریکہ سے واپسی کے دو ہفتہ کے بعد اس مرد مجاہد نے ایک جانباز سپاہی کی طرح ملک اور ملت پر اپنی جان قربان کر دی۔

ایڈیٹر دین دنیا کا حضرت مجاہد ملت سے بہت ہی قریب کا تعلق رہا ہے

اور مولانا موصوف کو قریب سے دیکھنے کے بعد بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری نظر سے کوئی ایک متنفس بھی مولانا مرحوم کی طرح سچی قومی تڑپ رکھنے والا۔ نڈر اور بے باک، ایثار پیشہ اور صاحب عقل و فہم آج تک نہیں گذرا ان کے قلم میں بھی بلا کی طاقت تھی اور تقریر میں بھی ایک جادو تھا۔ حق گوئی اور حق کوشی ان کا شیوہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی بے وقت وفات ملک و قوم کا اتنا بڑا نقصان ہے جس کی شائد کبھی بھی تلافی نہیں ہو سکیگی۔ مولانا مرحوم اب ہم سے جدا ہو چکے ہیں لیکن ہمارے لئے ایک بہت بڑا کام چھوڑ گئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ان کے نقش قدم پر چل کر ملک و وطن کی بے غرضانہ خدمت کی جائے اور اس جمعیۃ علماء کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنایا جائے جس سے کہ مولانا کو عشق تھا۔ اب دیکھنا ہے کہ مولانا مرحوم کے قدرداں کس حد تک اپنے فرض کو پورا کرتے ہیں۔"

پیام حق کراچی

جمعیۃ علماء ہند کے سکریٹری اور بھارتی مسلمانوں کے دکھ درد کا مداوا مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی دنیائے فانی سے منہ موڑ گئے ۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو بھارت کے مجبور و مقہور مسلمانوں کو آپ کی وفات سے جو صدمہ پہونچا ہے اس کی تلافی خدا ہی کرے تو ہو ورنہ بظاہر کوئی امید نظر نہیں آتی۔

مولانا کی وفات سے بھارت کے مسلمانوں کا یقیناً دل ٹوٹا ہے اور یہ ایسا سانحہ ہے جسے سنکر پاکستانی مسلمان بھی تڑپ اٹھے ——— مگر جو اللہ چاہتا ہے وہ ہوتا ہے۔ مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید اور مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد مولانا کی ذات بھارتی مسلمانوں کے لئے بہت بڑا سہارا تھی۔ افسوس وہ سہارا ٹوٹ گیا۔ مسلمانوں کی خدمت سبھی نے کی تھی! لیکن مولانا سیوہاروی مرحوم نے انتہائی خطرناک اور نامساعد حالات میں جس طرح اپنی کوششوں کو جاری رکھا تھا اسے تاریخ میں ایک درخشاں باب کی حیثیت حاصل رہے گی۔"

بھارتی مسلمانوں پر کانگریسی ہندوؤں کی طرف سے زیادتیاں ہوں یا مہا سبھائی درندے حملہ کریں۔ مسلمانوں کو تیر ستم کا نشانہ دہلی میں بنایا جائے یا یوپی، سی پی کے کسی شہر میں۔ مولانا ہر جگہ جان ہتھیلی پر لے کر پہونچے، اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے اور حکام ضلع کو جھنجھوڑتے، پارلیمنٹ میں شور مچاتے، وزیر اعظم اور صدر سے ملتے اور صوبائی وزراء اور حکام کے نام احکام نافذ کراتے یہ سب کچھ صرف اسی لئے کرتے کہ بھارت کی مجبور مسلم اقلیت پر ظلم کے دروازے بند ہوں اور وہ چین کا سانس لے سکے۔

مولانا مرحوم کئی ماہ سے علیل تھے۔ رات دن تک کام کی کثرت نے علاج ہی کا موقعہ نہیں آنے دیا۔ اور جب توجہ کی تو مرض اتنا بڑھ چکا تھا کہ ایک ماہ امریکہ میں علاج کرانے کے بعد بھی صحت یاب نہیں ہو سکے۔ بلا شبہ بھارت میں مسلمانوں کی تکالیف کا احساس، کام کا دباؤ اور بھارت کے متعصبوں کی معاندانہ روش، مولانا کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھاتی رہی۔ اور مولانا کی معمولی بیماری بڑھتے بڑھتے موت کا پیام بن گئی۔

خدا کے فضل سے بھارت میں آج بھی کئی کروڑ مسلمان موجود ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند بھی ہے۔ اور دینی مرکز دیوبند بھی ہے۔ مگر شعلہ بیان اور مخلص رہنما کی وفات نے جو خلا پیدا کیا ہے اس کے دور ہونے کی جلدی امید نہیں معلوم ہوتی۔"

مولانا زبردست عالم، بے مثال مقرر اور بہت نامور مصنف تھے ۱۹۲۱ء سے سیاست میں قدم رکھا بڑے بڑے نازک موقعے آئے مگر ہمیشہ ثابت قدم رہے، نہ زبان رکی اور نہ قلم میں کمزوری آئی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے ان کا صحیح جانشین پیدا فرمائے۔

ادارہ پیام حق حضرت مولانا کے ورثا سے اس صدمہ عظیم کے سلسلہ میں اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور بھارت کے مسلمانوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ مایوس نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں اور جمعیۃ علماء ہند کے زیر علم و ہدایت منظم و متحد رہنے کی کوششوں کو کسی وقت فراموش نہ ہونے دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا مددگار اور کارساز ہے

انوار اسلام بنارس

انوار اسلام کے اس خصوصی صفحہ کو ہم اس مرتبہ حضرت مجاہد ملتؒ کی نذر کر رہے ہیں ۲ر اگست کو مولانا حفظ الرحمٰن کا انتقال ہو گیا کتنی مختصر اور چھوٹی سی بات ہے۔ دو لفظوں کی لیکن یہ چھوٹی سی بات کتنی بڑی بات ہے۔ اپنے اندر کتنی شرح و تفصیل لئے ہوئے ہے کتنی ہنگامہ خیز تاریخ کی حامل ہے۔ کتنا بڑا المیہ ہے ملت اسلامیہ کا کتنا عظیم حادثہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور حضرت مولانا مدنیؒ کے بعد ملت اسلامیہ کے سینے کا یہ تیسرا زخم ہے۔ نہ وہ دونوں زخم بھرے نہ یہ بھرے گا۔ نہ مولانا آزاد اور مولانا مدنی کا کوئی بدل تھا۔ اور نہ مولانا حفظ الرحمٰنؒ کا کوئی بدل ہے۔ وہ بھی منفرد تھے اور یہ بھی منفرد۔

مسلمانان ہند کی تاریخ کے اس تاریک دور میں مولانا حفظ الرحمٰنؒ چل چل کر

پگھلنے والی اور پگھل پگھل کر جلنے والی ایک شمع تھے جو اس اندھیری رات میں مسلمانوں کے تاریک دلوں میں زندگی کے عزم و استقلال کی شمع روشن رکھتے تھے، ان کی وفات سے ملت اسلامیہ پر ایک گہری تاریکی چھا گئی ہے۔

جمعیۃ العلماء کی ایک عظیم الشان تاریخ ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن رح اس تاریخ کا آخری صفحۂ زریں تھے۔ اس آخری دور میں جمعیۃ العلماء عبارت تھی مولانا حفظ الرحمٰن رح کی ذات سے۔ جمعیۃ کا نظام ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے مسلمان علماء خواص اور عوام کی ایک کثیر تعداد اس سے وابستہ ہے۔ مگر وہ ایک جسد ہے۔ جمعیۃ کی روح رواں مولانا حفظ الرحمٰن تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن رح کا سب سے بڑا ملی کردار اس وقت ظاہر ہوا جب ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کی حد تک آٹھویں بار دہلی لوٹی گئی۔ مغل سلطنت کی تباہی کے بعد یہ دوسرا بڑا دن تھا جو مسلمانوں کو دہلی میں دیکھنا پڑا۔ اس وقت مولانا حفظ الرحمٰن نے اسی کردار کا مظاہرہ کیا جس کا مظاہرہ امام ابن تیمیہؒ نے بغداد کی تباہی کے وقت کیا تھا۔ مولانا کے نزدیک اپنی جان کے لئے نہ کوئی خطرہ خطرہ تھا اور نہ کوئی حادثہ حادثہ، ان کو فکر تھی تو مسلمانوں کے بچانے کی، وہ ان کو بچانے کے لئے ہر خطرہ میں بے باکانہ کود پڑتے تھے، نہ ان کو دن کے کھانے کی فکر تھی نہ رات کو سونے کی، گویا وہ ایک خدا کے مامور کئے ہوئے فرشتے تھے جن کا صرف یہی کام تھا، اس لئے مولانا نے جو کارنامہ انجام دیا وہ اپنی حقیقی صورت میں تاریخ کے صفحات پر نہ آسکے گا۔ اِلّا یہ کہ مولانا کے قریبی کوئی تمام حالات سے باخبر جیسے مولانا محمد میاں صاحب، مولانا کے سوانح حیات لکھیں اور اس میں دہلی کے اس حادثہ کے پس منظر اور پیش منظر کے خدوخال کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کریں جس میں مولانا آزادؒ کی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" سے بھی خصوصی مدد لی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ دہلی کے اس ہنگامے میں بظاہر صرف مسلمانان دہلی کے تحفظ کے لئے کام کیا لیکن دراصل مسلمانان دہلی کی تباہی کے پس منظر میں پورے ملک کے مسلمانوں اور خود ملک کی تباہی مضمر تھی۔ دہلی ہندوستان کا قلب ہے۔ قلب کی حالت بگڑ جاتی ہے تو جسم کی جو حالت ہو جاتی ہے وہ معلوم ہے۔ دہلی کی آگ دہلی میں نہ بجھ جاتی تو وہ پورے ملک کو اپنے لپیٹ میں لے سکتی تھی۔ اِس آگ کے بجھانے میں گاندھی جی کے خون کے ساتھ مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن کے ہاتھ نے برابر کا کام کیا۔

دہلی کے بعد جب ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں پر پے بہ پے مصائب اور حادثات کے پہاڑ ٹوٹنے لگے تو مولانا حفظ الرحمٰن رح سراپا برق بے تاب بن گئے۔ پھر تو ان کی تڑپ اور بیقراری کی انتہا نہ رہی، وہ کبھی ملک کے ایک حصے میں ہیں تو کل دوسرے حصے میں جیسے انھوں نے پوری ملت کا بار تنہا اپنے سر اٹھا لیا۔ مولانا کی وطنی خدمتیں اتنی عظیم ہیں کہ وہ جہاں پہنچتے وہاں کی زمین ایک وزن محسوس کرتی۔ کانگریسی لیڈر اور حکومت کے عمال بھی ان کا احترام کرتے، مسلمانوں کے پست حوصلے بلند ہو جاتے اور ان کی ٹوٹی ہوئی آس بندھ جاتی۔ غم ہے تو یہ ہے کہ مولانا کے بعد اب پوری ملت میں ان کے جیسی ملک گیر باوزن اور بلند بانگ کوئی شخصیت موجود نہیں ہے۔ مولانا کی گوناگوں خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ دین کے جتنے بڑے عالم تھے اتنے ہی بڑے صاحب زبان و قلم بھی تھے، اللہ تعالےٰ مولانا کو اپنی خصوصی رحمتوں سے نوازے اور اپنے نزدیک بلند مقام عطا فرمائے۔!

ماہنامہ میثاق لاہور

اخبارات سے یہ معلوم کر کے بڑا صدمہ ہوا کہ جمعیۃ علماء ہند کے ناظم اعلیٰ مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہاروی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ حادثہ مسلمانوں کی پوری قوم کے لئے ایک بڑا اہم حادثہ ہے۔ جو لوگ آج پاکستان کے گوشۂ امن و عافیت میں پہنچ کر بھارت میں اپنے چھ کروڑ مسلمان بھائیوں کو دلوں سے نکال بیٹھے ہیں وہ تو اس حادثہ کی اہمیت کا کماحقہ اندازہ نہیں کر سکیں گے لیکن جو لوگ ہند کے مسلمانوں کو بھولے نہیں ہیں اور انہیں اس مظلومیت کا بھی اندازہ ہے جس میں اس وقت ہمارے یہ بھائی مبتلا ہیں، وہ کچھ اندازہ کر سکیں گے کہ مولانا مرحوم کی ذات ان کے لئے اس دور ابتلاء میں کتنا بڑا سہارا تھی۔ وہ فی الواقع ایک نڈر اور بہادر مسلمان تھے۔ انہوں نے تقسیم ملک کے بعد کے خطرناک حالات کا نہایت دانشمندی، نہایت بردباری، نہایت صبر و استقلال اور نہایت عزم و حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنی قوم کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ میرا ذاتی تاثر تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھارت کے مسلمانوں کی خدمت کی جو توفیق انہیں میسر آئی اس میں کوئی دوسرا مشکل ہی سے ان کے برابر ہو سکے گا۔ انہوں نے ملک کی مشترک جدوجہد آزادی میں جو نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس کی وجہ سے کانگریسی حلقوں پر ان کا خاصا اثر تھا۔ انہوں نے اپنے اس پورے اثر کو بالکل بے لوث اور بالکل بے خوف ہو کر اپنی قوم کی حمایت و مدافعت میں صرف کیا۔ اللہ تعالےٰ مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے پوری قوم کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے اور ہند کے مسلمانوں کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ ایک زمانہ میں مولانا مرحوم کے ساتھ راقم کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ اب یہ

تعلقات تو دوری کے سبب سے ختم ہو چکے تھے لیکن اس دور میں مسلمانوں کی جو خدمت وہ کر رہے تھے اس کے سبب سے ان کی محبت اور ان کی قدر و عزت دل میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اللہ تعالےٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اب یہ دعائے مغفرت ہی واحد سوغات ہے جو اس مجاہد ملت کے لئے اتنی دور سے ہم بھیج سکتے ہیں ہم میثاق کے تمام قارئین سے بھی مولانا کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں۔

فاران کراچی

اب سے تیس سال پہلے کی بات ہے جب حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیدرآباد دکن تشریف لے گئے تھے اور وہاں کے مشہور دیندار وکیل مولوی فیض الدین مرحوم کے یہاں قیام فرمایا تھا۔ انہی کے ساتھ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب حیدرآباد پہلی مرتبہ آئے۔ اس وقت انہیں عوام بہت ہی کم جانتے تھے۔ یہ ان کی شہرت کے آغاز کا زمانہ تھا۔ پھر حضرت مولانا انور شاہ صاحب کی عظیم شخصیت کے ہوتے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن کی طرف عوام اور خواص کے متوجہ اور رجوع ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

میں نے انہیں حیدرآباد میں دوبار دیکھا۔ مولوی فیض الدین کے یہاں اور عابد شاپ کے سامنے سے گذرتے ہوئے کھدر کا کرتا۔ کھدر کا پاجامہ اور اسی کی ٹوپی گھنی ڈاڑھی۔ ان کی صورت، چال ڈھال اور وضع قطع کو دیکھکر ان کی طرف دل کھنچتا تھا۔ تقریباً چودہ سال کے بعد جب میں حیدرآباد چھوڑ کر اور بمبئی میں فلم کے چکّر سے نکل کر دلی آگیا تو مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم سے حصول نیاز کے بارہا موقعے ملے! وہ جب بھی ملتے بڑی خندہ پیشانی اور تپاک کے ساتھ ملتے! دلی کی جامع مسجد کے سامنے بالاخانہ پر ادارۂ شرقیہ تھا۔ وہاں ہر جمعہ کو ندوۃ المصنفین کے ارکان اور دوسرے اہل علم اور احباب جمع ہوتے چائے کا دور چلتا اور دو چار شاعر آجاتے تو چھوٹی سی بزم شعر و سخن بھی منعقد ہو جاتی۔ اسی بزم احباب میں مولانا مرحوم سے ملاقات ہوتی رہی۔ شعر کا وہ خاصہ ذوق رکھتے تھے اور اچھے شعروں پر ان کی داد دینے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ سخن فہم ہی نہیں، شعر کے ناقد بھی ہیں اور کیا عجیب ہے کہ اپنی جوانی کے آغاز میں انہوں نے شعر بھی کہے ہوں۔

مولانا مرحوم سے میری مفصل اور طویل ملاقات آگرہ میں ہوئی یہ غالباً ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے میں اپنے ایک عزیز کے یہاں ریاست رام پور میں مقیم تھا ان دنوں وہاں بڑی دھوم دھام کی نمائش ہو رہی تھی، آل انڈیا مشاعرہ بھی تھا۔ جناب اعجاز صدیقی مدیر "شاعر" کا دعوت نامہ ملا کہ سال کے سال قصر الادب کی جانب سے سیرت النبی کا جلسہ اور نعتیہ مشاعرہ ہوا کرتا ہے۔ تمہیں اس میں ضرور شریک ہونا پڑے گا۔ میں نے جواب دیا کہ مشاعرے میں شریک نہ ہو سکوں گا ہاں! سیرت کے جلسہ میں شرکت کی سعادت ضرور حاصل کروں گا۔ اور جو نعتیہ کلام میں مشاعرے میں سناتا۔ وہ جلسہ میں سُنا دوں گا۔ بات پکی ہو گئی۔ میں رام پور سے آگرہ پہونچا اور مجھے ہوٹل کے جس کمرے میں ٹھیرایا گیا۔ اس میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم پہلے سے قیام فرما تھے۔ علیک سلیک کے بعد مصافحہ معانقہ ہوا۔

یہ وہ دور تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان اختلافات کی خلیج اتنی گہری تھی کہ اس کی تھاہ نہ ملتی تھی۔ مولانا اس جمعیۃ علماء کی روح رواں تھے جو کانگریس کی ردیف بلکہ اس کا دست وبازو تھی، جمعیۃ علماء اس کا ساتھ چھوڑ دیتی تو۔۔۔۔

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

۔۔۔ ۔۔۔ انڈیا کانگریس، آل انڈیا ہندو کانگریس" بن کر رہ جاتی۔ مولانا مرحوم سے اس وقت کے سیاسی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ بعض اکابر دیو بند اور جمعیۃ العلماء سے جماعت اسلامی کے اختلافات اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا بھی ذکر آیا۔ ان کی عالی ظرفی تھی کہ میری بعض تند و تیز باتوں پر وہ چیں بہ چیں تک نہیں ہوئے شب کا کھانا ساتھ ہی کھایا۔ پھر ہم ساتھ ہی جلسہ گاہ میں پہونچے، شیب محمدیہ ہائی اسکول کے کمپاؤنڈ میں شامیانہ تنا ہوا تھا۔ حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔

اس جلسہ کا یہ واقعہ جب بھی یاد آجاتا ہے تو ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آجاتی ہے۔ کہ قصر الادب (اکبرآباد) کے زیر اہتمام سیرۃ النبی کا یہ جلسہ شروع ہی ہونے والا تھا کہ ایک صاحب خوش پوش، خوش شکل ہاتھ میں موٹی سی چھڑی لئے ہوئے اسٹیج پر پہونچے اور پہونچے کیا خود ہی لمبی لمبی ڈگیں بھرتے دندناتے ہوئے علماء کی صف میں جا دھمکے، اور فرمایا کہ میں تقریر کرونگا! ان کا چہرہ خاصہ وجیہ تھا۔ ڈاڑھی سے، لباس سے اور وضع قطع سے عالم نظر آتے تھے۔ ان کا نام پوچھا گیا۔ گرجدار آواز میں ارشاد ہوا۔

"اورنگ زیب عالمگیر"

قرآن کریم کی تلاوت کے بعد وہ صاحب تقریر کے لئے کھڑے ہوئے اور آغاز ہی بے ربط جملوں سے کیا۔ اہمال و بے ربطی کی یہ "لے" بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ مجمع کے اضطراب اور ناپسندیدگی کو دیکھکر انہیں تقریر کرنے سے روک دیا گیا! بعض بے تکے شاعروں کو تو مشاعروں میں ذلیل ہوتے دیکھا ہے مگر کسی مقرر کی ایسی ذلت دیکھنے میں نہیں آئی۔!

اس جلسہ کی کامیابی کا سہرا مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے سر رہا۔ ایسی دلآویز

اور کیف انگیز تقریر کی کہ سننے والے جھوم جھوم گئے۔ اس واقعہ کے دو سال بعد ہندوستان کی تقسیم عمل میں آگئی اور ملک کے طول و عرض میں وہ خونیں ہنگامہ برپا ہوا جس کی مثال تاریخ میں کم ہی ملیگی۔ اس کو ہجرت کہئے، فرار سے تعبیر کیجئے۔ لاکھوں مسلمانوں کی طرح میں بھی پاکستان چلا آیا یہ ۱۹۴۷ء کے آخر کی بات ہے۔ اب ۱۹۶۲ء ہے اس پندرہ سال کی مدت میں مشاعروں کے طفیل تین بار ہندوستان جانا ہوا۔ مگر کہاں؟ مدراس، بمبئی، احمد آباد، اپنے وطن کے دیکھنے کے لئے اب تک دل و نگاہ ترس رہے ہیں۔۔۔۔ ضلع بلند شہر اور دلی کا سرانہ قریب قریب ملا ہوا ہے۔ دلی سے ریل میں چلے، شاہدرہ پہونچے، پھر غازی آباد آیا۔ اس کے بعد بلند شہر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اُدھر جانا ہو جاتا تو دلی ضرور جاتا اور مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم سے لازمی طور پر نیاز حاصل کرتا! یہ تمنا دل کے دل ہی میں رہ گئی! عالم برزخ میں روحوں کا ایک دوسرے سے ملنا ہوتا ہوگا۔ یہ تمنا مرنے کے بعد ہی پوری ہو سکے گی۔

مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ اپنی ذہانت، تقریر اور علمی شغف کی بدولت دینی حلقوں میں متعارف ہو گئے تھے اور ان کا شمار ممتاز ترین طلباء میں ہوتا تھا۔ درس نظامی کی تکمیل کے بعد انھوں نے درس و تدریس اور دینی علوم کے مطالعہ کے سلسلہ کو جاری رکھا۔ ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت پائی جاتی تھی۔ وہ دینی رہنما تھے، سیاسی لیڈر تھے، شعلہ بیان مقرر تھے اور ساتھ ہی بلند پایہ مصنف بھی! ندوۃ المصنفین جیسے اونچے درجے کے علمی ادارے کی بنا انہی نے ڈالی تھی۔ ان کی تحریر میں علمی سنجیدگی اور دینی فکر کے ساتھ ادبی دل کشی بھی پائی جاتی تھی ان کی تصانیف میں "قصص القرآن" کو بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ تقریر و خطابت میں وہ آپ اپنا جواب تھے، شعلہ نوا بھی اور شبنم فشاں بھی! تقریر، تحریر، اور ذہانت میں مولانا ابوالکلام آزاد سے کم مگر دینی شغف اور ارکانِ شریعت کی پابندی میں ان سے بڑھ کر! انگریزی دورِ حکومت میں آزادی، بے باکی اور حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں! سیاسی مسلک میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمتہ اللہ علیہ کے قدم بہ قدم پیرو۔ مسلم لیگ کی مخالفت کی مگر شائستگی کے ساتھ! تقسیم ہند کی مخالفت انھوں نے کسی لالچ میں آکر نہیں کی، وہ نیک نیتی کے ساتھ یہی سمجھتے تھے کہ ملک کے اس بٹوارہ سے مسلمانانِ ہند کو نقصان پہونچے گا۔ پاکستان بن گیا تو دینی اخوت کی بنا پر اس کے استحکام و بقا کے متمنی اور خیر خواہ رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی میں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کی نگاہیں مولانا حفظ الرحمٰن کی طرف اٹھتی تھیں اور مولانا آزاد کی وفات کے بعد تو انہی کے تنہا ذات وہاں کے مسلمانوں کا مرجع سمجھی جاتی تھی، آخری زمانے میں انھوں نے بھارت کی پارلیمنٹ کو اپنی تقریروں سے ہلا ہلا دیا کس قدر جرأت و بیباکی کے ساتھ حکومت پر تنقید کی! خاص طور پر اردو زبان کی حمایت میں ان کا جوشِ عمل اور سرگرمی مثال اور یادگار بن کر رہے گی۔ چند سال سے تو وہ ملک و ملت کی ملکیت و متاع اور سراپا خدمتِ خلق بن کر رہ گئے تھے۔ دن رات کا زیادہ وقت دوسروں ہی کے کام آتا تھا اُن کی صحت لوگوں کی غمخواری ہی کی نذر ہو گئی! بھارت کے سب سے بڑے نیتا پنڈت جواہر لال نہرو سے ان کی انتہائی خوشگوار تعلقات تھے۔ ہندوستانی حکومت میں مولانا مرحوم کی بڑی عزت تھی۔ ان کی بلند پایہ شخصیت کے سامنے حکومت کے وزیر تک کچھ نہ کچھ دبتے ہوئے ہی نظر آتے تھے۔

آہ! وہ اس وقت دنیا سے رخصت ہوئے۔ جب ہندوستان کے مسلمانوں کو اُن کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ ان کی موت نے کروڑوں دلوں کو سوگوار بنا دیا۔ اللہ تعالےٰ آخرت میں ان کے درجات بلند فرمائے (آمین)

(از مولانا مفتی جمیل الرحمٰن سیوہاروی)

نوحۂ غم

اپنے عمِ مکرم حضرت مولانا حفظ الرحمان کی یاد میں

ہے زمیں کی آنکھ نم گردوں کو رونے کیلئے
صبر ہے خنجر لئے اپنے چبھونے کیلئے
حوصلے تیار ہیں خود جان کھونے کیلئے
دل میں گنجائش نہیں اب غم سمونے کیلئے
ضبط و تسکیں کی کرے تلقیں کسے فرصت ہے آج
وجہِ تسکینِ جہاں کی ہم سے خود رخصت ہے آج

ہر فرنگی کو ابھی تک اس کی ہمت یاد ہے
گوشِ ایوانِ حکومت کو وہ جرأت یاد ہے
طالبانِ علم کو اس کی محبت یاد ہے
جو ملے اک بار ان کو اس کی صورت یاد ہے
ہے تصور اس کا آنکھوں میں کہ تصویرِ وفا
اس کا سایہ تھا سروں پر یا کہ تھا ظلِ خدا

وہ کہ جسکی بات میں فوجِ حسینی کا تھا زور
تھی زباں یا ذوالفقارِ کربلا اب تک ہے شور
ناتواں تھا نختۂ دشمن مثالِ جانِ مور
اسکی اک جنبش زباں کی، اس طرف باتیں کرور
کانپتے تھے دشمنِ حق اس کا جب نام آگیا
وہ سپاہی آہ پر میدان میں کام آگیا

طول و عرضِ ملک میں پھرتا تھا مثلِ پاسباں
آج آیا ہے یہاں تو کل کو جانا ہے وہاں
تا نہ اس کے ہوتے پہنچے قوم و ملت کو زیاں
بے زبانی کا کرے شکوہ نہ کوئی بے زباں
بن کے دامن پونچھتا تھا دیدۂ گریاں کو وہ
دیکھ سکتا تھا نہ مشکل میں کسی انساں کو وہ

بے لحاظِ مذہب و ملت غریبوں کا رفیق
جن کے سر پر باپ کا سایہ نہ ہو انکا شفیق
ڈانٹتے پھٹکارتے ہوں سب جنھیں ان سے خلیق
کون ہوگا اشکِ بیوہ کی طرح دل کا رقیق
اپنی چادر غیر کے زخموں پہ اب ڈھانپے گا کون
بے سہاروں کو کمر پہ اپنی اب لادے گا کون

خدمتِ قومی کو اٹھیں گے ابھی لاکھوں بشر
پر کہاں سے لائیں گے وہ اسکا دل اسکا جگر
مسئلے سلجھانے کی خاطر کھپائیں گے وہ سر
اپنی ہمت تک کریں گے جستجو میں سنو مگر
جو کبھی پوری نہ ہوگی وہ کمی رہ جائے گی
ہاتھ ملتی رہبروں کی رہبری رہ جائے گی

از:- محمد عرفان

مجاہدِ ملّت کلکتہ کے اجلاس میں - فروری ۱۹۵۵ء کا ایک تاثر

مولانا اخلاق حسین قاسمی

سفر کی حالت میں ساتھی کا تجربہ ہوتا ہے اور کانفرنسوں کے موقعہ پر لیڈروں کی صلاحیتوں کا۔ کلکتہ میں جمعیۃ العلمائے ہند کی سالانہ کانفرنس ہوئی۔ اس میں ملت کے تمام رہنما اکابر جمع ہوتے۔ ہر مکتب خیال کے علماء و مشائخ ہر نقطۂ نظر کے حامی و علمبردار۔ اور پھر ایسے اکابر بزرگ جن میں ہر بزرگ اپنے رنگ میں ممتاز۔ اپنی صلاحیتوں میں نرالا۔ ان سراپا اخلاق و ایثار بزرگوں کے درمیان فرق کرنا نہ تو اپنے بس کی بات ہے نہ اپنے لئے موزوں ہے۔ البتہ اس بات کے اظہار کے لئے قلم بے تاب ضرور ہے کہ جو شخصیت کانفرنس کے ہر منظر میں نمایاں ہر کام میں آگے اور ہر نظر کا مرکز تھی وہ وضع قطع کی ایک بالکل سادہ سی شخصیت تھی جسے حفظ الرحمٰن کہتے ہیں۔ مہمانوں کا خیال اُن کا استقبال، کھانے پینے کا دھیان۔ قیام گاہ پر بڑے چھوٹوں کی دیکھ بھال۔ یہ رضاکارانہ کام ہیں۔ ان میں ایک مستعد سپاہی کی طرح بھاگ دوڑ۔ مجلس مضامین میں بحث و مباحثہ، اجلاس عام میں خطاب و تقریر، یہ عالمانہ اور مدبرانہ ذمہ داریاں ہیں۔ ان میں ایک کامیاب قومی اور ملّی وکیل کی طرح حکومت اور عوام دونوں کے حقوق کی ترجمانی خدمت و عظمت کے ان دونوں موقعوں پر نمایاں۔ ممتاز، ماحول پر چھایا ہوا اگر کسی کو دیکھا تو وہ مجاہدِ ملت تھے۔ ہم ان کے بے پناہ جذبۂ عمل کے پیش نظر انہیں مجاہد ملّت کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ جس درجہ کے عملی آدمی ہیں اسی درجہ کے صاحب فکر و فہم بھی ہیں، کلکتہ کے اجلاس میں میرے ساتھ بعض ایسے دوست بھی تھے جنہوں نے دلّی سے باہر سالانہ اجلاس کی گھما گھمیوں اور مختلف انتظامات کی مصروفیتوں میں پہلی مرتبہ مولانا کو اتنے قریب سے دیکھا۔ ایک انتھک کام کرنے والے لیڈر کی حیثیت سے انہوں نے مولانا کو ہمیشہ دیکھا تھا اور دلّی والوں سے زیادہ مولانا کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے واقف بھی کون ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک حقیقی جمہوریت پسند ملک و ملّت دونوں کے محبوب۔ ملّی وحدت کے واحد علمبردار رہنما کے روپ میں دیکھنے کا پہلا موقعہ تھا جو انہیں کلکتہ کانفرنس میں نصیب ہُوا۔ ارکان مرکزیہ کی میٹنگ میں جمعیۃ العلمائے ہند کے دستور پر بحث جاری تھی۔ ترمیمات کے سلسلہ میں مختلف صوبوں کی نمائندگی کا مسئلہ زیر غور تھا۔ معاملہ کی نزاکت نے ہاؤس میں گرما گرمی پیدا کر دی تھی۔ مولانا مجلس عاملہ کی تجویز کی حمایت میں بول رہے کچھ حضرات اس میں ردو بدل چاہتے تھے دونوں طرف سے تقریریں ہو رہی تھیں۔ جب سب حضرات بول چکے تو مولانا نے نہایت اختصار کے ساتھ عاملہ کی تجویز کو واضح کیا۔ گفتگو صاف تھی، دلائل معقول تھے۔ ہاؤس کا رنگ بدل گیا اور رائے شماری ہوئی اور اکثریت نے عاملہ کی تجویز کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ میں اور میرے چند ساتھی جہاں عاملہ کی تجویز سے مطمئن نہیں تھے وہاں اس ترمیم کو بھی کافی نہیں سمجھتے تھے جو پیش تھی اس لئے ہمارا خیال تھا کہ بہتر ہو کہ دونوں ترمیمیں ایک سب کمیٹی کے حوالہ کر دی جائیں لیکن مولانا نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور ہمیں رائے شماری میں غیر جانبدار رہنا پڑا۔

ہمیں مولانا سے بہت قریب سمجھا جاتا ہے اس لئے رائے شماری میں ہماری غیر جانبداری ان دوستوں کے لئے تعجب کا باعث ہوئی۔ ممکن ہے انہوں نے اپنے دل میں یہ سمجھا ہو کہ مولانا ان لوگوں سے ناراض ہوگئے ہوں گے۔ بات ختم ہوگئی۔ کھانا کھا کر ایک دوست سے ملاقات ہوئی۔ اجلاس کی گرما گرمی کا ذکر چھڑا۔ وہ بولے مولانا سے ایک صاحب کہہ رہے تھے۔ فلاں۔ فلاں صاحب نے جو اصلی ترمیم کے خلاف ووٹ دیا مولانا نے فرمایا یہ بہت خوشی کی بات ہے اس سے جماعتی زندگی کے ساتھ دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے یہ جماعتی زندگی کے استحکام کی علامت ہے ان جملوں کو اُن دوستوں نے بڑے غور سے سنا اور ہنس کر کہنے لگے اپنوں اور غیروں کی مخالفت کے باوجود جمعیۃ العلماء کے دِن دُگنی رات چوگنی ترقی کرنے کا اصل راز یہ ہی ہے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ دوسروں کی رائے کا احترام کرنا اجتماعی زندگی میں ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی دینا وہ عالی ظرفی اور بلند حوصلگی ہے جس کے بغیر جماعتوں کا چلنا اور کسی نصب العین کی طرف بڑھنا مشکل ہوتا ہے جماعت کے ارکان میں جب یہ روح پیدا ہو جاتی ہے تو عوام میں بھی یہ ایثار ابھر آتا ہے کہ وہ ذاتی مفاد کو جماعتی مفاد پر قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ آج کے حالات بہت نازک ہیں جس دور سے ہم گذر رہے ہیں اس کے تقاضے بہت پیچیدہ ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اس صورت حال کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اگر ایک طرف اقلیت کی مشکلات ہیں اور اس کا تقاضہ ہے کہ حکومت پر نکتہ چینی ہو تو دوسری طرف آزاد ہندوستان کی تعمیر کے لئے ہر شخص کا تعاون اور محنت درکار ہے اور اس کا تقاضہ ہے کہ مسلمانوں میں وطن اور اہل وطن کی محبت کے جذبہ

کو بڑھایا جائے اور انہیں یقین دلایا جائے کہ ملک کی ہر ترقی میں ان کا حصہ ہے۔ ان دونوں صورتوں کو سامنے رکھ کر زبان سے کوئی بات نکالنا ہی دانشمندی ہے جس کی اِس وقت ملک کو ضرورت ہے۔

ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مجاہدِ ملّت کو قدرت نے اس کمال پر قابو عطا فرمایا ہے۔ ان کی پُر وقار خطابت میں حکومت کے لئے تنبیہ اور للکار بھی ہوتی ہے اور عوام کے لئے محبت وطن کا پیغام بھی۔ وہ ارکان حکومت کو بتاتے ہیں کہ کسی حکومت میں ایک مظلوم انسان کا وجود بھی اس کے لئے خطرناک ہوتا ہے اور وہ عوام کو بھی ہشیار کرتے ہیں کہ ملک میں تماشائی کی حیثیت سے رہنے والوں کو کبھی ملک کی فلاح و بہبود میں سے کچھ حصہ نہیں ملتا۔ وہ نکتہ چینی کرتے ہیں لیکن ایک بھونڈے اور جذباتی مقرر کی طرح نہیں بلکہ ایک دُور اندیش مدبر کی طرح تعمیری نکتہ چینی نہ کہ تخریبی۔ کلکتہ کے اجلاس میں بڑے بڑے نازک مسئلے زیر بحث آئے۔ کسٹوڈین کے عملہ کی ستم رانیاں، مساجد کی تباہ حالی، مغربی بنگال کے برباد مسلمانوں کی آباد کاری وغیرہ۔ اِن سب تجویزوں پر مجاہدِ ملّت نے جس اثر انگیز وضاحت اور پُر زور استدلال کے ساتھ عوام کو خطاب کیا وہ مولانا ہی کا حصّہ تھا۔

اعوذ باللہ العلی العظیم من الشیطٰن الرجیم

۱۹ ع ۶۲

بسم اللہ العزیز العظیم الرحمٰن الرحیم

۱۹ ع ۶۲

چند جامع قطعات تاریخ

۱۹ ع ۶۲

آہ شمع خاموش ہے آج

۱۳ ھ ۸۲

آہ۔ غروب مہ کامل

۱۳ ھ ۸۲

ذکرِ صدمہ شدیدہ

۱۳ ھ ۸۲

مجاہدِ دین و حق کے اوپر قرآن پڑھ کر سلام کہہ کر
قمر نے سالِ وصال پایا "حبیبِ ذی احترام" کہہ کر

۱۳ ھ ۸۲

اے مجاہد اے محبّ مُلک اے سالارِ قوم شق ہے عالم کا کلیجہ چشمِ دل ہے اشکبار
سالِ رحلت یوں قمر لکھتا ہے باحزن وملال ایک عالم غم نشین ہے "اے محبّ غم گسار"

۱۳ ھ ۸۲

رقیمہ کمترین سلطان الدین قمر الحمیدی سنبھلی

۱۹ ع ۶۲

مسٹر ریاض الدین احمد۔ پرنسپل مجیدیہ اسلامیہ کالج۔ الہ آباد۔

وہ بھی ہم سے جُدا ہو گئے

انیسویں صدی افق ہند پر موتیاں بکھیر رہی ہے۔ کوئی میدان نہیں جو گہر باری سے خالی ہو۔ حکمت و فلسفہ علم و دانش۔ سیاست و حکمرانی۔ روحانیت اور مادیت ہر ہر سطح پر ایک نہیں کئی کئی گہر ہائے آبدار درخشاں نظر آتے ہیں صدی اپنے اختتام پر ہے مشیت کی گہر باری کا یہ تاریخی موڑ ختم ہو رہا ہے۔ مگر ابھی ایک ستارہ سرزمین ہند سے اُبھرنا باقی ہے۔ قوم و ملت کا ایک بے مثال رہنما۔ دین حق کا ایک زبردست محافظ۔ جنگ آزادی کا ایک سربلند قائد۔ حرص و ہوا سے مُبرّا۔ خلوص و محبّت کا مجسمہ۔ اسلام کا پاسبان اور اللہ کا مجاہد ابھی آرہا ہے۔ مبارک ہے وہ گھرانا جس نے انہیں جنم دیا۔ مبارک ہے وہ سرزمین جس نے انہیں پالا اور پوسا۔ مبارک ہے وہ دور جس میں اُس کی صلاحیتوں نے ضوفشانی کی۔ دیوبند میں وہ چمکے۔ پارلیمنٹ ان کی گرم گفتاری سے سرفراز ہوئی۔ خاص و عام دل کی گہرائیوں میں انہوں نے جگہ پائی۔ ملک کا گوشہ گوشہ اُن کی بے لوث خدمت سے منور رہا۔ ہم خیال اُن کے دوست ہوتے مخالفوں نے ان کی محبت میں پناہ لی۔ مجاہدوں نے ان کی قیادت قبول کی۔ حق پرستوں نے ان کا دامن پکڑا۔ جو بھی اُن سے ملا ان کا گرویدہ ہوا۔ جس نے ان کو سنا ان کا دم بھرنے لگا

یہ ہیں جنہیں اللہ نے اپنی مشیت کے ارادوں کو پورا کرنے کے لئے پیدا کیا اور اسی مناسبت سے نام حفظ الرحمٰن رکھا۔ یہی آزادیٔ ہند کی آخری جنگ کے سپاہی ہیں اُن کی جنگ اِس وقت بھی جاری رہی ہے جب ملک قید فرنگ سے آزاد ہو کر قید حرص و ہوس میں مبتلا ہے۔ ہر ستم شعار سے مورچہ لے رہے ہیں، قوم و ملک کے ہر دشمن کے خلاف وہ آواز بلند کر رہے ہیں۔ مظلوموں کی حمایت کر رہے ہیں پستیوں میں گرنے والوں کو ابھارنا اُن کا مشغلہ ہے۔ ملک کے دشمنوں سے وہ برسرپیکار ہیں۔ زبان کے حق پر وہ لڑ رہے۔ اللہ کے سپاہی پیدا ہوتے۔ اللہ کے سپاہی زندہ رہے اللہ کے سپاہی مرے۔

انگریز کی غلامی ختم ہو گئی ہے۔ لال قلعہ پر آزادی کا پرچم لہلہا رہا ہے۔ شادیانے بج رہے ہیں۔ سڑکیں سجائی جا رہی ہیں۔ فوجیں آراستہ کی جا رہی ہیں توپیں سلامیاں دے رہی ہیں اور وہی جو جیلوں کی سلاخیں چوم رہے تھے محلوں کی زینت بن چکے ہیں۔ کوئی وزارت کے لئے بھاگا جا رہا ہے۔ کوئی ملازمتوں پر قبضہ جما رہا ہے کوئی تجارت و صنعت و حرفت کا میدان سر کئے ہوتے ہے غرض کہ قربان گاہ آزادی کا ہر مہرہ بڑھ چڑھ کر قربانی کی قیمت وصول کر رہا ہے۔ مگر اللہ کا ایک بندہ وقت کی اس گرم بازاری سے دور تماشائے جنوں کے مشاہدوں میں ہے اُسے وزارت کی تمنا ہے نہ عہدوں کی طلب۔ نہ جاہ و حشمت کی خواہش ہے نہ دولت کی ہوس۔ اس کے لئے تو وہی قاسم جان کی گلی جو پہلے تھی اب بھی ہے۔ وہی کمرہ۔ وہی فرش ہی لباس وہی غذا۔ ہاں قربانیوں کا کوئی صلہ ملا تو یہ کہ دل کا درد بڑھ چکا ہے۔

جمعیۃ العلماء ہند کا دفتر ریوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم بنا ہوا ہے۔ جدھر دیکھئے پھیلے ہوئے بستر اور لپٹے ہوئے ہولڈال نظر آرہے ہیں لوگ ہیں کہ جوق در جوق آرہے ہیں اِس کو آبادکاری والوں نے اجاڑ دیا ہے۔ گھر بیٹھے ہوئے لوگ ملک بدر قرار دے دئے گئے ہیں یہ مسجدوں اور قبرستانوں کی بحالی پر جان نثار کر رہے ہیں یہ اردو کے مرحوم کے نوحہ خواں ہیں۔ یہ کافرانہ نصاب تعلیم پر ماتم کر رہے ہیں یہ ان شہیدوں کے اہل و عیال ہیں جو جبل پور اور ساگر کے حادثات میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔ یہ مدھیہ پردیش کے وکلاء ہیں یہ یو پی کے ہیں۔ یہ بہار اور بنگال کے ہیں جو بھی ہیں ان کا وہی ہمدرد و غم گسار ہے۔ انہی کے یہاں اس کے غم کا علاج اور درد کا درماں بھی ہے۔ انکے علاوہ اور کس میں یہ ہمت ہے کہ جواہر لعل کا ہاتھ پکڑ کر کہہ دے کہ "میری قربانیاں تم سے کم نہیں ہیں اس لئے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ مجھے دوسرے درجہ کا شہری بنا سکے" انکے علاوہ کس میں یہ دم ہے کہ سرکار کے بارے میں پارلیمنٹ میں اعلان کر دے کہ آج کی حکومت میں انسانوں کی جانوں کے مقابلے میں ایک چیونٹی کی جان بھی زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ کون ایسا سرپھرا ہے جو مرگ اردو کی حمایت میں گیتا حکومت کو جھنجوڑنے سے باز نہ رہے۔ کون ہے جو خدمت خلق کے پیچھے اپنی جان کی پرواہ نہ کرے اپنے آرام و آسائش سے کنارہ کش ہو جاتے اور اپنی زندگی کو اسی طرح قربان کر دے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

تاریخ کے اوراق ۱۹۴۷ء کی داستان خون لکھ رہے ہیں اور لکھتے ہی رہینگے بے لبسوں پر مشق ستم کی کہانیاں سُنی جا رہی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ غریبوں۔ یتیموں اور بیواؤں کی پکاریں دامن عرش کو چھو رہی ہیں مگر اس دور سیہ بخت کے

مجاہد اعظم کے ذکر سے آج ملک کا گوشہ گوشہ معمور ہے۔ وہ پرکیف شخصیت روئے زمین سے اوجھل ہو چکی ہے مگر اس کی روحانی بلندیاں اب بھی موجود ہیں۔ اس کی مجاہدانہ طاقتیں آج بھی گرتوں کو اُٹھا رہی ہیں مجبوروں کو سہارا دے رہی ہیں۔ دشمنوں کے خلاف سیر ہیں اور حکومت کو جھنجھوڑ رہی ہیں۔ آج .... ہر پیچیدہ مسئلہ۔ اُن کی یاد تازہ کر رہا ہے اور محفل عمل کا گوشہ گوشہ انہیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تلاش کر رہا ہے

دستور کے بین السطور کو پڑھنا اور اس کی روشنی میں دینی تعلیم کے مسئلہ کو منظر عام پر لانا انہی کی دور رس نگاہوں کا کرشمہ ہے۔ یہ انہی کی پیش بینی کا نتیجہ ہے کہ ابھی آزاد ہندوستان اپنے نظام تعلیم کی روپ ریکھا مرتب نہیں کر سکا کہ دینی تعلیمی بورڈ وجود میں آجاتا ہے اور ملک کے سنجیدہ اور دین پرور طبقے کو دعوت عمل پیش کرتا ہے۔ انہی کی ہمت ہے کہ عام بے حسی اور پست ہمتی کی سطح پر ارتعاش پیدا کر دیتی ہے۔ عالم جمود میں زندگی کا نکھار نظر آنے لگتا ہے اور مایوسی کے افق پر آس کا ستارہ چمکنے لگتا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر حقیقت یہی ہے کہ سونے والوں کا آنکھیں مل کر اٹھنا، بے عملوں کا کمر کسنا۔ بھٹکے ہوتے راہی کا ایمان کی ڈگر پر قدم جما لینا اسی مرد مجاہد کے جذبہ عارفانہ کا کرشمہ ہے۔

وہ علیل ہیں دنیائے اسلام ان کے لئے بے چین ہے۔ دعائیں ہو رہی ہیں۔ منتیں مانی جا رہی ہیں۔ خیر و خیرات کے دروازے کھول دئے گئے ہیں۔ منتیں غلاف کعبہ سے لپٹی ہوئی ہیں اور آرزوئیں عرش کا دامن پکڑ رہی ہیں لوگ اسی مرد مجاہد کو پھر چاہتے ہیں۔ اسی سے دامن مہر اخلاص کے پھر متلاشی ہیں۔ اسی نطق گھر بار کو پھر ڈھونڈ رہے ہیں۔ اسی نکتہ سنج اور معاملہ فہم ذہانت کی پھر ضرورت محسوس کر رہے ہیں۔ شیخ الاسلام کا غم ابھی تک تازہ ہے آزاد کے لئے آنکھیں آج بھی پرنم ہیں۔ حفظ الرحمٰن کی جدائی کیسے گوارا ہوگی!

مگر آہ! کہ دعاؤں میں اثر نہ رہا۔ دواؤں کی طاقتیں سلب ہو گئیں۔ طبیبوں کی عقل گم ہو گئی۔ تیمار داروں کی شب بیداریاں کام نہ آئیں۔ مخلصوں کا دامن خلوص آنسوؤں سے تر ہو گیا مگر قدرت کا فیصلہ اٹل ہے اللہ کا حکم غالب اور مشیت کے ارادے غیر متزلزل ہیں۔ وہی ہوا جس کو یقین کرنے کے لئے آج بھی دل تیار نہیں ہوتا۔ کیسے مان لیں کہ ایک قومی اثاثہ چھن گیا اور ملی خزانہ لٹ گیا کیسے یقین کریں کہ وہ بھی ہم سے جدا ہو گئے۔

"جن گھاٹیوں میں شیر بھی جھجکتا یا بھول جاتا ہی وہاں مولانا سر سے کفن باندھکر مردانہ وار گئے اور کامیابی انکے قدم چومے"

"حصولِ آزادی کے بعد جن لیڈروں نے عمل کے ناہموار میدانوں میں طوفانوں کا مقابلہ کیا وہ صرف مجاہد ملت تھے"

"مولانا کی ذات حُبِّ وطن، اور خدمت و عمل کا جلی عنوان تھی، وہ حال و مستقبل کی اُمید گاہ تھے"

"ابھی سال بھر کی بات ہے۔ مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب (جنوری ۶۲ء میں) امروہہ پارلیمانی سیٹ سے الیکشن میں کھڑے ہوئے تھے۔ (کیسے معلوم تھا کہ یہ زندگی کا آخری الیکشن ہے۔) حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے حق میں پورے ملک کے اُردو۔ انگریزی مسلم و غیر مسلم اخبارات و جرائد نے بڑی قوت کے ساتھ اپنے ادارتی نوٹ لکھے اور حضرت مولانا کی عظیم الشان خدمات کو برملا خراج تحسین پیش کیا۔ اسی سلسلہ میں دہلی کے مشہور ہفتہ وار پیام مشرق نے بھی اپنے اداریہ میں مولانا کی شخصیت پر اظہار خیال کیا تھا، جو آج بھی اس عظیم اور دل آفریں شخصیت کے لئے زبردست خراج عقیدت کہا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔!" (انیس الحسن)

اپنے پرانے حلقۂ انتخاب سے مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پارلیمنٹ کے امیدوار ہیں اور امیدوار ہونا چونکہ ایک مخصوص اصطلاح ہے اس لئے یہ اصطلاح لکھنا پڑتی ہے ورنہ وہ پارلیمنٹ کی بہت بڑی ضرورت ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے حال اور مستقبل کی امید و یقین

ہیں اور مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی رح کے بعد کس کا نام لیا جاسکتا ہے، جسے وہاں ہونا چاہیئے، جہاں ہندوستان کا جمہوری اقتدار کارفرما ہے۔ شاید انتخابی مہم کی یہی رسم ہے کہ مولانا کا مقابلہ کیا جائے اور مسلم کنونشن کی آڑ میں جن سنگھ تو پورا زور صرف کرے گا کہ معرکہ سر کرے۔ لیکن ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ مولانا کے خلاف جو ووٹ دیا جائیگا وہ گاندھی جی کے خلاف ووٹ ہوگا۔ اور اس دیش بھگتی اور حب وطن کے خلاف ہوگا جس کا جلی عنوان مولانا حفظ الرحمٰن ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم بلاخوف تردید کہتے ہیں کہ حصول آزادی کے بعد جس لیڈر نے عمل کے ناہموار میدانوں میں طوفانوں کا مقابلہ کیا اور صحیح معنوں میں مجاہد وطن اور مجاہد ملت ہونے کا ثبوت دیا، وہ مولانا حفظ الرحمٰن اور صرف حفظ الرحمٰن ہیں۔ بڑی بڑی قیادتوں کے قصر ڈول گئے، لیکن مولانا کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی جن گھاٹیوں میں شیر بھی چنگھاڑنا بھول جاتا ہے وہاں مولانا سر سے کفن باندھ کر مردانہ وار گئے، گولیوں کی بوچھار میں سینہ تان کے گئے اور کامیابی نے اُن کے قدم چومے۔ ذاتی زندگی میں مقاصد و عمل کی مطابقت کوئی مولانا سے سیکھے۔ سیکولر ہندوستان میں ایک سچے ہندوستانی اور سچے مسلمان کا جو کردار ہونا چاہیئے وہ مولانا کا کردار ہے جو بالکل بے ریا، نہایت پاک، نہایت استوار ہے۔ جن سنگھ کا ارشاد ہے کہ مولانا فرقہ پرستی سے ساز باز کر رہے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ ارشاد جن سنگھ ہے، جس کی فرقہ پرستی کا اژدھا پورے ملک میں منتار رہا ہے۔

مسلم کنونشن شاید مولانا کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ لیکن جن لوگوں نے چودہ برسوں میں فرقہ پرستی کے ہزارہا کنونشن کر ڈالے، انھیں زمین کی تہوں میں دفنانے کا اہتمام صرف دو نے کیا ہے۔ ایک کا نام پنڈت جواہرلال نہرو اور دوسرے کا نام مولانا حفظ الرحمٰن ہے۔

مسلم کنونشن کے بارے میں دو رائے ہوسکتی ہیں۔ لیکن اس رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ مسلم کنونشن نے جمہوری ہندوستان کی ان بنیادوں کو مضبوط کیا ہے جسے رجعت پسند اور فرقہ پرست کمزور کر رہے ہیں۔ مولانا کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ مسلمانوں میں انھوں نے جمہوریت پسندی اور ترقی پسندی کو ایک بار پھر نئی زندگی بخشی او

گمراہی کی بروقت روک تھام کی۔

مولانا کی راہ چلنے کے لئے بڑی ہمت درکار ہے۔ صحت بگڑ رہی ہے قویٰ مضمحل ہو رہے ہیں۔ اعصاب میں تشنج ہے۔ کھانسی دم نہیں لینے دیتی۔ لیکن آج بمبئی میں، کل کلکتہ میں، پرسوں لکھنؤ میں، نرسوں پٹنہ میں۔ اور یہ کوئی ایک دن کی بات نہیں، زندگی کا ایک لگا بندھا معمول ہے جو پورا ہوتا ہے۔ ہمیں مولانا حفظ الرحمٰن کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ قیادت کا سودا اس قدر مہنگا بھی ہوسکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد قیادت جتنی آسان ہوگئی ہے، مولانا کے لئے اتنی ہی مشکل ہے۔ نہ کوٹھی ہے نہ چپراسی، نہ وزارت کی آن بان، بس وہی گلی قاسم جان ہے۔ وہی بے سروسامان قافلہ ہے اور زندگی مجاہدوں کے لئے وقف ہے۔ مولانا چاہتے تو ایک ذرا سا بینترا بدل کر ایک دنیا کو خوش کرسکتے تھے لیکن یہ کیسی فرض شناسی ہے کہ مقاصد پر بھی زخم نہ آئے، وطن کا نام بھی اونچا رہے اور مسلمانوں کو بھی حال و مستقبل کے زندگی بخش ہنگاموں میں حصہ لینے کے قابل بنایا جائے۔ یہ پیارا انداز کسی جن سنگھی کا انداز نہیں، کسی مسلم لیگی کا انداز نہیں، مجاہد وطن کا مخصوص انداز ہے جسے ہندوستان کی تاریخ انقلاب بہت اونچا درجہ دے گی۔ دنیا نے مولانا آزاد کی عظمت کے سامنے سر جھکا دیا، لیکن مولانا حفظ الرحمٰن کے اخلاص کے آگے ابھی سر جھکانا باقی ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کا پارلیمنٹ میں جانا عوامی زندگی کے اس توازن کا جانا ہے جس کے بغیر ہندوستان، ہندوستان نہیں رہ سکتا ہمیں یقین ہے کہ مولانا حلقہ انتخاب امروہہ سے صرف کامیاب ہی نہیں ہونگے بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی غالب اکثریت سے کامیاب ہونگے۔ مولانا کی کامیابی ہندوستان کے بلند مقاصد کی کامیابی ہے۔

روحِ مجاہد سے خطاب

از: مولانا محمد اسرائیل صاحب فرحت قاسمی رکن ادارہ زین المعارف نیا بھوجپور

آج کیوں ہیں ملتِ بیضا کی آنکھیں اشکبار؟ — روح کو ہے صدمۂ جانکاہ دل ہے سوگوار
شاعرِ رنگیں بیاں بھی ہو گریباں تار تار۔ — تیرے اُٹھ جانے سے ہے محفل کی محفل بیقرار

کارناموں کو ترے دُنیا بھلا سکتی نہیں
دل سے تیری یاد کوئی شئے مٹا سکتی نہیں

تیرے دم سے آبروئے ملتِ بیضا بھی تھی — جرأتِ رندانہ کی قائل تری دُنیا بھی تھی
ترے ماتھے پہ کلاہ سروری زیبا بھی تھی — تیری رفعت دہر میں پنہاں بھی تھی پیدا بھی تھی

چشمِ ظاہر بیں سے لے جانِ جہاں پنہاں ہے تو
یاد تیری غیر فانی اور حرزِ جاں ہے تو

آندھیوں میں شمع حق لے کر کے اب آئیگا کون — راہ سے بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھلائے گا کون
روز و شب ملت کی خاطر فکر فرمائیگا کون — چوٹ کھا کر، مسکرا کر، پھول برسائے گا کون

اب کسے ڈھونڈھینگی آنکھیں اب کسے پائے گا دل
غم میں خود روئیگا اوروں کو بھی رُلوائے گا کون

ہائے کتنا جلد بدلا میکدے کا یہ نظام — وائے حسرت! کیوں ہوئے یہ خون سے لبریز جام
آہ رندو! خوں برستا ہے فضا میں صبح و شام — داستانِ زندگانی رہ گئی ہے نا تمام

انجمن میں کیف پرور وہ فضا باقی نہیں
ساغر و مینا سے کیا مطلب ہے جب ساقی نہیں

آسمانِ علم کا اک نیرِ تاباں بھی تھا — حسن سیرت، حسن صورت میں مہ کنعاں بھی تھا
بہرِ نظارہ جمالِ جلوۂ یزداں بھی تھا — پیکرِ صبر و رضا تھا مخزنِ ایماں بھی تھا

حشر تک شاید نہ ہوگا حفظ رحمٰن پھر کوئی
گل کرے پیدا، ہے ناممکن گلستاں پھر کوئی

خطۂ سی پی بنا جس دم تھا اک آتش فشاں — نالۂ و شیون بپا تھا دل میں اُٹھتا تھا دھواں
گر رہی تھیں بجلیاں اور جل رہے تھے آشیاں — خون روتی تھی زمیں، تھا محوِ حسرت آسماں

کس نے ایوان کو ہلایا گرمیٔ تقریر سے
فتنہ و شر کو مٹا ڈالا عجب تدبیر سے

انشا پردازی میں تھا وہ بے نظیر و بے مثال — واعظِ جادو بیاں وہ اک خطیب باکمال
پختہ تر کردار میں گفتار میں شیریں مقال — کارنامے حشر تک اس کے رہیں گے لازوال

غم میں ہر اک ذرہ خاکِ ہند کا نمدیدہ ہے
آج پہلوئے محدث؎ میں وہ آرامیدہ ہے

؎ (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ)

میر مشتاق احمد صاحب (دہلی)

(مولانا) حفظ الرحمن — ایک عظیم انسان

انسانی سماج میں کچھ شخصیتیں اس طرح چمکتی ہیں جیسے آسمان پر آفتاب۔ ایسی شخصیتوں کو یہ عظمت کیوں حاصل ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تاکہ صلاحیت رکھنے والے انسان اس سے سبق حاصل کر کے بڑھ سکیں اور اس عظمت کو پانے کی کوشش کریں۔

۲؍اگست کو ۳ بجے صبح ایک عظیم انسان ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا گویا علم و عرفان کی ایک لائبریری تھی جو دفن ہو گئی لیکن اُن کی عظمت اُن کے مسلسل اور متواتر عمل میں تھی۔ مولانا حفظ الرحمن مرحوم ایک دردمند دل کے مالک تھے جن کو ابتدائی زندگی میں انقلاب دین کے مجاہدین علماء کی صحبت نصیب ہوئی۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن، حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت مولانا انور شاہ صاحب کو ان بزرگوں کی صحبت نصیب ہوئی وہ خود کیسے انقلاب کی چنگاریوں سے بچتا۔ وہ تو شعلوں میں پلا تھا شاید اُن کی تربیت ایک خاص دور کی رہبری اور رہنمائی کے لئے ہوئی تھی ہندوستان کی جنگ آزادی میں ایک نمایاں حصہ لیا۔ یہ حصہ تو ہندوستان کے اور بہت لوگوں نے بھی اُن کی شخصیت کو عظیم بنانے والی خصوصیت تو اُن ہی کی تھی۔ وہ بمشکل ہی انسان میں ہوتی ہے۔

بہت دور جانے کی ضرورت نہیں صرف گزشتہ پندرہ سال یعنی آزادی کے بعد جب ملک کی تقسیم پر دستخط ہوئے اور انسانوں کی آبادیاں بے خانماں قافلوں کی صورت میں ہندوستان سے پاکستان کی طرف اور پاکستان سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوئیں جب انسان وحشی بن گئے اور پاگل پن سوار ہو گیا۔

آبادیوں کے تبادلہ کی وجہ سے شمالی ہندوستان پر اُس کے تباہ کن اثرات پڑے جب سرکاری مشین بھی اس جنون کے سامنے مفلوج ہو گئی کچھ دانستہ اور کچھ بے بسی میں ہندوستانی مسلمان عالم مایوسی کا شکار ہو گیا۔ احساس کمتری کے بادل جیسے اس کی زندگی کے گوشوں پر چھا گئے۔ مسلم لیگ نے جھاڑ کر اپنا بستر بوریا گول کر کے روانہ ہو گئی۔ ہندو فرقہ پرستی نے جارحانہ روپ اختیار کیا۔ اچھے ہوش مند لوگوں نے دماغی توازن کھو دیا۔ جارحیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ مہاتما گاندھی کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس دور میں مردے از پردہ برون آید و کارے بکند

کا صحیح مصداق مولانا حفظ الرحمن تھے۔ جرأت دلیری اپنی ذات سے لاپرواہی کے ساتھ صبر و استقامت ہوش مندی کی سخت ضرورت تھی یہ سب خصوصیات مولانا کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان نامساعد حالات کے اندر گلی کوچوں محلوں سے لے کر سرکاری ایوانوں تک گھومتے رہنا لوگوں کی ڈھارس بندھانا اُن کی دلجوئی کرنا اور اُن کے اندر ہمت پیدا کرنا۔ پاکستان بن جانے کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور ہم نے جو رُخ اختیار کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے اندر احساس کمتری پیدا ہو۔ پانچ کروڑ انسانوں کو اس احساس سے نکالنا ایک بڑی قومی خدمت تھی جو مولانا نے اپنے مذہبی تقدس اور سیکولر کیریکٹر کو قائم رکھتے ہوئے انجام دی۔ زبانی اور تحریری طور پر ہمدردی کا اظہار کرنے والے تو بہت ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر صحیح خدمت انجام دینے والے مولانا ہی تھے کوئی شخص جو مظلوم ہو یا کوئی فرقہ جو بے انصافی کا شکار ہو اُس کے جذبات سے کھیلنا اُسے اور زیادہ مشتعل کرنا نہایت آسان کام ہے یہ کام کچھ غیر اندیش خود غرض لوگ اس عرصہ میں بھی کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد محب وطن مسلم لیڈر کے سامنے دوہری مشکل تھی ایک تو مسلمانوں کے طرز فکر کو بدلنا دوسرے جارحانہ فرقہ پرستی کا مقابلہ۔ اس کام کو مولانا نے خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ اس میں غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ مگر وہ عزم و یقین کے ساتھ ڈٹے رہے وطنیت متحدہ اور مشترکہ قومیت اور اسلامی تعلیم اور روایات ایک ساتھ لے کر چلنا مولانا ہی کا کام تھا۔

ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

تحریک آزادی کے دور میں لیڈری پھر بھی آسان تھی۔ غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف تقریریں جیل گئے لیڈر بن گئے۔ آزادی کے بعد تعمیر و ترقی کا کام جب کہ سماج میں انسانی اور اخلاقی قدروں کا جنازہ نکل گیا۔ ان انسانی اور اخلاقی قدروں کو بحال کرنے کے لئے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کے لئے اتحاد اور ایکتا قائم کرنے کے لئے اُن کی زندگی کا ہر لمحہ وقف تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ہندوستانی سماج میں ایک مقام ہے یہ مقام اُن کو حاصل ہونا چاہیئے۔ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ محبت مروت شرافت ہی ہے اس کے لئے مختلف مذہبی *

* فرقوں کے افراد کے درمیان باہمی اعتماد ضروری ہے اس کے لئے وہ ہر دم کوشش کرتے رہتے تھے۔ اگر آزادی سے پہلے انہوں نے مسلم لیگ کی فرقہ پرستی کے خلاف دلیرانہ جنگ کی تو آزادی کے بعد جارحانہ ہندو فرقہ پرست عناصر کے خلاف اُسی دلیری سے جنگ کرتے رہے بے غرض بے لوث انسان تھے جن کی نظر وسیع تھی اُن کے دامن میں پھول اور کانٹے

آہ حفظ الرحمٰن!

مولانا قاری فخر الدین صاحب گیا

رہبرِ حلقۂ احرار تھے حفظ الرحمٰن ملت و قوم کے سردار تھے حفظ الرحمٰن

جس سے حب الوطنی سب کی پرکھ لی جائے دیش بھگتی کے وہ معیار تھے حفظ الرحمٰن

داعیِ امن واماں، حامی عدل وانصاف ماحیِ فتنۂ اشرار تھے حفظ الرحمٰن

فتنہ پرور تھے اُدھر درپئے تخریبِ وطن اور ادھر دیش کے معمار تھے حفظ الرحمٰن

ابتری ملک میں پھیلاتے تھے اگر فرقہ پرست سالمیت کے علمدار تھے حفظ الرحمٰن

پوچھو آزاد سے، گاندھی سے جواہر سے ذرا ملک کے کیسے وفادار تھے حفظ الرحمٰن

ظلم پر ظلم کئے جاتے تھے ظالم جو اُدھر تو ادھر ظلم سے بیزار تھے حفظ الرحمٰن

اپنے ہی ملک میں جن لوگوں پہ ہوتے تھے ستم ایسے مظلوموں کے غمخوار تھے حفظ الرحمٰن

اُن کا دل دُکھتا تھا ہر ایک دُکھی کے دُکھ پر درد مندوں کے مددگار تھے حفظ الرحمٰن

سرفروشانِ وطن کے تھے وہ دیرینہ رفیق جنگِ آزادی کے سالار تھے حفظ الرحمٰن

وہ مجاہد کہ، نہیں غازیِ گفتار فقط بالیقیں غازیِ کردار تھے حفظ الرحمٰن

ان کی خدمات پہ نازاں تھے محبانِ وطن موردِ طعنۂ اشرار تھے حفظ الرحمٰن

کانگریس کے بھی ممبر تو وہ ام، پی بھی تھے ہند کے واقفِ اسرار تھے حفظ الرحمٰن

اُن کے اُپدیش میں اس دیش کی خیریت تھی قائدِ حلقۂ اخیار تھے حفظ الرحمٰن

ایک ہی ذات تھی جس کا نہ تھا ثانی کوئی کیا کسی قوم میں دوچار تھے حفظ الرحمٰن

قوم کی یک جہتی کے لئے کوشاں ہر دم وحدتِ قوم کے مینار تھے حفظ الرحمٰن

کوئی فرقہ ہو۔ دُکھی کوئی رہے کیوں آخر دیش میں سُکھ کے سماچار تھے حفظ الرحمٰن

علماء ملک میں آزادی کے ہیرو جو رہے ان کے ہی ناظم وسردار تھے حفظ الرحمٰن

فخرؔ اس بات پہ جلتا تھا ہر اک خارِ وطن
کیوں وطن کے گل و گلزار تھے حفظ الرحمٰن

مجاہد ملت کا ایک دورہ

مولانا شاہ نصیر الحق رضوی صاحب

جنوری ۵۳ء کی بات ہے کہ مولانا سید انیس الحسن صاحب کا گرامی نامہ احقر کے نام آیا کہ مجاہد ملتؒ کلکتہ سیرت کے جلسہ میں تشریف لے جارہے ہیں۔ مولانا کے پاس دو روز کا وقت ہے تم مولانا سے مل کر بہار میں دورہ کرا سکتے ہو۔ اسی وقت مجاہد ملت کی خدمت میں دہلی بذریعہ تار کلکتہ سے واپسی میں بہار کے لئے استدعا کی۔

دھن باد۔ گرڈیہہ کی جمعیۃ کو مطلع کر دیا گیا کہ مولانا کی تشریف آوری کلکتہ کے اجلاس کے بعد ممکن ہے۔ دھن باد سے احقر کو بلایا گیا۔ وہیں گرڈیہہ سے بھی حضرات آگئے اور پروگرام بن گیا۔ دوسرے روز دھن باد سے میں کلکتہ پہنچا اور مجاہد ملت سے گزارش کی اور ہر دو جگہ کا پروگرام سامنے رکھ دیا۔ فرمایا کہ یہ دو روز تو میں نے آرام کے لئے رکھے تھے، اب آپ پہنچ گئے۔ میں نے عرض کیا حضرت بہار کے دفتر کی حالت آپ کو معلوم ہے آپ کے جانے سے ممکن ہے دفتر کو کچھ فائدہ پہنچ جائے۔

مجاہد ملت اپنے ساتھ خان بہادر صاحب کی کوٹھی سے یوسف صاحب کے یہاں کولوٹولہ مجھے لائے اور فرمایا کہ اچھا منظور ہے۔ ناظم جمعیۃ علماء ہند مولانا اسمٰعیل صاحب سنبھلی کو بھی مدعو کرو۔ مولانا اسمٰعیل صاحب پہلے چلے جائیں گے، میں عین جلسہ کے وقت پہنچوں گا۔ مجاہد ملت کی منظوری کی اطلاع دھن باد اور گرڈیہہ کو دے دی۔ دھن باد میں دو پروگرام ہوئے پہلے بعد ظہر کتراس گڑھ میں، دوسرا بعد عصر دھن باد میں، شب میں قیام دھن باد۔ دوسرے روز روانگی گرڈیہہ بعد ظہر ستر میل کی مسافت

گرڈیہہ میں بعد ظہر جلسہ تقریر۔ بعد عصر ملاقات اور عصرانہ وغیرہ۔ بعد عشا روانگی بذریعہ ریل مدھوپور اور مدھوپور سے ۲ بجے رات کو پنجاب میل سے لکھنؤ، مرادآباد ہوتے ہوئے دہلی۔

میں نے دھن باد واپسی کی اجازت چاہی، فرمایا کل چلے جانا۔ آج سیرت کے جلسہ میں شریک ہو لو۔ یہ ایک تاریخی اجتماع تھا۔ جمعیۃ علماء کلکتہ کی جد وجہد سے محمد علی پارک میں انتظام تھا۔ کلکتہ کے شایان شان بہت ہی شاندار پنڈال، روشنی کے اعتبار سے دیوالی کی روشنی سے کہیں زیادہ، دور دور تک انسانی سمندر راستہ بند۔ کل ہند اکابرین ڈائس پر جلوہ افروز خصوصاً حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ، حضرت قاری طیب صاحب، مجاہد ملت، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا شاہد فاخری، حامد الانصاری غازی، مولانا ابو الوفا، مولانا قاسم شاہجہان پوری، مولانا عبد العلیم صدیقی وغیرہم۔

شب میں تقریباً دو بجے مجاہد ملت جلسہ گاہ سے اٹھ کر جناب یوسف فیروزی صاحب کی قیام گاہ کولوٹولہ تشریف لے گئے پیدل استنجا کے واسطے۔ سردی شباب پر تھی۔ فاصلہ دو فرلانگ سے کم نہ ہو گا۔ مجاہد ملت کو شبہ ہوا کہ پیشاب کے قطرے نہ آگئے ہوں۔ آپ نے پائجامہ کے اوپری حصہ کو دھو لیا اور نچوڑ کر گیلا ہی پہن کر واپس جلسہ میں آگئے۔ آپ کی تقریر آخر میں تھی۔ ایک بجے کے بعد جلسہ ختم ہوا اور آپ قیام گاہ پر تشریف لے گئے، سرکار رنڈ بیہ

خان بہادر جان محمد صاحب کے یہاں۔ دوسرے روز کولوٹولہ میں مجاہد ملت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ حضرت کمبل اوڑھے لیٹے ہیں، آنکھیں سرخ ہیں، معلوم ہوا بخار ہو گیا ہے۔

فرمایا تم آج واپس دھن باد جاؤ۔ مولانا اسمٰعیل صاحب کو میں رات کی ٹرین سے بھیج دوں گا۔ کل صبح ان کو اسٹیشن پر ملنا پروگرام کے مطابق مولانا اسمٰعیل صاحب وقت پر کتراس گڑھ میں تقریر کریں گے۔ میں طوفان ایکسپریس سے بعد ظہر پہنچوں گا اور سیدھا اسٹیشن سے جلسہ گاہ جاؤں گا۔

احقر رخصت ہو کر واپس دھنباد آگیا۔ دوسرے روز صبح مولانا اسمٰعیل صاحب دھن باد پہنچ گئے۔ دوپہر میں مولانا اسمٰعیل صاحب کتراس گڑھ تشریف لے گئے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب صدر جمعیۃ علماء دھن باد کے ہمراہ ۲ بجے محترم عبد الحی صاحب انصاری ناظم جمعیۃ علماء کے ساتھ احقر دھن باد اسٹیشن آیا۔ طوفان ایکسپریس وقت پر پہنچا۔ مجاہد ملت، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ ٹرین سے اُترے

مفتی صاحب نے مجھ سے کہا کہ رضوی صاحب مولانا کو سخت بخار اور بے چینی ہے اور زبردستی دھن باد اترے ہیں ان کو تقریر نہ کرنے دینا۔ انھیں قیام گاہ پر لے جاؤ۔ یہ فرما کر حضرت مفتی صاحب ٹرین پر سوار ہو گئے اور ٹرین روانہ ہو گئی

مجاہد ملت نے کہا جلسہ گاہ چلو۔ عرض کیا گیا جلسہ گاہ یہاں سے دس میل دور کتراس گڑھ ہے جہاں پروگرام عصر تک ہے۔ بعد میں دھنباد میں دوسرے جلسہ کا انتظام ہے آپ یہیں ٹھہر کر آرام فرمایئے اور دھن باد کے جلسہ میں شرکت کیجئے آپ کو تیز بخار ہے۔ مسکرا کر فرمایا کہ سب ٹھیک ہے کتراس چلو مجبوراً کتراس کو روانگی ہو گئی۔

کتراس میں ہزاروں ہزار مشتاق منتظر تھے۔ مجاہد ملت کی آمد و روانگی کی اطلاع کتراس پہنچ چکی تھی۔ پہنچنے پر زندہ باد کے نعروں سے استقبال ہوا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب تقریر فرما رہے تھے۔ مجاہد ملت کے پہنچتے ہی تقریر ختم کر دی۔ مجاہد ملت نے فرمایا کہ مولانا اسمٰعیل صاحب کو دھن باد لے جاؤ۔ یہ وہاں جلسہ شروع کریں گے اور پہلی تقریر ان کی ہو گی، جب تک

میں یہاں سے نپٹ کر پہنچ جاؤں گا۔ مولانا تقریر کے لئے اُٹھے اور فرمایا کہ ایک کرسی منگاؤ کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ کرسی آگئی۔ مجاہد ملت نے بیٹھ کر ۴۰ منٹ تقریر کی۔ تقریر پر مزاج کی ناسازی، بخار وغیرہ کا کوئی اثر نہیں تھا۔

روانگی سے قبل لوگوں کا اصرار ہوا کہ عصرانہ میں شرکت چند منٹ کے لئے ہو۔ منظور فرمالیا اور جناب نظام الدین صاحب کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ مسجد میں نماز عصر پڑھی اور عصرانہ میں شرکت فرماکر دھن باد کے لئے روانہ ہوگئے۔ دھن باد میں ریلوے گراؤنڈ میں جلسہ تھا۔ حاضرین سے جلسہ گاہ بھری تھی۔ مولانا اسمٰعیل صاحب تقریر فرمارہے تھے مجاہد ملت کی آمد پر مولانا نے اپنی تقریر ختم کردی اور ایک صاحب جو کمیونسٹ خیال کے تھے ایک نظم پڑھنے لگے جس میں اشتراکیت کی مدح تھی۔ مجاہد ملت نے احقر سے کرسی منگانے کو کہا۔ میں نے عرض کیا حضرت آپ کی تقریر نہیں ہوگی۔ آپ کو بخار تیز ہوتا جارہا ہے۔ اعلان بھی ہوچکا ہے کہ آپ بخار کی وجہ سے تقریر نہیں فرمائیں گے۔

مجاہد ملت نے کچھ سختی سے فرمایا، آپ کرسی تو منگاؤ۔ بہرحال کرسی آئی حضرت نے اٹھنا چاہا۔ مگر اٹھ نہیں سکے۔ بخار کی شدت سے پاؤں میں لغزش تھی پھر بھی کرسی پر بیٹھ گئے اور تقریر شروع کردی۔ ایک گھنٹہ سے زائد تقریر جاری رہی اشتراکیت کی تردید میں، مغرب کا وقت ہوچکا تھا، اس لئے تقریر ختم کی اور قیام گاہ تشریف لےگئے قیام گاہ پہنچ کر تیمم سے نماز مغرب پڑھی اور لیٹ گئے۔ کرب و بےچینی بہت بڑھ گئی دیکھنے پر پتہ چلا کہ ہاتھ کی انگلیاں پھول گئی ہیں۔ گردن کی رگیں تنی ہوئی ہیں اور جوڑ جوڑ میں درد ہے۔ اسی وقت ڈاکٹر آئے، دوائیں آئیں، انجکشن لگے۔ مگر تکلیف میں کوئی کمی نہ ہوئی

مولانا محمد یحییٰ مرحوم، عبدالمجید صاحب۔ حافظ سندری والے، عبدالرشید صاحب اور دیگر حضرات کتراس گڑھ کے تمام رات آگ جلائے بیٹھے رہے۔ کوئی تیل مالش کررہا ہے کوئی سینک رہا ہے، بخار کم نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر بھی آتے رہے۔

مجاہد ملت کی بےچینی بشرہ سے عیاں ہے مگر خاموش لبوں پر مسکراہٹ

۲ بجے شب میں گریڈیہہ سے لوگ کار لے کر آگئے، انھوں نے مجاہد ملت کی بےچینی اور بخار دیکھا تو وہ بھی پریشان ہوئے۔ فجر ہوئی۔ مجاہد ملت نے فرمایا روانگی ہونا چاہئے۔ عرض کیا گیا حضرت اس حالت میں سفر مناسب نہیں، مبادا راستہ میں ہوا لگ جائے تو مرض میں اضافہ ہوگا۔

فرمایا کچھ نہ، جانا تو ہوگا۔ اور سختی سے کہا تیاری کرو اور مجھے صرف چاء پلاؤ۔ مجبوراً روانگی ہوئی۔ ۷۰ میل کا سفر بخیریت گزرا۔ ایک بجے گریڈیہہ پہنچ گئے ڈاک بنگلہ میں قیام ہوا۔ اور ہم فدائیوں نے طے کرلیا کہ یہاں ان کو جلسہ گاہ میں نہیں لے جائیں گے۔ ۴ بجے جلسہ کا وقت تھا۔ مولانا اسمٰعیل صاحب جلسہ گاہ تشریف لے گئے اور تقریر شروع کردی۔ ایک گھنٹہ کے بعد مجھ سے فرمایا کہ رضوی صاحب یہاں موٹر ہے۔ میں نے پوچھا حضرت موٹر کا کیا ہوگا۔ فرمایا جلسہ میں چلنا ہے۔ عرض کیا کہ آپ نہیں جائیں گے جس کو ملنا ہوگا وہ یہیں آتے رہیں گے۔ یہ طے ہوچکا ہے۔ بگڑ گئے اور غصہ میں فرمایا رضوی صاحب آپ نہیں جانتے کہ جماعت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ یہ دور دور سے آئے ہوئے عوام کیا اثر لیں گے، کیا خیال کریں گے کہ مولوی آرام طلب ہوتا ہے ذرا سے بخار میں لیٹ گیا۔ تم موٹر دیکھو۔

میں باہر گیا ڈرائیور موجود تھا۔ آکر عرض کیا گاڑی تیار ہے۔ فرمایا مجھے شیروانی پہنا دو۔ میں شیروانی کی آستین ہاتھوں میں حضرت کے ڈال رہا تھا۔ مگر خود حضرت کے ہاتھ کام نہیں کررہے تھے۔ ہاتھوں کی جنبش سے درد ہوتا تھا اور حضرت اُف کرکے خاموش رہتے۔ میں رونے لگا۔ غرض کسی طرح شیروانی پہنادی۔ ڈرائیور کی مدد سے موٹر میں بٹھا کر جلسہ گاہ جو قریب ہی تھا لے گیا۔

مجاہد ملت کو دیکھتے ہی لوگ ٹوٹ پڑے اور موٹر کو گھیر لیا۔ اچھی خاصی تعداد طلباء کی آگئی اور آٹوگراف کی خواہش مند ہوئی۔ حضرت نے "حب الوطنی از ملک سلیماں خوشتر" لکھتے ہوئے دستخط کردیئے۔

جلسہ گاہ سے مولوی عبدالرزاق صاحب آئے اور کہا کہ مجاہد ملت صرف جلسہ میں تشریف رکھیں تقریر کی ضرورت نہیں۔ جلسہ ختم کردیا جائے گا۔ حضرت مسکرائے، معاً آواز آئی کہ مجاہد ملت تشریف لارہے ہیں۔ آپ تقریر نہ کرسکیں گے۔

مولانا اسمٰعیل صاحب کی تقریر ختم ہوئی اور مجاہد ملت موٹر سے اترے لوگوں کا سہارا لئے جلسہ گاہ پہنچے اور کرسی طلب کی۔ کرسی رکھ دی گئی۔ تشریف رکھی اور تقریر شروع کردی۔ تقریباً ایک گھنٹہ مسلسل بولتے رہے، جلسہ ختم ہوا۔ پھر ڈاک بنگلہ میں لوگ جمع ہوگئے۔ ان سے بھی حضرت گفتگو فرماتے رہے جس سے تکان بڑھتی گئی۔

شب میں صرف چائے پی۔ سرخ تیل کی مالش جوڑوں پر کرائی اور کرب سے کروٹیں بدلتے رہے۔ ۹ بجے شب میں ذریعہ ٹرین مدھوپور کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک گھنٹہ میں مدھوپور آگئے دریافت پر معلوم ہوا کہ سیٹ پنجاب میل میں ریزرو ہوگئی ہے جو دوپہر میں ٹیلی گرام سے کرائی گئی تھی۔ ۱۲ بجے میل ٹرین آگئی اور حضرت مجاہد ملت مولانا اسمٰعیل صاحب کی معیت میں عازم لکھنؤ ہوئے۔ محترم حافظ ابراہیم صاحب وزیر حکومت یو، پی کو مجاہد ملت کے لکھنؤ پہنچنے کی اطلاع ایکسپریس ٹیلی گرام سے دے دی گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مجاہد ملت مرض گٹھیا (وجع المفاصل) میں عرصہ تک مبتلا رہے۔ یہ تھی مجاہد ملت کی مجاہدانہ سرگرمی، جس نے جمعیۃ علماء ہند کو زندہ رکھا۔

مولانا حفظ الرحمن کی تربت پر

عقیدت کے چند پھول

ابوالبقا ندوی

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے
واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے
کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جگا کر چل دیئے

محفلِ دوشیں کا ڈہ چراغ سحر جو کئی ماہ سے ضعف و مرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ۲؍ اگست ۱۹۶۲ء کو ٹھیک صبح صادق کے وقت اس گلستان نما خزاں آباد کی باسٹھ بہاریں دیکھ کر اس عالمِ آب و گل کو خیرباد کہہ گیا اور دہلی کی خاک نے جہاں ولی اللّٰہی خاندان آسودۂ خاک ہے۔ اس قیمتی گوہر کو ہمیشہ کے لئے اپنے آغوش میں لے لیا۔ ؏

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی، سو وہ بھی خموش ہے

دیارِ فرنگ سے واپسی پر اخباروں اور رسالوں میں تری آخری تصویر دیکھی تھی، دل نے کہا یہ ماہ درخشاں اب ہلال بن کر رہ گیا ہے اور اب یہ ہلال بھی محاق ہو کر دنیا کی نگاہوں سے چھپ گیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

ذاتِ معبود جاودانی ہے   باقی جو کچھ ہے وہ فانی ہے

ہندوستان کی جنگ آزادی میں تو نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور گاندھی اور نہرو کے کاندھوں سے کاندھا ملا کر چلا۔ مگر اس کے باوجود اپنی انفرادیت کو قائم رکھا، اور اُس حسن کی تکمیل میں ترے ارادوں اور قدموں میں لغزش نہ آنے پائی، جسے سید احمد شہیدؒ اور شیخ الہندؒ نے پورا کرنے کے لیے میدان عمل میں قدم رکھا تھا، آزادی کے حصول کے بعد بھی تیری جدّ و جہد میں کوئی فرق نہ آیا، کل تو ہندوستان کی آزادی کا ایک مردِ سپاہی تھا تو آج ملک اور قوم کا ایک مردِ مجاہد تھا، ۱۹۴۷ء کے ہلاکت خیز اور اندوہناک فسادات میں کتنے دلوں کو تو نے تھاما اور گرتے ہوؤں کو سنبھالا، اور کتنے گھروں کو ویران ہونے سے تو نے بچایا، اور کتنے یتیموں اور بیواؤں کی تو نے دادرسی کی، پنجاب میں کتنے اُکھڑتے ہوئے خیموں کو تو نے دوبارہ نصب کرایا، لُٹتے ہوئے سہاگ صرف تیری وجہ سے رُک گئے۔ غرض ملک اور قوم کے ہر غم کو تو نے اپنا غم سمجھا اور آخر اسی غم میں تو نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی ؏

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محلس کی

مگر آج اس "جلوہ گاہِ ناز" کا سارا طلسم ٹوٹ چکا ہے۔ بزم کی ساری رونق ماند پڑ چکی ہے، ساری مجلسیں ماتم کدہ بنی ہوئی ہیں، اور کیوں نہ ہو جب تیرا گھر دوسروں کے لئے ماتم کدہ بن سکتا ہے اور تیری مجلس دوسروں کی وجہ سے بے رونق ہو سکتی ہے، تو آج کیوں نہ ساری مجلسیں تیرے لیے ماتم کدہ بن جائیں؟ آج دنیا سے تو تنہا رخصت نہیں ہوا ہے بلکہ آج ایک قوم رخصت ہو گئی ہے۔

فما کان قیسٌ ھُلکہٗ ھُلکَ واحدٍ
و لکنہ بنیانُ قومٍ تہدّما

مولانا حفظ الرحمن کون تھے؟ لکھنے والے ان کے محامد صفحوں میں لکھیں گے اور بیان کرنے والے گھنٹوں بیان کریں گے، کہنے والے کہیں گے

- "سنّتِ یوسفی کا جلیل القدر پیرو اُٹھ گیا"۔
- "وہ ہمارے قافلے کے سالار تھے، یہ قافلہ پہلے ہی مٹ چکا تھا، اب یتیم ہو گیا"۔
- "اُن کا دل و دماغ قدرت کا معجزہ تھا"۔
- "وہ ایک نڈر اور بہادر سپاہی تھے"۔
- "وہ قومی یکجہتی کے سچے علمبردار تھے"۔

یہ سب کچھ تھا، لیکن اگر اس دفتر کو ایک لفظ میں کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہستی جو سرتاپا محبت تھی۔ خدا سے محبت، رسول سے محبت، اکابر سے محبت، دوستوں، ہم وطنوں سے محبت، کارکنوں اور عزیزوں سے محبت، ہند کے ہر خطے کی سرزمین کو تیری قدم بوسی کا شرف حاصل ہے۔ آج لکھنؤ ہیں تو کل کلکتہ، پھر آگرہ۔ آگرہ سے بمبئی۔ بمبئی سے مدراس، مدراس سے سُورت، آج جبلپور ہیں تو کل بھوپال ہیں۔ غرض ع

دن کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

آج سیرت کے جلسوں میں شریک ہیں تو کل اُجڑے ہوئے بے خانماں برباد لوگوں کی دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ خدا نے خطابت کا وہ ملکہ دیا تھا، کہ سیاسی اور عام مذہبی عنوانات پر دلوں کو ہلا دیتے اور مجلس کو لٹا دیتے اور بادِ خزاں کے تند وتیز جھونکوں کے رُخ کو بدل دیتے۔ دوران تقریر میں مجلس کا ہر شخص پتھر کا ایک مجسمہ بنا رہتا۔ دور سے دیکھنے والے کو دھوکا ہوتا کہ کسی صنّاع نے کھلونوں کی دوکان لگائی ہے۔ حبیب رب العالمین کا ذکر پاک کرنے کو اُٹھتے تو عشقِ رسول میں مسحور اور آنکھیں نورِ ایمانی سے معمور کھڑے ہو کر بلبل کی طرح بولتے اور چہکتے اور شاخ گل کی طرح جھومتے اور لچکتے۔ خطابت لپٹ لپٹ کر بلائیں لیتی، اور خوش بیانی سے مست ہو ہو کر منہ چوم لیتی، ایک ایک فقرہ معلوم ہوتا تھا کہ عشق و محبت کے سانچے میں ڈھلا ہوا نکلتا چلا آتا تھا، سیرت کا عام موضوع یہ رہا کرتا تھا کہ نبی اکرمؐ رحمۃ اللعالمین ہیں۔ اے طوطیٔ خوشنوا، جا آج تو ارحم الراحمین کے روبرو پیش ہو چکا، وہ بھی تیرے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کرے۔ آمین

ہند کے آوارہ گرد مسافر! جا اب تو دنیا کے تمام علائق سے بے نیاز ہر مدح وستائش سے بے پرواہ، حوریں تیرے انتظار میں چشم براہ، کبھی وقت تھا تو ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے دل گرماتا، ان کو ہنساتا، ان کو رُلاتا، ان کو بھولا ہوا سبق یاد دلاتا، اور آج وہی مخلوق تجھے اپنے کاندھوں پر، اور وہ کاندھے بھی کیسے فرشتوں کی آماجگاہ، ایک انسان کو جو فرشتہ خصلت تھا لے جا رہے ہیں۔ دریغا! ان کے کاندھوں میں توانائی کہاں سے آئی جو وہ اس اُمت کے عاشقِ رسول کو لحد میں آرام کرانے لے جا رہے ہیں، جہاں پہلے ہی سے محبت الٰہی کے متوالے آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ جانے والے جا تجھے سلانے والوں نے لحد میں نہیں بلکہ حوروں کے مہد میں سُلایا ہے، جہاں جنت کے خوشگوار جھونکوں میں تو مست سوئے گا اور قیامت تک سوتا رہے گا ع

کس کو لائے ہیں بہرِ دفن کہ قبر!
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

کیا یہ کوئی بعید بات ہے کہ جب تیرے نغموں سے سرکش انسان بھلائی کا راستہ اختیار کرتے اور پرندپرندوں کو جوڑ کر سلامی لیتے اور موجیں مارتا ہوا دریا تیری رعنائی سے مبہوت ہو جاتا تو کیا حوریں تیرے سُریلے نغمے سُن کر مسحور نہیں ہوتی ہوں گی؟

جو بھیجے گئے تھے واپس بُلا لئے گئے اور جس نے بھیجا تھا وہ اسی اور اسی شان، اسی جاہ اور اسی جلال، اسی حُسن اور اسی جمال اسی دارائی اور اسی کبریائی، اسی رعنائی اور اسی دلرُبائی کے ساتھ جوں کا توں قائم و موجود ہے۔ ع

رہ گیا لا الٰہ الا اللہ

آج کیوں نہ ہم غلام رسول اور عاشقِ حبیب کو رخصت کرتے ہوئے بیک آواز کہیں، ع

یہ ہوتا ہے رخصت غلام محمد
سلام محبت، سلام محبت

ایک اہم تفسیری مسئلہ پر مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ کا ایک گرانقدر مکتوب

مولانا غلام حسین بھاگلپوری

۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں مراد آباد ڈسٹرکٹ جیل میں تقریباً ایک سال حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بابرکت صحبت احقر کو حاصل ہوئی۔ احقر اس وقت مدرسہ شاہی مراد آباد میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور تحریک کے موقع پر گرفتار ہو گیا مجھکو ایک سال کی سزا اور پچاس روپیہ جرمانہ ہوا۔

مراد آباد جیل کے اندر اس وقت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب، حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی، قاری محمد عبداللہ صاحب رح، حاجی محمد ابراہیم صاحب مرحوم، مولوی عبدالقیوم صاحب ــــ مولانا محمد مقصود صاحب سنبھلی اور مولانا محمد منصور علی صاحب بھاگلپوری بھی تھے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب جیل میں قصص القرآن تالیف فرماتے تھے، احقر دن کا اکثر حصہ مولانا ہی کے پاس گذارتا تھا اور علمی بحث چھیڑ کر مولانا سے تحقیقی مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ حضرت مولانا بہت زیادہ توجہ سے مسائل کو سمجھایا کرتے تھے۔ اس کے ماسوا جیل کی زندگی میں مولانا کی توجہات ہماری طرف بہت زیادہ تھیں۔ اور یہ توجہات زندگی بھر رہیں۔

زیر نظر مکتوب حضرت مولانا نے مراد آباد جیل سے ہمارے پاس بھیجا تھا۔ چونکہ اس مکتوب میں مولانا نے علم تفسیر کے ایک اہم مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے میں اس کو ہدیہ ناظرین کر رہا ہوں۔ امید کہ اس سے فائدہ پہنچے گا۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں چونکہ خط و کتابت کی ممانعت تھی اس لئے براہ راست مراسلت نہیں ہو سکتی تھی۔ مراسلت کا ذریعہ اس وقت کرم فرما محترم جناب حکیم انتظار احمد صاحب مراد آبادی تھے۔ اس زمانہ میں سنسر کی وجہ سے حضرت مجاہد ملت اپنے آپ کو ابوالقاسم تحریر فرماتے تھے۔

غلام حسین ناظم جمعیۃ علماء ضلع بھاگلپور، ۱ستمبر ۱۹۶۲ء

برادر عزیز السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج شریف۔ محبت نامہ ملا مسرت ہوئی۔ اچھا ہوں اور دعا خیر کرتا ہوں۔ آپ کی پریشانی کا طبیعت پر خاص اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ کوئی بہتر صورت پیدا کر دے۔

مراد آباد جیل سے کافی حضرات رخصت ہو چکے تھوڑے سے آدمی باقی ہیں۔ خبریں گرم ہیں کہ دسمبر تک مراد آباد ضلع کے تمام نظر بند رہا ہو جائیں گے۔ خدا بہتر کرے۔ کھدّ نجی سلام کہتے ہیں۔

نسخ (قرآن) کے متعلق اس وقت تفصیل سے لکھنے کی فرصت نہیں ہے۔ صرف دو بنیادی باتوں کی جانب اشارہ کرتا ہوں، اغلب ہے کہ مفید ہوں۔ قرآن میں نسخ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ منسوخ آیت کا حکم کلیۃً ختم کر دیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ کیلئے قابل عمل نہیں رہتی بلکہ اُس سے یہ مراد ہے کہ ناسخ آیت نے ایک ایسا حکم دیدیا کہ اب منسوخ آیت ان حالات میں معمول بہا نہیں رہی، لیکن کل اگر حالات اُس قسم کے پیش آجائیں جن کے پیش نظر منسوخ آیت معمول بہا قرار دی گئی تھی تو اس وقت منسوخ آیت کا مفہوم معمول بہا اُس وقت تک عود کر آئیگا جبتک حالات ناسخ آیت کے مناسب حال نہ ہو جائیں تو اس صورت میں ناسخ آیت کا یہ فائدہ ہوا کہ اس سے حکم کا دوسرا پہلو سامنے آگیا کہ اگر وہ آیت نازل نہ ہوتی تو آیت منسوخ کا حکم ہی ہمیشہ واجب العمل رہتا اور حکم الٰہی صرف اسی کے اندر مقصور ہو جاتا حالانکہ حالات و واقعات کا تقاضا یہ چاہتا ہے کہ حکم ایک خاص پہلو کے اندر ہی قصر ہو کے نہ رہ جائے مثلاً سورہ کافرون کے متعلق یہ کہا گیا کہ آیت جہاد نے اس کو منسوخ الحکم بنا دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کی جماعت کی قلت اور حالات کی نامساعدت دونوں جمع رہیں اس وقت تک ایذاء کفار و مشرکین پر صرف "صبر" اور "اعراض" ہی واجب العمل رہا۔ لیکن جب مدینہ کی زندگی نے مسلمانوں کی جماعت اور حالات دونوں میں انقلاب پیدا کر دیا تو اب آیت جہاد نے یہ حکم واجب العمل

قرار دیا کہ دشمنوں کا مقابلہ طاقت کے ساتھ کیا جائے۔ اور اب "صبر" اور "اعراض" کافی نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی زمانہ میں تمام مسلمانوں کے لئے یا مسلمانوں کی کسی ایک جماعت کے لئے ایسی حالت پیش آجائے کہ اس وقت آیت جہاد پر عمل کرنا خاص اُن حالات میں ممکن نہ ہو اور ایسا کرنے سے خود مسلمانوں کے استیصال کا اندیشہ ہو تو اُس وقت آیات صبر و اعراض عن المشرکین یعنی منسوخ آیت واجب العمل ہوگی۔

البتہ ان ناسخ و منسوخ کا فرق مراتب اس طرح نمایاں ہوتا کہ اب شارع علیہ السلام کا مقصد عظمیٰ یہ قرار پائے گا کہ ہم کو ہر حالت اور ہر صورت حال میں یہ سعی کرتے رہنا ضروری ہے کہ ناسخ آیت پر عمل کرنے کا ماحول پیدا کریں اور منسوخ آیت کے ماحول کو ختم کرنے کی سعی کریں۔ گویا کہ دونوں کے درمیان یہ امتیاز رہا کہ اس صورت میں منسوخ آیت میں مذکور حکم خاص وقت کے لئے ایک علاج و تدبیر ہے تاکہ مسلمان اس وقت ضیق اور تنگی میں نہ پڑیں اور وقت کے مناسب علاج سے محروم نہ ہو جائیں اور ناسخ آیت میں حکم مذکور صاحب شریعت کا مقصد قرار پائے گا اور جب تک آیت ناسخ کا نزول نہیں ہوا تھا اس وقت تک ہماری نگاہیں اور ہمارا قلب بھی یقین رکھتا تھا کہ صاحب شریعت کا مقصد عظمیٰ یہی ہے۔ اور اس وقت تک کے لئے حقیقۃً بات بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ حکم صاحب شریعت کا مقصد ہی کہلاتا ہے۔

کسی آیت کے نسخ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس حکم کی تمام جزئیات ختم ہو گئی ہیں۔ اور اب ایک جزئی بھی معمول بہا نہیں ہے جیسا کہ عام کتب اصول اور کتب تفسیر سے مترشح ہوتا ہے اور جو حقیقتاً صحیح نہیں ہے بلکہ نسخ کے معنی یہ ہیں کہ ناسخ آیت کا جو مقصد ہے۔ جن جن مقامات پر اس آیت کا حکم منسوخ آیت کے حکم سے متصادم ہوتا ہو اُن جزئیات کے حق میں ناسخ آیت ناسخ ہے باقی جزئیات آیت منسوخ اپنی جگہ پر اُسی طرح قائم ہیں۔ اور کہیں واجب العمل اور کسی مقام پر مندوب العمل ہوتی ہیں مثلاً قرآن عزیز میں جس جس مقام پر مشرکین اور کفار کے مقابلہ میں آیات صبر موجود ہیں۔ مفسرین عام طور پر ان سب کے لیے یہ فرما دیتے ہیں انہا نسخت بآیۃ الجہاد اور بآیۃ السیف۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ صاحب شریعت کا منشا یہ ہے کہ جماعتی زندگی کی بقا کے لئے اب صبر اور اعراض کی صورت حال ختم کر دی گئی اور جہاد کا حکم فرض قرار دیا گیا لیکن انفرادی زندگی میں اور روزمرہ کی معاشرتی زندگی میں ایذاء مشرکین اور کفار کے مقابلہ میں اگر صبر کو معمول بہا بنایا جائے تو یہ احسن اور بہتر قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ بعض جزئیات میں جبکہ مثلاً کسی کافر اور مشرک کو اس طرز عمل سے اسلام کی جانب مائل کیا جانا مقصود ہو یا یقین ہو کہ اس طریق عمل سے کسی کافر جماعت کا اسلام قبول کرنا ارجح ہے تو اس وقت تلوار کے جہاد کے مقابلہ میں اُن کو صبر و اعراض کے ذریعہ مسلمان بنانا واجب ہوگا۔ اور اس صبر کو آیت جہاد سے منسوخ نہیں کہا جائے گا۔

دعاگو ابوالقاسم

اُن کی شفقت

از: محمد عبداللہ القاسمی

دارالعلوم دیوبند کی زندگی کا ایک واقعہ ہے کہ ایک ذی استعداد طالب علم صرف شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی علیہ الرحمۃ سے دورہ حدیث پڑھنے کی امید پر دیوبند آگئے۔ مگر تقدیر کا کرشمہ کسی ایک کتاب کی ناکامی دورہ حدیث کی راہ میں ایسی حائل ہوئی کہ وہی ایک کتاب لے کر ایک سال پڑھنا ہوگا تب دورہ مل سکے گا ورنہ دارالعلوم دیوبند کے ضابطہ کی رو سے دورہ حدیث نہیں ملیگا وہ سخت حیران، رفقاء کرام کی جو کوششیں تھیں سب ناکام ہو گئیں۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ مجاہد ملت صاحب کو دہلی لکھا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی سفارش حضرت (ناظم تعلیمات جو حضرت شیخ الاسلام تھے) کی خدمت میں مسموع ہو۔ اتفاق سے وہ زمانہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا زمانہ تھا تمام اراکین شوریٰ اور حضرت مجاہد ملت بھی دو چار دن کے لئے پہونچ گئے۔ موقع غنیمت سمجھ کر وہ بیچارے اور راقم الحروف حاضر ہوئے سلام کے بعد سلسلہ گفتگو شروع ہو گیا، ہماری عجز و انکساری دیکھتے ہوئے وعدہ فرمایا کہ یاد رہا تو حضرت شیخ سے زبانی تذکرہ کرونگا۔ اگلے روز چار بجے یا پانچ بجے کے فرنٹیر میل سے آپ دہلی جا رہے تھے۔ مولوی صاحب اور راقم سیدھا اسٹیشن چلا گیا۔ ہمیں دیکھکر مسکرائے اور فرمایا آپ بڑے عجیب طالبعلم ہیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ہم نے عاجزانہ درخواست کی حضرت ہماری مجبوری حد سے تجاوز کر چکی ہے ورنہ بے ضابطہ ہی سہی آپکو تکلیف نہ دیتے، فوراً قلم ہاتھ میں لیا اور ہماری درخواست کے ایک کونے پر لکھا یا

"سیدی ملاذی مولائی حضرت الشیخ، یہ طالب علم واقعی صاحب عذر معلوم ہوتا ہے، امید ہے کہ انکی درخواست منظور فرمائینگے" والسلام حفظ الرحمٰن کان اللہ لہ۔

خوش خوش دعا دیتے ہم دارالعلوم کی طرف دوڑے تمام رفقاء و ہمنشین دعائیں دیتے رہے۔ حضرت کی سفارش مسموع ہوئی اور غریب مولوی مقصود الرحمٰن سال بھر کی محنت سے بچ گئے۔

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوشنوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اُڑ گیا

اقبال

از:۔ قاضی محمد سفیان۔ علیگڈھ

محترمی سلامت السّلام علیکم۔

مجاھد نمبر کے لئے جو آپ دیر سے کوشش کر رہے ہیں اور اس کو مولانا مرحوم کی بلند خدمات کی مثل بلند پیمانہ پر شائع فرمانے کی سعی کر رہے ہیں بڑا اعتماد ہے کہ آپ کی ان مبارک خدمات کے عوض مولانا مرحوم کو ایک نئی زندگی ملے گی، انشاء اللہ۔ اور وہ ہم سے دور ہونے کے باوجود آنیوالی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ بنیں گے۔ ہمارے لئے بھی ان کی جد وجہد مسلسل چراغِ راہ تھی ہی، آنے والوں کے لئے بھی انشاء اللہ مزید روشنی کا سبب ہوگی۔ خدائے برتر آپ کی پُرخلوص کوششوں کو مزید بار آور مفید بنائے۔

مولانائے مغفور سے میرا تعلق خاطر شروع سے تھا۔ دیکھئے جب جمعیۃ علمائے ہند نے ۱۹۳۵ء غالباً فلسطین کانفرنس منعقد کی، میں بھی اُس میں بحیثیت خصوصی مہمان شریک تھا۔ علی گڈھ سے دو آدمی شریک ہوئے تھے میں اور مولوی عبد القیوم صاحب۔ میں تین روز دہلی رہا۔ مولانائے مرحوم کے علاوہ بہت سے نامور علمائے حق سے شرف ملاقات رہا۔ چند کے نام یہ ہیں۔

مولانا شوکت علی۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا محمد عرفان۔ مولانا حبیب الرحمٰن۔ مولانا احمد سعید۔ مولانا مفتی کفایت اللہ۔ ڈاکٹر سید محمود۔ ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ وغیرہ۔

جلسہ مولانا سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت تھا۔ تقریریں تین روز تک رات کو ہوتیں۔ مولانائے مرحوم کی بھی تقریر تھی۔ خیر یہ تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ دوسرے دن صبح کو مجلس منتظمہ کی خصوصی نشست تھی۔ خاص ارکان جمعیۃ اس میں سب موجود تھے۔ غالباً ۵۰ آدمی ہوں گے، مگر سب خواص۔

مولانا حفظ الرحمٰن نے کوئی تجویز فلسطین کے مظلوم مسلمانوں کے لئے رکھی۔ چونکہ وہ انگریز کے خلاف تجویز تھی۔ اور یہاں کے مسلمان سے بڑی قربانی اور مجاہدہ چاہتی تھی، اکثر ارکان نے اس کی دشواریاں بیان کیں، کہ یہ کام یہاں کا مسلمان کر نہ سکے گا، اور اس میں مولانا شوکت علی پیش پیش تھے۔ اس کی مخالفت میں — اب مولانا اپنی تجویز کی حمایت میں کھڑے ہوئے۔ میں برابر بیٹھا ہوا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ مولانا اُس وقت چھریرے بدن کے اور لانبے نظر آ رہے تھے۔ اب جو حمایت حق کے جوش میں انھوں نے تقریر شروع کی ہے، میں حیران تھا کہ ایک دریا تھا جو ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میرے پاس مولانا احمد سعید۔ بیٹھے ہوئے تھے۔ سر جھکائے چُپکے چُپکے کہہ رہے تھے کہ اب ان سے بچ کر کوئی نہیں جائے گا۔ ہماری ساری کمزوریاں سامنے رکھ دیں گے۔ مگر یہ خیالات بھی کسی احترام اور ادب کے ساتھ تھے اور سب ہی شرکاء لاجواب بنے ہوئے بیٹھے تھے۔ اور آخر میں تجویز سب ہی کو منظور کرنی پڑی۔

وہ اکثر علیگڈھ سیرت نبوی کی مجالس میں آتے اور ان کی تقریر سننے کا موقع ملتا رہا۔ اب آگیا ۱۹۴۷ء سیاست کا رُخ تعمیر کی جگہ تخریب نے لے لیا۔ کیا کیا بربادیاں آئیں۔ کہاں کہاں مولانا ہوا کا غلط رُخ موڑنے کیلئے پھرتے رہے علی گڈھ میں دس دفعہ اس سلسلہ میں آنا ہوا۔ دو سال ہوئے وہ علی گڈھ بلائے گئے۔ سیرت پر تقریر کے لئے نہیں، بلکہ ملک کی فضا میں جو زہر گھول دیا گیا اور مسلمان روز روشن میں اُس کا نشانہ تھا۔ اس پر لوگوں نے پوچھا کہ مسلمان باوجود تمام احتیاطوں اور دستور کی پابندی کے نشانۂ ستم کیوں ہے؟ اس پر مولانا نے تقریر میں نہایت شافی جواب دیئے۔ سب سے زیادہ فائدہ کی بات اُن کی تقاریر اور مشوروں میں یہ ہوتی تھی کہ باوجود فضا کے سیاہ ہونے کے، وہ ناامید نہ ہوتے تھے، بلکہ حوصلہ اور جوانمردی کی بات کرتے تھے، یاس اور قنوط سے ہمیشہ مسلمانوں کو بچاتے تھے اور اللہ پر بھروسہ رکھنے کی بات کرتے تھے، یہ نہیں کہ حالات خلاف ہیں تو ہاتھ پیر توڑ کر ایک طرف بیٹھ جاؤ یا کہیں اور بھاگ کھڑے ہوں۔ یہ بات دوسرے کسی بڑے سے بڑے لیڈر اور رہنما کے اندر نہیں ملتی تھی۔ یہ تقریر قاضی پاڑہ علی گڈھ میں ہوئی۔ عصر سے مغرب تک، اس میں نواب صاحب

چھتاری وغیرہ بھی شریک تھے۔ پھر بعد مغرب چارپائی پر دیر تک تبادلۂ خیال رہا۔ پھر بعد عشاء میرے مکان کے برابر ہی کھانا ساتھ ساتھ کھایا۔ اس میں بھی ایک گھنٹہ سے زیادہ تبادلۂ خیال رہا۔ کھانے میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی بھی شریک تھے۔ بڑی پرلطف صحبت اور نشست رہی اور اس شعر کا مصداق سامنے تھا؎

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق — باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

اکتوبر ۱۹۶۱ء میں علیگڈھ میں یک طرفہ فساد ہوا، مولانا آئے، آپ بیمار تھے مگر آپ بیماری میں بھی مسلمان کی تکلیف سن کر کہاں کہاں تک نہیں پہونچے۔ یہاں تک کہ زیادہ بیمار ہو کر امریکہ ہی چلے گئے۔

مولانا کا مشن تو یہ تھا کہ آزادی ملنے کے بعد سب مل کر رہ سکیں، مَن و تو کا فرق نہ ہو، مگر ملک کے سب ہی لوگ تو عقل و سمجھ کی بات نہیں سمجھتے۔ کچھ لائق ہوتے ہیں تو کچھ غنڈے بھی، جو عافیت اور عزت کا راستہ چلنا نہیں جانتے۔ مولانا سے زیادہ پنڈت نہرو خود کہتے کہتے تھکے جاتے ہیں، مگر سب کہاں سمجھتے ہیں اور سنتے ہیں۔

غرض کہ مولانا کو اللہ نے بلا لیا اور اُن کا خواب امن و عافیت ملک میں آپکے سامنے پورا نہ ہوا۔ یہاں تک کہ اب جارح دشمن آگیا اور سب کا رُخ اُدھر مڑ گیا۔ ملک کے اندر دنگا فساد اب نہیں۔ اب صرف ایک نعرہ ہے کہ سب ایک ہوں اور افتراق کو خیرباد کہیں۔ خدا کرے کہ اب ہی ہم دوست اور دشمن کو سمجھیں اور بے معنی جنگ و جدال کو خیرباد کہیں جس سے مولانا کی روح کو سرور ابدی حاصل ہو۔

آخر میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ میرے والد ماجد قاضی مولوی محمد عثمان کبھی تحریک ترک موالات اور کانگریس میں شریک نہیں ہوئے ہمیشہ علیحدہ رہے۔ اکثر خواجہ عبدالمجید تشریف لاتے تھے، اصرار تھا۔ کہ مولانا کانگریس کے ممبر بن جایئے۔ والد صاحب فرماتے رہے کہ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی مولانا تصدق احمد خاں شروانی آتے تھے کہ مولانا ممبر بن جایئے، والد ماجد انکار کر دیتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ والد کو پوچھا تھا (اس کو ۳۰ سال ہوگئے اور اب ان کے انتقال کو بھی ۲۵ سال ہوگئے . . . .) کہ اباجی سب لوگ اس تحریک میں شریک ہیں، آپ شریک کیوں نہیں ہوتے۔ لوگ ہم کو ٹوڈی کہتے ہیں اور کیا کیا کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میرا اپنا فیصلہ ہے، میں شریک نہیں ہوتا۔ کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ اچھا تم سے کہتا ہوں تم اپنے دل و جگر ہو۔ گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں کہ انگریز چلا جائے، ہم حکومت کریں گے۔ تم بتاؤ کس ہندو میں صلاحیت ہے کہ سارے ملک کا انتظام کرے گا۔ ہندو نے کبھی سارے ملک پر آج تک حکومت کی، مسلمان اس قابل ہوتا تو اپنی ہی کیوں کھوتا۔ اول تو انگریز جائے گا نہیں، چاہے قیامت ہو جائے۔ اگر کسی حادثہ سے چلا گیا، پھر تم دیکھو گے کہ وہ بدنظمی ہوگی کہ تم کو اپنے گھر میں چین اور سکون نہ ہوگا۔ یہ بات ہوگئی ۳۰ سال کی۔ ۲۵ سال ہوئے کہ وہ اللہ سے مل گئے۔ ۱۹۴۷ء . . . . . میں میرے بھائی کو جن کا نام محمد سلمان تھا، سولن پردری پٹیالہ میں اسٹیشن ماسٹر تھے، پہلی فرصت میں دوستوں نے اُن کو ہی شہید کیا۔ ان کی معصوم بی بی کو۔ ایک لڑکے کو۔ والد ماجد نے تو یہ صدمہ نہیں دیکھا، لیکن ہمارے قلوب تو اپنی جگہ پر اُن سے زیادہ زخمی ہیں۔ بس خدا سے یہ دعا ہے کہ ہمارے ملک کے بسنے والوں کو سمجھ دے جو چیزیں غارت کرنے والی ہیں اُن کے نقصان کو سمجھیں، اور جو ملک کی عزت بڑھانے والی ہیں ان پر عمل پیرا ہوں، خدا سے امید ہے کہ وہ ہم سب کو اچھی سمجھ دے گا اور بس!

قطعۂ تاریخ

صادق بستوی

بر وفات حسرت آیات مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان رحمۃ اللہ علیہ

ضیغم ہندوستان جاتا رہا — بجھ گیا اس دیس کا روشن چراغ
آہ صادق فوت ہم سے ہوگیا — "غم کشان قوم" اک شاہی دماغ

۱۳۸۲ھ

آہ مردِ حق پرست و حق نواز — پاک باز و پاک سیرت نیک نام
جنت الفردوس ہاں خلد بریں — ہو یہی جنت ترا عالی مقام

۱۳۸۲ھ

شیخ مدنی و ابوالکلام کے بعد — رہبرِ دین و میرِ جمعیت
تھے جہانِ خراب میں صادق — ایک حضرت مجاہد ملت

۱۹۶۲ء

خطیب وقت تری موت سے ہے — دلِ انسانیت سوزاں و گریاں
لکھو یہ مصرعۂ تاریخ صادق — امام قوم و امت حفظ رحمان

۱۹۶۲ء

مولانا وحیدی الحسینی۔ شہر قاضی بھوپال

نقوش قلب و ذہن

اس وقت جبکہ مولانا حفظ الرحمن مرحوم کی سیرت و شخصیت کی تذکار و یادآوری کے سلسلہ میں ہم کو اپنے تاثرات اور قلبی احساسات کا اظہار مقصود ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علمائے حق کی ان مساعی جمیلہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کر دیا جائے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی و ترقی کے نقشے تیار کئے تھے اور خون دل سے اس میں رنگ بھرا تھا اور پھر میدان جہاد میں اتر کر بکمال سرخروئی اپنے خدا سے جا ملے۔

یوں تو مسلمانوں کے فاتحانہ داخلہ سے صوفیائے کرام اور فقرائے اسلام کا ہراول دستہ اسلام کے اس فطری معاشرتی نظام کے قیام کے لئے زمین کو ہموار کرتا رہا جس کے اندر نہ ذات پات کی تفریق ہے نہ چھوت چھات کی لعنت جہاں نہ رنگ و نسل کا امتیاز ہے نہ خاندانی امتیازات کی برتری کا تصور۔ ہندوستان کی اس سنگلاخ سرزمین کو نرم کرنے میں ان کو جن دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑا تھا اُن کو حیطۂ خیال میں بھی نہیں لایا جا سکتا۔

حضرت شاہ ابو علی سندھی المتوفی سنہ ۲۷ھ اور حضرت سید سالار مسعود غازی المتوفی سنہ ۴۲۴ھ سرتاج ابدال حضرت شاہ عبد اللہ چنگال المتوفی سنہ ۴۴۱ھ (دھار مالوہ) اور قطب الاقطاب علی داتا گنج بخش ہجویری لاہوری المتوفی سنہ ۴۶۵ھ (لاہور) کی سالہا سال کی تبلیغی سرگرمیوں کے بعد جب حضرت خواجہ خواجگاں سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے قدم رکھا ہے تو زمین سخت آسماں دور ہے کا مصداق ہمارا ملک بنا ہوا تھا۔ لیکن ان بزرگوں نے اپنی سچی روحانیت اور مخلوق خدا کی شفقت کے جذبہ بیناہ سے سرکش اور اکھڑ انسانوں کو رام کیا۔ پھر ان کے خلفائے عظام حضرت قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید الدین شکر گنج، حضرت محبوب الٰہی۔ خواجہ نظام الدین اولیا، حضرت شیخ المشائخ علی احمد صابر کلیری وغیرہم نے مسلمان بادشاہوں سے یکسو ہو کر علی الرغم خدا پرستی اور خلق خدا کی ہمدردی کا نصب العین اختیار کیا اور تاریخ اسلامی ہند میں ایسے روشن نقوش مرتسم کئے کہ جن کی درخشانی و تابانی کو زمانہ کے حوادث اب تک نہ ماند کر سکے۔

اس کے ساتھ وہ علمائے کرام جو دربار شاہی سے وابستہ رہے ان کے اندر بھی ایسے علمائے حق پیدا ہوتے رہے کہ شاہی کروفر، اور حکومتی اقتدار، اور بادشاہوں کا رعب و داب اظہار حق میں کبھی مانع نہ ہوا۔

سلطان علاؤ الدین خلجی، شہنشاہ محمد تغلق جیسے زبردست جابر اور طاقتور حکمرانوں کے مقابل قاضی جلال الدین اور علامہ شہاب الدین کے واقعات اس پر شاہد عدل ہیں۔ مغل شہنشاہیت کے روشن عہد میں شہنشاہ اکبر جہانگیر کے دنیادار علماء اور پیشہ ور صوفیاء کے مدمقابل سچے عالموں اور پاک نفس بزرگوں کا ایک طبقہ ہمیشہ موجود رہا کہ مادیت کے دوش بدوش ان کی روحانیت کا غلغلہ ہر جگہ بلند رہا اور بسا اوقات وقت کے شہنشاہوں کو ان کے آگے گردن عقیدت کو خم کرنا پڑا۔

ان بزرگان دین، ارباب یقین کے سامنے اسلام کا وہ روحانی نظام رہا جس کے ماتحت دنیوی مادی نظام اگر قائم رہے تو انسانیت فلاح و کامیابی، بہبودی و کامرانی سے ہمکنار ہو جائے۔ مادی فلسفوں، دنیوی نظاموں کی ناکامی کا واحد راز انسانیت کی مادی اور روحانی تقسیم کے اندر مضمر ہے۔ جب بھی سیاست اور طریقہ حکمرانی اخلاق و روحانیت سے آزاد ہو گی دنیا کو بے چینی، بدامنی اور اضطراب و انتشار کے طوفان سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اسلام نے دیانت و سیاست کو اس خوبی و خوش اسلوبی سے باہم آمیز کیا ہے کہ اس سے جو معجون مرکب تیار ہوتا ہے وہ انسانیت کے جملہ امراض کا واحد علاج ہے۔ جہاں اس کے اندر تفریق پیدا کی گئی وہاں روحانی سکون غائب، دلوں کا اتحاد مفقود، اور عمومی امن و امان رخصت ہو جاتا ہے مغرب نے روحانیت کو زندگی سے نکال کر قومیت کو اس کا نعم البدل تجویز کیا تھا جس کے نتیجہ میں ایک ہی صدی میں دنیا کو دو عالمگیر جنگوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اور تیسری ہمہ گیر جنگ کا منحوس سایہ ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔

بہرحال ہمارے ملک کے راجے مہاراجے، بادشاہ و شہنشاہ ملک گیری کی ہوس کی آگ کو سلگاتے رہے اور یہ مذکورالصدر انسانیت کے خدام اخلاق و روحانیت کی تعلیم سے اس کو بجھاتے رہے اس طرح اس ملک کی سیاست کی

گاڑی چلتی رہی اور اس خونخواری و خونریزی سے بحد امکان بچاتے ہوئے اس کو آگے بڑھاتے رہے جو خاص مادیت کا خاصہ ہے جس کے پیش آنے والے نتائج بد سے عالم انسانیت اس وقت لرزہ بر اندام ہے۔ جب شہنشاہ اکبر نے اپنے سیاسی اقتدار کے بل بوتہ پر اس روحانیت کو کچلنا چاہا تو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی المتوفی نے اس طوفان کا رخ موڑ دیا اور جب مغلیہ حکومت کے زوال کے وقت پیشہ ور علماء و صوفیہ نے اسلام کے چہرہ کو مسخ کرنا چاہا تو حضرت حجۃ الاسلام امام الہند شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے اپنی تصانیف مبارکہ کے ذریعہ روحانیت کے نورانی چہرہ کو برافگندہ نقاب کیا۔

مذکورالصدر حقانی علماء کے سلسلہ نے مسلمانوں کے حکومتی سیاسی زوال کو اسلامی تعلیمات کی شکست نہیں مانا بلکہ اسکو بادشاہت و ملوکیت کی غلطیوں کا خمیازہ قرار دیا اس لئے وہ مغل شہنشاہیت کے زوال پر دل شکستہ ہو کر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھے بلکہ پہلے سے زیادہ سرگرم و مستعد چاق و چوبند ہو کر ان روحانی اصول اور روحانی نظام کو قائم کرنے کے لئے میدان جہاد میں اتر پڑے۔ چنانچہ ابتک اس ولی اللہی جماعت نے اپنے مؤسس اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ کے قائم کردہ ہدایات و خطوط پر بار بار اس روحانی و اسلامی انقلاب برپا کرنے کی مساعی کا سلسلہ جاری رکھا جو باہمی اختلاف، سروسامان کار کی کوتاہی اور احوال زمانہ کی ناسازگاری کیوجہ سے مشیت ایزدی کے مطابق منزل مقصود کو نہ پہنچ سکا۔ سب سے پہلے حضرت امیر المومنین سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اسمٰعیل شہید قدس سرہما کی سرکردگی میں مجاہدین کی جماعت قائم ہوئی جس نے اس ملک سے ہجرت کر کے بیرونی سرزمین سے محاذ جہاد قائم کیا اور ایک عرصہ تک کامیابیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہوتے ہوئے معرکۂ بالاکوٹ میں سنہ ۱۲۴۶ھ میں ایک منزل پوری کر کے یہ دعوت سرد ہو گئی۔

دوسری بار حضرت شیخ الآفاق شاہ محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت مکہ معظمہ کے بعد جنگ آزادی کا ایک مشترکہ میدان تجویز ہوا جو ۱۸۵۷ء کی ناکامی سے غدر جیسے رسوا کن نام سے مشہور کیا گیا۔ اس تحریک کی پشت پر علمائے حق کا زبردست ہاتھ تھا اور اس کی سخت پاداش بھی ان کو اٹھانی پڑی جس پر تاریخ ہند کے صفحات شاہد ہیں

تیسری انقلابی تحریک وہ ہے جسکو گورنمنٹ برطانیہ کی روپہلی سنہری مصلحتوں نے ریشمی سازش کے نام سے رسوائے زمانہ کیا۔ اگر تحریک مذکور حسب اسکیم کامیابی سے ہمکنار ہوتی تو ایشیا کی تاریخ بدلی ہوئی ہوتی۔ اس تحریک کی ناکامی، اور عالم اسلام کے زوال، اور خلافت ترکیہ کے خاتمہ پر علمائے حق کے ایک گروہ نے ہندوستان کی آزادی کے بوجھ کو تنہا اپنے شانہ پر اٹھانا حالات زمانہ کے خلاف سمجھا۔ اور ملکی و وطنی تحریک کے ساتھ اشتراک عمل کو اپنی حکمت عملی کا نشانہ بنایا۔

تحریک خلافت اور تاسیس جمعیت اسی دور کی یادگار ہے۔ خلافت کی اس تحریک نے ملک بھر میں جو ہلچل پیدا کی اور مسلمانان ہند میں ایثار و قربانی کی جو عظیم لہر پیدا کی اور برادران وطن میں جس قسم کے اتحاد کی عملی کھلبلی کی تھی وہ تاریخ آزادئ ہند کی زریں یادگار ہے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملک نے زبردست کروٹ بدلی ہے اور ایسی انگڑائی لی ہے کہ اس کے نتیجہ میں آزادی کا پھل بہت جلد ہی ملک کی گود میں ٹپک پڑیگا۔
اس دور میں خلافت جمعیۃ العلماء اور کانگریس کے اجلاس دوش بدوش ہوتے تھے اور علماء و عوام، ہندو مسلمان سب شانہ بہ شانہ چل رہے تھے یہی وہ زمانہ ہے جس کے اندر ملک و ملت کے ہر دلعزیز مشہور و مقبول زعماء اور لیڈر پیدا ہوئے اور وہ ہندوستان گیر شہرت سے نیکنام ہوئے۔

حضرت مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰنؒ کی عملی زندگی کا آغاز بھی اسی عہد سے ہوتا ہے جمعیۃ العلمائے ہند کے اجلاس منعقدہ امروہہ سنہ ۱۹۳۰ء سے ان کی شخصیت سیاسی و ملی پلیٹ فارم پر منظر عام پر نمودار ہوئی۔ اس جلسہ میں مولانا مرحوم کی قرارداد شرکت کانگریس نے سرگرمی اور بڑی ہماہمی اس لئے پیدا کی کہ اجلاس مذکور کے صدر مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اور صدر استقبالیہ مولانا ابوالنظر رضوی مرحوم اس کے مخالف تھے۔ لیکن شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ سید سلیمان ندوی وغیرہم نے اس تحریک کی پرزور تائید کر کے تجویز مذکور کو منظور کرالیا۔

مولانا مرحوم نے سنہ ۱۹۳۰ء میں جو راستہ اپنے لئے تجویز کیا تھا وہ نہایت پختگی کے ساتھ اس پر قائم رہے اور حالات کی سخت آندھیاں، مخالفوں کے شدید طوفان بھی ۱۹۶۲ء تک ان کو اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکے۔ مولانا ہندوستان کی آزادی اور مسلمانان ہند کا آزادانہ مذہبی و ملی موقف، اور اس آزادئ ہند کے ذریعہ عالم اسلام اور ایشیا بھر میں بیداری کی نئی لہر پیدا کرنے کی تحریک کے نہایت گرم جوش اور پرزور وکیل تھے۔ شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور امام الہند مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان سے زیادہ اس نصب العین کا داعی و حامی کوئی نہ رہا تھا وہ علمائے ہند کی اس آخری تحریک کے جس کے نتیجہ میں ہمارا ملک آزادی سے ہمکنار ہوا گویا آخری نشانی تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کی ہمراہی میں سنہ ۱۹۳۰ء کے اندر ملک کی ستیہ گرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور پھر اس

راستہ میں ان کے قدم آگے بڑھتے ہی رہے لیکن کسی وقت بھی ملی نصب العین سے عام قوم پرور زعماء کی طرح چشم پوشی اختیار نہیں کی۔ کیونکہ حضرت مرحوم نے آزادئ ہند کے نصب العین کو ایک دینی و ملی فریضہ کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔ ان کے نزدیک مذہب اور سیاست میں علیحدگی کا کوئی تصور ہی نہ تھا کہ ایک دامن پکڑنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا ممکن ہو۔ وطن پہلے یا مذہب جیسے لغو سوالات کی گنجائش انکے فراخنائے ذہن و فکر میں نہ تھی۔ عام ارباب سیاست کی طرح پبلک و پرائیویٹ لائسنس کی تقسیم ان کے احاطۂ خیال سے باہر تھی۔ ایک عالم دین اور ولی اللّٰہی تحریک کے ایک مخلص رضاکار کی حیثیت سے اس میدان میں گامزن ہوئے تھے اور ملکی زندگی کی وحدت کے سچے عقیدہ سے ان کا قلب سرشار تھا اس لئے مذہب و وطن کے مقام اور ان کے فرائض کی ادائیگی میں کبھی تضاد کے شکار نہ ہوئے مولانا مرحوم روحانیت کے اس مثل اعلیٰ کے قائل تھے جس کے وسیع دائرہ میں حیات انسانی کا ہر گوشہ آجاتا ہے۔ جب میدان سیاست میں ہوش و شعور کی ان کی آنکھیں کھلی تھیں اس وقت بھی فضا یہی تھا احوال عمومی طور پر چھایا ہوا تھا لیکن دیکھتے دیکھتے مخالف ہوائیں چلنے لگیں اور ناگاہ زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ زبردست جھکڑ چلے اور بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سمیت اکھڑ گئے، دریاؤں نے راستے بدل لئے، اور پرانے نقشے یکسر بدل کر رہ گئے۔ لیکن مذہب و ملت کے اس مجاہد کے پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش پیدا ہوئی نہ قدم میں لڑکھڑاہٹ، جس نصب العین کی تکمیل کا عہد و پیمان انہوں نے اپنے بزرگوں سے کیا اس کے لئے جان کی بازی لگانے کے لئے آخر دم تک قائم رہا بلکہ راہِ حق میں جان دیدی اور بقول غالب زمزمہ سنج رہا ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یقیناً جو دشوار گزار حیات گسل راستہ اختیار کیا گیا تھا وہ ہر ایک کے بس کا نہ تھا۔ ایک طرف فرائض ملی کا مضبوطی سے دامن تھامے رہنا دوسری طرف وطنی تقاضوں کو، ان فرائض ملی کے ماتحت رکھ کر تکمیل کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ بقول مولانا مرحوم کے ایک ہاتھ میں شریعت کا جام نازک تھامنا اور دوسرے ہاتھوں میں عشق کی ہتھوڑے کا رکھنا اور اس کو آپس کے ٹکراؤ سے بچائے رکھنا اور ان سے کھیلنا ہر آدمی کا کام نہیں ؎

در کفے جام شریعت، در کفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

اس شعر کی واقعی عملی تفسیر ان کی زندگی میں نظر آتی تھی بے شمار ایسے خطرناک مرحلے درپیش آتے تھے کہ اندیشہ ہوتا تھا کہ یہ نازک جام پاش پاش نہ ہو جائے لیکن ان کے حسن تدبیر نے حیات ملی کے قافلہ کو ہمیشہ بچا لیا۔ اور سیاست کے اس خارزار سے دامن بچا کر نکل گئے۔ راقم السطور کو مولانا مرحوم کی زندگی کو ۱۹۴۶ء-۱۹۴۷ء سے بہت قریب سے مطالعہ کرنے کی عزت حاصل ہوئی حالات کی خوفناکی، ماحول کی برہمی اور مسلم عوام کے احساسات و جذبات کے مد و جزر کا عالم نہ پوچھئے جوں جوں جنگ کے شعلے بلند، اور اس کا حلقۂ تاثرہ وسیع ہوتا جا رہا تھا ہندوستانی سیاست آتش فشاں پہاڑ بنتی جا رہی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ یہ پہاڑ ملتِ اسلامیہ ہند پر پھٹ پڑا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دلی میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھے گی اور مسلم عوام کو جھلس کر بھسم کر دے گی کیونکہ ہندوستان کی راجدھانی ہونے کی وجہ سے ہر سیاسی جماعت یہاں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتی تھی۔ لیگ و کانگریس کی کش مکش نقطۂ عروج پر پہنچ رہی تھی۔ پاکستان کی قرار داد منظور ہو کر زبردست تہلکہ مچاتے ہوئے تھی۔ سیاست کا سارا زور و شور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان قوم کے اندر مرکوز ہو کر رہ گیا ہے۔ نت نئی جماعتیں نئے نئے نعروں کے ساتھ نمودار ہو کر مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنا چاہتی تھیں اور یہ جوشیلی قوم ہر زوردار نعرہ کے بہاؤ میں بہنا چاہتی تھی اور مسلمانان دہلی پر ہر جماعت کی یورش بڑھتی جا رہی تھی، اور دلی مرحوم کے قدیم باشندے اپنی روایاتی مہمان نوازی سے کسی کو محروم یا مایوس نہ کرنا چاہتے تھے لیکن پلہ قوم پرور جماعتوں کا بھاری تھا۔ اس وقت دہلی میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقد ہونا طے پایا یہ تمام جماعتیں قوم پرور اصولوں کی حامی تھیں غالباً مولانا حفظ الرحمنؒ اس کے صدر استقبالیہ چنے گئے تھے یا سیکرٹری بہرحال اس کانفرنس کے اہم داعیوں میں سے تھے۔ اس کانفرنس میں تمام مسلم زعماء بجز لیگی لیڈران کے دلی میں سمٹ کر جمع ہو گئے تھے۔ بے شمار تجاویز پیش ہوئیں لیکن سب سے اہم قرار داد جس پر بڑی گرما گرمی پیدا ہوئی تھی وہ کانگریس کے ساتھ بلا شرط جنگ آزادی میں شمولیت کی تھی۔ ۱۹۳۵ء کی کانگریسی وزارتوں اور ان کی کارروائیوں کی تلخیاں عامۂ مسلمین کو شرکت کانگریس سے برگشتہ بنائے ہوئے تھیں جس کے اثرات مسلم رہنماؤں تک وسیع تھے جذبات مشتعل اور احساسات تند و تیز تھے۔ احرار اسلام اپنے زاویہ نگاہ کو عوام میں گرم گفتاری کے ساتھ پیش کر رہے تھے اور دیگر زعماء اپنے اپنے مطمح نظر کو لئے ہوئے میدان عمل میں سرگرم تھے۔ اس شعلہ فشاں تجویز کے محرک مولانا مرحومؒ تھے اس قدر ترمیموں کی بوچھاڑ کی گئی کہ یقین ہو گیا تھا کہ دب کر یا بجھ کر رہ جائے گی ہر مقرر نے زور خطابت سے اس کو دبانا چاہا اور ہر زعیم نے اپنی سحر البیانی سے اس کی روح کو اڑانا چاہا لیکن سب سے آخر میں مجاہد ملت بحیثیت مجیب کھڑے ہوئے

اور ہر ترمیم کو رد اور ہر تقریر کا جواب اس خوبی سے دینا شروع کیا کہ تھوڑی دیر میں ایک محفل بدلنے لگی۔ مولانا کی زبان کی قینچی نے ترمیمات کی دھجیاں بکھیرنا شروع کر دیں۔ ایک ایک ترمیم ہوا میں اڑنے لگی۔ خطابت کا جوش و خروش، معقول دلائل کا زور، شور، روانی و سحر البیانی کا تموّج اہل مجلس کو بہا لے گیا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مولانا مرحوم کی خطابت، پارلیمانی بے پناہ صلاحیت اور ٹھوس علمیت کا یہ نقش تھا کہ نیاز مند کے قلب میں مرتسم ہوا۔ جو استعداد زمانہ سے گہرا اور پائدار ہوتا گیا۔ اس سے پہلے ان کی علمی قابلیت اور تصنیفی استعداد کا اعتراف دل میں تھا لیکن تقریر و خطابت کے میدان میں فرد ہونے کا یقین نہ تھا کیونکہ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، سحبان الہند مولانا احمد سعید رحمۃ اللہ علیہ کی تقاریر کے آگے کسی کا چراغ جلتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ اور نہ کوئی نگاہ میں سماتا تھا

پھر حضرت مرحوم سے جو رشتہ خلوص و عقیدت قائم ہوا وہ برابر استوار ہوتا گیا اور مولانا کے کمالات کے جوہر کھلتے گئے بے پایاں فراست، گفتار و کردار کی یکسانی، ملی ہمدردی، وضعداری، خلق خدا کی نفع رسانی اور وفاداری بشرط استواری کے تو مجسمہ تھے۔ جس جس قدر قریب کے مواقع ملے اندازہ ہوا کہ ان کا باطن ظاہر سے زیادہ اُجلا اور روشن ہے۔ اس دور میں فراغت علمی کے بعد بھی طالبانہ کج بحثی کی عادت خاکسار میں کافی تھی۔ اس لئے جب بھی حاضری ہوتی اس قسم کے مباحث کا دفتر مولانا کے سامنے کھول دیتا جو زیادہ تر سیاسیات حاضرہ سے متعلق ہوتا مولانا مرحوم برجستہ ہر شک و شبہ کا جواب دے کر صاف کرتے بہت جلد جوش میں آجاتے اس وقت جب تیغ زباں بے نیام ہوتی تو پھر اس کا کاٹ نہیں ہو سکتا تھا معلوم ہوتا کہ اس مبحث کے لئے پہلے سے تیار ہو کر بیٹھے ہیں اور ایک ایک مسئلہ نگاہ میں ہے اس طرح کی بحث بازیوں کی وجہ سے کبھی کبھی تفریح بھی فرماتے جب حاضری ہوتی تو فرماتے کہئے لیڈر صاحب کچھ اور فرمانا ہے؟ اس جملہ کے اندر شفقت و محبت جلوہ گر ہوتی اور اپنے قیمتی اوقات کو بچانا مقصود ہوتا۔ لیکن اگر پھر بھی سوال کر دیا جاتا تو جزبز نہ ہوتے بلکہ خندہ پیشانی سے مطمئن کرنے کی کوشش فرماتے۔

دلی کی اس تین چار سالہ زندگی کا اختتام ۱۹۴۲ء کی تحریک پر ہوا اور فقیر اپنے وطن بھوپال پہنچ کر تدریسی زندگی میں مصروف ہو گیا۔ مولانا قبلہ و بند کو دعوت دیتے رہے الا کی زندگی کا یہ پرشور عہد تھا جبکہ اپنے مضبوط عقیدہ کی بنا پر خود اپنی قوم کی اکثریت سے ٹکرانا پڑا۔ ان کے ظلم و ستم سہنے پڑے۔ اپنوں اور بیگانوں کے طعن و تشنیع کا نشانہ بننا پڑا مگر پائے ثبات میں ذرہ برابر لغزش نہ پیدا ہوئی۔ پھر ۱۹۴۷ء میں آزادی کی صبح اپنے خونی افق کے ساتھ تقسیم ہند کی شکل میں نمودار ہوئی جس کی مخالفت کانگریس کی جنرل کونسل میں انہوں نے واشگاف انداز میں فرمائی تھی اور برملا اس اندیشہ کو ظاہر کیا تھا کہ بظاہر یہ پرامن انتقال اختیارات خانہ جنگی کے واقعات سے زیادہ خونریز حوادث کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ظاہر ہوگا۔ مولانا مرحوم نے واضح الفاظ میں اپنے اس عقیدہ کو ظاہر کیا تھا کہ تقسیم کے بغیر ہندوستان کی آزادی جملہ اہل ملک کو لڑ جھگڑ کر صحیح موقف و مقام تک پہنچا دے گی جو اغیار کے ٹھوسے ہوئے فارمولے کے مقابلہ میں زیادہ مفید اور پائدار اور ملک کے مستقبل کے لئے نایاب ہوگی۔ مولانا مرحوم کی فراست ایمانی اور بصیرت سیاسی کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ مذکورہ بالا اندیشہ خوفناک حقیقت کی شکل میں نکلا جس کی تلخی و ناگواری کے اثرات سے کام و دہن ابھی تک متاثر ہیں

رگ و پے میں جب اترے زہر غم پھر دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

۱۹۴۷ء اور اس کے بعد جو خوفناک واقعات اس ملک کی سرزمین پر ظاہر ہوئے اور وحشت و بربریت کے جس ہولناک اور گھناؤنے حادثات سے ہمارے ملک کی تاریخ داغدار ہوئی اور پورے ہندوستان کا سر ندامت اور شرمندگی سے جھک گیا تباہی و بربادی کے داغوں کو دھونا ممکن نہیں ان تمام واقعات و حادثات میں بحیثیت ایک حب وطن اور مظلوموں کے حامی و مددگار ہونیکے حضرت مجاہد ملت نے جو اعلیٰ کردار، سچی انسانی ہمدردی و دلسوزی اور جابر و ظالم قوتوں کے مقابلہ میں اعلاء حق کا جو زبردست فریضہ انجام دیا ہے ان کو مصلحین عالم کی صف میں لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔

ان قیامت خیز حوادث و فسادات میں فرشتہ رحمت بن کر مصیبت زدوں، ستم رسیدوں اور مظلوموں کے درمیان پہنچے اور ان کی ہر طرح کی امداد و معاونت فرماتے، زخموں پر پھائے رکھتے، دل جلوں کو تسلی و تشفی دیتے اور ظالموں کے خلاف بلاخوف لومۃ لائم اعلان حق فرماتے۔ جس طرح آزادی سے پہلے حضرت مولانا مرحوم نے حصول آزادی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اسی طرح آزادی کے بعد اس کے بقاء و استحکام کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ وہ جس ولولہ و حوصلہ کے مرد حق تھے افسوس ہے کہ حوادث زمانہ اور یہاں کے رہنے والوں کے باہمی اختلاف نے اس کا موقع نہیں دیا کہ وہ کل ہی نوع کی خدمت کے فریضہ کو انجام دے سکتے بارہا اس کا اظہار فرماتے۔ چودہ سالہ حیات مبارک مولانا کی زندگی کا یہ دور زریں ایثار و قربانی، ہمدردی و خدمت گذاری کا عظیم مرقع ہے جو تاریخ اسلامی ہند میں ہمیشہ نمایاں درخشاں رہے گا جس کے مختلف روشن پہلو اسی نمبر کے پھیلے ہوئے مقالات میں جگمگاتے ملیں گے۔

مجاہد ملتؒ کی یاد میں

مولانا صدرالدین صدرؔ انصاری صدر جمعیۃ علماء بھوپال

سالکِ راہ ہدایت، واقفِ سرِّ حیات
ماہر رمز سیاست، رازدار کائنات

عامل شرعِ متیں و باغبانِ علم دیں
رہرو راہ طریقت یادگارِ صالحیں

ذاکر و عالم، خطیب و واعظِ شعلہ مقال
زاہدِ شب زندہ دار و اہل دل صاحب کمال

ناظم جمعیت ہندوستاں عالی نہاد
اہل فکر، اہل نظر، اہل قلم، خوش اعتقاد

خوش مزاج و خوش مذاق و خوش خیال و خوش خصال
نیک فطرت، نیک طینت، نیک خصلت، نیک چال

باغبان گلشن اردو، مصنف باکمال
ناقد جادو بیاں تھا، وہ خطیب بے مثال

ناخدائے کشتی ملت، امیر کارواں
اتحاد قوم کا حامی زعیم نکتہ داں

مردِ میدان سیاست یادگار رفتگاں
افتخار ملک و ملت، عظمت ہندوستاں

محملِ لیلائے آزادی کا یکتا ساربان
آسمانِ حریت کا آفتابِ ضوفشاں

فرد میں شانِ جماعت یہ خدا کی دین تھی
دیدۂ بینا میں اس کی بات فرضِ عین تھی

زندہ دارِ عظمت علم رشیدؒ و قاسمیؒ
ناز بردار محمدؐ، حامل وصفِ علیؓ

یادگار احمد و محمود سجاد و ولی
نورِ دیں، مفتی کفایت کی ذہانت کا ولی

مظہر انوار شیخ و حامل اطوار شیخ
تھے نمایاں اس کے ہر کردار سے کردار شیخ

حضرتِ علامہ انور کے شاگردِ رشید
بوالکلام دہلوی کے فیض سے تھے مستفید

اُٹھ گیا ساقی مذاق جشن مے نوشی گیا
وہ سرور جانفزا وہ کیف مدہوشی گیا

مے کدہ باقی ہے، لیکن روحِ مے خانہ گئی
وہ نشاطِ زندگی وہ شانِ رندانہ گئی

اب کہاں دیکھیں گی آنکھیں وہ جمال دلنواز
اب کہاں ہوگی میسر لذت رازو نیاز

مولوی حفظ رحمنؒ وہ مجاہد بے مثال
باغ جنت میں ہے اب اے خدائے لایزال

زندہ جاوید تھی ذاتِ گرامی بالیقیں
صدرؔ وہ اس شعر کے مصداق تھے کچھ شک نہیں

در کفے جام شریعت در کفے سندانِ عشق
ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

ناگپور میں حضرت مجاہدِ ملّت کا ورُود

مولانا عبدالحق عارف

غالباً ۱۹۳۵ء میں کُل ہند سیرت کمیٹی پٹی لاہور کی صوبائی سیرت کمیٹی صوبہ متوسط و برار ناگپور کی دعوت پر مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب نور اللہ مرقدہم کلکتہ سے سیرت النبیؐ کے جلسہ میں خطاب کرنے کے لئے ناگپور میں پہلی بار تشریف لائے تھے، ناگپور کے رئیس الحاج نواب محی الدین خاں صاحب مرحوم نے اپنے دولتکدہ بھاؤڑہ ہاؤس میں حضرت مولانا کو اپنا مہمانِ خصوصی بنایا۔ مجاہد ملت اُس زمانے میں مولانا حفظ الرحمان سیوہاری کے نام سے عوام و خواص میں متعارف تھے۔ جوانی کا عالم تھا، چہرے پر گھنی اور سیاہ داڑھی بھوؤں کے ابرو جیسے تیغ براں، نہایت دُبلا پتلا جسم مگر چال ڈھال اور گفتگو سے مجاہدانہ زندگی کی نشاندہی کا پتہ چلتا تھا علاوہ اس کے ہر آن و ہر لمحہ علم و عمل کے اعتبار سے اُس ذات گرامی کی زندگی میں نمونۂ سلف کے فضل و کمال کا نمایاں اظہار ہوتا تھا۔

رحمت اللعالمین کے موضوع پر حضرت مولانا نے اپنے مخصوص انداز بیان میں ناگپور کے مشہور میدان چٹنویس پارک میں جہاں پر ہندو مسلم سکھ عیسائی اور دیگر مذاہب کے ہزاروں انسانوں کا مجمع تھا مسلسل ڈھائی گھنٹہ تک نہایت دلکش، کیف آور اور ایمان افروز تقریر سے سامعین کو محظوظ فرماتے ہوئے سرکار دو عالم کی سیرت مقدسہ کے ہر پہلو کو اُجاگر کرکے اس بات کو ثابت کیا کہ انسانی زندگی کے ہر طبقہ کو اُسوۂ رسول کی پیروی اس لئے لازم اور ضروری ہے کہ وہ انسان کی مثالی زندگی کا معیار ہے۔

اس تقریر کے بعد عوام و خواص کی خواہشوں اور درخواستوں پر حضرت مولانا نے ناگپور کے وینکٹش تھیٹر میں اپنی دوسری تقریر نہایت مبسوط اور پُر کیف انداز بیان میں فرمائی۔ ہندوستان کی آزادی کامل اور جنگِ عالمگیر کے عنوان پر اپنے سیاسی خطاب میں ۱۹۳۹ء کی عالمگیر جنگ ہونے کے امکان، اسباب و علل اور جنگ عالمگیر کے نتیجہ میں یورپی دنیا کی عبرتناک تباہی اور دنیا کا سیاسی نقشہ اور اُسی کے ساتھ ساتھ اتحادیوں اور جرمنی کی جنگی تیاریوں کے خدوخال، عالمگیر جنگ میں اتحادیوں کی کامیابی کے ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی کے آغاز کے دلائل و براہین پر بہت سی پیشینگوئیوں کا اظہار فرماتے ہوئے دوران تقریر میں نہایت واضح اور صاف الفاظوں میں بیان فرمایا تھا کہ اس غلام ہندستان کی غلامی کے سبب ہی آج تک ممالک اسلامیہ کا ہر ملک برطانوی سامراج کا غلام بنا ہوا ہے، حالاتِ حاضرہ میں روزانہ کے تغیر و تبدل یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں ہندستان اپنی غلامی کی زنجیر کو توڑے گا۔ ظاہر ہے جب زنجیر کی ایک کڑی زنجیر سے جدا ہوتی ہے تو اس کی ساری کڑیاں خود ڈھیلی ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ہر ہندوستانی کی قربانیوں اور دلوں کے موالات کے ساتھ ہی حل ہوگا، سامعین میں ارباب سیاست اور اصحاب علم و فہم کے یہ تاثرات تھے کہ مولانا کی ہر دو تقاریر بڑی بلند پایہ اور یادگار کے علاوہ ملک و ملت کے لئے نہایت سبق آموز اور سود مند تھیں۔

۱۹۴۷ء کے آخر دسمبر کے وسط میں امراؤتی کانفرنس میں شرکت کے لئے دوسری بار ناگپور میں مجاہد ملت تشریف فرما ہوئے تھے جبکہ ہندوستان آزاد ہوتے ہی ملک بھر میں قتل و خونریزی کے علاوہ مسلمانوں میں شدید خوف و ہراس اور عام طور پر بھگدڑ کا سلسلہ در سلسلہ پیدا ہو چکا تھا، اُسی کے اثرات تھے جس سے صوبہ متوسط و برار اور ناگپور کے مسلمانوں میں بھی عام بے چینی و اضطراب اور بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ کانفرنس میں حضرت مجاہد ملت نے اس موقع پر نہایت پُر جوش اور ولولہ انگیز تقریر سے بھگدڑ اور عام اضطراب و بے چینی کی فضا اور ماحول کی کایا پلٹ کردی۔ بتدریج دلوں سے خوف و ہراس ختم ہوتا گیا۔

۱۹۴۹ء میں صوبائی جمعیۃ علماء متوسط و برار کانفرنس کے عظیم الشان اجتماع کے موقع پر تیسری بار حضرت مجاہد ملت نے ناگپور میں اس کانفرنس کے دس ہزار کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کو وحدت کلمہ پر جمع ہونے، اتحاد و اتفاق والی کتاب و سنت کی زندگی کو عملاً اختیار کرنے، باہمی چپقلش سے پرہیز کرنے اور اللہ سے اپنا مضبوط تعلق جوڑے رکھنے کی پُر کیف انداز میں تلقین و ہدایت،

فرمائی تھی۔ نیز اسی کے ساتھ ساتھ فرمایا تھا کہ وطن عزیز اپنی دیرینہ غلامی سے آج آزاد ہے، آزادی جیسی نعمت عظمیٰ کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد اور ہر طرح کی قربانی پیش کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ لہٰذا آزادی کی ہر نعمت و دولت سے استفادہ اٹھانے میں برادران وطن کے ساتھ ہم بھی برابر کے شریک و سہیم ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے دل و دماغ سے احساس کمتری نکال دینا چاہیئے جس سے اُن کے دلوں میں یہ غلط خیال پیدا ہو چکا ہے کہ ہم یہاں پر کسی کے غلام اور محکوم ہیں اور اکثریت ہماری آقا اور بادشاہ ہے۔ آقائی اور بادشاہی کے راج کو ہم نے ختم کرکے دیش کو آزاد کرایا ہے۔ اب اس ملک میں سیکولرازم کا نظام جمہوری قائم ہے۔ ہر بالغ ہندوستانی کی رائے اور ووٹوں سے سیکولرازم کی جمہوری حکومت کا نظام بنتا ہے۔ یہ ہماری ڈیوٹی ہے کہ ملک کی تعمیر میں اپنی پوری پوری محنت اور جانفشانی سے ملک کو بام عروج پر پہونچائیں اور اپنے کردار و عمل سے یہ ثابت کر دکھائیں کہ ہم اپنے پیارے وطن کو جنت نشاں بنا کر رہیں گے تاکہ ہر ہندوستانی امن و چین کی زندگی بسر کر سکے۔

انقلاب ۱۹۴۷ء نے صوبہ متوسط و برار اور اس کی راجدھانی ناگپور میں بسنے والی بڑی تعداد کے مسلمانوں میں خوف و ہراس، پراگندگی، انتشار اور بھگدڑ کا ایک ہولناک سیلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ اُس سے شبانہ روز تباہی و بربادی کی بھیانک شکل شہر سے لے کر قریہ تک کے مسلمانوں میں پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ حالانکہ شمالی ہند کے شہروں کی طرح سے قتل و خونریزی اور مار کاٹ کا ایک واقعہ بھی اس صوبہ میں کہیں بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن دلی اور دیگر شہروں کی مار کاٹ کی خبروں اور واقعات نے صوبہ میں ہر طرف کے مسلمانوں کو اُس سے زیادہ سے زیادہ متاثر بنا کر خوف و ہراس، پراگندگی اور بھگدڑ میں مبتلا کر دیا تھا۔ دوسرے ۱۹۴۷ء سے پہلے کے وہ رہنما اور قائدین جو اس صوبہ میں مسلمانوں کی قیادت و رہنمائی فرما رہے تھے اُن میں سے زیادہ تر نے اپنے کو روپوش کر لیا تھا۔ بہتیروں نے اپنے اپنے مقامات سے سب سے پہلے راہِ فرار اختیار کرنے میں پیش قدمی کرکے مسلمانوں میں ہولناکی اور خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ انہیں وجوہات سے صوبہ متوسط و برار اور ناگپور میں شبانہ روز بھگدڑ کا لامتناہی سلسلہ مسلمانوں میں پیدا ہوتا گیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء کے آواخر تک کم و بیش صوبہ بھر میں یہی حالت مسلمانوں میں جاری و ساری رہی۔

ان ناگفتہ بہ حالات و ماحول کے پیش نظر صوبہ متوسط و برار اور ناگپور کی مایہ ناز بزرگ ترین اور عابد شب زندہ دار ہستی حضرت مولانا محمد یٰسین رحمۃ اللہ مرقدہٗ صدر جمعیۃ علماء متوسط و برار ناگپور نے صوبہ کے کل جماعتی رفقاء کار کو اپنے مدرسہ عربیہ اسلامیہ رائپور میں جمع کیا۔ کافی غور و خوض کے بعد طے کیا گیا کہ ناگپور میں جلد سے جلد صوبائی جمعیۃ کانفرنس طلب کی جائے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۴۹ء کے اواخر میں ایک عظیم الشان کانفرنس صوبہ جمعیۃ علماء متوسط برار ناگپور کا سہ روزہ اجلاس نہایت عظمت و شوکت کے ساتھ انعقاد پذیر ہوا جس میں مرکزی جمعیۃ علماء ہند کے کم و بیش تمام اکابرین نے اور حضرت مجاہد ملت نے اپنی تشریف آوری سے سہ روزہ کانفرنس کے اجلاس کو بارونق بنایا۔ خود حضرت مجاہد ملت اور تمام اکابرین کے کانفرنس سے متعلق یہ تاثرات تھے کہ "اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ کانفرنس اتنی عظیم الشان اور وسیع پیمانہ پر ہوگی تو اس کو آل انڈیا جمعیۃ کانفرنس بنا دیتے"۔ مجاہد ملت نے دوسرے دن کے اجلاس میں اپنے خطاب خصوصی سے کانفرنس کے دس ہزار شرکاء کے سہمے ہوئے اور خوف زدہ قلوب و اذہان کی کایا پلٹ کر رکھ دی جس نے صوبہ بھر کے دور دراز سے آئے ہوئے مسلمانوں میں زندگی کی نئی اُمنگ و ترنگ پیدا کر دی۔ حضرت مجاہد ملت کے خطاب کا یہ کھلا ہوا مجاز مسیحائی تھا کہ اکھڑے ہوئے قدم اپنی اپنی جگہ پتھر کی چٹان سے زیادہ مضبوط جم گئے اس طرح صوبہ میں ہر جگہ مسلمان مستقبل کے لئے کچھ سوچنے اور کرنے کے لئے آمادہ اور مستعد نظر آنے لگے۔ کانفرنس کے اختتام کے بعد صوبہ کے ہر ہر شہروں اور قریوں میں تنظیم جمعیۃ کا نہایت زور و شور کے ساتھ کام شروع ہو کر مضبوط اور متحرک جمعیۃ قائم ہو گئی تھی۔

شومئی قسمت ۱۹۵۲ء میں حضرت مولانا محمد یٰسین صدر جمعیۃ علماء صوبہ متوسط و برار ناگپور نے اچانک اس دار فانی سے رحلت فرمائی۔ مولانا مرحوم کی اسی سالہ عمر عزیز کے چالیس سال اس صوبہ میں صرف دو اہم کاموں کے لئے شبانہ روز وقف رہے ہیں۔ پہلا کام جمعیۃ علماء کی سربلندی کے لئے جان توڑ کوشش، دوسرا کام مدرسہ عربیہ اسلامیہ رائپور میں فن تجوید کے ساتھ قرآن کریم کا ناظرہ و حفظ قرآن کی تعلیم کے علاوہ درس نظامیہ کی تکمیل کا مشغلہ بہت عزیز تھا۔ اپنی ضعف و نقاہت کے سبب اپنے دیرینہ رفیق محترم حافظ جمیل الرحمٰن صدیقی اعظمی کو اپنی حیات ہی میں مولانا محمد یٰسین نے جمعیۃ صوبہ کی نظامت اعلیٰ پر متعین فرما دیا تھا۔ مذکورہ ہر دو بزرگوں کو حضرت مجاہد ملت سے نہایت گہرا قلبی تعلق اور قرب حاصل رہا ہے۔ چنانچہ ان بزرگوں نے صوبہ کے پریشان اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ مصیبت و خانماں بربادی کے زمانے میں

حضرت مجاہد ملت کی قیادت و رہنمائی سے مسلمانان صوبہ کو نجات دلوائی۔ خصوصاً ناگپور اور رائپور کے دو اہم کسٹوڈین کے معاملات قیامت تک حضرت مجاہد ملت کی قیادت و رہنمائی کا دم بھرتے رہیں گے۔

نومبر ۱۹۵۳ء میں چوتھی بار حضرت مجاہد ملت صوبائی تنظیم اور اس کے انتخابی اجلاس کی رہنمائی کے لئے ناگپور تشریف لائے اور اپنے پرانے میزبان نواب محی الدین خانصاحب مرحوم کی بیگم صاحبہ کے اصرار و خواہش پر ان کے دولتکدہ بھاؤڑا ہاؤس میں قیام فرمایا تھا۔ صوبہ کی خصوصی مجلس، نمائندگان صوبہ کو علیحدہ علیحدہ اپنے دلپذیر خطاب سے نوازا تھا۔ شب میں صوبہ جمعیۃ کے جلسۂ عام میں شہر ناگپور کے ۶۵ ہزار مسلمانوں کو واعتصمو بحبل اللہ جمیعا کے خطاب سے حرارت ایمانی پیدا فرماتے ہوئے جماعتی تنظیم کی زندگی کے پروگرام کی صداقت کے پرچم کے نیچے جمع کر کے مومن والی زندگی کا سبق پڑھایا تھا۔ ناگپور کے دو اہم اور بڑے تعلیمی اداروں انجمن ہرایئج مڈل اسکول اور انجمن حامی اسلام کے طلبا، اساتذہ اور کارکنان انجمن کو خطاب فرماتے ہوئے موجودہ ماحول کی تبدیلی کے ساتھ تعلیم کی اہمیت خصوصاً دینی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے موضوع پر دو گھنٹہ تک مسلسل سامعین کو محظوظ فرماتے رہے۔

سنہ ۱۹۵۵ء میں پانچویں بار ناگپور سے کھنڈوہ تک سیرت مقدسہ کا پروگرام اور مرکزی جمعیۃ علماء ہند کی مالی اعانت کے تحت صوبہ کے متعدد مقامات سے موصولہ دعوت ناموں میں مسلمانوں کے اصرار و خواہش کے پیش نظر حضرت مجاہد ملت کامل اٹھارہ دنوں کے لئے تشریف لائے۔ یہ راقم الحروف کی خوش قسمتی کہئے یا حسن اتفاق "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" کے مصداق حضرت مجاہد ملت کے ہر دو اسفار و ادوار میں ہم سفر بننے کا شرف حاصل ہو گیا۔ مسلسل اٹھارہ دن میں چالیس کے قریب تقاریر کی پرکیف مجلسوں میں لطیف، وجمیل، حکمت و دانائی، علم و فضل و کمالات کی بلند ترین خطابت و سیاست کی دولت و نعمت سے سرفراز ہونے کا زرین و بے بہا موقع ملتا رہا۔ شاید دوبارہ ایسی پُرکیف اور ایمان پرور صحبت سفر والی زندگی نہیں حاصل ہو گی ؎

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

۱۹۵۶ء میں چھٹی بار ناگپور کو حضرت مجاہد ملت نے اپنی تشریف آوری سے رونق بخشی تھی، صوبائی جمعیۃ کا انتخاب تھا جس کی قیادت اور رہنمائی فرمانے کے بعد شب کو جلسۂ عام سے خطاب ولنبلونکم بشیئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات وبشر الصابرین پر فرمایا تھا۔

۱۹۵۹ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے لئے ناگپور کی زمین کو ساتویں بار اپنی تشریف آوری سے مزین فرمایا تھا۔ یہ آخری سفر ناگپور کے لئے تھا اور اجلاس سے فارغ ہو کر مومن پورہ میں سیرت پر خطاب کے لئے سامعین سے مخاطب ہونے اور اپنی آخری تقریر پر مہر لگا کر الوداع ہی کہنے آئے تھے ؎

خدا بخشے حقیقت میں مجاہد تھا وہ ملت کا
عیاں تھا اس کے کردار و عمل سے درد ملت کا
وطن کے معاملے ہوں یا مسائل دین و مذہب کے
بیاں کرنا ہمیشہ اُس کا شیوہ تھا حقیقت کا

نذرِ عقیدت بیادگار شہیدِ ملت

مولانا نجم الدین اصلاحی

مجاہد ملت کو علمی بصیرت وقت کی اہم ترین علمی شخصیت فقیہ العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ و انار اللہ مضجعہ کی میسر آئی، سوجھ بوجھ اور سیاسی افکار حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی تحریک اور امام الہند مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی صحبتوں سے اخذ فرمایا۔ گاندھی جی کی خوبیوں کو اپنایا۔ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی قدس سرہٗ کی روحانیت نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ کیونکہ پیغمبرانہ دعوت جس عزیمت اور حوصلے کی محتاج ہے وہ بدون تعلق مع اللہ کے ناممکن ہے۔ اس تعلق مع اللہ سے جس مرد مجاہد نے اپنا رشتہ اور ناتہ قائم کر لیا وہ ظاہری وسائل اور ذرائع سے بھی بسا اوقات بے نیاز ہو جایا کرتا ہے اور غیر مرئی طور پر دست قدرت میں وہ گردش کرتا رہتا ہے۔ ایسا شخص نفعی اور نام آوری خود بینی اور شہرت پسندی کی لعنت سے مراحل دور ہوا کرتا ہے۔ ایسے بلند ہمت اور صاحب عزیمت شخص کی ایک دن کی زندگی تخت و تاج سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ لاریب مجاہد ملت کی زندگی اسی طرح کی تھی اس لئے اُن کی موت پر پوری دُنیا متاثر ہے اور کتنی آنکھیں ہیں کہ اب تک ماتم کناں بالخصوص ہندوستان کے بوڑھے اور جوان، بچے اور عورتیں اپنی قسمت کو رو رہے ہیں کہ آگ کے شعلوں سے کھیلنے والا اور فرقہ پرست دراز دستیوں کو چیلنج کرنے والا مرد مجاہد ہمیشہ کے لئے ہم سے رو ٹھ گیا۔ آج مجاہد ملت کے اٹھ جانے سے ایک ایسی بساط زندگی لپیٹ کر رکھ دی گئی کہ جس کے ساتھ ۱۸۵۷ء سے جو تحریک آزادی ہند قائم ہوئی تھی دفعتہً رک گئی اور ختم ہو گئی اور اس میں دو رائیں نہیں کہ آج تمام مرحومین کی جدائی بالخصوص مولانا آزادؒ اور مولانا مدنیؒ کی دائمی مفارقت کا احساس پورے طور پر ہر قدم پر محسوس ہو رہا ہے مگر بقول عرفی ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

مجاہد ملت اور خدمت خلق

انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلنے والے مصلحین اُمت اور مجاہدینِ ملت کے لئے ضروری ہے کہ وہ "الخلق عیال اللہ" کے بین الاقوامی اصول اور "الناس کلہم اخوۃ" کے ہمہ گیر دستور کی روشنی میں امر بالمعروف و النہی عن المنکر کے فریضہ کو حدود شرعیہ کی رعایت کے ساتھ انجام دیتے رہیں اور "وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ" کی عملی تصویر بن کر پوری جرأت حق اور خداداد فراست کو مشعلِ راہ بنا کر درمیان کارزار کفر و دیں ترکش خود را خدنگ آخریں کا رجز خواں بن جائیں۔ کیونکہ خدمتِ خلق کوئی بچوں کی سیج نہیں ہے جو حجروں اور ان خانقاہوں اور علمی اداروں کے اندر ہی جہاں ہوا اور روشنی کا گذر نہ ہو اور جہاں صدیوں تک جنتری کا ورق نہ پلٹے اس کا منتہائے نظر اور نیابت کار کی آخری سرحد ہو۔ بلکہ یہ وہ ہفتخوانِ رستم ہے کہ جس کی لمحہ بھر زندگی کے مقابل برسہا برس کی عبادت و ریاضت کو اس کے آگے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ آج تصوف و سلوک کے نام پر شریعت و طریقت وغیرہ کے چند بے معنی الفاظ صرف زبانوں پر دماغی عیاشیوں کی پیداوار بن کر رہ گئے ہیں حالاں کہ شریعت اور شریعت کی پابندی کے اندر ہی سے خدمت خلق اور تمام اولاد آدم کی خبر گیری، ہمدردی کا سراغ اللہ والوں نے پا کر ہر زمانہ میں انبیاء کرام کی لائی ہوئی تعلیم و تہذیب سے متصادم قوتوں کا بانگ دہل مقابلہ کیا اور تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے مٹھی بھر افراد ڈانوا ڈول کشتی کے ناخدا ثابت ہوئے اور ظلمت اور تاریکیوں کے پردوں کو انوار صبح سے درخشاں و تاباں کر دیا۔ انھیں روشن دماغ اور زمانہ کی ضرورتوں سے بھرپور علم و عرفان رکھنے والے حفظ الرحمٰنؒ نے اپنی چشم حقیقت نگر سے ہندوستانی قوم کے دکھ درد کو بھانپ لیا۔ اور پھر سر بکف اور کفن بر دوش یکہ و تنہا انتہائی بے خوفی اور بے باکی کے ساتھ قوم و ملت کی ہر ممکن صورت سے ترجمانی اپنا فریضہ سمجھا اور رجعت پسند عناصر اور فرقہ وارانہ رجحانات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور زندگی کے آخری لمحہ تک یہ مرد مجاہد ہر محاذ پر چو مکھی جنگ لڑتا رہا۔ اور کبھی اس کے ماتھے پر شکن اور ابروؤں پر بل نہیں آیا۔ بلکہ ایک تبسم آمیز مسکراہٹ سے ہر حوادث زمانہ کا جواب دیا۔ اس کا جسم بظاہر مشت خاک تھا مگر حقیقت میں ایک آہنی پیکر تھا جو قصر و ایوان کے اندر گرجتا اور اپنی شعلہ بار تقریروں سے اپنا لوہا منواتا رہا اور ساتھ ہی خون دل سے چمنستان وطن کی آبیاری کر کے اپنے ناخنِ تدبیر سے پیچیدہ گتھیوں کو برابر سلجھایا کیا۔ اس لئے قدرتی طور پر ہندوستان کا ذرہ ذرہ سوگوار اور اداس ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ وعلی اتباعہ الی یوم الدین

آزادیٔ ہند کا مفہوم اور مجاہد ملت کا پیغام

ہندوستان کی آزادی کا مفہوم یہ تھا اور ہے کہ ہندوستان کی تمام بسنے والی قوموں کو اس نقصان کی تلافی کا موقع مل جائے

جو انگریزی حکومت کے تسلط سے ان کی تہذیب اور قومیت کو پہنچا ہے۔ ہمارے اکابر نے آزادی کی جنگ اس لئے لڑی تھی کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو اتنا اقتدار حاصل ہو کہ وہ خالص اسلامی اصولوں پر اپنے نظام اجتماعی کو از سر نو مرتب کر سکیں۔ قوانین شرعی کو اپنے قوم کے افراد پر نافذ کر سکیں اپنی جماعت میں احکام اسلامی سے انحراف اور غیر اسلامی خیالات اور طریقوں کی اشاعت کو روک سکیں۔ تعلیم کے اس نظام سے جو سراسر مخالف اسلام ہے اور جس کی بدولت مسلمانوں کو بتدریج و باقساط مرتد بنایا جا رہا ہے نجات حاصل کریں اور اپنے اصولوں کے مطابق اپنی قوم کی تعلیم کا انتظام کر سکیں یا بالفاظ دیگر مسلمان کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ آزاد ہندوستان کے نظام حکومت میں دوسری قوموں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی اپنا اختیار تمیزی استعمال کرنے کا پورا موقع حاصل ہو تاکہ خارجی اور داخلی معاملات میں قانون سازی اور اس کے نفاذ میں نظم مملکت اور اس کے متعلق شعبوں میں ہندوستان کی حکومت کبھی کوئی پالیسی اور طریق کار استعمال نہ کر سکے جو مسلم قوم کے اصول تہذیب کے خلاف رہا ہو۔ یا جس سے مسلمانوں کو من حیث القوم نقصان پہنچتا ہو۔ خلاصہ یہ کہ آزاد ہندوستان میں اس کے باشندوں کو ترقی کے جتنے وسائل حاصل ہوں ان سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان بھی سب کے ساتھ برابر کے شریک ہوں اور کوئی طاقت ان کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔

مجاہد ملتؒ خوب سمجھ چکے تھے کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے۔ اس لئے ماتم اور نوحہ خوانی ان کا کردار نہ تھا۔ بلکہ مرحوم کا آخر دم تک یہ پیغام رہا کہ جب ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں تو ہماری زندگی کا نصب العین بھی تو اسلامی ہونا چاہئے۔ بالخصوص ایسے وقت میں جب کہ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہماری قومیت اور تہذیب کو فی الواقع عظیم الشان خطرے کا سامنا ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ جو کچھ جس کے بس میں ہو آزادی ہند کی متاع گراں مایہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیب اور اپنے اسلامی نصب العین کے لئے کر گزرے ہو سکتا ہے کہ ہم اس آنے والے سیلاب کا مقابلہ پوری طرح نہ کر سکیں۔ لیکن جب اس کا مقابلہ کرتے کرتے ہمارے ہاتھ شل ہو جائیں گے اور ہمارے بازوؤں میں قوت نہ رہے گی جب ہمیں موجوں کے تھپیڑے بالکل نیم مردہ کر کے ساحل کی ریت پر پھینک دیں گے تو اس آخری وقت میں کم از کم اتنا اطمینان تو ضرور رہے گا کہ بزدلی کی زندگی سے یہ مردانگی کی موت ہزار درجہ بہتر ہے۔

مجاہد ملت رحمۃ اللہ علیہ نے عروس آزادیٔ ہند کے گیسو سنوارنے میں کمال درجہ مشاطگی کا مظاہرہ فرمایا اور یہ پیغام دیتے ہوئے رخصت ہوئے کہ ہندوستان کو اپنا ملک سمجھ کر اس کی تعمیر و ترقی میں متحدہ قومیت کے نظریہ کے مطابق سرگرم عمل رہنا ایک سچے اور مخلص آدمی کا فریضہ ہے ہم جس طرح مسلمان ہیں اسی طرح ہندوستانی بھی ہیں۔ احساس کمتری مومن اور مسلم کی شان کے منافی ہے اور جمعیۃ علماء ہند کی مضبوطی مسلمانوں کی مضبوطی اور ہندوستان کی بہبودی کے مرادف ہے۔ مجاہد ملت اپنی خدمات ہی کی وجہ سے شہید ملت کے سب سے اونچے مقام پر پہنچے کیونکہ ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق۔

مجاہد ملت کے سیاسی مقام کو جاننا سب کے بس کی بات نہیں۔ تاہم اتنا فہم اخبار بیں طبقہ اور سیاسی دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کو اعتراف کرنا ہوگا کہ مہاتما گاندھی آپ پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتے تھے اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال مولانا مرحوم کو اپنے برابر کا سمجھتے رہے اور امام الہند مولانا آزاد آپ کی ذہانت اور تدبر

سے مطمئن تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی فرقہ پرستوں نے سر اٹھایا مولانا نے پوری جرأت حق سے پارلیمنٹ کے در و دیوار تک میں زلزلہ ڈال دیا۔ آج کون ہے جو اعلاء کلمۃ الحق کے لئے اپنی قربانی پیش کرتا ہے؟ اور کون ہے جو افضل الجہاد کلمۃ صدق عند سلطان جابر اپنا شعار بناتا ہے؟ مجاہد ملتؒ کا یہ وصف ان کے تمام اوصاف پر غالب تھا۔ یہ قدرت کی دین تھی کہ اسی صفت کو لے کر وہ جہاں گئے کامیاب رہے اور ان کو ملک و ملت کی جو خدمت میسر آئی ان کے معاصرین میں کسی کو نصیب نہیں ہو سکی۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء سچ فرمایا سعدیؒ نے ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

قوم اور ملت کے فدائی

جناب امین سلونوی لکھنؤ

مولانا حفظ الرحمٰنؒ۔ وہ مجاہد ملت، وہ عظیم انسان جنھیں آج ہماری آنکھیں ہر جگہ تلاش کرتی ہیں اور ہمیشہ تلاش کرتی رہیں گی۔ لیکن اب وہ نہیں مل سکیں گے۔ البتہ ان کی خوبیاں زندہ، ان کی نیکیاں باقی، اُن کے اعمال اور کردار کی روشنی، ان کی پُر خلوص رہنمائی ہمیشہ زندہ رہے گی۔ ابھی پچھلے سال کی بات ہے کہ وہ ہماری مشکلات میں اپنے نیک مشوروں سے مدد کرتے تھے۔ دور ہوں یا نزدیک، دلی ہوں یا لکھنؤ ان کا لطف وکرم ان کی مہربانیاں اور ان کی خدمات محدود نہیں تھیں۔ لیکن لوگ اپنے سکون اور اپنے اطمینان قلب کے لئے اُن کے پاس تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں بھی برابر ان کی خدمت میں پہنچتا رہتا تھا اور یہ سلسلہ عرصہ سے جاری تھا آج وہ ہم سے جدا ہیں۔ مگر ان کی خدمت، ان کے خلوص کے گہرے نقوش دلوں میں موجود ہیں اور موجود رہیں گے ان کی شخصیت اور ان کی بلندی قامت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جس مسئلہ میں وہ ہاتھ رکھ دیتے اس کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا تھا اور ان کی زندگی کے ہر گوشہ سے انکا اخلاق، ان کا اخلاص، ان کی صداقت نمایاں ہوتی تھی۔ ایک میں ہی نہیں ان کے ملنے والے، ان کے چاہنے والے ہر طبقہ اعلیٰ وادنیٰ میں موجود ہیں اور آج ان کی کمی کو سبھی محسوس کر رہے ہیں اور بار بار ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اب ان کی جگہ کو کون پُر کرنے والا ہے۔ اور کون ان کے اس پروگرام کو جو انھوں نے ملت کی ترقی اور خوش حالی کے لئے اپنے سامنے رکھا تھا پورا کرے گا۔

> ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
> بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مولانا حفظ الرحمٰن انھیں شخصیتوں میں تھے اور انھیں دیدہ وروں میں تھے۔ جن کے واسطے ایک دو نہیں، ہزاروں آنکھیں روتی رہیں گی اور زندگی کے ہر موڑ پر خواہ وہ مذہب ہو، خواہ قانون کی موشگافی ہو خواہ سیاست کا میدان ہو، خواہ پارلیمنٹ کا ایوان یا علم وفن کا پلیٹ فارم، ہر جگہ ان کی یاد، ہر محل پہ ان کا خیال ان کے فکر وعمل کی رسائی۔ ہر محفل میں ان کے تذکرے اور ان کے کارناموں پر فخر ومباہات جاری رہیں گے۔

میں نے ان کے مخالفین کو بھی دیکھا ہے۔ ان سے ملا ہوں۔ لیکن یہ بھی عجیب بات تھی کہ ان لوگوں کے متعلق خود مولانا نے کبھی اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں کی، بلکہ کہا کرتے تھے کہ ان کی باتوں کے سننے کا موقع ہی کہاں ہے۔ جو ایسے لوگوں کا جواب دیا جائے۔ ان کی یہ سب سے بڑی خوبی تھی۔ اپنے کام سے کام تھا۔ ہر وقت ملت کا مفاد، ہر وقت قومی خدمت کا جذبہ انھیں سارے ملک میں لئے لئے پھرتا تھا — انھیں اسی خدمت میں سارا لطف زندگی حاصل ہوتا تھا۔ نہ اس پر انھوں نے کبھی فخر کیا نہ اُسے اپنی طرف منسوب کیا۔ بلکہ ہمیشہ جمعیۃ علماء کی کارکردگی بتائی۔ نہ فخر تھا نہ کسی پر طنز تھا۔ ہر شخص کے درد میں ڈوب۔ ہر شخص کی مشکلات میں فکر مند اور پوری قوم وملت کے لئے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف، حد یہ ہے کہ جب بستر علالت پر تھے۔ بیماری بھی سنگین ہو چکی تھی اور ہر شخص آپ کے لئے فکر مند تھا۔ صحت وتندرستی کی دعا کرتا تھا مگر خود آپ کی آخری تمنا یہ تھی کہ کاش وہ ملت کو خوش حال دیکھ سکتے۔ کچھ کام کیا تھا اور بہت کچھ باقی ہے اسے کون پورا کرے گا۔ دریافت حال کرنے والوں سے پوری سنجیدگی اور اطمینان سے کہتے تھے کہ موت اور زندگی پر کسی کا بس نہیں ہے اور نہ انھیں کسی اور بات کی فکر ہے اگر کوئی چیز ہے تو صرف یہ کہ قوم اور ملت کا سکون اس کی خوش حالی۔ اپنی فکر نہ تھی۔ اپنے تیمار داروں کے سامنے یہی کہتے کہ انسانیت تباہ نہ ہو۔ ملت کا شیرازہ منتشر نہ ہو اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو۔ بتایئے کہ ان کی اس آخری آرزو کو پورا کرنے والا کون ہے بجز ذات خدا کے کہ وہی مولانا علیہ الرحمۃ کا کوئی نعم البدل پیدا کرے اور وہ ان کے ادھورے کام کی تکمیل کرے۔

مجھے اس عظیم انسان کی خدمت میں عرصہ سے نیاز مندی حاصل تھی، تقسیم سے پہلے نہ جانے کتنی مرتبہ جمعیۃ علماء ہند کی مجالس اور کانفرنسوں میں طلب فرمایا جاتا اور میں ایک اخباری نمایندہ کی حیثیت سے ان مجالس میں شریک ہوتا اور پھر ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے مولانا محترم کی مہربانیوں کا مرکز تنہا میں ہی ہوں اور ایسے موقع پر اور دو چار اخباری نمایندوں کی موجودگی سے مولانا کی خواہش ہوئی کہ ایک "نیشنلسٹ پریس" بھی ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ آپ کو ہمیشہ سے فرقہ پرستی سے نفرت رہی۔ مولانا کی تحریک پر ایک نیشنلسٹ صحافتی ادارہ کی تشکیل پہلے پہل جمعیۃ علماء سہارن پور کی ایک کانفرنس میں ہوئی تھی اور ان کی بے پایاں نوازش کی بدولت ملک کے ایسے اکابرین سے ملنے کا موقع ملا جنھوں نے ہمیشہ برطانوی سامراج کے خلاف انقلابی تحریکات میں حصہ لیا تھا۔ میں نے ان کے خیالات سے معلوم کئے اور اپنے قلب میں ایک سکون سا محسوس کیا۔ تقسیم ملک کے بعد

تو میں مولانائے محترم سے اور بھی قریب ہوگیا تھا ۔ [illegible] زندگی کے سینکڑوں [illegible] جن میں ان کی رہنمائی اور مشورہ کے بغیر قدم اٹھانا مشکل تھا ۔ یا مجھے میں اکثر خدمت میں حاضر ہوتا رہتا ۔ کبھی اپنی ضرورت دلّی لے جاتی کبھی ان کا طلبیدہ ہوتا ۔ تقسیم ملک سے پریشانی اور اِدھر سے اُدھر آبادی کے تبادلے نے تو ایسا ہولناک دور پیش کر دیا تھا کہ خدا کی پناہ ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص میدان حشر میں ہے ۔ اس پریشانی اور انتشار سے نہ ہندو بری تھا نہ مسلمان لیکن مسلمانوں پر قدرتاً اس کا بہت زیادہ اثر تھا اور ان میں ایک حد تک زبردست جمود پیدا ہوگیا تھا ۔ کوئی شخص بھی اپنے مستقبل کے متعلق کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکتا تھا ۔ دلّی میں جو عالم پریشانی اور انتشار کا تھا آج اس کے بتانے کی ضرورت نہیں ۔ چاروں طرف ہولناک اور بھیانک منظر ، انسان ہی نہیں تباہ ہو رہا تھا بلکہ انسانیت برباد ہو رہی تھی ۔ اور یہ سب کچھ انسانوں ہی کے ہاتھوں ہو رہا تھا ۔ اور ایسا وقت بھی آگیا تھا کہ جب شہید قوم مہاتما گاندھی نے مولانا سے کہا " مولانا اب میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا ۔ آپ کوئی راستہ اپنے لئے خود پیدا کیجئے " اس وقت مجاہد ملت نے انھیں جواب دیا " آپ میرے لئے فکر مند نہ ہوں ، میرا بھروسہ خدا پر ہے ۔ آپ اپنی حکومت کو متوجہ کیجئے کہ دنیا میں اس کے متعلق کیا کہا جائے گا " اور بس ۔ اور پھر اس ہولناک دور میں کون اٹھا ۔ کس نے اپنی جان کی بازی لگائی ۔ کس نے سر سے کفن باندھا ۔ دن کا آرام اور رات کی نیند اپنی کس نے حرام کی ۔ کس نے اکھڑے ہوئے قدموں کو روکا ۔ کس نے جلتے ہوئے گھروں کی آگ بجھائی کس نے گرتے ہوؤں کو اٹھایا اور سہارا دیا ۔ دلّی میں سبھی موجود تھے ۔ ان کے موافقین تو ان کے ساتھ ہی تھے ۔ البتہ ان کے مخالفین کا کہیں پتہ نہیں تھا مسلمانوں کی قیادت کا زبردستی دم بھرنے والے خدا اور رسول کے نام پر اپنا فائدہ اٹھانے والے معلوم نہیں اس وقت کس تہ خانہ میں چھپے ہوئے تھے ۔ جمعیۃ پر نکتہ چینی کرنے والے اور دوسری جماعتیں بھی موجود تھیں ۔ لیکن ان میں سے کون نکل کر باہر آیا ۔ کس نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر لوگوں کی خدمت کی ۔ وہ صرف مولانا حفظ الرحمٰن تھے ۔ ان تمام واقعات پر جب اطمینان کے ساتھ لکھنے والا لکھے گا تو ان کی خدمات پر روشنی پڑ سکے گی ۔ اور جب یہ سب کچھ ہو چکا اور دلّی میں فتنہ و فساد کی آگ سرد پڑ چکی اور دلوں کی بھڑاس نکل چکی تو پھر ہندوستان کے مسلمانوں کے اور مسائل سامنے تھے جو یہاں رہ گئے تھے یا جو واپس آ رہے تھے ۔ ان کے مکان اور جائیدادوں کا سوال تھا ۔ ان مسائل کا حل کرنا ! ان کے سوالوں کا جواب لینے والا بھی وہی ایک انسان تھا ۔ یہ موقع ان واقعات کے بیان کرنے کا نہیں ہے جو میں نے ان کی زبان سے سُنے بلکہ دوسروں کی آنکھوں دیکھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق لوگوں کو علم نہیں ۔ مگر ان سے مولانا کی بلندی اور ان کے کردار کی پختگی کا پتہ چلتا ہے ۔ انھیں مہاتما گاندھی ، پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کی حکومت کا بھی اعتماد حاصل تھا اور یہ حضرات مولانائے محترم کو خود بھی اپنا معتمد سمجھتے تھے ۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کے علاوہ "لٹے پٹے" پناہ گیروں نے بھی اپنی مشکلات میں مولانا کی رہنمائی حاصل کی تھی ۔ مولانا نے اگر ایک طرف میواتی مسلمانوں کے مسائل سے حکومت کو آگاہ کیا تو دوسری طرف دلّی کے مسلمان اور ان مسلمانوں کے مسائل کی طرف بھی توجہ دلائی جو پریشانی کے عالم میں بھاگ گئے تھے اور اب پھر واپس آ رہے تھے ۔ مجھے یاد ہے کہ فرقہ پرستی کے اس بحران میں جو تقسیم کی بنیاد بنی تھی اور اس دور کے کتنے ہی مسلمان مولانا کی ذات پر کتنے رکیک حملے کر چکے تھے ۔ تقسیم کے بعد شرمندہ اور شرمسار مولانا کی خدمت میں اپنی پریشانیوں کو لئے حاضر ہوتے اور مولانا سے اپنے درد کی دوا مانگتے تھے ۔ لیکن اس نیک نفس انسان کے چہرے پر کسی قسم کی علامت نفرت یا حقارت کی نہیں پیدا ہوتی تھی بلکہ خندہ پیشانی سے ان کے مسائل ، ان کی باتیں سنتے ، انھیں تدابیر بتاتے اور خود ہی کھڑے ہو جاتے کہ وہ ان کی خدمت کریں گے ۔

ملک کی تقسیم کا اثر سارے ملک پر تھا نہ ہندو اس سے بری تھا اور نہ مسلمان ۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں کچھ نہ کچھ پریشانی پیدا ہوئی لیکن لکھنؤ ان خوش قسمت شہروں میں ہے جہاں عوام و خواص کی جدوجہد ، کانگریس کے رہنماؤں اور حکومت کے ذمہ داروں کی حکمت عملی سے یہاں کسی قسم کے ہولناک واقعات پیش نہیں آئے ۔ پھر بھی عام طور پر لوگ پریشان تھے اور خاص طور پر مسلمان بے حد خوف زدہ ہراساں ہی نہیں بلکہ ایک زبردست جمود سے دوچار تھا اسی دور میں انجمن فردوس ادب نے یوم عید میلاد النبیؐ کی تقریب کا آغاز کیا ۔ یہ تقریب اس سے پہلے امین آباد میں ہوتی تھی ۔ لیکن تقسیم نے ایسا ماحول بنا دیا تھا کہ کوئی اٹھنا ہی نہیں تھا ۔ خدا کا نام لے کر ہمارے ساتھ اور کارکنان اٹھے اور انھوں نے اس تقریب کا اعلان کر دیا ۔ ہر طرف مسلمانوں نے اس کا خیر مقدم کیا ۔ اس تقریب میں سیرت رسول پر تقریر ، ایک مشاعرہ نعت اور صبح ہوتے ذکر ولادت اور درود و سلام پر تقریب کا اختتام یہ پروگرام بنایا گیا انجمن کے ممبران کے وفود شہر کے گوشے گوشے میں دوڑے اور ہر ہندو مسلمان کو شرکت کی دعوت دی ، مگر فکر یہ تھی کہ اس تقریب میں کسی ایسے مقرر کو بلایا جائے جو سیرت پاک پر ایسے انداز میں تقریر کرے جس سے ایک طرف مسلمان سکون حاصل کریں دوسری طرف تمام شرکاء ایک اثر لے کر اٹھیں ۔ ہماری نگاہیں مولانائے علیہ الرحمۃ کی طرف گئیں ۔ کیونکہ امین آباد میں بھی پچھلے دور میں آپ تقریریں کر چکے تھے اور لوگ بے حد متاثر تھے ۔ اس وقت ہم مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اگرچہ یہ وہ دور تھا آپ کی بے حد مصروفیت کا تھا سینکڑوں مسائل

کسٹوڈین کے معاملات [illegible] کے مسلمانوں [illegible] پورے عزم سے مقابلہ کررہے تھے اور جب [illegible] خدمت میں پہنچا ہندوستان بھر کے مختلف گوشوں کے وفود دفتر جمعیۃ میں موجود ہوتے مگر میں مولانا کے سامنے بیٹھ جاتا تو پھر کبھی وہ میری دعوت کو رد نہیں کرتے تھے حالاں کہ میں نے دیکھا کہ انھیں ملک کے دور دور مقامات کے پروگراموں میں ترمیم و تنسیخ کرنا پڑتی۔ اور میری دعوت کو شرف مل جاتا اور یہ سلسلہ گزشتہ دس سال سے برابر جاری تھا۔ مولانا لکھنؤ کی اس تقریب میں شرکت کرنے پر خوشی محسوس کرتے اور عام طور پر لوگوں سے بھی کہتے کہ لکھنؤ میں جیسی یہ تقریب ہوتی ہے میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ ہزاروں انسانوں کا پرہجوم اجتماع اور اس قدر پرسکون اور سنجیدہ۔ اور بار بار میری درخواست پر ربیع الاول کی گیارہ اور بارہ کی رات کے لئے لکھنؤ تشریف لاتے اور جب تک یہ سلسلہ رہا انھوں نے ایک پیسہ بھی انجمن کا قبول نہیں کیا۔ حالاں کہ اکثر آپ کو دور دراز سفر سے لکھنؤ پہنچنا پڑتا۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ انتہائی مجبوری کی بدولت حاضر نہیں ہوسکتے تھے تو کوئی دوسرا انتظام بھی کردیتے تھے۔ اب میں کیا کہوں، گزشتہ سال بھی جب وہ بستر علالت پر تھے میں اس موقع پر حاضر ہوا تھا اور یہ اُن سے آخری ملاقات تھی۔ ان کے قریب تیمارداروں کا مجمع، ان سے ملنے والوں کا اجتماع امریکہ سے علاج کے بعد واپس آچکے تھے۔ میں حسب معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ ایسے نازک وقت میں میں خود کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ خود ہی دریافت حال فرماتے رہے۔ میرے اوپر کتنا گہرا اثر تھا۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ امریکہ میں علاج سے کوئی خاص فائدہ ہوا ہوگا اور چند ہی روز میں پورے طور پر صحت یاب ہوجائیں گے لیکن میں نے کیا دیکھا۔ مولانا نے خیریت پوچھی، میں نے جواب دیا اور زبان سے صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ ہم سب لوگ خدا سے دعا کررہے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ہر چہرہ پر افسردگی اور ہر آنکھ میں نمی تھی اور جس دن کے ملنے کی سب لوگ دعائیں کررہے تھے۔ ہونے والی بات ہو کر رہی مشیت کے سامنے سب بے بس ہوگئے اور پھر لکھنؤ آکر یہ خبر سنی کہ مجاہد ملت نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ خبر کتنی تکلیف دہ تھی۔ آج جب میں ہر طرف اپنے خیال کو دوڑاتا ہوں اور اپنے اردگرد دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اس نوع کی درخواست اب کس کے سامنے پیش کی جائے گی اور کون مہربانیوں کے ساتھ اس کا حسب منشا جواب دے گا۔ اللہ تعالیٰ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن کی روح کو سکون عطا کرے۔ انھوں نے لاکھوں انسانوں کے سکون کا انتظام کیا۔ نہ جانے کتنے پریشان حالوں کے لئے وہ فکرمند رہے۔

تقسیم ملک کے بعد انھیں نہ معلوم کتنے ناخوش گوار حالات میں گزرنا پڑا۔ کتنی دشوار منزلیں ان کے سامنے آئیں۔ مگر انھوں نے ایک حقیقی مجاہد کی طرح بہادری سے مشکلات کا مقابلہ کیا۔ وطن عزیز کے لئے قربانیاں کیں۔ اتحاد اور یک جہتی کے لئے بڑی صبر آزما راہوں سے گزرے۔ ملک میں کہیں بھی فساد ہوتا اور لوگ اخباری بیان دیتے اور وہ خود وہاں پہنچ جاتے اور روک تھام کی تدابیر اختیار کرتے۔ مسلمانوں کی آواز ایوان حکومت تک پہنچاتے۔ ایک بڑی باعزم شخصیت تھی جس نے باوجود ہزاروں بدزبانوں کی مخالفتوں کے دلّی میں آل انڈیا مسلم کنونشن کرکے سیاست کے پلیٹ فارم سے اتحاد اور یک جہتی کا نعرہ دیا۔ حکومت اور قوم کے واسطے ایک متوازن پروگرام پیش کیا۔ افسوس اس کے نتائج کا دیکھنے والا وہ مجاہد ملت نہیں ہے۔ مگر ان کی عملی زندگی آنے والی نسلوں کے لئے شمع ہدایت کا کام کرے گی اور ہمیشہ ان کے [illegible] لیتی رہیں گی۔ ان کے بتائے ہوئے راستے سامنے ہیں۔ ان کی قیادت ایک ایسی روشنی تھی جس سے ہم ہمیشہ فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

سنہ ۱۹۴۶ء کی یاد

مولانا عبدالحمید الاعظمی

سنہ ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے، جگہ بجگہ فرقہ وارانہ فسادات کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ وطن عزیز کی فضاء حد درجہ ناخوشگوار ہو چلی ہے۔ قوم پرور مسلمانوں پر طرح طرح کی یورشیں ہیں اور ان کے لئے اپنے نظریات پر قائم رہنا آگ کے انگاروں کو پکڑنا ہے۔ نواکھالی میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا ہے اس سلسلہ میں ملک کے بعض ذمہ داروں کے غیر ذمہ دارانہ اور مبالغہ آمیز بیانات سے اس کے اثرات غلط اور گمراہ کن انداز میں دور دور تک پھیل چکے ہیں۔ گاندھی جی امن کا پیغام لے کر نواکھالی جا چکے ہیں کہ اتنے میں مسلمانان بہار کو سخت ترین آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا اور اس کے اضلاع پٹنہ، مونگیر، بھاگلپور اور گیا وغیرہ میں شدید قسم کا فرقہ وارانہ فساد برپا ہو گیا، کئی ہزار مکانات جلائے گئے۔ بے شمار خانۂ خدا مسمار کئے گئے۔ شہیدا اور مقتولین کی صحیح تعداد کا تو اندازہ لگانا ہی دشوار ہے، ہزاروں زخمی اسپتالوں اور ریلیف کیمپوں میں پڑے ہیں مسلمان بے گھر اور بے در نظر آ رہا ہے اور اس کو محسوس ہو رہا ہے کہ آج آزادی کے ساتھ اپنے علاقہ میں چلنا پھرنا دشوار ہے مختلف جماعتوں کے رہنما اور رضا کار ریلیف اور بحالی امن کے لئے میدان عمل میں سرگرم ہیں۔ فساد کی خبر پاتے ہی دو ہی تین دنوں کے بعد عارضی حکومت (انٹریم گورنمنٹ) کے وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو اور مسلم لیگی وزیر سردار عبدالرب نشتر مرحوم فساد زدہ علاقہ کا مشترکہ دورہ کر چکے ہیں مشہور رہنما خان عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی بھی اپنے چند رفقاء کے ساتھ مظلوموں کی خدمت کے لئے سرحد سے بہار آ چکے ہیں جمعیۃ اور احرار کے باضابطہ کیمپ قائم ہیں۔ جمعیۃ علماء ہند کا ایک وفد موجودہ ناظم اعلیٰ حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی قیادت میں فساد زدہ علاقہ کا دورہ کر کے حالات کا سرسری جائزہ لے چکا ہے۔ گاندھی جی کو نواکھالی میں بہار کے اس حادثۂ عظیم کے بارے میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ذرائع سے طرح طرح کی اطلاعات مل رہی ہیں۔ راقم الحروف ان دنوں جمعیۃ کے ریلیف آفس کا خادم تھا۔ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی نے اخباری بیان کی ایک نقل اپنے عریضہ کے ساتھ گاندھی جی کی خدمت میں نواکھالی بھیج کر ان سے درخواست کی کہ آپ کو بہار آ کر حالات پر قابو پانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

چنانچہ گاندھی جی نے نواکھالی سے بہار آ کر قیام امن کے لئے اپنی مہم شروع کر دی۔ میں نے گاندھی جی کو اردو زبان میں خط لکھا تھا اس لئے انہوں نے مجھ کو اردو ہی میں حسب ذیل جواب دیا۔ دستخط خود مہاتما جی کے اردو میں اپنے تھے۔

رام گنج نواکھالی

۱۴-۲-۴۶ء

بھائی عبدالحمید اعظمی صاحب!

آپ کا خط اور اخباری بیان کی نقل مجھے ملی۔ آپ جو لکھتے ہیں وہ سب ٹھیک ہے تو میرے لئے بہت سوچنے کے لائق بات ہوگی۔ لکھ کر آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے اتنا تو آپ جانتے ہیں نا کہ میں نے بہار گورنمنٹ کو صلاح دی ہے کہ بہار میں جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں نرپکش کمیشن مقرر کرنی چاہیئے۔

آپ کا

م۔ ک۔ گاندھی

اس سے اندازہ کیجیے کہ بہار کے حالات کتنے سنگین تھے اور یہاں خدمت کا میدان کس قدر وسیع اور کتنا پر خطر رہا ہوگا۔

مجاہد ملت کی تشریف آوری

ان ہی حالات میں مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ہند اپنے چند رفقاء جمعیۃ کے ساتھ صوبہ بہار تشریف لائے اور سب سے پہلے پٹنہ میں بہار گورنمنٹ کے وزیر اعلیٰ اور وزیر بحالیات وغیرہ سے ابتدائی ملاقات کے بعد بہت تفصیل سے فساد زدہ علاقہ کا دورہ کر کے اصل حالات کو براہ راست معلوم کرنا ضروری سمجھا۔ اس دورہ میں تقریباً ایک ہزار میل کی طویل مسافت حضرت مرحوم نے طے فرمائی۔ جمعیۃ علماء بہار کے محترم صدر مولانا نوراللہ صاحب مستقل طور پر اور موجودہ امیر شریعت بہار مولانا منت اللہ صاحب کہیں کہیں شریک سفر رہے۔ مجاہد ملت نے مجھ خادم کو فساد کی رپورٹ مرتب کرنے، خاص کر جانی اور مالی نقصانات کا صحیح اندازہ لگانے اور اس ذیل کے اعداد و شمار جمع کرنے کے لئے اپنی ہمرکابی میں رکھا۔ اس طرح جہاں فساد سے متعلق مجھ کو جملہ قسم کی معلومات حاصل ہوئی وہیں

میں نے حضرت مجاہد ملت کی [illegible] رحمۃ اللہ علیہ [illegible] کے ساتھ مظلوموں کے ساتھ بے پناہ [illegible] شفقت و محبت کے نہ جانے کتنے واقعات دیکھے۔ آج جبکہ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو چکے ہیں ممکن ہے کہ ان واقعات کی اشاعت سے ہمیں اپنی زندگی بنانے کا موقع ہاتھ آجائے۔ یہ چند سطریں اسی جذبہ کے ماتحت لکھی جا رہی ہیں۔

خدا پر بھروسہ اور مخلوق خدا کی خدمت

اس سفر سے پہلے نہ جانے کتنی بار میں نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی تھی :۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا الخ

پارہ ۲۴ رکوع ع۔

لیکن یہ کیسے عرض کروں کہ فساد زدہ علاقہ میں جہاں خطرہ ہی خطرہ تھا نہ پولیس ہے، نہ کوئی غیر مسلم رہنما اور نہ رضا کار ساتھ ہے۔ صرف خدا پر بھروسہ ہے اور مظلوموں سے ملاقات اور ان کی خدمت کا جذبہ۔ حضرت مولانا کی جرأت بے خوفی اور اعتماد علی اللہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آیت مذکورہ بالا کی عملی تفسیر آج ہی سامنے آگئی ہے حضرت مجاہد ملت جب پُر خطر راستوں سے پورے اطمینان کے ساتھ گذر کر فساد زدہ بستی میں پہونچتے تو ہر جگہ مظلوم مسلمانوں کو صبر و استقامت کی تلقین فرماتے ہوئے عجیب ناصحانہ انداز میں فرماتے :۔

میں نے آپ کی تباہیوں اور بربادیوں کے بھیانک نقشے دیکھے ہیں۔ شہداء کی لمبی لمبی قبریں اور ان کی لاشوں کی بچی کھچی ہڈیاں اور ان کے کہیں کہیں ڈھانچے بھی دیکھے گئے ہیں۔ آپ کے جلے اُجڑے ہوئے مکانات اور ان کے ملبے تو میرے سامنے ہی ہیں۔ یقیناً آپ کے لئے طرح طرح کی پریشانیاں ہیں اور ہمارے سامنے بھی بہت سے نئے سوالات آگئے ہیں مگر دیکھو! خدا زندہ ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، اس کی حکومت میں دیر تو ہو سکتی ہے اندھیر نہیں ہو سکتا۔ بس خدا پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح جمے رہو، اور اپنی نیک عملی، بلند اخلاقی اور پاکیزہ زندگی کے صاف اور ستھرے پانی سے نفرت اور عداوت کے ان بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بجھانے کی کامیاب کوشش کرو۔ یاد رکھو! ہندوستان ہمارا وطن ہے ہمیں اس کی خاک سے بھی محبت ہے۔ ہم اپنے وطن میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر عزت سے رہیں گے ورنہ شہادت کو گوارہ کریں گے۔ اس طرح کے حالات سے گھبرا کر وطن سے بھاگنا گوارہ نہ کریں گے۔ میں امداد و بحالیات کے بارے میں گورنمنٹ کو توجہ دلاؤں گا کہ وہ اپنی ذمہ داری [illegible] محسوس کرے۔ ہماری جماعت بھی جی جان کی بازی لگا کر آپ کی مدد کرے گی۔ حضرت مولانا کی اس دلنشیں اور مؤثر تقریر کے بعد ہم نے ان مسلمانوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا جن کے خاندان اُجڑ گئے تھے اور ایک ایک گھر کے آٹھ آٹھ دس دس افراد شہید کر دیئے گئے تھے :۔

کہ حضرت مولانا! ہم آپ کی نصیحتوں پر عمل کریں گے۔ آج بھی ہمیں اپنے گاؤں کے کتے دوسرے گاؤں کے کتوں سے زیادہ پیارے لگتے ہیں، آپ کی تشریف آوری سے ہماری بڑی ڈھارس بندھ گئی ہے ہمارے مکانات جلد بنوا دیئے جائیں تاکہ ہم گرمی، سردی اور بارش سے محفوظ رہ سکیں۔

مجاہد ملت کی غضب ناکی اور ہماری انتہائی بے بسی

غالباً سفر کا تیسرا یا چوتھا دن تھا۔ پٹنہ، بھاگلپور اور مونگیر کے اضلاع کا تفصیلی دورہ ختم کرنے کے بعد اب ہمیں ضلع گیا کی سرحد میں داخل ہونا تھا سورج غروب ہو رہا تھا اور رات بھی غالباً اندھیری تھی بعض مقامی کارکن جو راستہ بتلانے کے لئے شریک سفر ہو گئے تھے انہوں نے چپکے سے کہا :۔

اب جہاں چلنا ہے وہاں کا راستہ بہت خطرناک ہے
بغیر پولیس کی مدد کے جانا مناسب نہیں ہے۔

بس اب کیا تھا، ان کلمات کو سُنتے ہی حضرت مجاہد ملت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مقامی کارکنوں کی طرف مخاطب ہونے کی بجائے کہ ان سے مولانا کا تعارف نہیں تھا مجھ خادم کی طرف انتہائی غصہ آمیز لہجہ میں فرمایا :۔

اعظمی صاحب! تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے تین دن سے آپ کے بہار میں منافقانہ تقریریں کی ہیں یعنی میں برابر مسلمانوں کو یہ کہتا آرہا ہوں کہ خدا پر بھروسہ کرو، جرأت اور بہادری کے ساتھ اپنی جگہ جمے رہو اور جب میری باری آئی ہے تو پولیس کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ میں اس بزدلی کا قائل نہیں ہوں۔ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ اپنا راستہ لیں ہم لوگ وہاں چلیں گے، موت لکھی ہوگی تو خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کریں گے۔ ہم اس موقع پر پولیس کی مدد ہرگز نہیں لیں گے۔ سچ ہے کہ دو ایک آدمی کی بزدلی پورے قافلہ کو نکما بنا دیتی ہے۔

تب ان مقامی حضرات کو چھوڑ کر ہمارا قافلہ کچھ دور آگے بڑھا اب دیہات میں جانے کا راستہ کون بتائے۔ مولانا کی فوجی جیپ گاڑی کا ڈرائیور خود دوسرے صوبہ کا آدمی تھا۔ ہم سب ہی لوگ راستہ سے ناواقف، چار و ناچار افسوس کے ساتھ واپس آنا پڑا۔ حضرت مولانا پر اس واقعہ کا بہت گہرا اثر تھا صدمے سے چور تھے غصہ اتر نہیں رہا تھا مگر انہیں ہم لوگوں کی مجبوری بھی معلوم تھی بہت

دیر تک ساکت اور صامت رہنے کے بعد دریافت کیا

خیر جو کچھ ہونا تھا ہوا۔ یہ تو بتلاؤ کہ رات کہاں گذاری جائے گی۔ عرض کیا گیا کہ چند میل پر نوادہ سب ڈویژن آ رہا ہے وہاں ڈاک بنگلہ ہے وہاں قیام کیا جائے تو اچھا ہے مسکرا کر فرمایا! پھر پیٹ بھر کھانا کھانے اور رات بھر سونے کے لئے اچھی جگہ کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یاد رکھو! آج کی رات میں حفظ الرحمن کے لئے سونا تو کیا مجھ کو حق نہیں کہ میں آج رات کو کھانا کھا سکوں یقین فرمایئے کہ بڑی مشکل سے حضرت کو رات میں کھانا کھلایا گیا۔ اس واقعہ سے تمام رات مولانا کو بے چینی رہی اور بار بار یہی فرماتے رہے کہ افسوس کہ اگلے پروگرام کی وجہ سے اب اس جگہ جانے کی کوئی شکل نہیں بن رہی ہے۔

حضرت مولانا کو اس سفر میں جہاں کہیں یہ خبر ملتی کہ فلاں غیر مسلم بھائی نے کچھ مسلمانوں کو اپنے گھر میں پناہ دی ہے اور ان کی حفاظت کے لئے اپنے کو خطرہ میں ڈال دیا ہے تو مولانا اس شریف انسان سے ملنے کے لئے بے چین اور بیقرار ہو جاتے اور فرماتے کہ اس کے گھر چل کر نہ صرف ملنا بلکہ اس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

فساد زدہ علاقہ میں باوضو رہنے کی تلقین

مولانا حفظ الرحمن صاحب جیسے سیاسی رہنما کی ظاہری زندگی کو دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا تھا کہ مولانا مستحبات کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے ہوں گے۔ لیکن میں نے اس دورہ میں اور بعض دوسرے مواقع میں حضرت مولانا کو اس کے بالکل برعکس دیکھا۔

بہار کے اس فساد میں مونگھیر ضلع میں تھانہ تارا پور کے حالات بہت ہی دردناک تھے جس علاقہ کی ایک کوٹھری میں تین سو لاشوں کے ڈھیر کا اندوہناک واقعہ پیش آیا تھا اسی علاقہ کی بات ہے کہ ایک جگہ معلوم ہوا کہ کھیتوں میں اب تک لاشوں کی ہڈیاں نظر آ رہی ہیں اور اس کا سلسلہ سامنے پہاڑی تک تقریباً ۴ فرلانگ تک چلا گیا ہے۔ حضرت مولانا نے مجھ کو ساتھ لیا اور سڑک پر گاڑی چھوڑ کر بڑی تیزی سے کھیتوں کی اونچی اونچی مینڈوں کو پھاندتے ہوئے بات کی بات میں متعلقہ مقام تک پہونچ گئے۔ میری جوانی کا عالم تھا۔ پیدل چلنے کا میں عادی بھی تھا مگر مجھ کو مولانا کے پیچھے باضابطہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور میں

(مولانا شرافت علی سیوہاروی فاضل دیوبند)

۱۹۲۱ء میں جبکہ سیوہارہ میں خلافت کمیٹی کا بڑا جلسہ ہوا تھا اسکی کچھ دھندلی سی یاد مجھے اب بھی باقی ہے — اس وقت مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی (علی برادران) کی قیادت و سیادت کے شباب کا دور تھا۔ بیسیوں عورتوں نے اپنے بچوں کے نام شوکت علی اور محمد علی رکھے — بچے بچے کی زبان پر تھا:-

کہہ رہی ہیں، یہ اماں محمد علی کی —
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

سیوہارہ کے اس جلسہ کے روحِ رواں مولانا بشیر بھٹہ تھے۔ اس وقت میری عمر مشکل سے آٹھ، نوسال کی ہوگی۔ سمرنا اور بروصہ کے فتح ہونے اور کمال اتاترک مرحوم کی سرگرمیوں کے تذکرے سنا کرتا تھا۔ لیکن جانتا نہ تھا کہ یہ کیا چرچے ہیں اور کیوں ہو رہے ہیں۔ البتہ ہلالی نشان کا ایک سبز پرچم ہر وقت میرے ساتھ ضرور رہتا تھا۔

بہت سی شخصیتیں نگاہوں کے سامنے آتی تھیں اور گزر جاتی تھیں، یہ وقت تھا جب مسلمانوں میں لیڈرشپ کے خانہ میں قحط الرجال نہ تھا، بہت سے لیڈر تھے، لیکن اس ہجوم کے باوجود اپنی نظر جس شخصیت پر جا کر جمتی تھی، وہ مولانا حفظ الرحمٰن کی ذات گرامی تھی۔

لانبا قد، چھریرا بدن۔ جاذب نظر چہرہ۔ دلکش آواز۔ مخصوص اندازِ بیان۔ انوکھا لب و لہجہ۔ دورانِ تقریر میں جب کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوتے تھے تو کمر میں بل پڑ جاتا تھا۔

بس میری نگاہ انتخاب، عالموں۔ صوفیوں۔ لیڈروں — مقتداؤں اور رہنماؤں کے انبوہ کثیر میں کسی پر جا کر جمتی تھی تو وہ یہی انوکھی شخصیت تھی، جو اس وقت نہ ناظم عمومی تھی، نہ ایم ایل اے نہ ممبر پارلیمنٹ، نہ مجاہد ملت۔ نہ مولانا۔ بلکہ صرف مولوی حفظ الرحمٰن — مگر

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

مجھے خوب یاد ہے۔ میں بچوں کی محفل میں بھی اور رنجیدہ و تنہائی کی حالت میں بھی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی چال ڈھال۔ اندازِ گفتگو۔ طرزِ ادا۔ اور لب و لہجہ کی نقالی کیا کرتا تھا۔ اگرچہ نسبت چراغ سحر اور نور آفتاب جیسی بھی نہ تھی، لیکن طبیعت ان کی نقالی کی جانب نہ معلوم کیوں راغب تھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔

پھر میں مقامی مدرسہ اسلامیہ فیض عام سیوہارہ میں تعلیمی مشاغل میں لگ گیا اور مولانا ملک کی سیاسی و مذہبی رہنمائی کی بلندیوں میں مصروف پرواز ہوگئے۔ مگر مجھے یاد ہے کہ مولانا جب بھی سیوہارہ تشریف لاتے تھے، ضرور تقریر کیا کرتے تھے۔ اپنا خاندان اور محلہ چھوڑ کر زیادہ وقت ہم لوگوں ہی میں بسر فرمایا کرتے تھے۔ مدرسہ فیض عام کے مہتمم حضرت مولانا الحاج حافظ احمد حسن صاحبؒ مولانا کے خاص شفیق استاد تھے اور بہت محبت کرتے تھے اور مدرسہ کی شورائی مجالس میں بھی مولانا کو ذی رائے صائب ہونے کی بنا پر شریک کیا کرتے تھے حالانکہ سب ہی لوگ عمر میں مولانا سے بڑے تھے کوئی ایک بھی ہم عمر نہ تھا۔ مدرسہ فیض عام کی مجلس شوریٰ میں جب کوئی تجویز ہو جاتی تھی تو حضرت حافظ صاحب موصوف مولانا ہی کے حوالہ کیا کرتے تھے اور شفقت بھرے انداز میں فرمایا کرتے تھے، حفظ الرحمٰن، تم تفصیل سے سب کو سمجھا دو۔ کون جانے جو مٹھاس اور خالص محبت کے سوتے ان سیدھے سادے الفاظ سے پھوٹتے تھے، وہ آج مولانا۔ مولوی۔ حضرت۔ قبلہ۔ محترم۔ مکرم۔ کسی بھی لفظ میں محسوس نہیں کئے جا سکتے۔

مولانا مدرسہ فیض عام سیوہارہ کی تعلیم و تربیت، یہاں تک کہ دورۂ حدیث شریف سے بھی فراغت پا کر ملک کی واحد دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کی جانب متوجہ ہوئے۔ جہاں اس وقت علوم اسلامیہ کا خورشید

خادر اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ یہ بھی ذاتِ گرامی حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی۔

حضرت کے جلال کا یہ عالم تھا کہ دورانِ درس میں بہت کم لوگوں کو بولنے کی جرأت ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ حضرت موصوف مہمل اور سبک سوالات کے جوابات سے قصداً گریز فرمایا کرتے تھے۔ جس پر طالب علم کو بہت خفت ہوتی تھی۔ بہت کم طلبہ بولنے کی جرأت کرتے تھے اور بولنے سے پہلے اپنی بات کو تول لیتے تھے۔ لیکن سنا ہے کہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ذکاوت و ذہانت کے پیش نظر حضرت علامہ نے مولانا کو یہ شرف بخشا تھا کہ خود دریافت فرمایا کرتے تھے کہ حفظ الرحمٰن تمھیں کچھ معلوم کرنا ہے۔

دوسرا خاص شرف جو حضرت نے مولانا کو ارزانی فرمایا وہ یہ ہے کہ حضرت العلام رات کو جس حجرے میں مصروف مطالعہ ہوتے تھے اسی کے بیچ میں پردہ ڈال کر مولانا کو بھی جگہ عطا فرمائی۔ ایسا قرب یگانگت طلبہ تو طلبہ کسی مدرس کو بھی حضرت نے نہیں بخشا۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ مولانا کی اصابتِ فکر، ذہانت اور طبعِ رسا کی اعلیٰ صلاحیتوں ہی کی وجہ سے تھا۔ حضرت العلام سے پورے ایک سال دورۂ حدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولانا کو دارالعلوم کے زمرۂ اساتذہ میں شامل کر لیا گیا۔

لیکن ابھی درس و تدریس کے مشاغل کو صرف ایک ہی سال نہیں ہوا تھا کہ وہ فتنہ کھڑا ہو گیا جس کو علم والے اسٹرائک ۱۳۴۳ھ کے نام سے جانتے ہیں۔

اس اسٹرائک کی روحِ رواں مکمل مخلصانہ جذبات کے ساتھ جن شخصیتوں میں کارفرما تھی ان کے گل سر سبد تو علامہ کشمیری تھے، اور کلی مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی ذات ستودہ صفات۔

بہرحال ایک والہانہ جذبۂ عقیدت و خلوص کے ساتھ مولانا نے حضرت علامہ کشمیریؒ کا ساتھ دیا۔ اور نہ صرف ساتھ بلکہ ان کے ہمراہ بادیہ پیمائی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ جب یہ آفتاب و ماہتاب سرزمین دیوبند سے سیاروں کے ایک قافلہ کے ساتھ ڈابھیل روانہ ہو رہے تھے تو کون کہہ سکتا تھا کہ یہ نورانی ستارے اپنی علمی و روحانی ضیا باریوں سے اس تاریک علمی تہی دامن وادی کو ایک تابندہ بقعہ نور بنا سکیں گے اور جہالت کی اندھیری بستیوں میں علوم نبوت و روحانیت کی شمعیں جلا سکیں گے۔ —

جو قدرت کو منظور تھا وہ ہوا۔ اس معرفت کی پیاسی سرزمین کو اسی جماعت دیوبند نے جا کر علوم نبوت سے سیراب کیا۔ اور مدتوں کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام لوگوں تک پہنچاتی رہی لیکن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی ذات ایسی نہ تھی جو مقام و مکان کی حدبندیوں میں محبوس ہو کر رہ جاتی۔ مولانا نے وہاں بھی تبلیغی اور تنظیمی دورے فرمائے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کا پیغام اس کی مخلوق کو پہنچانے میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر تدریسی ذمہ داریوں کو بھی پورے انہماک کے ساتھ پورا کیا۔ جس سے نہ صرف عام پبلک بلکہ اہل علم طبقہ پر بھی مولانا کا اثر و رسوخ بے حد بڑھ گیا۔ لیکن چند سال بعد ہی آب و ہوا کی عدم مساعدت نے اس دور دیس کے باسیوں کو مولانا کی سرگرمیوں سے پورے طور پر مستفید ہونے کا تادیر موقعہ نہ دیا۔ بہرحال مولانا وہاں سے تشریف لے آئے۔ اور اپنی سیاسی و علمی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ مولانا اس وقت بھی قصص القرآن نامی تالیف کا ارادہ رکھتے تھے اور بارہا مختلف مجالس میں اس کا اکثر ذکر فرمایا کرتے تھے۔

جب مولانا سیوہارہ تشریف لائے۔ یہی وہ وقت ہے جب مجھے شرف تلمذ کی عزت سے سرفراز فرمایا۔ ہوا یہ کہ مولانا اکثر اوقات اپنے مشفق استاذ محترم حافظ احمد حسن صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ فیض عام اسکول سیوہارہ کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب میں مقاماتِ حریری مختصر المعانی اور تلخیص المفتاح وغیرہ کتابیں پڑھتا تھا۔ کچھ اسباق مولانا جمیل الرحمٰن صاحب سیوہاروی (الحال نائب مفتی دارالعلوم دیوبند) اور کچھ اسباق مولانا محمود علی صاحب اوجھاروی پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن اس وقت یہ جگہ مولانا محمود صاحب کے انتقال سے خالی ہو چکی تھی۔ عجیب سعادت تھی کہ جس روز مولانا محمود صاحب کا وصال ہوا، اس دن مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارہ میں موجود تھے۔ غسّال کو بلایا جا رہا تھا۔ مولانا نے فرمایا کوئی ضرورت نہیں، یہ خدمت میں خود انجام دوں گا۔ چنانچہ انجام دی اور نہایت سنت کے مطابق۔ کیونکہ حامل شریعت سے زیادہ کون آدابِ غسل سے واقف ہو سکتا ہے؟

بہرحال مولانا کے انتقال کے بعد حضرت حافظ صاحب موصوف نے مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہیں مدرسہ میں

[illegible] ایک مرغ زریں بال کو بھلا [illegible]
سے کیا نسبت ہوسکتی ہے، جہاں نہ سحرگاہی بلبلیں چہچہاتی ہوں نہ پرندے
لاہوتی صدائیں لگاتے ہوں۔ ایک گلستاں جہاں صرف چند پھول اور
معدودے چند کلیاں ـــــ !!!
مولانا مرحوم کی روح نے شاید دل دل میں کہا ہو ـــ"

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

لیکن نہیں ـــ ہوا وہ جو خلاف امید تھا، شاید حافظ صاحب کو بھی امید نہ تھی۔ لیکن ایک لائق شاگرد کی شان یہ نہ تھی جو اپنے استاد محترم کا حکم ٹال دیتے۔ قبول کیا اور بسروچشم قبول کیا۔

مدرسہ فیض عام سیوہارہ کے کتب خانہ کے اوپر داہنی جانب جو بالا خانہ ہے جس میں آج سے پہلے زانوئے تلمذ تہ کی تھی آج اسی جگہ استاد محترم کی حیثیت سے رونق افروز ہونے کے لئے تشریف لائے تھے۔

نہ پوچھئے کتنی مسرت ہوئی، جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مجھے پڑھانے کے لئے تشریف لا رہے ہیں۔ خوشی کا یہ عالم تھا کہ دل بلّیوں اُچھل رہا تھا اور پاؤں زمین پر جمتے نہ تھے۔ میں اور میرا ایک کشمیری ساتھی (نہیں معلوم وہ اب کہاں ہے اور یہ کہ زندہ بھی ہے یا نہیں) خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے ـــــ

بہرحال مولانا نے تلخیص المفتاح اور مقامات حریری کا سبق بیک وقت پڑھایا اور ایسا پڑھایا کہ آج تک یاد ہے۔ انداز گفتگو، وہ دلربایانہ طرز ادا، ہاتھوں کے واضح اشارے اور مشکل ومغلق الفاظ کی مکمل تشریح اب تک دماغ میں محفوظ ہے، جس کا کیف دماغ اس وقت بھی محسوس کر رہا ہے۔ لیکن۔ ایک ہی روز پڑھانے کے بعد اگلے روز فرمایا میں تو حافظ جی کے کہنے کی وجہ سے یہاں بیٹھ گیا ہوں پڑھ لو جبتک میں یہاں ہوں۔ ورنہ درحقیقت میرا یہاں کا کام نہیں ہے ـــــ

مولانا کے اس بیان سے دل پر جو غم والم کے جو پہاڑ ٹوٹے ان کو الفاظ کے جامہ میں نہیں لایا جا سکتا۔ بے حد رنج ہوا۔ پھر سوچا واقعی مولانا کی ذات سیوہارہ کی تنگنائیوں میں محصور ہوتے کے لئے پیدا نہیں ہوئی گلاب اس لئے نہیں ہے کہ آپ اس کو ڈبیہ میں بند کرلیں، بلکہ اس لئے ہے کہ اس کی خوشبوئیں پھیلیں اور دور ونزدیک کو معطر کردیں۔ اور بات تو اصلی یہ ہے کہ کسی پھول کی قدر وقیمت چمن کے اندر نہیں جانچی جا سکتی [illegible] قدر وقیمت [illegible] سے باہر ہی ہوتا ہے

سرسبز پھول وہ چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

یہی شان تھی مولانا حفظ الرحمٰن کی۔ بھلا وہ کس طرح اپنی عالمگیر صلاحیتوں کو سیوہارہ کے ایک مقامی مدرسہ کی محدود پہنائیوں میں محبوس کرسکتے تھے۔ اور کس طرح ان کی رفعت پسند طبیعت ارض وطن (جائے پیدائش) کی خاک پر قناعت کرسکتی تھی ؟

دو چار ہی دن گزرے تھے کہ وہ وقت آگیا جب مولانا نے ہمیں پڑھانا بند کردیا۔ ایک دن اچانک یہ معلوم ہوا کہ مولانا نے مجھے اپنے مکان طلب فرمایا ہے۔ گم شدہ مسرت کا سرمایا پھر لوٹا۔ دل میں طرح طرح کے خیالات موجیں مارنے لگے۔ لیکن سب پر غالب خیال یہ تھا کہ مجھے اپنے مکان پر پڑھانے کے لئے بلایا ہے۔ کیونکہ ایک طالب علم کی زندگی طلب علم ہی سے لبریز ہوا کرتی ہے۔ لیکن علی الرغم وہاں جاکر یہ معلوم ہوا کہ مولانا اپنی تصنیف کا مسودہ صاف کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ شرف مجھے اس لئے بخشا گیا ہے کہ میں کچھ عربیت سے بھی واقف ہوں اور خط بھی صاف ہے۔ میرے لئے یہ خدمت بار نہیں بلکہ شرف تھا کہ میرے استاد محترم نے مجھے ایک خدمت کے لئے یاد فرمایا :۔

چنانچہ رسول کریمؐ المعروف بہ نور البصر فی سیرت خیر البشر جو غالباً مولانا کی پہلی مشہور تصنیف ہے۔ اس کا مسودہ اسی ناچیز نے صاف کیا تھا

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مرا
بلبل ہمیں کہ قافیہ گل بود بس است

اس کے بعد مولانا امروہہ مدرسہ جلّیہ وجامع مسجد کے مشترکہ بورڈ کے بحکم حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ صدر بنائے گئے۔ لیکن یہ طائر لاہوتی، ان خاکنائیوں پر کب صبر کرنے والا تھا۔ پھر حالات ایسے بنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد مولانا کو امروہہ کی صدارت ترک کرنی پڑی جس پر حضرت شیخ الاسلام نے مولانا کو کلکتہ بھیج دیا۔ جہاں قرآن حکیم کا درس فرمایا۔

لیکن چند روز ہی بعد صلاحیت کار اور دماغی اعلیٰ اُپج نے اس پر بھی قانع ہونے سے انکار کردیا۔ بلند سیرت انسان کا اونچا کردار پھر

اس کو لے کر سربلندیوں کی طرف مائل پرواز ہو۔
بالآخر حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب مفتی اعظم ہند کے ایما سے جمعیۃ علماء ہند کی جملہ ذمہ داریوں کا بارگراں اس نحیف الجثہ مرد مومن کے دوش توانا پر ڈال دیا گیا، جن ہاتھوں نے اس بھاری بوجھ کو لادا تھا۔ ان کی مومنانہ بصیرت نے پہلے ہی سے کارکردگی اعلیٰ سوجھ بوجھ اور جودتِ طبع کی بھرپور صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ جب قافلہ سالار بنے تو قافلہ کو اس تیزی کے ساتھ لے کر چلے کہ پیش روؤں کی روش گرد بن کر راہ میں رہ گئی۔
اس زمانہ کی مذہبی و سیاسی رہنمائی کی تاریخ اس قدر روشن ہے جس پر مستقل تصنیف کی ضرورت ہے اور جو مجھ سے تہی مایہ کی بساط سے باہر ہے۔

اللھم ارحمہ رحمۃ واسعہ

کچھ یادیں

مولانا سیّد محمد ازہر شاہ قیصر کے قلم سے

مظہر الدین صاحب مالک اخبار الامان دہلی سے دیوبند آئے۔ دارالعلوم کے ادارۂ اہتمام کی حمایت میں جامع مسجد میں ان کی تقریر ہوئی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے وہیں دوبدو انھیں جواب دیا۔ اور ان کی شعلہ بار تقریر سے مجمع کا رنگ بدل گیا دیوبند کے بعد مولانا جامعہ ڈابھیل ضلع سورت علاقہ بمبئی میں پروفیسر کی حیثیت سے کئی سال رہے۔ بعد میں قیصر بھی اپنے والد مرحوم کے ساتھ پڑھنے کے بہانے سے اس درسگاہ میں گیا۔ اور وہاں دو سال مولانا کے کمرے کے بالکل قریب رہنے کا اتفاق ہوا۔ چار پانچ سال کا یہ عرصہ ڈابھیل میں بسر ہوا۔ مولانا کی زندگی کا عجیب زمانہ تھا کہ بظاہر پرسکون مشاغل صرف تعلیم و تدریس۔ تصنیف، تالیف اور اپنے استاذ مرحوم علامہ کاشمیری سے افاضہ و استفادہ تھے۔ مگر باطن پرشور وہی سیاسی مذاق کی گہرائیاں ملک کی تباہ حالی کا رنج قوم کی بربادی کا فکر اور مستقبل کی تعمیر کا جنون۔ دراصل اس زمانے سے بہت پہلے خلافت کی تحریک میں وہ باقاعدہ سیاسی میدان میں آچکے تھے اور اس وقت تو انھیں دنیا اس زمانہ کی مقبول عام جمعیۃ علماء ہند کے نوجوان گروپ کے ایک سربرآوردہ رکن کی حیثیت سے جانتی تھی ڈابھیل کی زندگی بھی عجیب تھی۔ کھانے پر سب حضرات ساتھ بیٹھتے۔ ملکی معاملات و مسائل پر بحث ہوتی۔ مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا حفظ الرحمٰن کی ایک رائے ہوتی۔ اور مولوی بدر عالم صاحب کا کچھ اور خیال۔ بعض وقت بحث طویل ہو جاتی۔ اور مولانا مخصوص انداز میں برس پڑتے۔ بگڑ اٹھتے۔ بے تکان بولتے اور بحث و مذاکرہ کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔ استاذ مرحوم کے یہاں دن میں کئی بار ان کی حاضری کا معمول تھا۔ جب آتے علمی مسائل پر سوالات کرتے اور جب جاتے تو بہت کچھ لے کر جاتے۔ ان کے استاذ کو خود ان کے ساتھ اتنی محبت تھی کہ باید شاید۔ استاذ کا دربار وہ تھا کہ فراست و ہوشمندی کو وہاں دامن سنبھال کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اور علم و فضل چوکنے ہو کر آتے تھے اور شرمندہ ہو کر جاتے تھے۔ ایسے کے دل میں جگہ پیدا کرنا بہت مشکل تھا۔ مگر استاذ کے تعلق کا یہ عالم تھا کہ شاید ۱۹۴۲ء کے آخر میں مولانا گرفتار ہو کر جب میرٹھ جیل گئے تو استاذ یہ خبر سن کر تڑپ اٹھے۔ ہائے وہ شفقت بھرے الفاظ کہ یہ صاحب عجیب قسم کے آدمی ہیں۔ اب وہاں جا پڑے ہیں۔ خبر نہیں وہاں کیا گذر رہے اور کس طرح بسر ہو، جب تک جیل میں رہے استاذ کے دل سے نہیں اترے، برابر پوچھتے رہے خط لکھتے رہے دعا میں یاد کرتے رہے۔ مولانا میرٹھ سے چھوٹے تو دیوبند آئے۔ یہاں استاذ تھے ان کی قدم بوسی کی۔ پھر آگے گھر گئے۔ میرٹھ جیل سے ان کا رہا ہو کر دیوبند آنا نگاہوں میں پھرتا ہے۔ سردی کا موسم تھا شام کا جھٹپٹا سا وقت جب مولانا پوری متانت و سنجیدگی کے ساتھ تانگہ سے اترے اور استاذ نے آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ سیاسی رہنما اور مقرر و مصنف کی حیثیت سے وہ آج ہزاروں پر بھاری ہیں۔ مگر درس و تدریس میں بھی ان کا اپنا خاص رنگ تھا۔

حدیث و تفسیر کی اعلیٰ کتابیں ان کے زیر تدریس تھیں اور یہ خاص شفقت و محبت پڑھاتے تھے۔ طلبا کی بڑی جماعت ہوتی تھی اور سب اس شیوا

بیان مدرس کی تقریر پر فدا تھے۔

مولانا حفظ الرحمٰن کا تصور آتا ہے تو ڈابھیل کی اس زندگی کے سارے اوراق ذہن میں گھوم جاتے ہیں۔ کھانے پینے کا کوئی اہتمام حسب عادت یہاں بھی نہیں تھا۔ کھدر کے دو چار جوڑے ان کے لئے بہت تھے۔ البتہ صاف ستھری شیروانی اور اچھا سا ہیٹ ان کی پسندیدہ چیزیں تھیں۔ کھانے میں کوئی خاص ذوق نہیں رکھتے تھے۔ کبھی اگر مانگتے بھی تھے تو کھانے کے بعد کوئی میٹھی سی چیز۔ اڑد ان کے ضلع بجنور کی خاص غذا ہے۔ یہ ہی انھیں بھی مرغوب تھی۔

مولانا نے ڈابھیل کے بعد کئی سال امروہہ ضلع مراد آباد اور کلکتہ میں بسر کئے۔ کلکتہ میں تبلیغی خدمت پیش نظر تھی۔ اور امروہہ میں درس تدریس کا مشغلہ اور پھر ۳۸ء سے دہلی میں مستقل طور سے قیام رہا۔ یہاں وقت کا ایک حصہ ندوۃ المصنفین کی نذر ہوتا رہا۔ اور باقی جمعیۃ علماء اور کانگریس کی۔ ندوۃ المصنفین کے وقت میں دس بارہ اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھ ڈالیں اور جمعیۃ وکانگریس کے کاموں میں ہزاروں میل کا سفر کیا۔ ہزاروں تقریریں ہوئیں۔ مسلمانوں سے برسہا برس تک گالیاں کھائیں۔ قاتلانہ حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا، غداری کے طعنے سُنے، ہندؤوں کے ہاتھ بک جانے کی تہمت دھری گئی۔ اخباروں نے ہزاروں صلواتیں سنائیں۔ مخالفین نے تکلیف دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

وقت ایسے بھی گذرے کہ عزت وآبرو تو الگ رہی جان کی سلامتی بھی مشکل تھی . . . . پورا ملک پوری قوم مخالف تھی مگر ان کی زندگی میں مطلق فرق نہ آیا۔ جو رائے کل تھی وہ آج بھی ہے اور جس طرح کل اس کا اظہار ہوتا تھا اسی طرح آج بھی ہوا۔ سچائی ہمیشہ ان کی زندگی کا اصول رہا۔ طبیعت سچائی کی اس لائن سے ہٹنے پر قادر ہی نہیں رہی۔ وقت نے کتنے ہی دھکے دیئے۔ مگر ان کے قدم میں لغزش نہیں آئی قوم نے کتنا ہی بُرا بھلا کہا مگر یہ قوم کا ساتھ نہ چھوڑ سکے قوم اور اسکے ہر فرد سے محبت وخلوص کا یہ عالم [illegible] ایک لیگی کارکن نے جلسہ میں برملا ان پر حملہ کیا۔ مگر جب یہی لیگی لیڈر مجبور وحاجت مند بن کر ان کے سامنے آیا تو ادھر سے محبت وشفقت سے اس کا استقبال کیا۔ اور دو سخت لفظوں سے بھی اس کا دل توڑنا گوارہ نہیں کیا درآنحالیکہ رائے اور مسلک کا اختلاف پہلے سے زیادہ مسلط ہوچکا تھا۔ جلسوں میں کتنی مرتبہ قدرشناس قوم نے ان کو گالیاں دیں۔ اسٹیشنوں پر کہاں کہاں حملے ہوئے۔ چلتے پھرتے کتنے برس انھیں دل خراش آوازے سُننے پڑے، اخبارات نے ان پر کیا کیا گند اُچھالا۔ اور اس معصوم فطرت انسان پر جسے یقیناً گناہ کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا جھوٹے الزامات لگائے، ان کی تفصیل تو ان لوگوں کو معلوم ہوگی جو سیاسی کاموں میں ان کے شریک رہے ہیں۔

گذشتہ پندرہ برس، مولانا حفظ الرحمٰن نے دفتر جمعیۃ میں چٹائی پر بیٹھ کر گذار دیئے۔ جو کھانا اس وقت مل گیا تو شام کو ناغہ، شام کو ملگیا تو صبح کو غائب۔ جو سامنے آگیا اسی پر قناعت اور جو مل گیا، اس پر صبر شکر، بیس بائیس سال کی مدت اپنوں کے مظالم اور غیروں کے مصائب میں گذرگئی۔ مگر پیشانی پر بل نہیں پڑا۔ راستہ کی صعوبتوں اور سفر کی تکلیفوں سے گھبرا کر بڑوں بڑوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر حفظ الرحمٰن نے منزل مقصود پر ہی پر دم لیا۔ چاہتے تو امیرانہ زندگی گذار سکتے تھے۔ رزق کے لئے حیلہ وکوشش کی ضرورت ہے۔ ان امور پر توجہ ہوتی تو کم از کم ان کے بیوی بچوں کے لئے تو اچھی زندگی پیدا کر دیتے۔ مگر یہاں امارت وغربت کا امتیاز ہی کوئی نہیں۔ بقدر لایموت رزق حاصل کرنا اور وقت کا بڑا حصہ مسلمانوں کی خدمت میں بسر کرنا ہی مقصود زندگی تھا۔ بیوی کوئی اللہ کی نیک بندی پلّے بندھ گئی تھی اسی طرح اولاد بھی شریف ہے جس نے مولانا حفظ الرحمٰن کی ان تمام عادتوں میں ان کا ساتھ دیا۔ اور سارے مصائب میں ان کے شریک حال رہے۔ ورنہ یہ ہی اولاد اور کنبہ اور گھر گرہستی اکثر انسان کو ہوس پرستی کا شکار کر دیتی ہے۔

ہند کا مجاہدِ جلیل

اپنے مکتوب اور اقوال و اعمال کی روشنی میں

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

(از مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، بجنور)

بالآخر ۲ اگست ۱۹۶۲ء کو ۸ بجے صبح سے قبل ہی وہ خبر سن لی جس کے سننے کو کان کسی قیمت پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اور جس کے تصور سے دل و دماغ غیر معمولی طور پر پریشان ہو جاتے تھے یعنی

آج شب کو سوا تین بجے جبکہ ہر سو رحمت کا نزول ہوتا ہے اور قدسیوں کے پرے کے پرے ہر سو شب زندہ داروں کی تلاش میں پھرا کرتے ہیں۔ ایک ۶۲ سالہ مجاہدِ اعظم جو ۴۳ سال سے برابر جہاد کر رہا تھا جس کی سیف ہمت نے فرنگیوں کو ناک چنے چبا دیئے تھے اور جو ۴۷ء سے فرقہ پرستوں کے خلاف صف آرا، اور مظلوموں کا پشت پناہ بنا ہوا تھا۔ اور جو فروری ۱۹۶۲ء سے موت سے لڑ رہا تھا۔ اس کی مقدس روح کو فرشتے رحمت کے سایہ میں اپنے ساتھ لے گئے اور ہمیشہ کیلئے جوارِ رحمت کا ہم نشین بنا دیا۔

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

آخر کیا کہیں؟ اور کس سے کہیں؟ سب یہی کہہ رہے ہیں اور سب یہی سن رہے ایک ہی آواز ہے جو بالاتفاق سب کی زبانوں سے نکل رہی ہے سب ایک ہی غم میں مبتلا ہیں۔ پھر کہیں تو کس طرح کہیں؟ کہاں سے زبان لائیں اور کہاں سے قلم، تاہم ملک و قوم کی ایک امانت یعنی حضرت مجاہد ملت رح کے کچھ خطوط اور مختلف صحبتوں کی کچھ باتیں میرے پاس ہیں ان کو ملک و قوم کے حوالہ کرتا ہوں ؎

نہ سکون ہے نہ قرار ہے نہ غم و الم کی شمار ہے
یہ نظر جو آتا مزار ہے وہ حبیب اس میں سما گئے

چند مکتوباتِ گرامی

ادھر کچھ عرصہ سے مجھے ہندوستان کی مقتدر ہستیوں کے مکتوبات جمع کرنے کی عادت ہو چلی ہے۔ اس سے بیشتر بہت سے قیمتی خطوط لاپرواہی سے اِدھر اُدھر ڈال دیئے۔ حضرت مجاہد ملت رح سے بھی عرصہ سے مکاتبت رہی۔ موصوف کے کچھ خطوط محفوظ ہیں جن کو پیش کرتا ہوں۔

جون ۶۱ء میں موصوف بجنور تشریف لائے تھے۔ درمیان تقریر میں یا نجی مجلس میں ایک صاحب نے کاروبار حکومت میں اشتراک کے سلسلہ میں سوال کر لیا تھا حضرت مجاہد ملت نے حضرت یوسف ع کی وزارت سے استدلال کیا تھا۔ اس وقت تو بات رفع دفع ہو گئی، لیکن میں نے ایک عریضہ موصوف کی خدمت میں بھیجا۔ وہ عریضہ اور اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت اقدس زید مجدکم، سلام مسنون

مزاج گرامی

یہ عریضہ ڈرتے ہوئے لکھ رہا ہوں کیونکہ میرا یہ مقام نہیں ہے تاہم ایک غلطی سے مطلع کرنا بھی ضروری ہے۔ اس سے اعتراض مقصود نہیں ہے بلکہ سہواً جو بات آپ نے بیان کر دی ہے۔ اس کی اطلاع دینا مقصود ہے۔

بجنور میں آپ نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ حضرت یوسف ع جو مصر میں فرعونی حکومت کے وزیرِ اعظم تھے انھوں نے بن یامین کو فرعونی دستور کے مطابق روک لیا تھا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ قرآن شریف میں اس طرح مذکور ہے۔ کذالک کدنا لیوسف وماکان لیاخذ اخاہ فی دین الملک الا ان یشاء اللّٰہ۔ اس سے معلوم ہوا حضرت یوسف ع نے شریعت یعقوبی کے مطابق روک لیا تھا جب ہی تو اپنے بھائیوں سے سوال کیا تھا اور انھوں نے یہ جواب دیا تھا۔

قالوا جزاؤہ من [illegible] فھو جزاؤہ [illegible] کے بعد یہ آیت ہے [illegible] یوسف معلوم ہوا کہ یہ معاملہ شریعت یعقوبی کے مطابق ہوا تھا نہ کہ فرعونی دستور کے مطابق، اطلاعاً عرض ہے گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں اور دعا کا طالب ہوں۔ والسلام

عزیز الرحمٰن غفرلہ بجنور: ۲ جون ۱۹۶۱ء

محترم مفتی صاحب زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ عنایت نامہ موصول ہوا۔ میں مسلسل سفر میں تھا جواب نہ دے سکا حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو میں نے جس غرض سے دلیل بنایا تھا (اپنی بجنور والی تقریر میں) اس کی ادا اور غالباً تعبیر میں مجھ سے غلطی ہوئی اور میں اپنے مافی الضمیر کو صحیح طور پر پیش نہ کر سکا۔ آپ کا یہ فرمانا صحیح ہے کہ قرآن عزیز کی آیت

میں یہ ذکر ہے کہ فرعون کے قانون کے مطابق تم اپنے بھائی بن یامین کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا انعام تھا کہ اس نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے اسلامی قانون کے مطابق ان کے بھائیوں سے ایسی بات کہلا دی کہ تم اپنے بھائی بن یامین کو اپنے پاس روک سکتے ہو۔

میرے اس استدلال کا مبنیٰ یہ ہے کہ قرآن عزیز کی آیت میں دلالۃ النص کے طور پر یہ بات واضح کر دی گئی کہ حضرت یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام بزمانہ وزارت مصر فرعونیوں کے بنائے قانون مصر کے مطابق احکام جاری کرتے ہوں گے تب ہی تو بن یامین کے مسئلہ میں خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے فی دین الملک کہہ کر اپنے احسان و فضل کا ذکر کیا ہے۔ جو دین ملک سے جدا پیش آیا۔ ورنہ فی دین الملک کہنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دین سے یہاں قانون مراد ہے ملت نہیں اگر اس سلسلہ میں جناب محترم کو کوئی اعتراض ہے تو اس سے براہ کرم مطلع فرمائیں، کیونکہ یہ ایک علمی بحث ہے۔ جو ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے ہر وقت دلچسپی کا باعث ہے۔

والسلام۔ آپکا مخلص: محمد حفظ الرحمٰن

۲۲ جولائی ۱۹۶۱ء

حضرت مجاہد ملت ؒ کے مکتوب سے دو باتیں خاص طور سے ظاہر ہوتی ہیں ۱ اعتراف حق اور یہ بڑے کمال کی بات ہے ۲ دلالۃ النص کہہ کر طریق استدلال اور قوت استدلال ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ موصوف کو محض سیاسیات ہی میں مہارت نہیں تھی بلکہ علوم دینیہ بھی ہر وقت مستحضر رہتے تھے۔

ایک مرتبہ دیوبند میں ایک واقعہ پیش آگیا جس پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو کچھ افسوس ہوا، اور کچھ غصہ آگیا۔ اسی حالت میں حضرت مجاہد ملت کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کر دیا، موصوف نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا۔

مولانا المحترم زید مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مزاج گرامی!

عنایت نامہ پہونچا۔ دارالعلوم دیوبند میں جو بات پیش آئی جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا ہے۔ میں اس کے انسداد کے لئے جو کچھ کر سکتا تھا کر آیا۔ امید ہے کہ اب کوئی ایسی بات انشاء اللہ پیدا نہ ہوگی۔ آپ کی خدمت میں یہی گزارش ہے کہ آپ صاحب باطن ہیں۔ اور حضرت شیخ رح کے ساتھ نسبت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کو اتنا مشتعل نہیں ہونا چاہئے۔

تجربہ یہی بتاتا ہے کہ ہمیشہ کشمکش اور مخالفت کا فتنہ ان درمیانی لوگوں سے اٹھتا ہے جو ادھر کی ادھر اور ادھر کی ادھر لگاتے رہتے ہیں۔ آپ خود عالم ہیں۔ جانتے ہیں کہ اگر صحیح بات بھی فتنہ کا باعث بنے تو اس کی نقل نہ کرنا کرنے سے بہتر ہے۔ مطمئن رہئے کہ اس قسم کی باتیں انشاء اللہ آہستہ آہستہ خود ختم ہو جائیں گی اور کہنے والوں کو خود ندامت ہوگی۔ اس لئے ہمارا اور آپ کا اشتعال۔ اس کا علاج نہیں ہے۔ والسلام۔ آپکا مخلص

محمد حفظ الرحمٰن۔ یکم اگست ۱۹۵۸ء

اس مکتوب سے یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ اس کے پس منظر میں جو واقعہ رونما ہوا ہے۔ اس کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے حضرت مجاہد ملت نے کاتب کے عریضہ سے پیشتر ہی اس کا علاج کر دیا تھا۔ یہ مولانا رح کی دور بینی کی دلیل ہے۔

ضلع بجنور میں جمعیۃ علماء کا کام خاطر خواہ نہ ہونے کی وجہ سے مولانا کو بہت زیادہ شکایت تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ اس ضلع کا کام سب اضلاع سے آگے ہونا چاہئے۔ چنانچہ مرحوم نے میرے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے فرمایا!

محترم مفتی صاحب! زاد مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، مزاج گرامی!
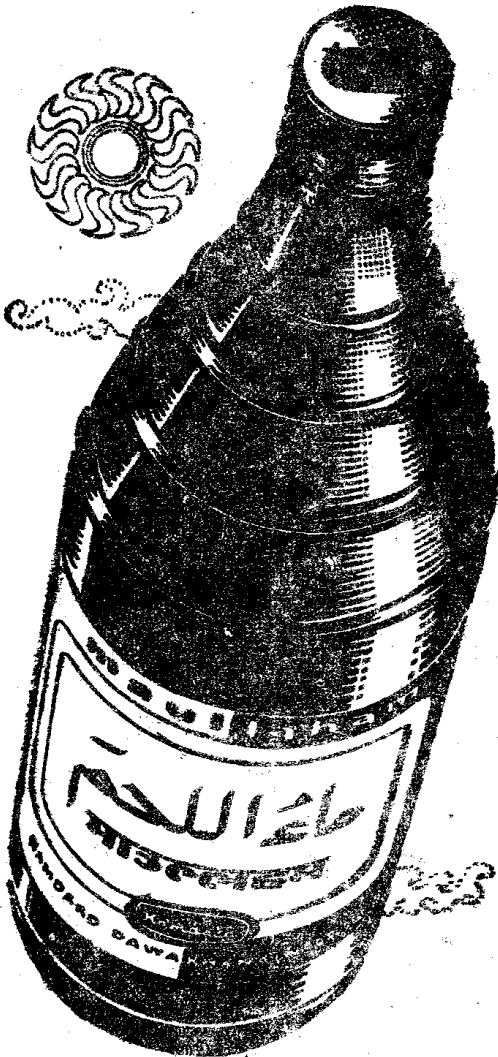
مکتوب ملا حسن ظن کا شکریہ۔ خدا کرے آپ جیسی ذی علم اور ذی عمل شخصیتوں کی بدولت بجنور کے ضلع میں جمعیۃ کے مقاصد بروئے کار آسکیں اور جمود ٹوٹ سکے۔ برادر عزیز سعید اختر صاحب نے بھی مولانا محمد میاں صاحب کو خط لکھا ہے اور اسی کا چرچا کیا ہے۔ میں مئی کے مہینہ میں زیادہ تر دہلی میں ہی حاضر رہوں گا ضرور تشریف لاکر زبانی گفتگو کریں۔

آپکا مخلص:۔ محمد حفظ الرحمن۔ ۹ مئی ۱۹۶۱ء

قابل رشک اسوۂ حسنہ

اکیلا لحد میں ہے کون کہتا نعش حاتم کو
ہزاروں حسرتیں مدفون ہیں دریا کے پہلو میں

۱۹۴۷ء کے بعد کی بات ہے کہ مجلس میں اپنے اکابر میں سے کسی کو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوری کا یہ مقولہ نقل کرتے ہوئے سُنا تھا یا خود حضرت موصوف سے سُنا۔

"حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب اپنی ۱۹۴۷ء کی خدمات کے عیوض اگر عبدالقادر کے تمام عمر کے مجاہدات لینا چاہیں تو میں خوشی سے اس کے لئے تیار ہوں۔

اس زمانہ میں تو عجیب اور بہت عجیب ہے کہ کوئی آدمی بیک وقت متضاد امور اور افعال کو انجام دیتا ہو۔ قرون سابقہ ہی میں ایسے حضرات بکثرت ملتے تھے کہ وہ شب کو عابد اور دن میں مجاہد ہوں آجکل بہت کم ایسے ملتے ہیں۔ لوگ حضرت مجاہد ملت رح کو ایک سیاسی لیڈر سمجھتے تھے چنانچہ ہندوستان کے تنگ نظر اور اسلام نا آشنا زاہدان خشک تو موصوف رح کو خدا معاف کرے کیا کیا سمجھتے تھے۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اسلام یہ ہے جو مجاہد ملت کے مندرجہ ذیل اسوہ سے ظاہر ہو رہا ہے اسلام کبھی بھی محض مسجد کی چہار دیواری میں محصور نہیں رہا۔ اسلام مرد مجاہد کی شمشیر اور پیشانی سے مساوی ضو فشانی کے ساتھ چمکتا ہوا ملے گا۔ چند نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

۱۹۶۱ء میں خادم حضرت مجاہد ملت رح کو لینے کے لئے گجرولہ اسٹیشن پہونچا۔ صبح کا وقت تھا۔ آفتاب نکل آیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں صبح کی نماز راستے ہی میں پڑھ چکا تھا۔ جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت مجاہد ملت گرمی میں اندر ویٹنگ روم میں قرآن کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور وظیفہ پڑھا بعد میں مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ "آپ کے یہاں آنے کا مجھے بہت احساس ہے میں تو آہی رہا تھا بیکار تکلیف اٹھائی۔

(از جناب رحمت بنی میرٹھی نمائندہ خصوصی روزنامہ الجمعیۃ دہلی)

حضرت مجاہد ملت کا میرٹھ سے خصوصی تعلق

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس عالم فانی میں مجاہد ملت خطیب جادو بیان حضرت مولانا محمد حفظ الرحمان صاحب قدس اللہ سرہٗ و نور مرقدہٗ کا وجود علامہ اقبال کے مندرجہ بالا شعر کا صحیح معنوں میں آئینہ دار تھا، وقت ضرورت کے اعتبار سے قدرت مجاہد پیدا کرتی ہے جو پورے عزم و ہمت اور پورے صبر و استقلال کے ساتھ ملت اسلامیہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو منجدھار سے نکال کر سلامتی کے کنارے پر لگا دیتے ہیں، اٹھتے ہوئے طوفانوں اور بڑھتی ہوئی لہروں کے تھپیڑوں کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرتے ہیں۔

حضرت مجاہد ملت کی زندگی کے آخری پینتالیس سال انگریزی سامراج اور ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کے طوفانوں سے مسلسل جہاد کرتے ہوئے گزرے اس دوران میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا کہ حضرت کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہو یا ان کی قوت ارادی اور صبر و استقلال نے ان کو جواب دیدیا ہو۔ آپ پوری مجاہدانہ شان کے ساتھ ملک دشمن عناصر کا مقابلہ کرتے رہے۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمان صاحب قدس اللہ سرہٗ کا یوں تو پورے ملک سے خاص تعلق تھا اور ملک کے گوشہ گوشہ میں ان کی سرگرمیاں برابر جاری رہیں، وہ موسم کی گرمی و سردی اور اپنی صحت کی بحالی و بیماری کی پرواہ کئے بغیر ہندوستان کے ہر حصہ میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں کے عوام کی مشکلات میں ان کی خاطر خواہ مدد کرتے اور ہاتھ بٹاتے تھے، لیکن موصوف کو میرٹھ سے ایک خصوصی لگاؤ آخری وقت تک جاری رہا اور آپ میرٹھ کو اکثر اپنا گھر فرمایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ دہلی و میرٹھ میرے لئے دو نہیں ہیں اور ہم لوگ بھی حضرت کو اپنی ہر مشکل کے وقت یاد کرتے اور ان کو تکلیف دیتے رہتے تھے۔ وہ باوجود اپنی انتہائی مصروفیات اور بیماری کے بھی ہماری درخواست کو رد نہ فرماتے تھے، یوں تو حضرت مجاہد ملت کو میرٹھ سے یہ خصوصی تعلق ۱۹۲۱ء سے ہوا جبکہ آپ جمیم خانہ میدان میرٹھ کے ایک عظیم الشان جلسہ عام میں جمعیۃ علماء ہند کی امروہہ کانفرنس کی کانگریس میں غیر مشروط شرکت کی تجویز کی وضاحت فرمانے کے واسطے تشریف لائے تھے سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب اس جلسے کے خاص مقرر تھے، کہتے ہیں کہ یہ جلسہ مولانا محمد اسد اللہ خاں صاحب بدایونی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، اس جلسے کی تقریروں پر حضرت مجاہد ملت اور صدر جلسہ کو گرفتار کر لیا گیا تھا، حضرت مجاہد ملت کو قصبہ سیوہارہ سے گرفتار کر کے لایا گیا تھا، چنانچہ میرٹھ ہی کی جیل میں آپ نے اسیری کے دن گزارے اور میرٹھ کے سیاسی دوستوں سے خصوصی رابطہ پیدا ہوا حضرت مجاہد ملت اپنی خوش مزاجی کے علاوہ وضع کے بہت پابند تھے جن حضرات سے آپ کے مراسم قائم ہو جاتے تھے ان کو کبھی فراموش نہ فرماتے تھے، چنانچہ آپ جب بھی میرٹھ تشریف لاتے تو یہاں کے مخصوص حضرات سے ملنے ضرور تشریف لے جاتے تھے، اور میرٹھ کے حضرات کو بھی آپ کی ذات سے بے حد وابستگی قائم رہی اور وہ مولانا کی ذات پر فخر کرتے تھے، آپ جس وقت تشریف لاتے تو احباب و دوستوں میں اچانک مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور جو سنتا وہ آپ کی جانب غیر اختیاری طور پر کھنچا چلا آتا اور آپ کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسرت و شادمانی رقص کرنے لگتی، اور حضرت مجاہد ملت بھی ایک ایک کو دیکھ کر خوش ہوتے اور ہر ایک کا مختصر حال معلوم کرتے حاضرین سے غائبین کی کیفیت مزاج معلوم فرماتے

حق تو یہ ہے کہ میرٹھ کے تمام لوگ آپ کو اس طرح عزت و عظمت کی نظروں سے دیکھتے تھے جس طرح ملک کے نوجوان پنڈت نہرو کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کو موجودہ دور میں ہندوستان کا واحد مسلم رہنما سمجھتے تھے۔ حضرت مجاہد ملت جب بھی یہاں تشریف لاتے تو اپنی وضع کے مطابق اپنے احباب و دوستوں پر خصوصی کرم فرماتے اور جس قدر بھی موقع ملتا اکثر سے ملنے ان کے مکانوں پر جاتے اور خیریت معلوم کرتے، حضرت مولانا سید محمد اسحٰق صاحب مرحوم کٹھوری تاحیات دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے حضرت مجاہد ملت حکیم صاحب مرحوم کی حیات تک برابر ان کے مکان پر قیام فرماتے تھے، حضرت مولانا مبارک حسین صاحب مرحوم مدرسہ دارالعلوم اندر کوٹ میرٹھ کے بانی تھے حضرت مجاہد ملت کو موصوف مدرسہ کے سالانہ جلسوں میں بلایا کرتے تھے چنانچہ اسی زمانہ سے آپ جب بھی میرٹھ تشریف لائے تو مدرسہ دارالعلوم بھی تشریف لے گئے اور حضرت مولانا سید لائق علی صاحب قاسمی وغیرہ حضرات

سے ملاقات فرماتے اور یہاں بھی اکثر قیام فرماتے۔

حضرت مجاہد ملتؒ کے مخصوص احباب میں جناب حافظ عبدالحمید صاحب قریشی کو بھی یہ سعادت حاصل ہے، کہ آپ اکثر و بیشتر موصوف کے مختصر سے بالاخانہ پر بے تکلفانہ قیام پذیر ہوتے یہ قیام اپنی نوعیت اور وضع داری کی ایک عظیم مثال ہے، حضرت مجاہد ملتؒ کو میرٹھ کے کباب بہت مرغوب تھے حافظ صاحب کے یہاں آپ اکثر کباب تناول فرماتے تھے، آپ کبھی کبھی حکیم ظہورالحسن صاحب کے یہاں لال کرتی میں بھی قیام فرمالیتے تھے حکیم ظہورالحسن صاحب مولانا حکیم محمد میاں صاحب مرحوم کے داماد ہیں حکیم صاحب مرحوم کے تعلق سے اکثر حضرت مجاہد ملتؒ ان کے انتقال کے بعد بھی مکان پر تشریف لے جاتے رہے، ویسے آپ کے مخصوص احباب میں خان بہادر بھیا مظفرالدین صاحب رئیس لال کرتی بھی شامل ہیں اور ان کے یہاں بھی اکثر تشریف آوری ہوا کرتی تھی، شیخ محمد اصغر صاحب چاندی والوں سے بھی حضرت کے تعلق کا ایک سبب یہ بنا، کہ اگست ۱۹۴۷ء کے خونی انقلاب کے بعد پنجاب کی تباہ حال اور اپنوں سے بچھڑی ہوئی تین مسلمان لڑکیاں انسانی درندوں کے ظلم و ستم سہتی ہوئی محافظ انسانیت و شرافت مجاہد ملتؒ کے سایہ عاطفت میں آکر رہنے لگیں۔ حضرت مجاہد ملتؒ نے ان تینوں لڑکیوں کو اپنی اولاد کی طرح پرورش کیا اور یہ لڑکیاں حضرت مجاہد ملتؒ کی شفقت سے اس قدر متاثر ہوئیں، کہ بے اختیار "اباجان" کے باعظمت نام سے مخاطب کرنے لگیں۔ وہ مجاہد اعظمؒ نے جو کہ پوری ملت کی باپ اور محسن تھے۔ ان لڑکیوں کے بخوشی باپ بن گئے جو ان لڑکیوں کے باپ کو جو فکر ہوتا ہے وہ ہی اس پیکر اخلاص کے قلب پر طاری ہوگیا۔ ان ہی دنوں آپ کی میرٹھ تشریف آوری ہوئی ایک مخصوص نشست میں ان لڑکیوں کے نکاح کے لئے آپ نے اپنے فکر کا اظہار فرمایا۔ ڈاکٹر نظام الدین صاحب وغیرہ نے اس سلسلہ میں کوشش کا وعدہ فرمایا اور کچھ ہی دنوں بعد تینوں لڑکیوں کے نکاح ہوگئے، حضرت مجاہد ملتؒ نے حقیقی باپ کی طرح پوری دیکھ بھال اور اطمینان کرنے کے بعد اپنی نگرانی میں ان کی شادیاں کرائیں اور تا حیات ایک مشفق باپ کی طرح برابر خیریت معلوم کرنے اور ان کو دعائیں دینے کے لئے ان کے یہاں جاتے رہے ان لڑکیوں میں سب سے چھوٹی لڑکی حلیم بانو کا نکاح شیخ محمد اصغر صاحب چاندی والوں سے ہوا تھا۔ حضرت مجاہد ملتؒ ضلع میرٹھ کے جماعتی معاملات میں مولانا سید لائق علی صاحب قاسمی، مفتی عبدالخالق صاحب صدیقی۔ ڈاکٹر نظام الدین صاحب وغیرہ حضرات کے مشوروں کو زیادہ اہم تصور فرماتے تھے، حضرت مجاہد ملتؒ کا قاضی شہر میرٹھ حضرت الحاج قاضی زین العابدین صاحب سجاد سے بھی خاص تعلق تھا۔

اہل میرٹھ کو حضرت مجاہد ملتؒ کی جس قدر جادو اثر تقریریں سننے کا شرف حاصل ہوا ہے میں سمجھتا ہوں، کہ ہندوستان کے کسی اور خطہ کو یہ فخر حاصل نہیں ہوا ہوگا۔ میرٹھ شہر کے علاوہ قصبات و دیہات اور وہاں کے عربی مدارس بھی حضرت کی ذات سے برابر فیض حاصل کرتے رہے ہیں۔ حضرت مجاہد ملتؒ نے میرٹھ میں متعدد کانفرنسوں کو خصوصیت سے شرکت فرما کر نوازا ہے، جن میں سے آل انڈیا مسلم نیشلسٹ کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۳ء یہ کانفرنس ڈاکٹر سید محمود صاحب کی صدارت میں موجودہ نگار سینما کی بلڈنگ کی جگہ پر ہوئی تھی اور جس میں خان عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی۔ ڈاکٹر خان صاحب مرحوم خان عبدالصمد خاں، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہٗ اور امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ جیسے رہنمایان ملت نے بھی شرکت فرمائی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں فلسطین کانفرنس جس کی صدارت رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ لدھیانوی نے فرمائی اور ٹاؤن ہال کے میدان میں حضرت مجاہد ملتؒ نے اس کانفرنس کو خطاب فرماتے ہوئے اپنی جادو بیان تقریر میں جن خیالات و جذبات کا اظہار فرمایا تھا وہ آج ماضی کی ایک یادگار ہیں جن کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ ۱۹۴۳ء میں جمعیۃ علماء ضلع میرٹھ کی تبلیغی کانفرنس جو کہ گڑھ مکتیشر میں حضرت مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی کی صدارت منعقد ہوئی تھی اور حضرت مجاہد ملتؒ اس کانفرنس کے خاص مقرر تھے، ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا کانگریس سیشن جو کہ وکٹوریہ پارک میرٹھ میں منعقد ہوا تھا اور اسی دوران کے فرقہ وارانہ فسادات پر حضرت مجاہد ملتؒ نے بہت ہی اہم تقریر فرمائی۔ ان کانفرنسوں کے علاوہ حضرت میرٹھ کی جمعیۃ علماء، انجمن تبلیغ الاسلام، مدرسہ عربیہ دارالعلوم جامع مسجد میرٹھ، اور شہر و صدر اور رجبن و موتی گنج کے مسلمانوں کے قائم کردہ سیکڑوں جلسوں کی روح حضرت مجاہد ملتؒ کا وجود سمجھا جاتا تھا۔

تقسیم وطن کے بعد پہلی بار آپ نے ۱۹۴۸ء کے شروع میں میرٹھ ٹاؤن ہال کے میدان میں ایک نہایت اہم اور تاریخی تقریر فرمائی جس میں مقامی کانگریس لیڈروں کے علاوہ ہندو مسلمان اور سکھ تقریباً بیس پچیس ہزار کی تعداد میں موجود تھے۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ ملک میں شر و فساد کے طوفان اٹھ رہے تھے قتل و غارت گری کا بازار ابھی سرد نہیں پڑا تھا، انسانی خون

سے ہولی کھیلی جا رہی تھی، [illegible] نوی نعروں سے سہمے ہوئے اور [illegible] تھے اور ان پر مایوسیوں کے بادل چھائے ہوئے تھے، حضرت مجاہد ملتؒ نے اس جلسے میں ایک کامل مرد مومن کی طرح بڑے مجاہدانہ انداز و جوش میں فرقہ پرستوں کو للکارتے ہوئے فرمایا، کہ میں "مسلم لیگی" کے نام پر مسلمانوں کا خون نہیں بہانے دوں گا اور اگر مسلمانوں کے خون سے ابھی تمہاری پیاس نہیں بجھی ہے تو میں مسلم نیشلسٹوں کو تمہارے سامنے پیش کرنے کو تیار ہوں تم ان کے خون سے اپنی پیاس بجھا سکتے ہو اور اگر تمہاری پھر بھی پیاس نہ بجھے تو مجھے بتاؤ میں سرحد سے خدائی خدمت گاروں کو بلاکر تمہارے سامنے پیش کر دوں گا ان کے خون سے اپنی پیاس بجھا لینا، لیکن اب یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مسلم لیگی کا نام لے کر کسی مسلمان کا خون بہاؤ یہاں اب کوئی مسلم لیگی نہیں مسلم لیگی پاکستان جا چکے۔ یہاں جتنے مسلمان ہیں وہ سب ہندوستانی ہیں اور ہندوستان ہی کو اپنا وطن سمجھتے ہیں دوسری جانب حضرت مجاہد ملتؒ نے نیشلسٹ مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ اب وہ کسی بھی مسلمان کو لیگی نہ کہیں اور نہ ان سے کوئی غیریت برتیں اس طعنے کو اب میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا میں نے مراد آباد کے ایک صاحب کو بھی یہی بات کہی ہے جبکہ وہ کسی کو لیگی لیگی کہہ کر طعن کر رہے تھے، آپ نے فرمایا، کہ لیگی لیڈروں نے کچھ سیدھے سادھے مسلمانوں کو جھوٹے نعرے لگا کر گمراہ کر دیا تھا وہ اب ان نعروں کی حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں۔"

اس کے بعد جمعیۃ علماء ضلع میرٹھ کی ایک عظیم الشان سیرت کانفرنس میں حضرت مجاہد ملتؒ نے ۱۹۵۹ء میں شرکت کی یہ کانفرنس بھی میرٹھ کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ تقسیم ملک کے بعد میرٹھ میں مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا اور عظیم الشان اجتماع تھا۔ حضرت مجاہد ملتؒ نے جس اجلاس کو خطاب فرمایا اس کی صدارت سعودی عربیہ کے سفیر برائے ہندوستان آنریبل شیخ یوسف الفوزان نے فرمائی تھی۔ حضرت مجاہد ملتؒ نے اپنی زندگی کی آخری تقریر بھی اسی میرٹھ ہی کی ہے آپ سیرت النبی کے ایک جلسہ میں تقریر کرنے کے لئے ۲ر جنوری ۱۹۶۲ء کو موضع سسنہ ضلع میرٹھ تشریف لے گئے۔ وہاں سے واپسی پر ۳ر جنوری کو میرٹھ تشریف لائے اول میرے غریب خانہ پر ہمشیرہ کی وفات کے سلسلہ میں عیادت کے لئے تشریف لائے کچھ دیر قیام فرما کر اور تسلی و تشفی کی باتیں فرما کر فیض عام کالج میں مجھے ہمراہ لے گئے جہاں آپؒ نے [illegible] پال پر مد[illegible] بعد ازاں کالج کی جانب سے آپ کو عصرانہ دیا گیا جس میں معززین شہر موجود تھے۔ آپ کو اس وقت نزلہ اور کھانسی کے علاوہ معمولی حرارت بھی تھی آپ کی پسندیدہ غذا میرٹھ کے مشہور کباب بھی پیش کئے گئے جن کو آپ نے بڑے شوق سے تناول فرمایا۔ حضرت مجاہد ملتؒ کی میرٹھ میں یہ آخری تقریر جو مفتی عبدالخالق صاحب ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء ضلع کی صدارت میں ہوئی بطور یادگار رہے گی۔

حضرت مجاہد ملتؒ نے میرٹھ والوں پر بڑے احسانات کئے ہیں۔ میرٹھ کے مسلمانوں پر جب بھی کسی ظلم یا زیادتی کی خبر آپ کو ملتی تو بے چین ہو جاتے تھے اور ان کی مشکلات کو اپنی مشکل جان کر بڑے عزم اور ہمت کے ساتھ میرٹھ پہونچ جاتے اور حالات کا مقابلہ جواں مردی اور صبر و شکر کے ساتھ کرنے کی تلقین فرمانے کے ساتھ ساتھ ہی ہر ممکن امداد فرماتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء میں گڑھ مکتیشر کے فساد کے موقع پر اور جبکہ پنجاب سے آئے ہوئے فسادیوں نے کوتانہ تحصیل باغپت میں مسلمانوں پر اچانک آفت نازل کر دی تھی۔ اس وقت آپ نے نیچے سے اوپر تک ذمہ داران حکومت کو مظلوموں کی فریاد پہونچانے کا حق ادا کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں آپ بار بار میرٹھ تشریف لاتے، اور مظلوموں کے لئے اور مظلوموں کے لئے امدادی مشن کو جاری کرایا مرکزی جمعیۃ علماء ہند سے ہزاروں روپے کی امداد دلائی۔

۵ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو علیگڈھ کے واقعہ پر طلباء نے ایک جلوس یہاں بھی نکالا اور بے گناہ مسلمانوں کی دو کالونی کو لوٹا اور نذر آتش کیا گیا۔ فیض عام انٹر کالج کو بھی برباد کیا گیا میں نے جس وقت حضرت مجاہد ملتؒ کو فون پر اس واقعہ سے باخبر کیا تو آپ علیگڈھ سے اسی روز واپس لوٹے تھے بخار کی شکایت تھی، اس کے باوجود آپ فوراً ہی میرٹھ تشریف لے آئے اور سب سے پہلے دار العلوم تشریف لے گئے اور حالات و خیریت معلوم کی۔ دار العلوم میں مفتی عبدالخالق صاحب اور شہر کے دوسرے معزز حضرات سے واقعات معلوم کئے۔ اس کے بعد آپ دفتر جمعیۃ علماء شہر تشریف لائے اور وہاں سے مجھے ساتھ لے کر متاثرہ علاقوں کا دورہ فرمایا بعد میں افسران سے مل کر دہلی واپس تشریف لے گئے۔ ۶ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو بڑے پیمانے پر فساد ہوا اور شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ دوپہر کے وقت میں نے پھر حضرت مجاہد ملتؒ کو فون پر تازہ صورت حال سے مطلع کیا۔ آپ کو اس وقت بخار تیز تھا۔ آپ نے فون پر فرمایا کہ مجھے کافی تیز بخار ہے میں یہاں سے جنرل شاہنواز خاں کو بھیج رہا ہوں۔ لیکن شام کو کیا دیکھتے ہیں

کہ شاہنواز خاں سے پہلے حضرت یہاں [illegible]
انتہائی ناسازی کے باوجود حالات کا پورے طور [illegible] کر مقامی حکام
اور مرکزی حکومت کے ذمہ داروں کو آگاہ فرمایا، اس کے بعد دوران فساد
حضرت موصوف اپنے دل میں انتہائی کرب و بے چینی لئے ہوئے بار بار میرٹھ
تشریف لائے اور مسلمانوں کو صبر و شکر کی تلقین فرمائی اور اُن کو ہر طرح دلاسا
دیا تو دوسری طرف پنڈت نہرو۔ لال بہادر شاستری اور جنرل شاہنواز کو حالات
سے آگاہ کر کے اُن کو متحرک کرتے اور حکومت کی ذمہ داریوں کی جانب
توجہ دلاتے رہے۔ مقامی کانگریسی نیتاؤں سے بھی تبادلہ خیالات کیا حضرت
مجاہد ملتؒ کی یہ سرگرمیاں جو محض مظلوموں کی حمایت اور حکومت کو بدنامی
سے بچانے کے لئے تھیں مقامی فرقہ پرستوں کو ایک آنکھ نہ بھائیں اور
ایک حقیقت شناس مرد مجاہد پر بھی فرقہ پرستی کا الزام لگائے بغیر نہ رہ سکے
دوران فساد کرفیو کے اوقات میں آپ میرٹھ کے سرکٹ ہاؤس پہونچے
جہاں یوپی کے وزیر اعلیٰ چندر بھان گپتا ہوم منسٹر یو۔ پی چودھری چرن سنگھ
نائب وزیر ریلوے جنرل شاہنواز خاں، کیلاش پرکاش وغیرہ ٹھہرے
ہوئے تھے۔ مولانا نے اُن سے ملاقات کی۔ حضرت مجاہد ملتؒ کی چودھری
چرن سنگھ سے جھڑپ ہوگئی جس کے بعد چودھری چرن سنگھ نے اپنا رنگ
بدل دیا اور حضرت مجاہد ملتؒ و جمعیۃ علماء ہند کے خلاف اخبارات میں
بیانات دیئے جن کے ترکی بہ ترکی ہندوستان بھر کے اخبارات نے جوابات
دیئے اور بعض اونچے رہنماؤں نے بھی چودھری چرن سنگھ کے بیان کی
مذمت کی۔

حضرت مجاہد ملتؒ نے فساد کے دوران میرٹھ کی شہید کی ہوئی
مسجدوں کی تعمیر کے لئے حکومت یو۔ پی سے مطالبہ کیا اور وزیر اعلیٰ یوپی
شری چندر بھان گپتا سے ان مسجدوں کو دوبارہ تعمیر کرایا۔ اس کے علاوہ
آپ نے میرٹھ کے فساد میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے وارثان
کو چار چار سو روپے کی امداد دلائی اور مجروحین و لُٹے ہوئے مظلوموں
کو بھی حکومت سے روپیہ دلایا جمعیۃ علماء ہند کی طرف سے بھی آپ نے
کئی ہزار روپیہ مقتولین کے وارثان مجروحین و مظلومین میں تقسیم کرایا۔

ملت کے محبوب رہنما سے میری آخری ملاقات

امریکہ سے واپسی پر حضرت مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمان صاحب
قدس اللہ سرہٗ و نور مرقدہٗ سے میری آخری ملاقات ۱۲ر جولائی ۱۹۶۲ء کو
صبح ۹ بجے حضرت کی نئی دلی کی قیام گاہ پر ہوئی، کوٹھی کے باہر ملاقاتیوں
[illegible] ی عتیق الرحمان [illegible] یا، کہ حضرت
بہت [illegible] کمزور ہیں مصافحہ کی کوشش نہ کرنا اور زیادہ دیر گفتگو نہ کرنا
چنانچہ میں اور میرے ساتھی اُس کمرہ میں داخل ہوئے جہاں ملت اسلامیہ
کا محبوب رہنما مجاہد اعظم بستر علالت پر دراز تھا، حضرت مجاہد ملتؒ کو
میں نے سلام کیا آپ نے مجھے دیکھتے ہی اشارے سے اپنے قریب
بلا کر چارپائی پر بٹھا لیا۔ اشارہ سے ہی خیریت معلوم کی اور ساتھ ہی اہل
میرٹھ کی خیریت بھی معلوم فرمائی اور آہستہ سے فرمایا، کہ سب سے میرا سلام
کہہ دینا۔ یہ فرماتے وقت حضرت کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ جن کو دیکھ کر میرے
دل پر بے حد اثر ہوا۔ اور میرے اندر ایک بے چینی سی پیدا ہوگئی۔

۲ر اگست کی صبح کو آفتاب کی پہلی کرن نکلنے کے ساتھ ہی میرٹھ
والوں نے اپنے محسن اور محافظ انسانیت و شرافت مجاہد ملتؒ کی وفات
کی اندوہناک خبر سُنی تو جو جس جگہ تھا کچھ دیر کے لئے وہیں ساکت ہوگیا
بازار بند ہوگئے اسکول اور کالج بند کر دیئے گئے۔ ایصال ثواب کی مجلسیں
شروع ہوگئیں اور اسپیشل بسوں کے ذریعے ہزاروں شہریوں نے پہونچکر
اپنے محبوب رہنما کے آخری دیدار کئے اور آغوش رحمت کے سپرد
کرنے کے بعد واپس لوٹے،

آہ! حضرت مجاہد ملتؒ کی شخصیت، آپ کی شفقت، آپ کا خلوص
و ہمدردی، آپ کی ملک و ملت کے لئے مسلسل جد و جہد، ایثار و قربانی
اور مجاہدانہ جرات و ہمت یہ ایسی چیزیں ہیں جن کو کبھی فراموش نہیں کیا
جا سکتا۔ حضرت مجاہد ملتؒ کی ذات اس دور میں ملت اسلامیہ کے
لئے ایک آخری سہارا تھی افسوس کہ قدرت کے ہاتھ نے ہم سے اُس
کو بھی چھین لیا۔ اس قحط الرجال کے دور میں ہماری نگاہیں سارے ملک
میں تلاش کر رہی ہیں۔ لیکن ایسے شخص پر نظر نہیں پڑتی جس کو حضرت مجاہد
ملت مولانا محمد حفظ الرحمان صاحب قدس اللہ سرہٗ و نور مرقدہٗ کا صحیح جانشین
سمجھا جائے۔

منشی عیسیٰ بھائی ... ی ضلع بھروچ

حضرت مجاہدِ ملّت قدس اللہ سرہٗ کی یاد

مجاہد ملّت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ سے جمعیۃ علماءِ ضلع بھروچ کے ناظم کی حیثیت سے خط وکتابت کا سلسلہ ۱۹۴۲ء سے شروع ہو چکا تھا مگر ملاقات کا شرف آزادی کے بعد جمعیۃ علماءِ ہند کے (بمبئی) کے تاریخی اجلاس کے موقع پر ہوا۔ اس اجلاس کی مجلس مضامین میں حضرت مجاہد ملت کی شخصیت اور خطابت کے جوہر بہت قریب سے مطالعہ میں آئے جب ہم بوری بندر اسٹیشن پر مولانا کو الوداع کرنے گئے تو حضرت ہمیں دیکھ کر پلیٹ فارم پر تشریف لے آئے بہت محبّت سے مُلاقات سے نوازا اور رفیع احمد قدوائی رحؒ سے بھی ملاقات اور تعارف کرایا، پھر لکھنؤ، حیدرآباد اور سورت کے سالانہ اجلاسوں میں بھی مُسلسل ملاقاتیں ہوتی رہیں علاوہ ازیں بمبئی، اٹولی، پالنپور، احمد آباد، راندیر، سورت بھروچ، رکھیتر، گوہنیہ، کاوی کے جلسوں اور کانفرنسوں میں بھی بار بار ملاقاتیں ہوئیں بہرحال ان ملاقاتوں کے ذریعے آپ کی شخصیت کو دیکھنے اور سمجھنے کے مواقع میسّر آتے رہے۔ نیز اہم ملّی اور ملکی مسائل کے بارے میں حضرت کے خیالات وخدمات سے واقفیت ہوتی رہی کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ جہاں گھنٹوں حضرت کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ کئی مرتبہ قیام گاہ پر نماز فجر اس طرح ادا ہوئی کہ حضرت امام تھے اور میں تنہا مقتدی۔ ایک مرتبہ سورت میں جناب محسن بھائی حضوری کے مکان پر قیام تھا وہاں ڈابھیل کے اطراف سے ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ حضرت فلاں صاحب کو سانپ نے کاٹا ہے مجاہدؒ نے فوراً پانی پر دم کر کے اس کو پلایا پھر وہ چلا گیا ہم نے دریافت کیا تو فرمایا کہ ڈابھیل کی مدرسی کے زمانے سے یہ عمل میرے پاس ہے، سینکڑوں مارگزیدہ صحت یاب ہو چکے ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ ہمیں یہ عمل سکھائیں گے؟ تو فرمایا کہ یہ عمل محض دو ہی آدمیوں کو سکھایا جاتا ہے اور میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا انور شاہؒ کو سکھا چکا ہوں۔ پھر ہنس کے فرمایا کہ یہ دونوں بزرگ دنیا سے رحلت فرما چکے ہیں نہ معلوم انھوں نے کسی کو سکھایا بھی ہے یا نہیں میرے وطن کاوی میں غالباً حضرتؒ تین بار تشریف لائے۔ ایک مرتبہ مجھ سے پروگرام طلب فرمایا میں نے عرض کیا عصر کی نماز کے بعد بڑی مسجد میں جمعیۃ علماء کے بارے میں تقریر فرمائیں اور شب کو آزاد چوک میں سیرت پر تقریر فرمائیں۔ فرمایا بہت اچھا عصر کے بعد بڑی مسجد میں۔ جب میں نے ابتداءً ہماری دعوت پر تشریف لانے اور شدید گرمی اور گرد میں تکلیف اُٹھانے پر حضرت کا شکریہ ادا کر کے سامعین کو بتایا کہ حضرت مجاہدؒ اس وقت تو جمعیۃ علماء کی اہمیت پر تقریر فرمائیں گے۔ اور رات کو آزاد چوک میں سیرت مقدسہ پر تقریر فرمائیں گے۔ پھر جب حضرت مائیک پر تشریف لے آئے تو ابتداء ہی ان الفاظ سے کی کہ مجھے عیسیٰ بھائی پر تعجب ہوتا ہے کہ شاید یہ جمعیۃ علماء کو کوئی دینی جماعت اور اس کی خدمات کو دینی کام نہیں سمجھ رہے ہیں ورنہ یہ امتیاز کیسا؟ واللہ اگر ہم جمعیۃ علماء کے کام کو دینی کام نہ سمجھتے تو یہ در در اور گھر گھر کی خاک کیوں چھانتے۔ الحمد للہ مسندِ حدیث پر بیٹھ کر احادیث ہم پڑھا سکتے ہیں اور اس میں بڑا لطف آتا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہٗ نے بھی ابتداء میں اپنے شفیق اُستاد حضرت شیخ الہندؒ سے یہی عرض کیا تھا کہ حضرت درس حدیث چھوڑ کر آپ کس کام میں لگے ہیں۔ تو حضرت شیخ الہند نے فرمایا تھا کہ تم اپنے ان الفاظ کو یاد رکھنا اور دیکھنا کہ تم کیا کرو گے۔ پھر جب رات کو سیرت مقدسہ پر تقریر فرمائی تو جمعیۃ علماء کا نام تک نہیں آنے دیا مگر جب تقریر کے اختتام پر ساڑھے گیارہ سو کی تھیلی پیش کی گئی تو ہنس کے فرمایا کہ کاوی جمعیۃ علماء کا شکریہ ادا کرتا ہوں میں نے جمعیۃ علماء کا نام اس شکریہ کے ضمن میں لیا ہے ورنہ عیسیٰ بھائی نے تو سیرت پر ہی بولنے کو فرمایا تھا۔

سورت میں ایک مرتبہ مقامی کانگریسیوں نے آپ کو ٹیبل ٹوک کی میٹنگ میں مدعو فرمایا میں بھی ساتھ تھا وہاں حضرت مجاہد ملّت سے سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ کانگریس اور کانگریسی حکومتوں کا اثر عوام پر وہ نہیں جو آزادی سے قبل تھا؟ آپ نے فرمایا کہ آزادی سے قبل کانگریسی احباب جب دیہاتوں میں گھومتے تھے اس وقت ان کے سینوں میں خدمت خلق کا جذبہ موجزن تھا اور آج محض کھدر کی پوشاک ہے وہ جذبۂ خدمت نہیں رہا اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک تو ہوتا ہے گلاب کا اصل پھول اور ایک ہوتا ہے گلابی کاغذ کا پھول۔ کاغذی پھول دیکھنے میں اصل پھول سے بھی زیادہ دلکش ہوگا مگر اس میں وہ خوشبو کہاں جو اصل پھول میں ہے یہی وجہ ہے کہ عوام پر سے کانگریس کا اثر زائل ہو رہا ہے کیوں کہ ان میں وہ اصلیت اور جذبۂ خدمتِ خلق کی خوشبو نہیں رہی۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ گجرات کے مسلمان کا عمر [illegible] رہتے ہیں [illegible]
حضرتؒ نے یہ جواب دیا تھا کہ گجرات کے مسلمان جنگ آزادی میں بہت قلیل
تعداد میں کانگریس میں شریک تھے البتہ آزادی کے بعد وہ کانگریس کے قریب
آرہے تھے مگر افسوس ہمارے اکثریتی بھائیوں نے انھیں اپنانے میں کوتاہی
کی وہی شکوک وشبہات اور اکثریت کا پندار سنگ راہ بن گیا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان
مایوس اور بددل ہوکر بدک گئے البتہ آپ یوپی میں آئیں اور دیکھیں وہاں
کا مسلمان کانگریس سے لڑے گا مقابلہ ہوگا مگر کانگریس کو چھوڑے گا نہیں۔
حضرتؒ کے جوابات سے کانگرسی احباب بہت متاثر ہوئے۔

تارکیسر ضلع سورت میں غالباً ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء میں شیخ الاسلام حضرت
مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہٗ تشریف فرما تھے۔ حضرت مجاہدؒ نے
بھی تشریف آوری کا وعدہ فرمایا تھا مگر اچانک تاریخ میں تبدیلی ہو جانے کی
وجہ سے تشریف نہ لاسکے۔ مجلس میں گفتگو کے درمیان حضرت شیخ نے فرمایا
کہ مولانا حفظ الرحمٰن آزادی وطن کے لئے ایسے بے چین اور بے قرار رہتے
ہیں جیسے سیماب۔

ایک مرتبہ احمد آباد میں ٹیل لوک کی میٹنگ رکھی تھی شہر کے مشہور مسلمان
وکلاء، سیاسی لیڈران اور سربرآوردہ حضرات کا بہت بڑا اجتماع تھا وہاں ایک
سوال کیا گیا کہ محکمۂ کسٹوڈین کی چیرہ دستیوں کے خلاف جمعیۃ علماء نے کیا خدمت
انجام دی؟ حضرت مجاہدؒ نے فوراً جواب دیا آزادی کے بعد مسلمانوں کی کروڑوں
اربوں روپیوں کی املاک پر بلا قانون کے حکام نے قبضہ شروع کیا تو ہم خدام
جمعیت نے وزیر اعظم سے ملاقات کی۔ اور کہا کہ دنیا کی کوئی حکومت بھی ایسی
نہیں ہے کہ جہاں لاقانونیت جاری ہو اور بلا قانون کے رعایا کے املاک پر قبضہ
کیا جائے اس کے فوراً بعد حکومت کی جانب سے ایک قانون بنایا گیا۔ یہ قانون
یقیناً غیر منصفانہ تھا پھر ہم ذمہ داران جمعیۃ نے ارباب حکومت سے کہا کہ یہ قانون
دیکھ کر دنیا کیا کہے گی؟ یہ تو صریحاً بے انصافیوں کا مرقعہ ہے اس کے بعد قانون
میں تبدیلی کرکے منصفانہ اور عادلانہ قانون بنایا گیا جو آج آپ لوگوں کے ہاتھ
میں ہے اس پر ایک وکیل صاحب نے سوال کیا کہ فلاں دفعہ قابل اعتراض
نہیں ہے؟ جواب دیا گیا کہ اس کا تدارک حاشیہ پر ہی کیا گیا ہے ان صاحب
نے حاشیہ دیکھ کر ہنستے ہوئے سر تسلیم خم کیا۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ اب یہ مرحلہ
باقی رہ گیا ہے کہ اس قانون پر پورا عمل درآمد کرایا جائے۔ جمعیۃ علماء اس کے
لئے کوشاں ہے پھر ایک صاحب نے سوال کیا کہ جمعیۃ علماء آزادی سے قبل
تو سیاست میں حصہ لیتی تھی کیا وجہ ہے کہ اب جب کہ لیگ بھی نہیں رہی جمعیۃ
[illegible] کش ہوگئی؟ حضرت نے [illegible] دیا کہ آزادی سے
قبل مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کے لئے نشستیں محفوظ تھیں اور
انتخاب جداگانہ تھے مگر آزادی کے بعد انتخاب مشترکہ اور سیٹیں ریزرو نہیں
رہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اکثریتی فرقہ کی بعض فرقہ وارانہ جماعتیں بھی
مجالس قانون ساز میں اپنے نمایندے کامیاب نہ کراسکیں تو اقلیتی فرقہ کی سیاسی
جماعت کس طرح کامیاب ہوسکتی ہے دوسرے یہ کہ اگر جمعیۃ سیاست میں حصہ
لے بھی تو کل مسلمانوں میں سے دوسری جماعتیں بن کر سیاست میں حصہ لینا
شروع کریں گی اور مسلمان (Divide in Minority) کا شکار
ہوکر رہ جائیں گے۔ اس جواب کو مسلمانان احمد آباد نے بے حد پسند کیا اور ان کی
پوری تشفی ہوگئی۔ اب سے کوئی تین سال قبل ایلول ضلع سابر کانٹھا میں ایک
جمعیۃ کانفرنس ہوئی تھی وہاں جمعیۃ علماء صوبۂ گجرات کی انتخابی میٹنگ بھی رکھی
گئی تھی حضرت مجاہدؒ نے اس میٹنگ میں بھی ایک پر زور پر اثر تقریر فرمائی تھی ذمہ داران
جمعیۃ میں ایثار و کردار اور قوت عمل پیدا کرنے کی غرض سے حضرت مجاہدؒ نے
نہایت دردناک لہجہ میں یہاں تک فرمادیا تھا۔ کہ افسوس آج پورے ہندوستان
میں احباب اس بات کے خواہاں رہتے ہیں کہ ہر کانفرنس میں خواہ چھوٹی
ہو یا بڑی حفظ الرحمٰن کو ضرور شریک ہونا چاہیئے آخر یہ صورت حال کہاں تک
رہے گی۔ اب تو ہم نے قبر میں پیر لٹکا دیئے ہیں جمعیۃ کے ہر خادم کا فرض ہے
کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کی ادائے گی میں ہرگز ہرگز تساہل نہ کرے اس وقت میٹنگ
پر سناٹا اور ایک رقت خیز کیفیت طاری ہوگئی۔

بہرحال حضرت مجاہدؒ جہاں کہیں بھی تشریف لے گئے وہاں اپنی صداقت
وامانت بصیرت ومحبت وخلوص وہیئت ایثار وکردار متانت وخطابت تدبر و
تفکر بے باکی وبے لوثی اور اپنی خداداد انا بلیتیوں نیز صلاحیتوں کے گہرے نقوش
چھوڑ آئے ہیں جنھیں ہر وہ شخص ہمیشہ یاد رکھے گا جسے حق تعالیٰ نے محاسن
ومحامد کے ادراک اور حضرت مجاہدؒ کی جان بازانہ خدمات کا شعور حاصل ہے۔
میرے خیال میں ہندوستان کی دوسری اقلیتیں ہی نہیں بلکہ اکثریتی فرقہ بھی
حضرت مجاہد ملت جیسے سراپا درد لو رجامع الصفات شخصیت پیدا نہیں کرسکا۔ آہ
۲ اگست ۱۹۶۲ء کو یہ آفتاب دین وسیاست غروب ہوگیا ملت مسلمہ ایک لاثانی مفکر و
مدبر ایک لاجواب خطیب مصنف اور ایک عظیم رہنما سے محروم ہوگئی۔ بسر دست کانگریس
ایک شتر بے مہار ایا پارلیمنٹ ایک جسد بے زبان مسلمانان ہند ایک پراگندہ ریوڑ،
اور جمعیۃ علماء ایک تن خستہ جان اور نیم بسمل کی حیثیت سے زندہ ہے لہٰذا حضرت
شیخؒ اور حضرت مجاہدؒ سے محبت رکھنے والوں کا فرض ہے کہ ان دو اکابر کی محبوب ۲۹۵

صہ ۲۹ جماعت جمعیۃ علماء کے ساتھ ہر معاملہ میں تعاون فرمائیں اور ان بزرگوں کی اس محبوب یادگار کو تقویت پہنچائیں۔

آہ مجاہد ملت

از: کوثر بھارتی (نوساری)

حفظ رحمٰن مجاہد ملت ۔ تجھ پہ نازاں خدا کی رحمت ہو
وقف تھی جاں تری وطن کیلئے ۔ زندگی بھر کی قوم کی خدمت
بات ڈنکے کی چوٹ کہتا تھا ۔ ہاں تری بے مثال تھی جرأت
تجھ کو شہرت کی تھی نہ کچھ پروا ۔ تجھ کو حاصل نہ تھی کوئی دولت
دوست دشمن تھے معترف تیرے ۔ سب کے دل میں رہی تری وقعت
درد دنیا کا تھا تیرے دل میں ۔ مقصد زندگی تھا بس خدمت
وہ جبلپور ہو کہ چند وسی ۔ ہو کہیں بھی فساد کی صورت
گھر میں آرام سے نہ بیٹھا تو ۔ تو سراپا تھا پیکر حرکت
یاد ہم کو ہے ملک کی تقسیم ۔ اور اس کا نتیجہ برکت
چھوڑیئے دوسری جگہ کی بات ۔ راجدھانی کی تھی یہ کیفیت
گرم تھا قتل و خون کا بازار ۔ آج غنڈوں کے پاس تھی قوت
تھے درندوں کی شکل میں انساں ۔ بھیڑیئے کی لئے ہوئے خصلت
شہر تبدیل تھا بیاباں میں ۔ آدمیت کی تھی نہ اصلیت
لُٹ رہا تھا متاعِ مال و زر ۔ چور اچکوں کو دی گئی مہلت
بربریت کا ناچ ہوتا تھا ۔ ہر طرف ایک عالم وحشت
آج یلغار تھی علی الاعلان ۔ تھی یہ تقسیم ملک کی برکت
کتنا مکروہ بدنما چہرہ ۔ آہ دلی تو اتنی بدصورت
دم بخود تھے ابوالکلام آزاد ۔ اور نہرو تھے دیدۂ حیرت

تو ہی باندھے ہوئے کفن آیا ۔ حفظ رحماں تری ہی تھی ہمت
عزم تھا تیرا کوہ کی مانند ۔ حوصلہ آسمان کی صورت
دشمنی تھی خلوص پر مبنی ۔ دوستی کی نہیں کوئی قیمت
عالم باعمل، سیاستداں ۔ لائق احترام شخصیت
فن تقریر ہو کہ ہو تحریر ۔ تھی ہر اک بات کی صلاحیت
تو مقرر بھی تھا تو شعلہ بیاں ۔ بڑھتی جاتی تھی دم بدم حیرت
آہ تیری زبان کا جادو ۔ جس میں تسخیر قلب کی قوت
اے کہ تو تھا مصنف قابل ۔ تیری تصنیف لائق عظمت
تو نے لکھے قصص ہیں قرآں کے ۔ تو نے لکھا صحیفۂ سیرت
اے محب وطن کہاں ہے تو ۔ تجھ کو روتی ہے آج جمعیت
اب تجھے ڈھونڈنے کہاں جائیں ۔ رہبر قوم، خادم ملت
تجھ سا رہبر کہاں سے لائیں ہم ۔ مرد میدانِ جنگ حریت
رو رہے ہیں تجھے زمیں والے ۔ تو نے کی سوئے آسماں ہجرت
زندگی میں تجھے نہ پہچانا ۔ ہم نے جانی نہ تھی تری قیمت
قوم مردہ پرست ہے تیری ۔ بعد مرنے کے ہے تری عزت
ڈھونڈتی ہے تجھے نظر میری ۔ تک رہا ہے یہ دیدۂ حیرت
لب پہ کوثر کے ہے دعا ہر دم ۔ تجھ کو پروردگار دے جنت
روح پر ہو تری ہزار سلام ۔ تجھ پہ ہر دم ہو سایۂ رحمت

تا قیامت ہو نور کی بارش
شعلہ طور ہو تری تربت

یوں تو ٹارچیں ہی ٹارچیں ملتی ہیں........ مگر کوئی بھی جنتا ٹارچ سے بہتر نہیں
کیونکہ یہ اپنی صناعی خوبیوں کی وجہ سے دوسروں سے ممتاز حیثیت کی حامل ہے
آپ اس کو تمام اچھی دوکانوں اور دفاعی محکمہ کی کینٹینوں سے خرید سکتے ہیں

STERLING GP. 30 URDU

SHERWANI ENTERPRISE

جیپ فلیش لائٹ انڈسٹریز لیمیٹڈ۔ الہ آباد۔۱

ریجنل ڈسٹری بیوٹرز: میسرز جے سن کمپنی۔ ۱۱۰۔ کناٹ لاج۔ کناٹ سرکس، نیو دہلی

عبدالصمد صارم ازہری

فخرِ وطن

یادش بخیر! مولانا حفظ الرحمان سہواروی کا اصلی نام مُعِزّ الدین تھا اور وہ بلاشبہ دین کی عزّت تھے۔ ان کے پدر بزرگوار کا نام شمس الدین تھا جو بھوپال میں انجنیر تھے، ان کے بڑے بھائی فخرالدین ڈپٹی کلکٹر تھے جو اب بھی بقیدحیات ہیں اور ان سے بارہ چودہ سال بڑے ہیں۔ حفظ الرحمان صاحب سے بڑے ایک اور بھائی بھی بڑے تھے جن کا نام بدرالدین تھا یہ ایڈوکیٹ تھے۔ عرصہ ہوا انتقال کر چکے۔ ان کے سب سے چھوٹے بھائی حکیم صلاح الدین ہیں جنھوں نے ان کی بڑی تیمارداری کی۔ ان کی ہمشیرہ جوان سے بڑی ہیں، حافظ محمد ابراہیم کی بیوی ہیں۔ ایک بہن اور ان سے بڑی تھیں۔ جن کا چند سال ہوئے انتقال ہوگیا۔ مولانا کے ایک لڑکا محمد اسلم اور پانچ لڑکیاں ہیں جن میں سے دو کی شادی ہوچکی ہے۔ ایک کی شادی حافظ محمد ابراہیم کے بڑے لڑکے عزیز سے ہوئی۔ دوسری کی حاجی محمد ایوب سے۔ تین جوان لڑکیاں اور ہیں۔

حفظ الرحمان نام ان کی والدہ نے رکھا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ مولانا نے ابتدائی اور انتہائی تعلیم مدرسہ "فیضِ عام" سہوارہ میں پائی۔ دورۂ حدیث کے لئے دیوبند تشریف لے گئے اور وہیں مدرس ہوگئے۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے ساتھ اسٹرائک میں وہاں سے ڈابھیل چلے گئے۔ مگر وہاں صحت اچھی نہ رہی، لہذا کلکتہ چلے گئے اور رلو رحیت پور روڈ کی ایک مسجد میں قرآن پاک کا ترجمہ سُنانے لگے یہاں بھی صحت اچھی نہ رہی تو پھر امروہہ میں صدرالمدرسین ہوکر چلے آئے۔ پھر انھوں نے اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے شیخ فیروز الدین صاحب کی مدد سے ندوۃ المصنفین قائم کیا۔ یہاں سے کئی قابل قدر کتابیں شائع کیں۔ تقسیم ملک کے بعد سیاست نے انھیں مہلت نہ دی اور وہ جمعیتہ علمائے ہند ہی کے ہو رہے۔ سیاسی زندگی نے انھیں علمی زندگی ترک کرنے پر مجبور کردیا۔

نوجوانی میں انھوں نے تحریکِ خلافت میں کام کیا اور رہنمائی پھر کانگریسی تحریکات میں کئی بار جیل جانا ہوا۔ ایک بار سول نافرمانی کے سلسلے میں وہ جمعیتہ علمار ہند کی طرف سے ڈکٹیٹر بنائے گئے اور گرفتار ہوئے۔ یہاں سے ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔

مولانا نے سب سے پہلے ایک رسالہ "مالابار میں اسلام" لکھا۔ پھر اور چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھیں۔ ندوۃ المصنفین میں آنے کے بعد انھوں نے بڑی معیاری کتابیں لکھیں جن میں "بلاغ المبین فی مکاتیب سیّد المرسلین"۔ "اسلام کا اقتصادی نظام"۔ "قصص القرآن" اور "اخلاق و فلسفۂ اخلاق" مشہور ہیں۔

حفظ الرحمان دیو بند گئے تو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کی خدمت میں رہے اور انھیں کے رنگ میں تقریر کرنے لگے۔ وہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے شاگرد رشید تھے۔ بلا کے ذہین اور بولنے والے تھے۔ درس و تدریس اور تقریر و تحریر دونوں کے مردِ میدان تھے۔ ہر فن کی کتابیں پڑھا لیتے تھے اور ہر فن میں یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر وہ بہت جلد دارالعلوم دیوبند کے اونچے مدرسین میں ہو گئے تھے۔

ایسے عالم کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ جو قلم کے بھی بادشاہ ہوں، اور تقریر اچھی کرسکیں۔ حفظ الرحمان تحریر و تقریر دونوں کے ماہر تھے۔ اُن کی تحریریں بہت سلجھی ہوئی ہوتی تھیں اور اُن کی تقریر بھی اس قدر سلجھی ہوئی اور دلچسپ ہوتی تھی۔ کیا مجال جو کوئی اُٹھ کر چلا جائے۔ وہ سات۔ آٹھ گھنٹے بے تکان بول لیتے تھے۔ نہ صرف سیاست پر بلکہ مذہبی عنوانات پر خصوصیت سے وہ بہت اچھا بولتے تھے۔

حفظ الرحمان بڑے مردِ مجاہد تھے تھکنا جانتے ہی نہ تھے۔ جہاں کہیں فساد ہوتا، پہنچ جاتے اور بڑے نڈر ہوکر کام کرتے۔ وہ مسلمانوں کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے تھے۔

مولانا بچپن ہی سے بڑے مہمان نواز تھے۔ یہ بات اُن کے تمام دوستوں میں مشہور تھی۔ بڑے ملنسار اور خلیق تھے انکی ازدواجی زندگی بے غل و غش نہایت صاف ستھری گزری خلیق ایسے کہ دشمن بھی آنکے

اخلاق کے مدّاح تھے ۔ وہ ہر شخص سے ... بی سی ...
نہ کرتے تھے ۔ عزیزوں، دوستوں کے مقدمات بڑی خوش اسلوبی سے سلجھا دیتے ...
اللہ نے انھیں معاملہ فہمی کی بڑی قوت عطا کی تھی ۔

مولوی حفظ الرحمان جہاں تک ہو سکتا کسی کی بُرائی نہ کرتے، ہر ایک کی تعظیم کرتے اور ہر ایک سے پیار و محبت سے پیش آتے وہ چائے، سگریٹ یا تمباکو، غرض کسی چیز کے عادی نہ تھے ۔ البتہ کھانے کے شوقین تھے کبھی سیو ہارے آتے اور بیروں کا زمانہ ہوتا تو ایک ہی نشست میں کچے کھٹے بیر ڈلیا بھرے کھا جاتے ۔ شاید یہی چیز ان کی موت کا باعث ہوئی ۔ کیونکہ اُنھیں چند ماہ پیشتر انفلوئنزا ہوا تھا اور ابھی کھانسی باقی تھی کہ انھوں نے ایک دعوت میں خوب ٹھنسی ۔ اچار اور مربے کھائے اور پھر علاج کی طرف زیادہ توجہ نہ دی ۔ کیونکہ وہ دوا بہت کم کھاتے تھے ۔

حفظ الرحمان بڑے سخی اور فیاض تھے میرے پھوپی زاد بھائی تھے ۔ وہ مجھ سے بہت ہی محبت کرتے تھے ۔ ہمیشہ عید بقرعید وہ میرے لئے کپڑے بناتے اور میری پسند کا جوتا ٹوپی لوا کر دیتے ۔

جب کبھی میں لاہور سے آتا تو وہ مجھ سے ملنے ضرور آتے ۔ ایک دفعہ میں لاہور سے صرف ایک ہفتہ کے لئے آیا اور یہ سوچ کر انھیں اطلاع نہ دی کہ میری وجہ سے انھیں خرچ کرنا اور تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے اتفاق بات کہ اُنھیں بھی میرے آنے کا پتہ نہ چلا اور میں واپس چلا گیا ۔ تین ماہ بعد پھر آیا تو وہ مجھ سے ملنے کے لئے آئے اور کہنے لگے ۔ پچھلی دفعہ تم آئے تو مجھے اطلاع تک نہ دی ۔ میں نے کہا کہ مجھے شرم آئی کہ آپ میری وجہ سے خرچ کرتے ہیں اور تکلیف اُٹھاتے ہیں، اس لئے اطلاع نہ دی ۔ پھر یہ کہ تین ماہ پہلے جب میں آیا تھا تو آپ سے ملاقات ہو بھی چکی تھی ۔ تو وہ مجھ پر بہت خفا ہوئے اور کہا، جب بھی آیا کرو، مجھے فوراً اطلاع دیا کرو، تکلیف کی کیا بات ہے ۔

میں مولوی صاحب کا گود کھلایا بچہ تھا، اور ان کے، میرے خیالات میں بڑا اختلاف تھا ۔ مذہبی بھی اور سیاسی بھی ۔ دونوں ایک گھرانے کے فرزند، مگر کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے ان کی محبت میں کوئی کمی دیکھی ہو یا کبھی کسی معاملے میں ان کی میری تلخ گفتگو ہوئی ہو ۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی سیاسی یا مذہبی معاملہ پر گفتگو ہوگئی اور بات بڑھ گئی، مگر کبھی کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی ۔ ہمیشہ نہایت سنجیدگی اور پیار محبت کے ساتھ گفتگو ہوئی ۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب میں تعصب نہ تھا ۔ اور وہ بڑی حد تک روشن خیال تھے ۔ وہ قدیم و جدید کے جامع تھے اور ایک بڑے عالی ظرف عالم تھے

انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرت مجاہد ملت کی آخری تمنا

ابو صالح محمد عبد الجمیل الخطیب
مدیر
"روشنی" بنگلور

حادثۂ تقسیم ہند کے بعد جہادِ آزادی کے عظیم مجاہد حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نور اللہ مرقدہٗ ہندوستانی مسلمانوں کے بیشمار مسائل کے لئے پریشان و کوشاں رہے۔ ملک کی آزادی کا وہ تصور جو حضرت امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ، حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ، حضرت شاہ سید احمد شہیدؒ، حضرت مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ، حضرت شاہ امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ، حضرت امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا حجۃ الاسلام محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا شیخ الہندؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ، مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہؒ، حضرت مولانا ابو الکلام آزاد اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے پاک و شفاف ذہنوں میں تھا۔ افسوس وہ اپنوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث عمل میں نہ آسکا۔ اسی لئے اس آزادی کو ہم اپنے اکابر کے مبارک اور مضبوط عقیدہ کی بنیاد پر حادثہ کہنے پر مجبور ہیں۔ اس حادثہ کا شکار زیادہ تر شمالی ہند کے مسلمان تھے۔ پورے ملک میں ہر طرف دہشت، خوف اور ہیبت طاری تھی۔ ان حالات میں ایک تنہا شخصیت اپنی شبانہ روز انتھک جدوجہد کے ساتھ مسائل کی پیچیدگیوں کو حل کرنے میں مصروف تھی۔ انہی قربانیوں کے باعث حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم مجاہدین کی صف میں داخل ہوکر مجاہد ملت کے کامیاب خطاب سے نوازے گئے۔ گو جنوبی ہند مثلاً مدراس، میسور، اندھرا اور کیرالا کے مسلمان اپنی دوری اور بے حسی کی وجہ سے شمال کی آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ تھے۔ پھر بھی جو کچھ اخبارات کے ذریعہ یا فطری اثرات دماغوں پر مسلط تھے ان سے متاثر ضرور تھے اور مسائل کا چونکہ پورے ملک سے تعلق تھا اس لئے خدشہ سے تو خالی نہیں۔ آزادی کے پہلے کے تمام لیڈر یا اڑ گئے تھے یا سو گئے تھے۔ میدان میں ایک بھی موجود نہیں تھا۔ ساری چیخ و پکار سارا جوش و خروش، تمام آسمان شگاف نعرہائے تکبیر و زندہ باد گویا کافور ہو چکے تھے۔ مردہ دلی اور بزدلی کا یہ عالم تھا کہ آزادی کیا آئی اپنے ساتھ مسلمانوں کے لئے بدحواسی، غلط فہمی، اور نادانی کے سبب ملک کے اندر رہنے کے باوجود انگریزی دور سے زیادہ غلامی اور بے بسی کا تصور دماغوں پر مسلط کر لینے کا المیہ لے کر آئی۔

ان حالات سے متاثر ہو کر ۱۹۵۳ء میں مسلسل تقاضوں پر پہلی مرتبہ وقت نکال کر حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب نے جنوبی ہند کا دورہ کیا اور ان کے بصیرت افروز پیغام و تقاریر سے متاثر ہو کر عوام و خواص ایک ایک کر کے گھروں سے نکل پڑے اور حضرت مجاہد ملت کے اطراف جمع ہو گئے۔ جمعیۃ علماء ہند کی شاخ کا بنگلور میں قیام عمل میں آگیا۔ یہ ایک ہنگامی اور محدود سفر تھا اور مسائل کے باعث جوش بھی ہنگامی تھا۔ مولانا کے تشریف لے جانے کے بعد ختم سا ہو گیا۔ پھر مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی اور مولانا عاقل صاحب الہ آبادی کو مستقل تنظیم اور ترویج کے لئے مرکز سے روانہ کیا گیا۔ مختلف اضلاع کے دورے ہوئے۔

قیام جمعیۃ کے بعد حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ ان علاقوں میں تین مرتبہ لائے گئے۔ حضرت اقدس کو سیاسی حیثیت اور جہاد آزادی کے کامیاب مجاہد کے اسٹیج سے کسی نے سمجھا نہیں۔ بلاشبہ علوم و معارف اسلامیہ کی بڑی شخصیت کے مالک اور اسلاف عارفین کے قبیل کے بزرگ کی حیثیت سے تعارف ہوا اس طرح بیعت و ارشاد کا ہنگامی تعلق قائم ہو گیا۔ سلسلۂ صوفیہ متعارفہ کے اوراد و ارشادات کی لہر دوڑ گئی۔ اگر ان علاقوں کے مسلمانوں کے روبرو حضرت اقدس کی زندگی کا وہ رخ بھی آجاتا جس میں وہ درسِ حدیث کو چھوڑ کر دن رات مصروف جہاد تھے اور اپنے معلم و مربی کامل حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نور اللہ مرقدہٗ کی معیت میں مالٹا کے اسیر کی حیثیت سے تاریخ میں نامور تھے تو شاید متوسلین و متعلقین کے اندر اس کی اہمیت پیدا ہوتی۔ دار العلوم دیوبند کے سفراء اور مبلغین اپنے مختلف اوقات میں تشریف لائے۔ مگر ان حضرات نے بھی جہادِ آزادی کی داستان کو کماحقہ مستقل تربیتی اور معلوماتی انداز میں نہیں پیش کیا۔ ان تمام باتوں کے لئے رکاوٹ ان علاقوں کا وہ غلط ماحول تھا جس میں مغربی ذہنیت کے سبب لیگ اور اسی قبیل کی تحریکوں نے اپنے اثرات چھوڑ رکھے تھے۔ ملک آزاد ہوا اور افسوس کہ تقسیم کے ساتھ آزاد ہوا۔ مسلمانوں کے اندر جو لوگ انگریزی دورِ حکومت میں کارندے تھے۔ آزادی کے بعد ان کا وہ پارٹ موجودہ اقتدار کی نذر ہو گیا۔ مسلسل غلامی کے باعث ان میں سے بعض کی آنکھوں سے شرم و حیا کا پانی سوکھ چکا تھا۔ دل و دماغ کے اندر بے غیرتی پیدا ہو چکی تھی۔ کانگریسی حکومت میں اپنی ملازمتوں، عہدوں اور اثر و رسوخ کو باقی رکھنے کے لئے تعلقات کی راہیں تلاش کرنے میں مصروف تھے۔ جمود و بے حسی، بزدلی و بے بسی یہ ایسے انسانیت سوز اوصاف تھے جو اُن کا اوڑھنا بچھونا بن چکے تھے۔ عوام کا مزدور، ملازم اور تاجر طبقہ انہی لوگوں کو پہلے بھی دیکھتا تھا اب بھی دیکھ رہا تھا۔ عوام بے چارے ہر زمانے میں ان کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر محفل کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شمال کے اندر مسلمانوں کے سامنے سرکاری مدارس میں رائج شدہ نصاب کا مسئلہ درپیش

ہے۔ اسکے اندر جو زہر تریاق کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس سے وہاں کا ہوشمند طبقہ ہرگز غافل نہیں ہے۔ اس کے تدارک کی مختلف صورتیں اختیار کی جا رہی ہیں اور ایک حد تک اُن کو عملی جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ اس عملی صورتِ حال سے خود حکومت بھی ایک حد تک مطمئن ہو چکی ہے۔ برخلاف جنوب کے ان چار صوبوں کے یہاں ابھی تک اس قسم کا لغضاب رائج نہیں ہوا ہے۔ اگر خدانخواستہ ایسی صورتِ حال یہاں بھی پیش آجائے تو اس کو ہماری بدقسمتی پر محمول کرنا چاہیئے کہ اس کے تدارک کی کوئی صورت اور شکل نہیں ہے۔ انڈین یونین مسلم لیگ کا عام شہرہ ہے۔ اگر اس کے اندر گھس کر دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ کوئی جان نہیں کوئی زندگی نہیں ہے۔ دراصل وہ ملکی سیاست کے شطرنج کا ایک مہرہ ہے جو مختلف صوبوں میں اپنی مختلف صورتوں کے ساتھ پھرایا جا رہا ہے۔

ان تمام حالات کے پیش نظر ۱۹۶۰ء میں دہلی پہونچ کر حضرت مجاہد ملت مرحوم سے راقم الحروف نے ملاقات کی اور ان کے بعد دیگرے اکابرین جمعیۃ مثلاً حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب وغیرہ سے مل کر اس بات کی طرف آمادہ کیا، کہ جمعیۃ علماء ہند کا سالانہ اجلاس جنوب کے کسی بڑے شہر میں کیا جائے تاکہ وہاں جمعیۃ کے لئے راہ ہموار ہو سکے اور وہاں کے خواص کے اندر جمعیۃ سے متعلق جو غلط فہمیاں موجود ہیں۔ وہ دور ہوں اور پھر تفصیلی حالات دیوبند پہنچ کر حضرت مولانا صاحبزادہ صاحب کے روبرو رکھے غرض یہ دن بھی گذر گئے۔

اسی رمضان کے آخری عشرہ کی بات ہے جس کو میں اپنی خوش نصیبی پر محمول کرتا ہوں ابھی کانگریس کے انتخابات کے آخری اجلاس میں مولانا حامد الانصاری غازی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ اجلاس سے فارغ ہو کر وہ حضرت مجاہد ملتؒ کی خیریت پرسی کے لئے جا رہے تھے میں بھی ساتھ ہو گیا۔ حضرت مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ غازی صاحب نے میرا نام لیکر تعارف کرایا ایک بزرگ جو پہلے سے وہاں تشریف فرما تھے۔ کہنے لگے ڈاکٹروں کی تاکید ہے کہ مولانا سے بات چیت نہ کی جائے" اُن کا جواب خود مولانائے مرحوم نے دیا " یہ ہو سکتا ہے کہ بستر پڑا رہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اعضاء کو حرکت نہ دوں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی میری زبان پر پابندی عائد کردے۔ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ کی زندگی سے خدا کی پناہ ہے" پھر راقم الحروف سے مخاطب ہو کر مدراس اور بنگلور کے حالات اور انتخابی دور میں مسلمانوں کی پوزیشن اور جو مسلم افراد مدراس کے اضلاع میں کانگریس کی سیٹ سے انتخاب کی کوشش میں تھے غرض جملہ حالات کو دریافت فرمایا۔ راقم الحروف نے ایک ایک کا جواب اپنی معلومات کے مطابق دینے کی کوشش کی پھر فرمایا

" اللہ تعالیٰ اگر مجھے زندہ رکھے تو جمعیۃ کا سالانہ اجلاس بنگلور میں کراؤں گا۔ میں نے کہا وہاں حالات جمعیۃ کے موافق نہیں ہیں۔ بارہا کوششوں کے باوجود خود وہاں کے خواص نے جمعیۃ کو مضبوط نہیں کیا ہے۔ جواب میں فرمایا ۔

میں خود آکر پندرہ دن بنگلور میں بیٹھ جاؤں گا اور ایک ایک کو آواز دے کر یا ان کے گھروں پر جاکر بلاؤں گا پھر یہ کام ہوگا۔ پھر فرمایا اگر زندگی نے میرا ساتھ نہ دیا تو میرے نائب یہ فریضہ انجام دیں گے۔

اللہ تعالیٰ مولانائے مرحوم کی اس آخری تمنا کو پورا ہونے کی راہیں آسان فرمائے۔ یہ کوئی معمولی تمنا نہیں ہے بلکہ ایک وسیع علاقہ کی بقا اور زندگی کا مسئلہ ہے جس کے لئے مولانائے مرحوم بستر مرض الموت پر بے چین تھے

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور

نہیں رہا

از
اکرم نعمانی شیرکوٹی

وہ پیکر خلوص و مروّت نہیں رہا
گنجینۂ کمال و صداقت نہیں رہا
نازاں تھی جس پہ بزم ثقافت نہیں رہا
روشن نگاہ نجم صحافت نہیں رہا
وہ صاحب ذکاء و فراست نہیں رہا
وہ عالم کتاب سیاست نہیں رہا
عالم کو جس پہ ہوتی تھی حیرت نہیں رہا
کھولے تھے جس نے عقدۂ حکمت نہیں رہا
حاصل تھی سب کو جس کی حمایت نہیں رہا
ہم کو تھی آج جس کی ضرورت نہیں رہا
وہ دوستدار شیخ و برہمن کہ جس سے تھی
قائم اساسِ خلق و مروت نہیں رہا
ظاہر یہی ہے تیرگیٔ شام غم سے آج
کہ آفتابِ صبح مسرت نہیں رہا
یہ کہہ رہی ہے خامشیٔ عرصۂ جہاد
افسوس وہ مجاہد ملت نہیں رہا
سالِ وصال از سرِ افسوس بر ملا
"اکرم لکھو حلیِ خطابت نہیں رہا"
۱ ۳ ۸ ۲ ھ

کویراج ہرنام داس بی اے کا ہدیہ نیاز

وہی انسان جو جہاد کرتے ہیں ملک و قوم کی سربلندی اور دین و ایمان کی ترقی کے لئے وہی ہیں مجاہدانِ عظیم۔ بیسویں صدی کے مجاہدین میں مولانا حفظ الرحمٰن کا درجہ بہت بلند ہے۔ لاہور سے دہلی آ قیام پذیر ہونے پر ۱۹۴۷ء کے آخر میں مولانا صاحب موصوف کا نیاز میں نے حاصل کیا۔ میں نے انہیں بہت مخلص۔ وضعدار۔ ممد و معاون۔ طبیعت کا فرشتہ سیرت انسان پایا۔ پہلی ملاقات ہی میں مجھ نیازمند کو سر آنکھوں پر بٹھالیا اور فرمایا! آپ سے غائبانہ تعارف تو کافی پہلے سے خواجہ حسن نظامی صاحب کی معرفت ہو چکا ہے جنھوں نے اپنے اخبار منادی میں آپ کے ہدایت ناموں کی بہت دلچسپ تنقید شائع فرمائی۔ موصوف خواجہ صاحب سے ٹیلی فون پر آپ کی بابت پوچھا تو فرمایا۔

بہت دلچسپ مفید اور سبق آموز تصانیف ہیں۔ کویراج صاحب کی۔ مگر بڑی بات یہ ہے کہ ہندو اپنی مجلسی و جسمانی و حکیمی تعلیمات میں مسلمانوں کو روزانہ تلاوت قرآن مجید کی تاکید فرماتا ہے۔ مگر کتب دینیات کے علاوہ مسلمان مصنف اس قسم کی تعلیم اپنے ناظرین کو کم ہی دیتے ہیں۔" مزید فرمایا! کویراج صاحب میں آپکا معترف بھی ہوں اور احسانمند بھی۔ آپ کہئے کیا خدمت ہے میرے لائق ہے کیسے تشریف آوری ہوئی۔ میں نے مدعا عرض کیا تو دل و جان سے امداد کا وعدہ فرمایا۔ ساتھ چل پڑے۔ دوران گفتگو یہ بھی پوچھا کہ کویراج صاحب آپکو اسلام کی صوم و صلوٰۃ اور شریعت کے متعلق اپنی واقفیت کہاں سے حاصل ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ میری ابتدائی تعلیم مسجد میں ایک بہت ہی شفیق استاد اور عالم مولوی صاحب کے قدموں میں ہوئی۔

اس کے بعد جب جب بھی مولانا موصوف سے ملنا ہوا پرانے وقتوں کے مولوی صاحبان کی قابلیت موضوع گفتگو رہی۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب بہت خوبیوں کے مالک تھے اور رب العالمین پاک پروردگار کے جوار رحمت کے کلیتاً حقدار۔ خداوند ہم سب کو ان کے اوصاف حمیدہ کی پیروی کی توفیق بخشے۔

خاک نشین

کویراج ہرنام داس

مجاہد ملت ؒ

جناب عبدالعظیم ... حرمی۔ بنگلور۔

کاش کچھ دن اور آپ جئے ہوتے

۳ر اگست ۱۹۶۲ء کو صبح نئی دہلی ریڈیو نے دنیا بھر میں یہ اندوہناک خبر پھیلائی کہ مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نئی دہلی میں اپنی قیام گاہ میں انتقال فرما گئے۔ مولانا ۶۲ سال کی عمر میں ہم سے جدا ہوتے ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے بے وقت انتقال فرمایا۔ لیکن جب ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اس پر آشوب دور میں جبکہ مسلمان چاروں طرف سے خوف و ہراس میں گھرے ہوتے ہیں مرعوبیت کا شکار بن چکے ہیں۔ ملک کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق ان کی صحیح رہنمائی کرنے والا کوئی نظر نہیں آرہا ہے تو وحشت سی ہونے لگتی ہے اور ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ کاش آپ ہماری رہنمائی کے لئے کچھ اور دن جئے ہوتے!

مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی ساری زندگی ایثار قربانیوں کا ایک مرقع رہی ہے۔ ملک کی آزادی کے لئے بڑی بڑی قربانیاں پیش کرنے والے مسلمانوں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔ لیکن ان تمام میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ نے جس بے باکی، اولوالعزمی اور بہادری کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال موجودہ دور میں کسی اور مسلم لیڈر میں مشکل ہی سے مل سکے گی، مولانا نے سیاسی حیثیت سے اپنی ساری زندگی صرف کانگریس ہی میں گذار دی مہاتما گاندھی کو آپ پر مکمل اعتماد تھا۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو بھی دل سے آپ کی عزت کرتے تھے پارلیمنٹ کے مسلم ممبروں میں بھی آپ ہی کی ایک ایسی شخصیت تھی جس کی ایک للکار پر سارے ایوان کے کان کھڑے ہو جاتے اور حکومت کی ساری مشنری حرکت میں آجاتی تھی۔

۱۹۴۷ء تک مولانا حفظ الرحمٰن نے بعض جلیل القدر لیڈروں کے ساتھ ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے کی جد وجہد کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد ملک کی ترقی اور اتحاد کی کوشش میں جب آپ ہمہ تن مصروف ہو گئے تو آپ کی دور رس نظروں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ مسلمانوں کو اگر اس ملک میں باوقار زندگی بسر کرنا ہے اور اپنا مستقبل روشن بنانا ہے تو انہیں دو اہم ذمہ داریوں کا بوجھ برداشت کرنا ہوگا۔ ایک یہ کہ مسلم عوام کو ملک کے نئے سانچے میں ڈھالا جائے اور پھر انہیں اپنی مذہبی روایات اور اسلامی تہذیب کو برقرار رکھنے کے لئے غیر سیاسی بنیادوں پر متحد کیا جائے۔ ایک طرف آپ ان مقاصد کے حصول کے لئے جد وجہد کرنے لگے تھے تو دوسری طرف ملک کے فرقہ پرستوں کی سرکوبی اور مظلومین کی حمایت کے لئے بھی دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔

اس سلسلے میں حق کی آواز بلند کرنے میں نہ تو حکومت کی ہیبت اور چاپلوسی ان کی راہ میں رکاوٹ بن سکی اور نہ فرقہ پرستوں کی تلواریں اور جان کا ڈر انہیں اس جد وجہد سے ہٹا سکا حصول آزادی کے ساتھ ملک کے اندر جب غارت گری اور خونریزی کا دور دورہ شروع ہوا تو آپ نے دہلی کے گلی کوچوں تک میں مظلومین کی حمایت میں جس بے جگری اور عزم و ہمت کا ثبوت دیا اس کا ہر شخص معترف ہے۔ کچھ دن بعد خونریزی اور فسادات کا زور ٹوٹا تو قانون املاک متروکہ کی زد بہت سارے معصوم اور بے گناہ مسلمانوں پر بھی پڑنے لگی تھی۔ ان بے گناہوں کی تائید و مدد کے لئے نہ تو آپ دن بھر کسی بھی وقت چین سے بیٹھتے تھے اور نہ ساری رات نیند بھر کر سوتے تھے۔

جدید حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مسلمانوں کو متحد اور منظم کرنے کی غرض سے آپ ملک کے مختلف مقامات کے دورے کرتے رہے حالات اور فضا کو سازگار بنانے کے لئے اہم مقامات کو جمعیتہ علماء کے سفیر اور نمائندے بھی بھیجتے رہے۔ زندگی کے آخری لمحے تک بھی آپ کی یہی خواہش اور کوشش رہی کہ کسی نہ کسی طرح جمعیتہ علماء کو ملک بھر میں مضبوط کیا جائے اور اس کے تحت مسلمانوں کو متحد و منظم کیا جائے۔

مولانا مرحوم کو جنوبی ہند میں مدراس اور بنگلور سے بڑی توقعات وابستہ تھیں آپ کی یہ خواہش رہی کہ جنوب کے لئے بنگلور کو جمعیتہ علماء کا مرکز بنایا جائے چنانچہ آپ کئی دفعہ خود بھی بنگلور تشریف فرما ہوتے اور پھر مولانا محمد عاقل۔ مولانا محمد اسمٰعیل سنبھلی اور مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی جیسے حضرات کو بھی محض اسی تنظیمی مقصد کی خاطر بنگلور بھیجتے رہے۔

جنوب میں جمعیتہ علماء کی تنظیم کیوں جڑ نہیں پکڑ سکی؟ یہ علیحدہ سوال ہے لیکن مولانا مرحوم اپنی ان کوششوں میں بار بار ناکام ہونے کے باوجود مایوس نہیں ہوتے تھے۔ آپ نے جنوب کے بہت سارے حضرات سے ذاتی طور پر جو گفتگو کی ہے اور جن حضرات کے نام آپ خطوط لکھتے رہے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ

آپ پھر بنگلور تشریف لانے والے تھے اور عملی ... بنیاد مقصد ... کرنے کے ارادے کر رہے تھے۔

افسوس ہے کہ سرطان جیسے موذی مرض نے آپ کے ان عزائم میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ اس کی وجہ سے آپ کا بنگلور کا سفر بار بار ملتوی ہوتا رہا۔ آخر کار زندگی نے آپ سے وفا نہیں کی۔ علاج کے سلسلہ میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود ۲ راگست کو صبح کے چار بجے آپ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب ہم مولانا کی قیادت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکے ہیں مولانا نے گو ہم سے منہ موڑ لیا لیکن یہاں سے جاتے ہوئے آپ اپنے نقش قدم چھوڑ گئے ہیں جن پر چل کر ہم اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکے۔

... رحلت کے بعد اس وقت ہم ... کوئی یادگار قائم کرنے پر غور کر رہے ہیں اگر مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ کی کوئی حقیقی یادگار قائم ہو سکتی ہے جو آپ کے شایان شان ہو تو صرف ایک ہی چیز ہے جمعیۃ علماء اور اس کی ہندوستان گیر تنظیم۔ اس کے ذریعہ ہم مولانا حفظ الرحمٰن کے نقش قدم پر چل کر ان کی روح کو خوش کر سکیں گے بلکہ ان بزرگوں کے مقاصد کو پورا کرنے اور ماضی کی طرح مسلمانوں کے مستقبل کو روشن بنانے میں بھی ہم کامیاب ہو سکیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ

اُن کی جُدائی

جناب مطرب سلطان صاحب نظامی لکھنوی

فرطِ احساس سے گلزار کی فطرت ہے اُداس — کیا جُنوں خیز تبسّم ہے نکہت ہے اُداس
خلوتِ غم کی قسم شیشۂ ساعت ہے اُداس — ہند کے جام میں صہبائے سیاست ہے اُداس

مہر چمکا ہے شعاعوں میں مگر رنگ نہیں
پرتوِ شام میں بھی عکسِ شب آہنگ نہیں

باغِ اُمید میں کیا ساعتِ تاراج آئی — چھپ کے پردے میں بہاروں کے خزاں آج آئی
جب گھڑی آئی وہ سر برہنہ بے تاج آئی — آہ بھی آئی تو تاثیر کی محتاج آئی

موت نے تیری عجب رشتۂ غم جوڑ دیا
جیسے کونین کی ہر چیز کا دل توڑ دیا

رنگِ غم گہرا ہُوا رنگ تغیّر کی قسم — عالمِ ہوش کہاں حسنِ تحیر کی قسم
فکرِ فردا کی قسم کیف تفکّر کی قسم — تری تصویر ہے آنکھوں میں تصور کی قسم

ہر نفس عشرتِ بے کیف ہوا جاتا ہے
پھول ہنستے ہیں مگر رنگ اُڑا جاتا ہے

مہر شبنم کدۂ یاس میں ہے سرگرداں — برف کے سینے میں ہے شعلۂ خاموش نہاں
مضمحل ہو گئی خود گردشِ نبضِ دوراں — نفس زیست ہُوا جاتا ہے اب بارِ گراں

جوئے خوں می چکد از حسرتِ دیرینۂ ما
می تپد نالہ بہ نشتر کدۂ سینۂ ما

سید قسیم الحق گیاوی ۔ ناظم کتب خانہ مدرسہ قاسمیہ ۔ گیا ۔

آہ ! حضرت مجاہد ملّت

میں یہ کیسی خبر سُن رہا ہوں کہ مسلمانوں کا آخری رہبر، آخری سہارا چھن گیا
وہ ہم سے جدا ہو گیا جو ہماری ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جایا کرتا تھا جب ہم پر
مصیبتیں نازل ہوتی تھیں تو وہ ہمارے لئے اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیا کرتا تھا
کاش ! ہمارے کان یہ خبر سننے سے پہلے بہرے ہو جاتے کہ ہندوستان کی
جنگ آزادی کا مجاہد، جمعیۃ العلماء ہند کا روح رواں، کانگریس کا قوت بازو،
دار العلوم دیوبند کی گتھیوں کو سلجھانے والا، ندوۃ المصنفین کا بانی، شعلہ بیان
مقرر، جادو نگار مصنف، قوم کے لئے جان و مال لٹانے والا لیڈر، پارلیمنٹ کو
اپنی مؤثر تقریروں سے ہلا دینے والا ممبر پارلیمنٹ، جبل پور کے مصیبت زدوں
کے دل کی ٹھنڈک، علی گڑھ اور دوسرے فساد زدہ علاقوں کے آفت زدوں
کا آنسو پوچھنے والا، وہ شخص جسے لوگ مجاہد ملت کہتے ہیں، مولانا حفظ الرحمن
صاحب ایم، پی کہتے تھے ۔ افسوس صد افسوس کہ وہ ہم سے جدا ہو کر اپنے
محبوب حقیقی سے جا ملے ؎

آہ اس دنیا سے آج اک عالم دین اٹھ گیا
عالم اسلام جس کی موت سے غمناک ہے

وائے ! حسرت کہ ہماری دنیا تاریک ہو گئی، ہمارے دماغ کی روشنی ختم ہو گئی،
ہمارا دل سرد پڑ گیا، ہمارے ارادے پست ہو گئے ۔

حیف صد حیف ! کہ وہ شخص جو شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے بعد لوگوں
کے درد کا درماں تھا، وہ عظیم المرتبت انسان جسے دیکھ کر امام الہند رحمۃ اللہ علیہ
کی جدائی کا غم کم ہو جایا کرتا تھا، وہ بلند پایہ مقرر جس کی تقریریں دلوں میں جوش
بھر دیا کرتی تھیں، جس کے جوشیلے پر حکمت کلمات ایسے ہوا کرتے تھے
کہ ہر سننے والے کے دل میں جوش عمل پیدا ہو جایا کرتا تھا جس کی تقریروں کو
سن کر سحبان الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں سے محرومی کا صدمہ ہلکا ہوا کرتا
تھا، آہ ! کہ سیوہارہ کا وہ فرزند، دار العلوم دیوبند کا وہ نامور فاضل، دار العلوم
دیوبند کی مجلس شوریٰ کا وہ معزز ممبر، جمعیۃ العلماء ہند کا وہ سالار اعظم ہم سے
ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ۔ ہمارا کلیجہ یہ سوچ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام رح

کے انتقال پر ملال سے جو بے پایاں نقصان ہوا اس کی تلافی نہ ہوسکی امام الہند کی وفات حسرت آیات سے جو خلا پیدا ہوا اسے کوئی پُر نہ کرسکا اب وہ شخص بھی جس نے مسلم کنونشن کے ذریعہ ایک طرف حکومت کے سامنے مطالبات پیش کئے، ارباب اقتدار کو مسلمانوں کی طرف متوجہ کیا اور دوسری طرف مسلمانوں میں قوت عمل کی روح پھونکی مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی، جس کی پوری زندگی مجاہدہ وقربانی، خدمت قوم وملت، اور قوم کی ترقی وبہبودی کے لئے وقف تھی، جس کی پوری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی، ہم سے روٹھ گیا، ہم سے جُدا ہو گیا۔

حسرتا واحسرتا کہ اب مائیں ہزاروں بچے جنیں گی لیکن مجاہد ملت پیدا نہ کرسکیں گی۔ ع ایک دل ہے اور طوفان حوادث اے جگر

آہ صد آہ! کہ اب وہ ہماری مدد کرنے نہ آسکے گا ہم اب اُسے اِس دنیا میں کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ وادریغا واحسرتاہ! کہ اس کی جدائی سے جمعیۃ العلماء پر ویرانی چھاگئی، دلّی کی گلیاں سونی ہوگئیں، دارالعلوم دیوبند میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے، اس کی تقریروں کے شیدائی گریہ کناں اور اس کی تصنیفات کے دلدادہ چاک گریباں ہیں، اُس کی خدمات کے بوجھ سے لدے ہوئے ہندوستانی اس کے لئے اُٹھ اُٹھ کر آنسو بہا رہے ہیں، اس کی یاد میں مسلمانوں کا جگر پانی ہو رہا ہے، علماء، طلباء، اہل سیاست، جمعیۃ العلماء ہند کی تمام شاخوں اور تمام شعبوں، عام مسلمانوں اور تمام ہندوستانیوں پر افسردگی و مردنی چھائی ہوئی ہے۔ ع۔ کوئی ہے خستہ جگر کوئی گریباں چاک ہے۔

انکی وفات حسرت آیات کی خبر وحشت اثر لوگوں پر بجلی بن کر گری ہے اور لوگ تڑپ رہے ہیں رُو رہے ہیں، سر پیٹ رہے ہیں۔ ماتم کر رہے ہیں

ع۔ نہ تھمتے ہیں آنسوں نہ رکتی ہیں آہیں۔

لیکن چاہے جتنا بھی رویا جائے، جتنا سوگ منایا جائے، جتنا واویلا کیا جائے اب مجاہد ملت واپس نہیں آسکتے۔ قدرت خداوندی میں کسی کو دخل نہیں، اس لئے اب ہمارا فرض ہے کہ ان کی روح پاک کے سکون وقرار کے لئے کوششیں کریں، زیادہ سے زیادہ ایصال ثواب اور ان کی مغفرت کے لئے دعائیں کریں ؎

اور اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں سے پھر کوئی مجاہد ملت پیدا ہو تو ہمارے لئے لازم ہے کہ ہم ان کی زندگی کو مشعل راہ بنائیں، ان کی زندگی سے ہم سبق حاصل کریں ؎

FASTER
initial
action...

سُعَالین

سُعَالین فوراً بے چینی کو دور کرتی ہے۔ خراش کو روکتی ہے اور تسکین پہنچاتی ہے۔
یہ سانس کی نالیوں کو صاف کرتی ہے۔ کھانسی کو دُور کرتی ہے۔ اور مکمّل اور دیرپا شفا بخشتی ہے۔

... Followed by
prolonged relief

دہلی - کانپور - پٹنہ

مدرسہ عالیہ عربیہ مسجد فتحپوری۔ دہلی۔
مدرسہ اسلامیہ درگاہ حضرت مخدوم صاحب پانی پت
مدرسہ اسلامیہ۔ باب نگر
مدرسہ معین الغربا۔ ناصری گنج۔
مدرسہ صدیقیہ۔ شہنا پور (گونڈہ)۔
مدرسہ شریفیہ۔ نواب گنج۔ دہلی۔
مدرسہ تعلیم القرآن۔ رام پور۔ منہاران۔
مدرسہ کمال اسلام۔ کوسمبہ
مدرسہ انجمن تعمیرات۔ رسڑا ضلع بلیا۔
مدرسہ عثمانیہ پھلکا۔ پٹنہ۔
مدرسہ اشرف المدارس۔ کلٹی
دارالاسلام حقانیہ۔ اکوڑہ خٹک
مدرسہ اسلامیہ۔ سونس
مدرسہ بدر الاسلام۔ شاہ گنج
دارالعلوم۔ بانسکنڈی۔ (آسام)
مدرسہ تعلیم القرآن۔ احمد گڈھ
مدرسہ محمدیہ۔ گوگرن۔ (مونگھیر)
مدرسہ فیض العلوم۔ کانٹھ
مدرسہ ناصر العلوم۔ کانٹھ
خانگی پنچایت۔ مدرسہ اسلامیہ پنج گاہ۔ ہوشیارپور۔
مدرسہ نعمانیہ ڈومریا عیدگاہ پورنیہ
مدرسہ اصلاح المسلمین۔ کاندھلہ
مدرسہ اسلامیہ قاسمیہ عارفپور۔

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل۔ (سورت)
مدرسہ تعلیم القرآن پھاٹک حبش خاں۔ دہلی
مدرسہ ریاض العلوم۔ دہلی۔
مدرسہ فیض القرآن۔ سہارنپور۔
مدرسہ رحمانیہ۔ ہاپوڑ
مدرسہ جامع الہدیٰ۔ مرادآباد۔
مدرسہ محمودیہ۔ چھتاری۔
مدرسہ فیض الاسلام۔ دہلی۔
مدرسہ عبدالرب۔ دہلی۔
مدرسہ امینیہ۔ دہلی۔
مدرسہ فیض الاسلام۔ کٹرہ نظام الملک۔ دہلی
دارالعلوم خلیلیہ۔ ٹونک۔
مدرسہ احیاء العلوم۔ ہلدوانی۔
مدرسہ اسلامیہ عربیہ۔ ابراہیم پورہ۔ بھوپال۔
مدرسہ دارالعلوم۔ چھاپی۔ کانٹھا۔
دارالعلوم چلّہ۔ امروہہ۔
مدرسہ خادم القرآن۔ سردھنہ
شاہی مسجد۔ سیوہارہ
مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ۔ گیا۔
مدرسہ امارت شرعیہ۔ بہار۔
مدرسہ اسلامیہ۔ دھام پور۔
مدرسہ اسلامیہ فتح پور
جامعہ عربیہ احیاء العلوم۔ مبارکپور

دارالعلوم معینیہ۔ اجمیر شریف
دارالمبلغین۔ لکھنؤ۔
انجمن اسلامیہ۔ بھوپال
مدرسہ قاسمیہ۔ شاہی مسجد۔ مرادآباد۔
مدرسہ اسلامیہ عربیہ۔ قصبہ اجراڑہ
دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ
خانقاہ مجیبیہ۔ پھلواری شریف۔ پٹنہ۔
مدرسہ عالیہ۔ کلکتہ۔
مدرسہ حسینیہ۔ رانچی۔
میوات پنچایت۔ نگینہ۔ میوات۔
مدرسہ ضیاء العلوم۔ احمد آباد
مدنی مکتب جھانسی۔
جماعت اسلامی ہند۔ سوائی مادھوپور۔
مدرسہ مسعودیہ۔ بہرائچ
مدرسہ کاشف العلوم۔ چھٹمل پور۔
مدرسہ فیض عام۔ سہسوان۔
جامعہ حسینیہ۔ گریڈیہ
مدرسہ مصباح العلوم۔ قصبہ کوپا گنج
مدرسہ آزاد۔ ڈھاکہ چمپارن۔
مدرسہ جامع العلوم۔ کانپور۔
جامعۃ الرشاد۔ اعظم گڈھ
مدرسہ تعلیم القرآن۔ رانی گنج
مدرسہ سراج العلوم۔ نوتنوا نی بازار

مدرسہ محمدیہ - رایاراگ
دارالقرآن - رانچی
مدرسہ ضیاء العلوم - بالی - رانچی
مدرسہ رشیدیہ - ڈنگرا گیا
مدرسہ مشکوٰۃ العلوم - بنگلورہ
مدرسہ حمیدیہ - گودنا -
مدرسہ کنز العلوم - ٹانڈہ
مدرسہ انوار العلوم - گیا -
مدرسہ جامعہ امدادیہ - لہریا سرائے
مدرسہ خادم العلوم - کرنیل گنج
مدرسہ نوریہ اونڈ ول - بنگال
مدرسہ فاروقیہ - صبر حد -
مدرسہ حبیبیہ - احمد آباد
مدرسہ اسلامیہ پانڈولی - ضلع سہارنپور -
مدرسہ اشرفیہ - راندیر
مدرسہ محمدیہ - سوپول -
مدرسہ عظیمیہ - غازی پور -
مدرسہ محمودیہ - شیر گھاٹی - گیا -
مدرسہ احمدیہ - ابوبکر پور -
مدرسہ حسینیہ اسلامیہ - جیبولہ - افغانان
مدرسہ ریاض العلوم - ساٹھی چمپارن -
مدرسہ بدر الاسلام - بیگوسرائے -
مدرسہ ضیاء العلوم - ٹنکوپا
مدرسہ عربیہ منبع الاسلام - گلا دھٹی -
مدرسہ انوار العلوم - اسلامپور -
دارالعلوم عزیزی - ضلع پشاور -
دارالعلوم ناصریہ - ٹونک
دارالعلوم - اننت پور آندھرا -
مدرسہ اشرف العلوم - گنگوہ -
مدرسہ محمدیہ بشن پور - ضلع پورنیہ
مدرسہ اسلامیہ - بینچ

ادارۂ اسلامیہ - جوہانسبرگ
مدرسہ رشیدیہ - منٹگمری
مدرسہ قوت الاسلام - گھلہ - (سورت)
مدرسہ دارالعلوم - ٹکی - رانچی -
شفیق میموریل اسکول
دارالعلوم عربک کالج - میرٹھ
نوشل ایجوکیشنل سینٹر لال کنواں دہلی -
پنجابی جونیر ہائی اسکول - مراد آباد
مسلم قدرت انٹر کالج - سیوہارہ -
حمیدیہ کالج - بھوپال -
مڈل اسکول - سرائے خلیل - دہلی -
اینگلو عربک ہائیر سیکنڈری اسکول - دہلی
حافظ محمد ابراہیم کالج - ہنٹور -
اکیڈمی - بنارس -
ابوالکلام آزاد اسٹیڈی فورم - دہلی
اسلامیہ انٹر کالج - مظفر نگر -
اسلامیہ ہائیر سیکنڈری اسکول - دیوبند -
کرشنک ڈگری کالج - موانہ ضلع میرٹھ
اسلامیہ انٹر کالج - اٹاوہ -
ایسوسی ایشن اردو ہائی اسکول - امراوتی
مولانا ابوالکلام ہائی اسکول - ناگپور -
مسلم یونیورسٹی یونین - علی گڑھ -
شبیر گرلز اسکول - اٹاوہ
ہندو انٹر کالج - امروہہ -
شیروانی انٹر کالج - صلاپور - الہ آباد
مسلم انٹر کالج - فتح پور -
اسلامیہ جونیر ہائی اسکول - لکھیم پور - کھیری
اسلامیہ انٹر کالج - بریلی -
مسلم ہائی اسکول - جے پور -
ایم - اے - جونیر ہائی اسکول - آگرہ
اینگلو اردو ہائی اسکول - ہانسوٹ (گجرات)

اسلامیہ انٹر کالج - فیروزآباد
فیض عام انٹر کالج - میرٹھ -
تکمیل ادب کالج - لکھنؤ -
اسلامیہ ہائی اسکول - سوپور - کشمیر
مسلم اسکول - مغلسرائے -
قادریہ سائنس کالج - برہان پور -
مہرانساء اسکول - الہ آباد
مسلم جاٹ انٹر کالج - اساڑہ - ضلع میرٹھ -
مظہر الاسلام مڈل اسکول - دہلی -
ایم - آر - انٹر کالج - دلراز نگر -
ڈگری کالج - کانٹھ -
رحمانیہ کالج - مودھا - (یو - پی)
فتح پوری ہائیر سیکنڈری اسکول - دہلی -
ابوالکلام گرلز اسکول امروہہ
دہلی پردیش کانگریس دہلی
دفاتر ماہنامہ شمع - دہلی -
ہندوستانی ادبی سوسائٹی - دہلی
ہمدرد دواخانہ دہلی -
جوہر میموریل کمیٹی - الہ آباد
انجمن دائرہ ادب - دہلی
ہول سیل کلاتھ مرچنٹس ایسوسی ایشن - دہلی -
ینگ مینس مسلم ایسوسی ایشن الہ آباد
بیخود اکیڈمی - دہلی -
نشاط اکیڈمی - دہلی -
احمدیہ کمیونٹی - دہلی -
جماعت اہلحدیث - کراچی -
جنتا سیوک سوسائٹی محلہ شاہ گنج - کوچہ پنڈت - دہلی
بھارتیہ خدائی خدمتگار جرگہ -
انجمن اتحاد تاجران جامع مسجد - دہلی -
انجمن تعمیر اردو - دہلی -
انجمن تکمیل ادب - دہلی

آل انڈیا انجمن سلیمانیہ
فرینڈز ایسوسی ایشن۔ فراشخانہ۔ دہلی۔
پورٹ حج کمیٹی۔ بمبئی۔
انجمن تہذیب البیانی۔ مدرسہ شاہی مراد آباد
مجلس تحقیق ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ
اسلامک یوتھ آرگنائزیشن۔ رام پور۔
وکلاء محررہ اہلکاران مظفر نگر۔
نگر کانگریس کمیٹی۔ سنبھل۔
نگر کانگریس کمیٹی۔ امروہہ
داؤدی بوہرہ مرچنٹس ایسوسی ایشن۔ کلکتہ
بیڑی ورکس یونین۔ امروہہ
کمیونسٹ پارٹی فیروز پور جھرکہ۔
انجمن جامع اسلام۔ ناگپور۔ کامٹی۔
قریش برادری۔ دہلی
انجمن ترقی اردو شاخ دہلی۔
انجمن فیضِ ادب۔ میرٹھ۔

تعلیمات عامہ کمیٹی۔ دہلی۔
انجمن اسلامیہ دارجلنگ۔
مجتبیٰ لٹریری یونین۔ امروہہ
سوشل ریلیف کمیٹی نئی سرائے میرٹھ۔
اجملی شفاخانہ دہلی۔
انجمن تعمیر اردو۔ دہلی۔
قومی ایکتا کمیٹی۔ نوگانواں سادات۔
مکتبہ جامعہ۔ دہلی
جامعہ اردو علی گڑھ
مسلم وقف بورڈ۔ دہلی۔
مسلم وقف بورڈ۔ یوپی
مسلم وقف بورڈ مدھیہ پردیش
مسلم وقف بورڈ۔ پنجاب۔
مسلم وقف بورڈ۔ آندھرا۔
میونسپل کارپوریشن۔ دہلی۔
میونسپل کارپوریشن۔ کلکتہ

جوہر میموریل کمیٹی۔ الہ آباد۔
آزاد ہند لائبریری۔ چنارن۔ (آگرہ)
جمعیۃ الانصار امروہہ۔
ضلع مومن کانفرنس۔ مراد آباد۔
احرار خدام خلق۔ دہلی
سکینڈ ہینڈ موٹر پارٹس ڈیلرز ایسوسی ایشن جامع مسجد دہلی
کتب خانہ امینیہ۔ دینا۔ جے پور۔
طیبہ لائبریری۔ بیجھ۔
ملایا اسٹوڈینس ایسوسی ایشن۔ دیوبند۔
انجمن مرکز اردو ۔ جے پور۔
انجمن خدام الدین۔ لاہور۔
مسلم پبلک لائبریری۔ مراد آباد۔
بھٹکل مسلم جماعت۔ کالی کٹ۔ (الہ آباد)
مسلم ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ۔ سملک ضلع سورت۔
منتظمہ کمیٹی درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلی
انڈیا لائبریری۔ سہارنپور۔

علاج
وہی بہتر ہے جو قدرتی جڑی بوٹیوں سے کیا جائے
قدرت نے آپ کے مزاج اور طبیعت کے مطابق
ملک میں جڑی بوٹیاں پیدا کی ہیں۔ اگر یہ اطمینان
بخش صورت میں کہیں مل جائیں تو یقیناً آپ کے
مزاج پر ان کا فوری اور دائمی اثر ہوگا۔
آپ کی تندرستی اور صحت کا تقاضہ ہے کہ پہلے
اپنے ملک کی جڑی بوٹیوں سے بنی ہوئی دوائیں
استعمال کریں۔
ہمدم
دواخانہ دہلی ۱۹۱۶ء سے اپنے ملک کی جڑی
بوٹیوں سے تیار کی ہوئی دوائیں پیش کر رہا ہے۔
HAMDAM
Abdullah 62
اچھے علاج۔ اور مفید مشوروں کے لئے لکھیے یا تشریف لائیے۔
ہمدم دواخانہ لال کنواں پوسٹ بکس نمبر ۱۰۰۱ دہلی ۶
فہرست و دیگر لٹریچر مفت طلب فرمائیں۔

Dt. 15-3-63

(SPECIAL ISSUE (REGD. NO. D. 187)
THE DAILY 'ALJAMIAT' DELHI-6

only Title Markazi Press, Delhi-6.